READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

گھر کے ہر فرد کے لیے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
جولائی 2017
نگران اعلیٰ
معراج رسول

www.paksociety.com

رفعت سراج اور شیریں حیدر کے قسط وار ناول
سحر ساجد، رضوانہ پرنس اور غزالہ عزیز کی دل نشین تحریریں
معروف قلم کار ”فریدہ اشفاق“ سے پُر لطف ملاقات

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی

نگرانِ اعلیٰ : معراج رسول
مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول
مدیرہ : نزہت اصغر
معاون : آمنہ حماد
اشتہارات : محمد شہزاد خان

MEMBER APNS
CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رابطہ : شعبہ اشتہارات
محمد شہزاد خان 0333-2256789

قیمت فی پرچا (پاکستان) 60 روپے
قیمت فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات
زرسالانہ (اندرون ملک) 800 روپے [illegible] 2007 [illegible] 04 [illegible] 45 [illegible]

سرورق ٹائیٹل ...... انعم ...... فوٹو گرافی ...... شوکت، لاہور

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

www.paksociety.com

عید سعید

اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے مدیرہ 15

سلسلے وار ناول

پیا آن بجیں گی دل ہے رفعت سراج 22
امرت شیریں حیدر 116

منی ناول

ہم کو عبث بدنام کیا سیما رضا ردا 180

ناولٹ

من جان جاں بازم سحر ساجد 58
مسافت غزالہ عزیز 94
چاند کی کھڑکی منشا محسن علی 140
زندگی تو حسین ہے فوزیہ اشرف 165

مکمل ناول

خلش نادیہ احمد 222

افسانے

اماں کی عید رضوانہ پرنس 47
مہر عقیلہ حق 83
سسرال میں عید کرن خان اسمی 111
تخلیق کار فوزیہ احسان رانا 136
سجنا سنگ میری عید ریما نور رضوان 157
ہاں کہو کہ عید ہے فریدہ سیفی 197
جینا اسی کا نام ہے فصیحہ آصف خان 207
گھر سے چوراہے تک صاعقہ علی جیلانی 213
دو میٹھے بول فریدہ لاکھانی 219

خصوصی مضامین

اللہ اور آپ کا نور ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی 18
شمع ہدایت اختر شجاعت 253
باتیں بہار و خزاں کی قارئین 258
وہ آئے بزم میں نزہت اصغر 260
سروے شائستہ زریں 271

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

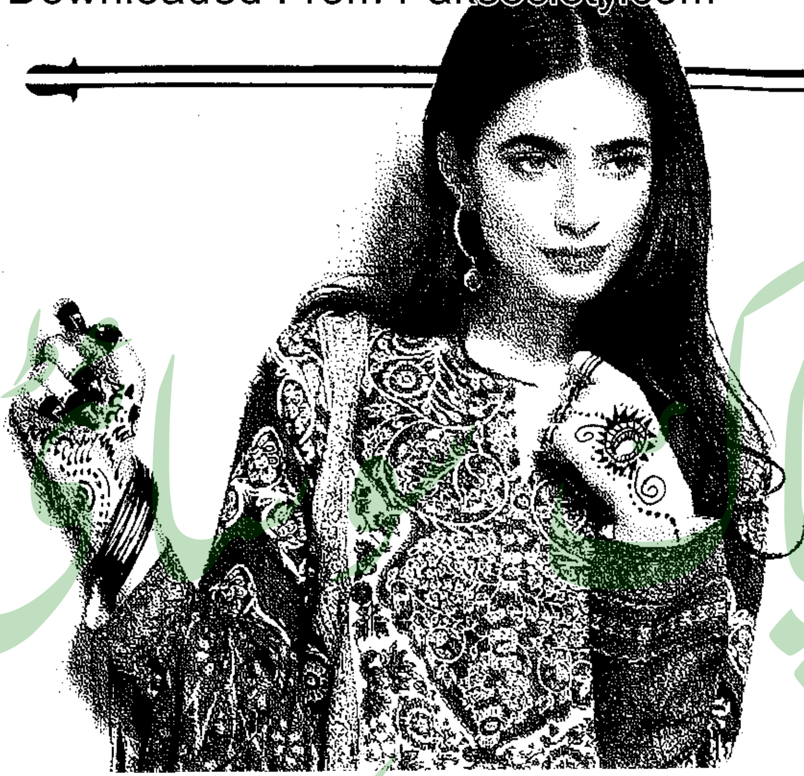

مستقل عنوانات

دین کی باتیں ادارہ 16
بہنوں کی محفل مدیرہ 275
پاکیزہ ڈائری عظمیٰ آفاق سعید 286
گوشۂ ظرافت ادارہ 289
میں اکثر گنگناتی ہوں صغریٰ زیدی 291
منتخب غزلیں ادارہ 293
خوش ذائقہ پاکیزہ بہنیں 294
بزم پاکیزہ پاکیزہ بہنیں 296
حسن نکھاریئے مہ جبیں 298
مہندی کے ڈیزائن ادارہ 298
روحانی مشورے ادارہ 300
ہومیو کلینک 302

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

ماہنامہ
سرگزشت

کا ایک
اہم نمبر

بے وقت موت نمبر

ان افراد کی روداد جو "بے وقت موت" کا شکار ہوئے لیکن
اپنی مختصر سی زندگی میں انہوں نے قابلِ تقلید کام کیے

سرگزشت کا خاص نمبر
اہمیت کا حامل ہوتا ہے
لوگ مجلد کرا کر رکھتے ہیں

اگر آپ ایسی کسی شخصیت پر لکھنا چاہتے ہیں
تو پہلے آگاہ کر دیں تاکہ کوئی دوسرا اس
شخصیت پر لکھ رہا ہو تو اسے روک دیا جائے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے......!

قارئینِ محترم! السلام علیکم!

عید الفطر کے اس بابرکت اور پُرمسرت موقع پر ہم تمام مسلمانانِ عالم اور بالخصوص اپنے ہم وطنوں کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں...... یہ دن بلاشبہ ہم سب کے لیے اپنے پروردگار کی جانب سے بہترین انعام ہے کہ جب ہم ماہِ رمضان المبارک کی برکتوں، رحمتوں اور نعمتوں سے فیض یاب ہو کر شکرانہ رب العزت ادا کرنے کے قابل ہوتے ہیں اور اپنے اللہ کی جانب سے خصوصی رحمت سے سیراب ہوتے ہیں۔

عید کا تہوار جہاں بے پناہ خوشیاں لاتا ہے وہیں بحیثیت مسلمان ہمیں زندگی گزارنے کے اصول وضوابط بھی سکھاتا ہے جو ماہِ رمضان کی عبادات و تعلیمات کا ہی تسلسل ہے۔

سب سے پہلے تو شبِ عید کے احکامات اور پھر نمازِ عید الفطر کی ادائیگی کہ جب تمام مسلمان بلاتفریق رنگ ونسل، بلاتفریقِ علاقہ، طبقہ، زبان ایک ہو کر اپنے اللہ کے حضور سجدۂ شکر بجالاتے ہیں...... ایک دوسرے سے مصافحہ اور معانقہ کر کے خوش دلی سے مبارک باد دیتے ہیں اور پھر فطرانہ کی ادائیگی کے ذریعے اپنے دیگر مسلمان بھائیوں کو بھی عیدِ سعید کی حقیقی خوشیاں منانے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

عید تو دراصل وہی ہے کہ جب آپ اپنے جیسے دوسرے مسلمان بھائی کے دل میں جگہ بنائیں، چاہے وہ ایک جملۂ نرم وشیریں ہی سے کیوں نہ ہو...... اپنے گھر والوں کی طرح ان کی ضروریات کا خیال کہ انہیں کسی طرح کی کمی اور شرمندگی محسوس نہ ہو۔ یہی ایک مسلمان کی اصل عید ہوتی ہے۔ جبھی تو کوشش ہوتی ہے کہ اپنے مرحومین کو بھی یاد رکھیں اور اپنے پیارے عزیز رشتے داروں اور دوست احباب کی عیادت کو بھی ضرور جائیں۔ مساکین اور یتیموں کی دست گیری اور دلجوئی اور ضرورت مندوں کی حتی المقدور مدد...... یہی عید الفطر کی حقیقی مسرت ہے۔

ماہِ شوال تو گزرتا چلا جا رہا ہے مگر عید کے حوالے سے جوش وخروش اور گہما گہمی پورے ماہ ہی رہے گی۔ اس لیے ہمیں کوشش کرنی ہے کہ جو وعدے اور پیمان ماہِ رمضان اور عید کی عبادتوں میں کیے تھے وہ بتدریج پورے کرتے رہیں......

رب کریم سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں ہر مذہبی تہوار مذہبی عقیدت، روایتی جوش وجذبے اور حسنِ سلوک سے منانے کی توفیق عطا ہو، الٰہی آمین۔

مدیرہ

نزہت اصغر

دین کی باتیں

اور یہ کتاب جو ہم نے اتاری ہے برکت والی ہے، پس اسی کی پیروی کرو اور ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (۱۵۵) (کہیں ایسا نہ ہو) کہ تم یہ کہہ دو کہ ماسوا اس کے نہیں ہے کہ ہم سے پہلے دو گروہوں پر کتاب نازل کی گئی تھی۔ اور یہ کہ ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے یقیناً بے خبر تھے۔ (۱۵۶) یا تم یہ کہو کہ اگر ہم پر کتاب نازل کی جاتی، تو ہم یقیناً اس سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ پس تحقیق تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے روشن دلیل اور ہدایت اور رحمت آ گئی ہوئی ہے۔ تو اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلائے، اور ان سے منہ موڑے۔ عنقریب ہم ان لوگوں کو جو ہماری آیتوں سے منہ موڑتے ہیں بڑے عذاب کی سزا دیں گے۔ بہ سبب اس کے کہ وہ منہ موڑا کرتے تھے۔ (۱۵۷) کیا وہ اس بات کا انتظار کرتے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں۔ یا تمہارا پروردگار (ہی) آ جائے، یا تمہارے پروردگار کی کچھ نشانیاں آئیں۔ جس دن تمہارے پروردگار کی بعض نشانیاں آ جائیں گی، تو کسی نفس کو جو پہلے ایمان نہ لا چکا ہو گا، یا جس نے اپنے ایمان میں کوئی نیکی نہ کمائی ہوگی، اس کا ایمان فائدہ نہ دے گا۔ کہہ دو کہ تم انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں۔ (۱۵۸) یقیناً وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور وہ گروہ گروہ بن گئے۔ تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ ماسوا اس کے نہیں ہے کہ ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ ہی کے سپرد ہے پھر وہ انہیں بتائے گا، جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔ (۱۵۹) جو کوئی ایک نیکی لائے گا، تو اس کے لیے اس کا دس گنا ہے۔ اور جو کوئی ایک بدی لائے گا، تو اس کو سزا نہیں دی جائے گی مگر اسی کے موافق ہی۔ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا (۱۶۰) کہہ دو کہ یقیناً میرے پروردگار نے مجھے سیدھے راستے کی طرف ہدایت کی ہے۔ درست دین ابراہیم حنیف کی ملت ہے۔ اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ (۱۶۱) (اے رسول)، کہہ دو کہ یقیناً میری نماز اور میری عبادتیں اور میرا جینا اور میرا مرنا سب جہانوں کے پروردگار اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ (۱۶۲) اس کا کوئی بھی شریک نہیں۔ اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔ (۱۶۳) کہہ دو کہ کیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو پروردگار تلاش کروں حالانکہ وہ ہر چیز کا پروردگار ہے اور کوئی نفس کچھ نہیں کماتا مگر یہ کہ اس کا وبال اسی پر ہوتا ہے۔ اور کوئی بوجھ اٹھانے والا (نفس) دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ پھر تمہاری بازگشت تمہارے پروردگار کی طرف ہوگی۔ پس جن امور میں تم اختلاف کرتے تھے وہ تمہیں بتا دے گا۔ (۱۶۴) اور وہ وہی ہے جس نے تمہیں زمین کے جانشین بنایا۔ اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں کے لحاظ سے بلند کر دیا۔ تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ یقیناً تمہارا پروردگار جلد سزا دینے والا ہے۔ اور بلاشبہ وہ بخشنے والا بڑا رحم والا ہے۔ (۱۶۵)

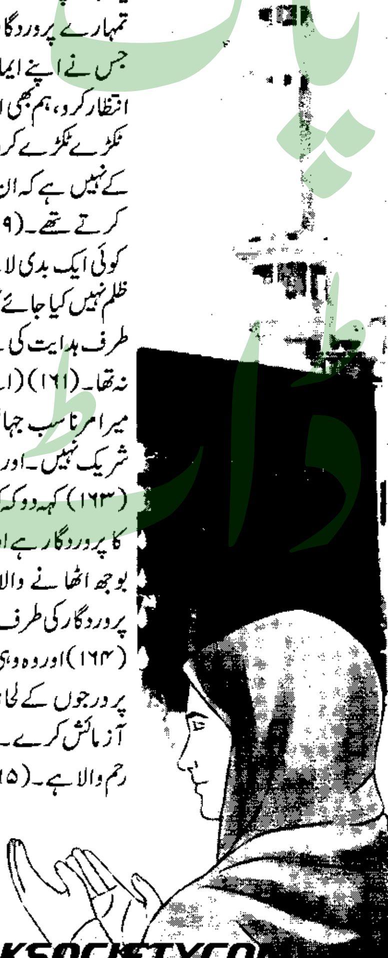

(سورۂ انعام ۶، پارہ ۸۔ آیات ۱۵۵ تا ۱۶۵)

دین کی باتیں

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ سَیِّدِ الْمَھْدِیِّیْنَ ط

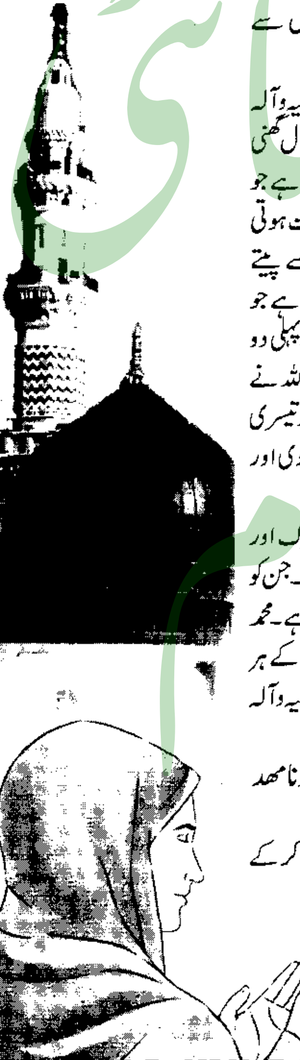

افضل الانبیا، ختمی مرتبت، سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام ''سیدنا مھد'' بھی ہے جس کے مفہوم، ہدایت والے۔ ہدایت یافتہ کے ہیں۔

1۔ القرآن: ترجمہ: کہہ دو کہ مجھے میرے پروردگار نے سیدھا راستہ دکھایا یعنی (دینِ صحیح) مذہب ابراہیمؑ کا جو ایک خدا ہی کی طرف تھے اور مشرکوں میں سے نہیں تھے۔ (سورۂ سبا (34) آیت 50)

2۔ الحدیث: حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت اور علم دے کر مجھے بھیجا ہے اس کی مثال گھنی بارش کی سی ہے جو زمین پر برستی ہے تو کوئی زمین اس میں تو اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے جو پانی کو جذب کرلیتی ہے اور اس میں وافر چارہ اور سبزہ اگتا ہے اور کوئی زمین سخت ہوتی ہے جو پانی کو روک لیتی ہے اور اللہ اس پانی سے لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے کہ وہ اسے پیتے ہیں اور کھیتی باڑی کے کام میں لاتے ہیں اور یہی بارش ایسی زمین پر بھی برستی ہے جو ہموار اور چکنی ہوتی ہے تو پانی کو روک کر جمع کرتی ہے اور اس میں چارہ اگتا ہے۔ پہلی دو مثالیں تو اس شخص کی ہیں جس نے اللہ کے دین کو سمجھا اور اس کو اس علم نے، جو اللہ نے مجھے دے کر بھیجا ہے نفع پہنچایا۔ اس نے علم حاصل کیا اور دوسروں کو علم سکھایا اور تیسری مثال اس شخص کی ہے جس نے اپنے غرور و تکبر کی وجہ سے اس طرف توجہ ہی نہیں دی اور اللہ کی اس ہدایت کو جو اللہ نے مجھے دے کر بھیجا ہے قبول نہیں کیا۔ (بخاری)

3۔ الرائے: ان کے (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خیالات نہایت متبرک اور ان کے اخلاق نہایت اعلیٰ تھے۔ وہ ایک سرگرم اور پُرجوش ریفارمر (مصلح) تھے۔ جن کو خدا نے گمراہوں کی ہدایت کے لیے مقرر کیا تھا۔ ایسے شخص کا کلام خدائی آواز ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تھک کوشش کے ساتھ حقانیت کی اشاعت کی۔ دنیا کے ہر حصے میں ان کے متبعین بکثرت موجود ہیں اور اس میں شک نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کامیاب ہوئی۔ (تھامس کارلائل)

4۔ الفضائل: (1) جو کوئی کھانا کھانے سے پہلے دس مرتبہ اسم مبارک سیدنا مھد کا ورد کرے تو معدے کے جملہ امراض سے محفوظ رہے گا۔

(2) کسی کا بچہ یا بچی نافرمان ہوں تو باوضو حالت میں ۵۹ مرتبہ پانی پر دم کرکے اسے یہ پانی پلادے تو وہ تابعدار ہوجائے گا۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماالنبی ﷺ سے اقتباس

اللہ اور اس کا نور

باب ششم

قرآن پاک سے عشق کی پرنور داستان ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے قلم سے

☆ ”بلاشبہ گناہ گار بڑی غلطی اور پاگل پن میں مبتلا ہیں۔ جس دن وہ اندھے منہ جہنم میں گھسیٹے جائیں گے۔ ان سے کہا جائے گا کہ (اب) آگ میں جلنے کا مزہ چکھو......“ سورۂ قمر (54) (آیات 47، 48)

دوزخ، کافر کی نظروں کے سامنے ہوگی جہاں پر زقوم کا درخت، کھولتا ہوا پانی اس کی غذا ہوگی۔ وہ دوزخ میں دھکیلا جائے گا۔ یہ وہ بدنصیب ہے جو دنیا میں اپنے کو زبردست عزت والا سمجھتا رہا۔

☆ ”بے شک زقوم کا درخت گناہ گاروں کا کھانا ہوگا۔ (یہ ایسی غذا ہوگی) جیسے پگھلا ہوا تانبا، پیٹوں میں (اس طرح) کھولے گا جیسے کھولتا ہوا پانی۔ (عذاب پر مامور فرشتے کو حکم ہوگا) اس کو پکڑ لو اور گھسیٹتے ہوئے دوزخ کے بیچوں بیچ لے جاؤ۔ پھر اس کے سر پر کھولتا ہوا پانی عذاب دینے کے لیے ڈالو۔ مزہ چکھ تو بڑا عزت والا سردار (بنتا) ہے۔“ سورۂ دخان (44) (آیات 43 تا 50)

☆ سورۂ زمر (39) میں ارشاد رب العزت ہوتا ہے۔

”اور کافروں کو گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانکا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور ان سے اس (دوزخ) کے محافظ (فرشتے) کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تم کو تمہارے پروردگار کی آیتیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور تم کو اس دن کے پیش آنے سے ڈرایا کرتے تھے۔ وہ (ندامت سے) کہیں گے ہاں۔ لیکن عذاب کا وعدہ کافروں پر پورا ہو کر رہا۔ حکم ہوگا کہ دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ (اور) اس میں ہمیشہ رہا کرو۔ بس تکبر کرنے والوں کا کیا برا ٹھکانا ہے۔“ (آیات 71 تا 72)

☆ سورۂ فاطر (35) میں ارشاد ہوتا ہے۔

”اور جو لوگ (اللہ اور رسول کے) منکر ہیں، ان کے لیے دوزخ کی آگ ہے (جہاں) نہ ان کو قضا ہی آئے گی کہ مر جائیں اور نہ ہی ان سے عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا۔ اسی طرح ہم ہر کافر کو سزا دیتے

ہیں۔'' (آیت 36)

☆ سورۂ عنکبوت (29) میں ارشادِ پروردگارِ عالم ہوتا ہے۔

''اور یہ آپ سے عذاب کی جلدی کرتے ہیں اور یقیناً دوزخ کافروں کو گھیر لینے والی ہے۔ جس روز عذاب ان کو اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے گھیر لے گا اور (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے (اب) اس کا مزہ چکھو۔'' (آیات 54، 55)

☆ سورۂ فرقان (25) میں ارشاد ہوتا ہے۔

''حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ قیامت کو جھٹلاتے ہیں اور ہم نے منکرینِ قیامت کے لیے (دوزخ کی) آگ تیار کر رکھی ہے۔ جب وہ آگ انہیں دور سے دیکھے گی تو یہ (کافر) اس کا غیظ (وغضب) اور جوش (وخروش) دیکھیں گے۔ اور جب یہ اس کی کسی تنگ جگہ میں (زنجیروں سے ہاتھ پاؤں) جکڑ کر ڈالے جائیں گے تو وہ اس وقت (چلا چلّا) کر موت کو پکڑیں گے۔ (لیکن اب موت کہاں) (ان کو ندا دی جائے گی) آج کے دن ایک ہی موت کو نہیں بلکہ بہت سی موتوں کو پکارو۔'' (آیات 11 تا 14)

☆ سورۂ مومنون (23) میں ارشادِ پروردگار ہے۔

''اور جس کا پلہ ہلکا ہوگا تو وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو گھاٹے میں ڈالا (اور) وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے چہروں کو آگ جھلس دے گی اور اسی (جہنم) میں بد شکل ہو کر رہ جائیں گے۔'' (آیات 103۔104)

☆ سورۂ مریم (19) میں ارشاد ہوتا ہے۔

''پس آپ کے رب کی قسم ہم ان سب (یعنی کفار اور منکرینِ حق) کو اور شیاطین کو جمع کریں گے۔ پھر ہم ان سب کو دوزخ کے گرد لائیں گے (اور اس وقت وہ) گھٹنوں کے بل گرے ہوئے (ہوں گے)۔ (آیت 68)

☆ سورۂ کہف (18) میں کچھ اس قسم کا نقشہ کھینچا جا رہا ہے۔

''بے شک ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوں گی اور جب وہ (پیاس اور تکلیف سے) فریاد کریں گے تو پیپ جیسے پانی سے ان کی فریاد رسی کی جائے گی جو چہروں کو بھون ڈالے گا۔ کیا ہی برا وہ پانی ہوگا اور کیا ہی بری وہ جگہ ہوگی۔'' (آیت 29)

☆ سورۂ بنی اسرائیل (17) میں گمراہوں کے لیے فرمایا۔

''اور اللہ جس کو ہدایت دے، وہی ہدایت پاتا ہے اور جن کو بے راہ کر دے تو اللہ کے سوا آپ ان کے لیے کوئی مددگار نہ پائیں گے۔ اور ہم ان (گمراہوں) کو قیامت کے دن اندھے، گونگے اور بہرے (بنا کر) منہ کے بل اٹھائیں گے۔ ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگا (اور) جب (دوزخ کی) آگ ذرا بجھنے لگے گی تو ہم اس کو اور بھڑکا دیں گے (ان کے لیے آگ اور تیز ہو جائے گی)'' (آیت 97)

☆ جن لوگوں نے آیتوں کو جھوٹا جانا اور تکبر کیا، ان کے واسطے سورۂ اعراف (7) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''فرمایا داخل ہو جاؤ، ساتھ اور امتوں کے جو تم سے پہلے ہو چکی ہیں۔ جن اور انسان آگ میں، جہاں داخل ہوئی ایک امت، لعنت کرنے لگی دوسری کو، جب تک گر چکے اس میں سارے۔ کہا پچھلوں نے پہلوں کو، اے رب ہمارے! ہم کو ان ہی نے گمراہ کیا سو تو دے ان کو دونا عذاب آگ کا۔ فرمایا کہ دونوں کو دونا ہے پر تم نہیں جانتے۔'' (آیت 38)

☆ جو لوگ سونا چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں، ان کے واسطے اللہ تعالیٰ سورۂ توبہ (9) میں ارشاد فرماتا ہے۔

''اور جو لوگ گاڑ رکھتے ہیں سونا اور روپیہ اور خرچ نہیں کرتے، اللہ کی راہ میں، سو ان کو خوشخبری سنا دو دکھ والی مار کی جس دن آگ دہکا دیں گے اس پر دوزخ کی پھر داغیں گے اس سے ان کے ماتھے اور کروٹیں اور پشتیں۔ یہ ہے جو تم گاڑتے تھے اور اپنے واسطے اب چکھو مزہ اپنے گاڑنے کا۔'' (آیات 35، 34)

ہمارا مذہب اور چالیس کا عدد

ہمارے مذہب میں چالیس (40) کے عدد کی بہت اہمیت ہے۔ یہ اہمیت ظاہری یا باطنی بھی ہو سکتی ہے۔ مندرجہ ذیل مثالیں چالیس کے عدد کی ظاہری خاصیت کو ظاہر کر رہی ہیں۔

1۔ حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر 40 دن کے لیے بھیجا گیا تھا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ وہیں پر حضرت موسیٰؑ کی اللہ تعالیٰ سے بات چیت ہوئی۔ انہیں توریت تختیوں کی صورت میں عطا ہوئی۔

2۔ حضرت موسیٰؑ ہی کے حوالے سے ایک اور واقعہ (سورۂ مائدہ (5) میں ہے۔

”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ بھائیو! تم پر خدا نے جو احسان کیے ہیں ان کو یاد کرو کہ اس نے تم میں پیغمبر پیدا کیے اور تمہیں بادشاہ بنایا اور تم کو اتنا کچھ عنایت کیا کہ عالم میں سے کسی کو نہیں دیا تو بھائیو! تم ارضِ مقدس (یعنی ملکِ شام) میں جسے خدا نے تمہارے لیے لکھ رکھا ہے داخل ہو جاؤ اور (مقابلے کے وقت) پیٹھ نہ پھیر دینا ورنہ نقصان میں پڑ جاؤ گے وہ کہنے لگے کہ موسیٰ وہاں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں اور جب تک وہ اس سرزمین سے نکل نہ جائیں تو ہم وہاں نہ داخل ہوں گے۔ جو لوگ خدا سے ڈرتے تھے ان میں سے دو شخص جن پر خدا کی عنایت تھی کہنے لگے کہ ان لوگوں پر دروازے کے راستے سے حملہ کردو جب تم دروازے میں داخل ہو گے تو فتح تمہاری ہے اور خدا ہی پر بھروسا رکھو بشرطیکہ صاحب ایمان ہو وہ بولے کہ موسیٰ جب تک وہ لوگ وہاں ہیں ہم کبھی وہاں نہیں جا سکتے تو تم اور تمہارا خدا جاؤ اور لڑو...... ہم بیٹھے رہیں گے۔ موسیٰ نے خدا سے التجا کی کہ پروردگار! میں اپنے اور اپنے بھائی کے سوا اور کسی پر اختیار نہیں رکھتا۔ تو ہم میں اور ان نافرمان لوگوں میں جدائی کردے۔ خدا نے فرمایا کہ وہ ملک ان پر چالیس برس تک کے لیے حرام کردیا گیا۔ (کہ وہاں جانے نہ پائیں گے) زمین میں سرگرداں پھریں گے تو ان لوگوں کے حال پر افسوس نہ کر۔ (آیت 26 تا 30)

3۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت 40 سال کی عمر میں ملی۔ اگرچہ وہ پیدائشی نبی تھے مگر باقاعدہ اعلان وحی کی صورت میں 40 سال کی عمر میں ہوا۔

4۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شادی حضرت خدیجہؓ سے ہوئی جن کی عمر مبارک اس وقت 40 سال تھی۔

5۔ مسجد نبوی میں 40 نمازیں پڑھی جاتی ہیں، ان کا بہت ثواب رکھا گیا ہے۔

6۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام سے 40 سال کے بعد ملے۔

7۔ حضرت عثمانؓ شہادت سے قبل اپنے گھر میں 40 دن محصور رہے۔

8۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ مشہور ہے جب وہ کم سن تھے اور ان کی والدہ نے ایک تجارتی قافلے کے ساتھ انہیں روانہ کیا تھا، ان کی واسکٹ میں 40 دینار رکھے تھے اور نصیحت کی تھی کہ جھوٹ نہ بولنا۔ مختصر یہ کہ ان کے سچ بولنے پر ڈاکوؤں کے سردار نے توبہ کرلی اور سب کو لوٹا ہوا مال واپس کردیا۔

9۔ حرام کا نوالہ کھانے والے کی 40 روز کی نمازیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی روایات ہیں جن میں 40 کے عدد کا تذکرہ ہے۔ اس عدد کی باطنی اہمیت علما بتا سکتے ہیں۔

☆☆☆

قرآن میں پیڑ اور پودوں کا ذکر

اللہ تعالیٰ نے لاکھوں قسم کے پیڑ، پودے، درخت پیدا کیے ہیں اور ان سے دنیا کو سجایا۔ قرآن حکیم میں پیڑ، پودوں کا ذکر مختلف انداز میں کیا گیا ہے۔ یعنی اجتماعی طور پر بھی اور انفرادی طور پر بھی۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں موجود تمام پیڑ پودوں کا تذکرہ اس انداز میں کیا ہے۔

سورۂ رحمٰن (55) آیت نمبر 6 ترجمہ:

”اور ستارے اور درخت سجدہ کر رہے ہیں۔“

اس آیت میں پوری دنیا میں جتنے بھی پیڑ پودے ہیں ان کے سجدہ کرنے کا ذکر ہے۔ اور ایک جگہ کچھ اس طرح ارشاد ہوتا ہے۔

(سورۂ لقمان (31) آیت نمبر 27)

ترجمہ: ”اگر یوں ہو کہ زمین میں جتنے درخت ہیں (سب کے سب) قلم ہوں اور سمندر (کا تمام پانی) روشنائی ہو (اور) اس کے بعد سات سمندر اور (روشنائی ہو جائیں) تو خدا کی باتیں ختم نہ ہوں۔“

اس آیت میں بھی پوری دنیا کے درختوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اجتماعی طور پر پودوں کا ذکر یوں ہے۔

1۔ تمام درخت	سورۂ رحمٰن (55)
2۔ تمام نباتات	سورۂ لقمان (31)
3۔ کھیتی	سورۂ نحل (16) سورۂ رعد (13)
4۔ سبزیاں	سورۂ بقرہ (2)
5۔ ترکاریاں	سورۂ عبس (80)
6۔ تمام پھل	سورۂ رحمٰن (55)
7۔ باغات	سورۂ عبس (80)
8۔ اناج	سورۂ عبس (80) سورۂ رحمٰن، (55) سورۂ یٰسین (36)
9۔ چارا	سورۂ عبس (80)

انفرادی طور پر درختوں کا تذکرہ دو انداز سے ہوا ہے۔

1۔ وہ درخت جن کا نام نہیں لیا گیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

2۔ وہ درخت جن کا نام لیا گیا ہے۔

وہ درخت جن کا نام نہیں لیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

1۔ وہ درخت جس کا پھل کھانے پر حضرت آدمؑ کو جنت سے نکالا گیا تھا۔ (علامتی درخت)

2۔ وہ درخت جس کے نیچے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مومنوں سے بیعت لی تھی۔ (سورۂ فتح (48) آیت نمبر 18)

چونکہ اللہ تعالیٰ اس بیعت سے خوش ہوا تھا اس وجہ سے اسے بیعتِ رضوان کہا جاتا ہے۔ یہ درخت کون سا تھا؟ اس میں دو آرا ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ یہ کیکر کا درخت تھا اور کچھ کا خیال ہے کہ یہ بیری کا درخت تھا۔ بعد میں لوگوں نے اسے متبرک سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں لوگ اس کی پوجا نہ کرنے لگیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اسے کٹوا دیا تھا۔

3۔ وہ درخت جس کی ٹہنیوں کو رگڑ کر آگ نکالی جاتی ہے۔ (سورۂ یسین (36) آیت 80)

4۔ ”جب اس کے پاس پہنچے تو میدان کے دائیں کنارے سے ایک مبارک جگہ میں ایک درخت میں سے آواز آئی کہ موسیٰ میں تو خدائے رب العالمین ہوں۔“ (سورۂ قصص (28) آیت 30)

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر آگ لینے گئے تھے تو یہ آواز آئی تھی، اس درخت کا بھی نام نہیں لکھا گیا۔

اب ان درختوں کی تفصیل درج کی جا رہی ہے جن کے نام کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

1۔ کھجور۔ رحمٰن، (55) کہف، (18) مریم، (19) عبس، (80)، انعام، (6) نحل، (16) یسین، (36)، رعد، (13)

2۔ انار۔ رحمٰن، (55) انعام (6)

3۔ انگور۔ رحمٰن (55) عبس (80) نحل (16) یٰسین، (36) رعد (13)

4۔ انجیر۔ (التین (95)

5۔ زیتون۔ التین، (95) نحل، (16) نجم (53) عبس (80) (نور) (24)

6۔ کیلے (واقعہ (56) آیت 29)

7۔ بیری کا درخت، ساتویں آسمان پر واقع ہے جسے سدرۃ المنتہیٰ کہا جاتا ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج شریف ہوئی تھی تو آپؐ یہاں پہنچے تھے اور اللہ کی قدرت کے نمونے دیکھے تھے۔ (سورۂ نجم آیات 14 تا 16)

8۔ بیری کا درخت...... یہ بے خار کی بیری کا درخت ہے جو جنت میں ہے اور جنتی لوگوں کے لیے ہے۔ (سورۂ واقعہ (56) آیت 28)

9۔ بیری کا درخت...... یہ دنیا میں پایا جانے والا بیری کا درخت ہے جس میں خار ہوتے ہیں۔ (سورۂ سبا (34) آیت نمبر 16)

10۔ میوہ جات۔ نحل (16) رحمٰن، (55) بقرہ (2) عبس (80)۔ یٰسین، (36) واقعہ، (56)

11۔ ککڑی۔ سورۂ بقرہ (2)

12۔ گیہوں۔ سورۂ بقرہ

13۔ مسور۔ سورۂ بقرہ

14۔ پیاز۔ سورۂ بقرہ

15۔ کدو۔ سورۂ صٰفٰت (37)، آیت 146)

16۔ Tamarix۔ سورۂ سبا، (34)، آیت 19)

17۔ تلسی۔ سورۂ رحمٰن، (55) آیت 12)

18۔ المن (بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے من وسلویٰ اترتا تھا۔ اس میں سلویٰ بھنی ہوئی بٹیر کو کہتے ہیں لیکن من کے بارے میں مختلف آرا ہیں۔ بہرحال یہ ایک پودا ہی تھا۔ اس سلسلے میں چند احادیث پیش کی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ من دراصل m ashroom ہے جسے اردو میں کھمبی کہا جاتا ہے۔

حضرت سعید بن زیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”کھمبی من میں سے ہے۔ اس کا پانی آنکھوں کے لیے شفا ہے۔“

حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”کھمبی من کا حصہ ہے، من درحقیقت جنت سے ہے۔ اس کا پانی آنکھوں کے لیے شفا ہے۔“

کھمبی من میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے نازل فرمایا تھا۔ اس کا پانی آنکھوں کے لیے شفا ہے۔ (مسلم۔ ابن ماجہ)

19۔ شجر زقوم: یہ دوزخی پودا ہے جو دوزخی لوگوں کو کھانے کے لیے دیا جائے گا۔ اس کا ذکر تین سورتوں دخان (44) آیت 43، صٰفٰت (37) آیت 62 اور واقعہ (56) آیت 52 میں آیا ہے۔

(جاری ہے)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

www.paksociety.com

...... یہ کہاں بچیں کہ دل ہے

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالر، پونڈ، یورو، درہم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں . . .

سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے . . .

دل کو رویا جاتا ہے، جگر کو پیٹا جاتا ہے . . .

کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، یاریاں ٹوٹ جاتی ہیں۔

الزام تراشیوں کا ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو جاتا ہے۔

دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے . . .

آج کا انسان یہ راہ سٹیلائٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دل اور سونے کا بچھڑا . . .

عبادات، معاملات . . .

جنت گم گشتہ کے بے دخل باسیوں کی ازلی کہانی . . .

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قسط 12

فیملی ڈاکٹر نے لیڈی صوفیہ کا معائنہ کرنے کے بعد انہیں فوری اسپتال میں ایڈمٹ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ جس پر پرنس نے فوری عمل درآمد کیا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر، اندر وہ شہر کے بہترین اسپتال کے وی آئی پی وارڈ میں منتقل کر دی گئی تھیں۔ مختلف اقسام کے ٹیسٹ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

پرنس مستقل ایک تاسف کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اندر سے ایک آواز مسلسل آ رہی تھی۔ اگر وہ سفینہ کا ذکر نہ کرتا تو شاید گرینڈ مام اس حال کو نہ پہنچتیں...... وہ دل کی گہرائیوں سے دعا کر رہا تھا کہ وہ جلد سے جلد صحتیاب و نارمل ہو جائیں۔

لیڈی صوفیہ اس عہد کی خوش نصیب ترین خاتون تھیں کہ سینچری کے قریب پہنچنے والی تھیں مگر انہیں شوگر نہیں تھی اور صرف یہ ایک بیماری نہ ہونے کی وجہ سے بہت سی وقتی بیماریاں جلد جان چھوڑ دیتی ہیں۔ دل پر یادوں کا اتنا بوجھ ڈال دیا تھا کہ اس نے ہاتھ کھڑے کر دیے تھے اور انہیں اوپن سرجری کے مرحلے سے گزرنا پڑا تھا۔ یوں کہہ سکتے ہیں دل کو پیار

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

سے ہاتھ میں لے کر منانا پڑا تھا۔

پرنس اپنے معمولات سے کٹ گیا تھا۔ اس کا سارا دھیان اپنی پردادی کی طرف تھا۔ دو بہت مستعد نرسیں لیڈی صوفیہ کی دیکھ بھال کر رہی تھیں، ان کی ذاتی ملازمہ بھی اسپتال میں موجود تھی مگر پرنس چاہتا تھا کہ دادی کا ہر کام وہ اپنے ہاتھ سے کرے جبکہ اپنے دستِ راست کو تو وہ پہلی بار ساتھ بھی نہیں لایا تھا۔ جو پرنس کو رومال یا ٹشو پیش کرنے کے علاوہ اس کا سگار تک سلگاتا تھا۔

کتنے چکر تو وہ روم سے باہر لگا چکا تھا۔ ڈاکٹرز کو احساس دلانے کے لیے کہ وہ معمولی سی بھی کوتاہی یا دیر برداشت نہیں کرے گا۔

اس نے ظہر، عصر، مغرب کی نماز روم میں ہی پڑھی تھی۔ وی آئی پی روم میں ہر طرح کی سہولت موجود تھی، جائے نماز کے علاوہ قرآن مجید اور تسبیح تک موجود تھی۔ مغرب کی نماز کے بعد اس نے وہیں کمرے میں مراقبہ کیا اور دادی کے لیے دعا کی غرض سے اٹھے ہوئے ہاتھ ابھی نیچے بھی نہیں ہوئے تھے کہ لیڈی صوفیہ نے اسے پکارا تھا۔

”پرنس...... my be loved son کیا تم یہاں موجود ہو، میری آواز سن رہے ہو؟“

پرنس یوں والہانہ دوڑا جیسے بچہ بھیڑ میں ماں کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑتا ہے۔ اس نے لیڈی صوفیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بوسہ دیا۔

”آپ ٹھیک ہیں گرینڈ مام...... کیسا محسوس کر رہی ہیں؟“ اس نے بے قرار نگاہوں سے ان کا چہرہ یوں دیکھا جیسے دیکھ نہ رہا ہو۔ ”دیدار“ کر رہا ہو۔

”میں بہت بہتر محسوس کر رہی ہوں...... مگر تم نے میرے ساتھ یہ زیادتی کیوں کی؟“ وہ نقاہت بھری آواز میں بول رہی تھیں۔

”زیادتی......؟“ پرنس پریشان ہو گیا۔

”یہ فنائل اور اسپرٹ کی smell...... تم جانتے ہو مجھے الرجی ہے ان چیزوں سے......“

”گرینڈ مام اسپتال میں تو یہ سب ہوتا ہے۔“

”وہی تو کہہ رہی ہوں...... اسپتال کیوں لے آئے...... ڈاکٹر مہیش کو بلاتے وہ ٹریٹ منٹ کرتے کافی تھا۔ آخر ایسا کیا ہوا تھا مجھے جو تم اسپتال لے آئے۔“

”آپ un conscious ہو گئی تھیں گرینڈ مام...... ڈاکٹر مہیش کی ایڈوائز پر ہی آپ کو یہاں لایا گیا تھا...... لیکن آپ اب بہتر ہیں...... پریشان نہ ہوں۔“ پرنس نے دادی کے ہاتھ کی پشت پر پھر ایک پیار بھرا بوسہ ثبت کیا۔

”السلام علیکم جینٹل مین......“ پشت سے حماد حسین کی آواز ابھری تو پرنس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

حماد حسین، ماہین کے ساتھ اندر داخل ہو رہے تھے۔ ماہین پر نظر پڑتے ہی پرنس نے دونوں کے پیچھے دیکھا تھا گویا ماہین کی موجودگی سفینہ کی موجودگی کی بھی ضمانت تھی۔ مگر دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اور روم میں بس وہ دونوں باپ بیٹی ہی تھے...... وہ نہیں آئی...... پتا نہیں رات ہی اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ شاید اب دوبارہ نظر نہیں آئے......

وہ اس نکتے پر بھی بہت غور و خوض کرتا رہا تھا کہ سفینہ سے ملنے میں فطرت کی کیا حکمت پوشیدہ ہے۔ دیدار، شوق، اجنبیت اور جدائی...... جبکہ وہ گہری سوچ کے دوران اس کے خیالات کو وصول کرتا رہا...... انتہائی مصروفیت کے دوران بھی وہ اس کے ذہن پر مستقل دستک دیتی رہی تھی۔ رات سے اب تک وہ اس کے خیالات کی لہروں کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا۔ اسے اندھا یقین تھا کہ وہ مستقل اسے سوچ رہی ہے۔

”وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں گھر فون کیا تو پتا چلا لیڈی صاحبہ کی طبیعت ناساز ہے۔“ حماد حسین، پرنس سے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

مصافحہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ماہین، پرنس کو سلام کر کے لیڈی صوفیہ کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''آپ کے پی اے سے ہی ساری تفصیلات حاصل کیں...... سن کر بہت پریشانی ہوئی۔ اب کیسی طبیعت ہے؟'' حماد حسین مصافحے کے بعد لیڈی صوفیہ کے بیڈ کے قریب پہنچ کر بولے...... جو ایک ٹک ماہین کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''آپ نے شاید مجھ سے کچھ کہا......؟'' لیڈی صوفیہ نے غائب دماغی کی کیفیت میں حماد حسین سے قدرے مجوب انداز میں پوچھا۔

''جی آپ کی طبیعت کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔'' ایک سن رسیدہ بوڑھی عورت کی غفلت کو ہر ذی شعور نظر انداز کرتا ہے۔ لہٰذا حماد حسین نے بہت ادب و اہتمام سے لیڈی صوفیہ کو جواب دیا۔

''اللہ نے بہت کرم کیا...... دیکھیے آپ سے باتیں کر رہی ہوں۔'' وہ اب قدرے تکلیف سے مسکرائیں۔ نظریں پھر ماہین کے چہرے پر ٹک گئیں۔ دادی اور پوتا اس وقت دونوں ایک نام کے طلسم میں قید تھے۔

''وہ تمہاری دوست نہیں آئی...... شاید اس کو اطلاع نہیں۔'' لیڈی صوفیہ نے اس ستم گر کا ذکر چھیڑ دیا جس کا نام لینے کی جسارت پرنس نہیں کر سکتا تھا...... اسے دادی پر جیسے ٹوٹ کر پیار آ گیا۔

''اوہ...... سفینہ...... امیزنگ...... آپ کو یاد ہے وہ...... گڈ......!'' ماہین یوں بچوں کی طرح خوش ہو کر گویا ہوئی جیسے کہیں سے غیر متوقع تحفہ وصول کیا ہو۔

”وہ تو آج صبح لاہور چلی گئی۔“ حماد حسین نے ماہین سے پہلے جواب دے دیا۔

”لاہور...... “لیڈی صوفیہ نے مارے تعجب کے پوری آنکھیں کھول کر ماہین اور حماد حسین کو باری، باری دیکھا۔

پرنس کو تو بات سمجھ آگئی تھی...... خاموش کھڑا بس سن رہا تھا۔

”جی لیڈی صاحبہ...... شاید آپ کو یاد نہیں رہا...... سفینہ اور ماہین دونوں lums سے ایم بی اے کر رہی ہیں۔ لاہور میں ہاسٹل میں رہتی ہیں...... ہماری بیگم صاحبہ کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں، ماہین ان کی وجہ سے رک گئی...... اور یہی وجہ ہے کہ بیگم صاحبہ آپ کی عیادت کو بھی نہ آسکیں......“ حماد حسین نے بہت تفصیل سے جواب دیا تھا۔

”لاہور چلی گئی۔“ پرنس کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے کوئی بہت ہی بری خبر سنی ہو۔

”اوہ...... یس...... مجھے یاد آگیا...... اوکے...... اچھا، اچھا ٹھیک ہے، کیا کہا آپ نے کوئٹہ چلی گئی ہے...... کوئٹہ کراچی سے زیادہ دور نہیں ہے۔“

”جی میں نے عرض کیا لاہور چلی گئی ہے......“ حماد حسین نے مؤدبانہ عرض کی۔ جبکہ پرنس کسی تصحیح کرنے کے موڈ میں نہیں تھا...... اسے گویا ایک چپ لگ گئی تھی۔

”کب آئے گی وہ......؟“ لیڈی صوفیہ نے خالی، خالی آنکھوں سے ماہین کی طرف دیکھا

”آپ اسے اتنا یاد کر رہی ہیں...... پرامس ہم جب بھی اب کراچی آئیں گے تو آپ سے ملنے ضرور آئیں گے۔“ ماہین تو یوں خوش ہوئی جیسے کھڑے، کھڑے کوئی خوش خبری مل گئی ہو...... مارے خوشی کے دل تیز، تیز دھڑکنے لگا...... اب تو وہ جا کر سفینہ کو مبارک باد دے گی کہ مبارک ہو تمہیں پرنس کی دادی نے پسند کرلیا ہے۔ وہ پُرجوش انداز میں سوچ رہی تھی...... بڑا مزہ آئے گا۔

”good promise“ لیڈی صوفیہ بچوں کی طرح کھل اٹھی تھیں...... پرنس مہمانوں کے لیے فریش جوس فریج سے نکال رہا تھا۔

”اتنا سوچتی ہو مجھے......؟ کہ میں تمہارے علاوہ کچھ اور نہیں سوچ پاتا...... مت کرو مجھ سے اتنی باتیں......“ وہ جوس گلاس میں ڈالتے ہوئے سفینہ سے مخاطب تھا۔

جس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ ایسے حیرت انگیز انسان کے عشق میں مبتلا ہے جو زمان و مکان کی قید سے جب چاہے خود کو آزاد کرالیتا تھا۔ مثبت سوچ، معصومیت، انسانیت، عاجزی، سادگی، دل و زبان کی ہم آہنگی، عبادت، معبودِ حقیقی کا پختہ یقین و شعور...... اسے تو محبوبہ کے گلابی خطوط کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

وہ صوفی تھا...... بظاہر نہیں تھا۔ جس بچے کو ہوش سنبھالتے ہی ذہن نشین کرادیا ہو کہ زندگی کھیل تماشا نہیں ایک بھاری ذمے داری کا نام ہے۔ اور انسان کو خیر و شر کی دو قوتوں کا شعور دے کر دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ دنیا کے بہترین دماغوں کا مطالعہ کرنے والی دادی نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ جو لوگ کسی بھی انسان کا برا نہیں چاہتے...... دوسروں کے لیے بھی اسی طرح اسی جذبے سے دعا کرتے ہیں جس طرح اپنے لیے کرتے ہیں...... دوسروں کی خوشیاں، اپنی خوشی کی طرح مناتے ہیں وہ بہت بلیسڈ ہوتے ہیں اللہ ان کو ہر لمحہ پیار سے دیکھتا ہے۔

انسانیت کا احترام کرنے والے کی ہر نعمت میں برکت ہوتی ہے... جو انسانوں کی بھلائی میں لگا ہوتا ہے رزق تو اس کا مسئلہ ہی نہیں ہوتا، وہ تو بارش کی طرح برستا ہے، تمہیں بڑے ہو کر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ پیسہ کہاں سے آئے گا...... تم نے صرف یہ سوچنا ہے کہ میں کسی کی تکلیف دور کرنے کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟ اس کی زندگی میں بہت سے بنیادی کمپلیکسز نہیں تھے۔ وہ خوف و اندیشوں سے پاک صاف زندگی کا عادی بنتا چلا گیا...... ذہنی الجھنوں سے پاک ذہن خود بخود روحانیت کی طرف متوجہ ہوتا گیا۔

جاننے والے اسے تنہائی پسند سمجھتے تھے...... یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کی تنہائیاں بڑی، بڑی محفلوں سے زیادہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

بارونق ہوتی ہیں۔

اس کی باقاعدہ تربیت کی گئی تھی کہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت فطرت کے ساتھ گزارے۔ اس کو شاندار زندگی گزارنے کے لوازمات کے ساتھ، ساتھ وقت بھی بہت دیا گیا تھا۔ اس کے ہر سوال کا جواب دینے والے گھر میں ہی موجود تھے، سب سے بڑھ کر دادی جو اس کے ہر سوال کا جواب دے کر مطمئن کرنا اپنا فرضِ اولین سمجھتی تھیں، اس کی روحانی طاقتیں روز بروز نکھرتی چلی گئیں۔ روحانی مسرت کے ہوتے ہوئے اسے بوریت مٹانے، وقت گزارنے کے طریقے ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں تھی۔

یہی وجہ تھی جو پہلی بار اس سے ملتا تھا چونک پڑتا تھا۔ آئینے کی طرح شفاف چہرہ، مقناطیسیت کی حامل چمکدار آنکھیں، دلفریب مسکراہٹ جو بڑی فطری محسوس ہوتی تھی، اتنی ہی فطری جتنی شیر خوار بچے کی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ جس سے وابستگی محسوس کرتا تھا، اس کے خیالات بھی پڑھ لیتا تھا۔ روح جب طاقتور ہوجاتی ہے تو ذوقِ یقین کی تشریح خودبخود ہوجاتی ہے۔

سفینہ کو اگر اس کی اس خصوصیت کا ادراک ہوجاتا تو وہ شاید خوفزدہ ہوکر پہلے ہی بھاگ کھڑی ہوتی۔

ماہین چوری، چوری سفینہ کی آنکھیں اپنی آنکھوں میں فٹ کرکے پرنس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لے رہی تھی۔

پرنس نے پہلے جوس کا گلاس حماد حسین کو تھمایا تھا پھر ماہین کو...... وہ ماہین کی نظروں کی گرمی محسوس کرنے کی وجہ سے اس کی طرف براہِ راست دیکھنے سے احتراز کررہا تھا۔

''آپ دونوں فرینڈز تو ایک دوسرے کا سایہ محسوس ہوتی ہیں...... پہلی بار آپ کو سفینہ کے بغیر دیکھا ہے تو کچھ عجیب سا محسوس ہورہا ہے۔'' پرنس نے اپنی دانست میں ماہین کو بھی کمپنی دینا ضروری خیال کیا تھا۔

''آپ نے ہمیں دیکھا ہی کتنی مرتبہ ہے شاید تین بار......'' ماہین نے جوس کا گلاس تھام کر اب پرنس کو سر سے پاؤں تک بہت اہتمام سے دیکھا تھا۔

''نقش ہوجائے تو ایک ملاقات بھی بہت ہے...... ورنہ تو ایک عمر ساتھ، ساتھ چلنے والے بھی اجنبی لگتے ہیں۔''

''واہ صاحب...... واہ......'' حماد حسین نے پرنس کو یوں داد دی تھی گویا مشاعرے میں کوئی اچھا سا شعر سن کر پھڑک گئے ہوں......

''آداب عرض ہے......'' پرنس نے خالص شاعرانہ انداز میں شکریہ ادا کیا تھا...... ماہین برجستہ انداز میں کھلکھلائی تھی۔

لیڈی صوفیہ کے بیڈ کا سرہانہ اونچا کردیا گیا تھا۔ اب وہ تقریباً نیم دراز تھیں۔ اور بچوں کی سی معصومیت سے تینوں کی طرف ٹکر، ٹکر دیکھ رہی تھیں۔

''بہت پیاری بیٹی ہے آپ کی...... کتنا پیارا دل ہے اس کا...... ماشاء اللہ...... میں اس کی طرف دیکھ رہی ہوں تو مجھے بہت خوشی محسوس ہورہی ہے۔ کتنی زندگی ہے اس کی ہنسی میں...... بہت معصوم ہے اسے تو ابھی باپ کے سوا کچھ بھی نہیں چاہیے۔''

لیڈی صوفیہ تواتر سے گویا ہوئیں تو ماہین کی ہنسی کو بریک لگ گئے...... شرمندہ سی ہوکر ادھر اُدھر دیکھنے لگی...... کیا تجزیہ کرنے کا انداز تھا...... شرمندگی کے ساتھ، ساتھ اسے گھبراہٹ بھی ہونے لگی...... اس نے آہستگی سے حماد حسین کا ہاتھ چھوا گویا چلنے کا اشارہ کیا۔

کیونکہ پرنس نے جس گہری نگاہ سے صرف اور صرف پل بھر کو اس کی طرف دیکھا تھا۔ یوں لگا تھا گویا وہ آنکھوں کے کیمرے سے اس کی دلی کیفیات کی فوٹو کھینچ رہا ہے۔

''تمہاری آنکھوں سے صاف پتا چل رہا ہے کہ تم دونوں فرینڈز میرے بارے میں کتنی باتیں کرتی ہو۔ بالکل

واضح ہے...... نکلتے ہوئے روشن سورج کی طرح کہ تم مجھے سفینہ کے حوالے سے دیکھ رہی ہو۔'' پرنس سوچتے ہوئے لیڈی صوفیہ کا کمبل درست کر رہا تھا۔

☆☆☆

''جس وقت تمہارے پاپا موجود تھے اور تم دونوں بہت چھوٹی تھیں تو میں ان سے کہتی تھی کہ میں ان دونوں کی شادیاں جلدی کردوں گی...... تیس سال سے پہلے، پہلے بچے ہوجائیں تو عورت ساری زندگی کمفرٹیبل فیل کرتی ہے، بیس بائیس سال کی لڑکی میں اسٹیمنا ہوتا ہے۔ energetic ہوتی ہے، بچوں کی بہت اچھی دیکھ بھال کرسکتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے اپنے بچوں کو انجوائے کرتی ہے۔'' تاجور بول رہی تھیں اور زارا منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ میں کوئی نرالی بات کر رہی ہوں......؟'' تاجور کو اس کے انداز پر بے ساختہ ہنسی آگئی وہ بہت اچھا سا موڈ بنا کر اس سے بات کر رہی تھیں۔ کچھ دیر پہلے ہی وہ اپنے لنچ نما ناشتے سے فارغ ہوکر مووی دیکھنے کا پروگرام بنا کر لاؤنج میں آئی تھی۔ ایل ای ڈی تو اس کے اپنے کمرے میں بھی موجود تھی۔ مگر پلازمہ اسکرین پر مووی دیکھنے کا مزہ ہی دوسرا تھا۔ لاؤنج کے بھاری پردے گرا کر پورا سینما ہاؤس بنا کر بیٹھ جاتی تھی۔

لاؤنج سے آتی مووی کی آواز سن کر نوکر بھی اِدھر اُدھر ہوجاتے تھے کیونکہ اس دوران کسی بھی قسم کی مداخلت پر وہ ہنگامہ کردیا کرتی۔ مگر تاجور نے اس وقت اس کا سارا پروگرام درہم برہم کردیا تھا۔ بہت اچھے موڈ میں مسکراتی ہوئی آئیں تو زارا یہ بھی نہ کہہ سکی کہ اماں میں تو مووی دیکھنے کے لیے بیٹھی تھی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے فوراً بعد آج انہوں نے بالکل ہی نیا موضوع چھیڑ دیا تھا۔

''یہ آج سنڈے کو اچانک کیا خیال آگیا...... پہلے تو آپ نے کبھی اس طرح کی بات نہیں کی؟'' زارا حیرت کے دریا میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''خیال تو ہر وقت رہتا ہے۔ تم دونوں بہنوں کے پرپوزل آتے رہتے ہیں......اور پھر جب گھر میں جوان بچیاں ہوں تو انہی کے بارے میں سوچ بچار رہتی ہے۔''

''کس بے وقوف نے پرپوز کردیا ہے مجھے؟'' زارا کا انداز بات ہوا میں اڑانے جیسا تھا...... بہت کوفت بھرے انداز میں ماں سے سوال کیا تھا۔

''اچھی بات ہے تمہیں اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔'' زارا سے اپنی منوانے کے لیے تاجور کو بھی بہت جتن کرنا تھے مگر مزاج میں فطری ٹھہراؤ اور صبر کی وجہ سے یہ ان کے لیے کوئی کارِ مشقت نہیں تھا۔

وہ تہیہ کرچکی تھیں کہ وہ زارا سے صرف اور صرف مسکرا کر بات کریں گی...... اس کے سارے ہتھیاروں کو اپنی مسکراہٹ سے کند کردیں گی...... یہی وجہ تھی کہ زارا بہت بے بسی محسوس کر رہی تھی۔

یہ تو نہیں تھا کہ تاجور اس سے مسکرا کر بات نہیں کرتی تھیں۔ ماں تھیں، اکیسویں گریڈ کی بیوروکریٹ افسر تو نہیں تھیں...... لیکن کئی دنوں سے اتفاق ایسا تھا کہ وہ اپنی غلطیوں کی وجہ سے مسلسل ان سے ڈانٹ کھا رہی تھی۔

''پرپوزل تو بہت ہیں...... مگر جب تک تم ذہنی طور پر تیار نہیں ہوگی بات آگے نہیں بڑھائی جاسکتی...... میں نے تم دونوں بہنوں کی پرورش اس طرح سے کی ہے کہ تم دونوں اپنے دل کی ہر بات مجھ سے شیئر کرو...... ماں سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے...... اس لیے کہ ماں ہی وہ واحد رشتہ ہے جو اپنی اولاد کی غلطیوں، حماقتوں کی پردہ پوشی کرتا ہے...... کوئی ماں کبھی اپنے بچوں کا تماشا بنانا پسند نہیں کرتی۔ چاہے بچے کتنی ہی خودسری دکھائیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے اماں......'' زارا، تاجور کی بات سن کر اتنا زیرِ اثر آئی کہ خود بخود انداز نرم اور صلح جُو ہوگیا۔

''لیکن میں نے تو کبھی شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں......اور پھر سفینہ مجھ سے بڑی ہے...... ظاہری بات

ہے میں تو سوچ بھی نہیں سکتی کہ سفینہ سے پہلے میری شادی ہو۔'' بہر حال اس نے دل کی بات ماں سے کہہ دی۔

''میں جانتی ہوں...... یقیناً ایسا ہی ہے...... میں نے کہا تاں، میں تو تم دونوں بہنوں کی شادیاں جلدی کرنے کا سوچتی تھی مگر سفینہ نے ایک کے بعد ایک اسکالرشپ لینا شروع کیا۔ اے لیول میں گولڈ میڈل بھی لیا...... تو مجھے خیال آیا کہ وہ اپنی خوشی اور محنت سے کیریئر کی طرف جا رہی ہے، میں اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ مگر تم فائن آرٹس کر رہی ہو...... یہ تو شادی کے بعد بھی کر سکتی ہو۔'' تاجور نے اب یوں کہا جیسے بڑے طریقے سے ضدی بچے سے اپنی بات منوانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ زارا نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا تھا۔

''اماں تو بہت سیریس موڈ میں بات کر رہی ہیں...... آخر چکر کیا ہے؟'' دل میں اندیشہ سا جاگا۔

''لیکن اماں یہ تو اسی وقت سوچا جا سکتا ہے جب کوئی بہت اچھا سا پروپوزل سامنے ہو...... ایسا تو فی الحال کچھ بھی نہیں ہے۔'' زارا نے بڑی ہوشیاری سے تاجور سے حقیقت جاننا چاہی۔

''پروپوزل تو کافی آرہے ہیں...... مگر پہلے میں تمہاری اسٹڈی کی وجہ سے سیریس نہیں لے رہی تھی...... پھر یونہی خیال آیا کہ آج اچھے پروپوزل آرہے ہیں شاید کل نہیں آئیں اور ہم اچھے پروپوزلز کا انتظار کرتے رہیں۔ میں تو بس یہ جاننا چاہ رہی تھی کہ تم تو کسی کو پسند نہیں کرتیں۔ آئیڈیلائز تو نہیں کر رہیں...... کیونکہ شادی میں تمہاری پسند کو سامنے رکھنا تمہارا حق ہے۔'' تاجور نے بھی اب اس کے خیالات جاننے کے لیے حتمی بات کر ہی ڈالی۔

''oh good God...... اماں مجھے تو ابھی تک کسی نے یہ احساس نہیں دلایا کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے یا میرے لیے سیریس ہے...... میرے کلاس فیلوز وہ تو بہت immature ہیں...... سیریس باتوں پر بھی سیریس نہیں ہوتے......'' زارا بولتے، بولتے دھیرے سے ہنس دی۔

''تھینک گاڈ...... میں بس یہی جاننا چاہ رہی تھی...... اس کا مطلب ہے جو پروپوزل مجھے اچھا لگے میں تمہاری طرف سے اسٹیپ لے سکتی ہوں...... کیونکہ تم تو کسی بھی اچھے سے لڑکے سے شادی کر سکتی ہو۔''

''کسی بھی......'' زارا پھر چونکی۔ ''اماں اب ایسا بھی نہیں ہے...... یہ decision تو لڑکے سے ملنے کے بعد ہی لیا جا سکتا ہے۔'' زارا نے بڑی حاضر دماغی سے خود کو کسی وعدے کی پابندی سے بچا لیا۔

''اوکے...... بہر حال میرے لیے یہ بھی بہت ہے کہ تم کسی سے commited نہیں ہو۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے اپنا مدعا پورا کر لیا تھا...... زارا کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ وہ کسی بھی وقت اس کی شادی کا سلسلہ شروع کر سکتی ہیں۔

وہ تو اپنے بیڈروم میں چلی گئیں مگر زارا کو کام دے گئیں۔

یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی شادی کی باتیں بھی اچانک شروع ہو سکتی ہیں اس کے حساب سے تو دور تک فرصت تھی۔ جب تک سفینہ کی شادی نہیں ہو جاتی اس کی شادی کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

مگر اس وقت تو ماں نے اسے حیران کر کے رکھ دیا تھا۔

اس کے نزدیک تو شادی آزادی کا پروانہ تھی...... ماں کی روک ٹوک سے آزاد زندگی، ہر معاملے میں آزادی کا احساس......

مگر شادی کے لیے ایک لڑکے کی شرط لازمی تھی...... اس کا تو ابھی دور، دور تک نام و نشان نہیں تھا۔

☆☆☆

"the difference between genius and stupidity is genius has its limits" پرنس، ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق لیڈی صوفیہ کو باہر لان میں ہلکی پھلکی چہل قدمی کرا کر روم میں داخل ہوا تھا...... لیڈی صوفیہ گھر جانے کی اجازت نہ ملنے پر ڈاکٹرز کو تنقید کا نشانہ بنائے ہوئے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

تھیں۔ انہیں اعتراض تھا کہ ڈاکٹر کو ان کی بات سمجھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ ایک ہیوی اماؤنٹ کے چکر میں انہیں ہاسپٹلائزڈ کرنے کے درپے ہیں۔

جبکہ ڈاکٹر پرنس کو قائل کر چکے تھے کہ عمر کے جس دور میں لیڈی صوفیہ...... داخل ہو چکی ہیں اس کا تقاضا ہے کہ ہر تین ماہ بعد ان کا باقاعدہ میڈیکل چیک اپ ضرور کرایا جائے۔ دوائیں اور معائنہ کسی بھی انسان کو ہمیشہ کی زندگی دینے کی ضمانت نہیں ہے۔ مگر بہت بڑی تکلیف سے نمٹنے کا راستہ ضرور مل جاتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ لیڈی صوفیہ چہل قدمی سے ہانپنے کے بعد چڑچڑی ہو گئی تھیں۔ ان کی ذاتی خادمہ کو ان کے اس موڈ سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگی کسی حکم کی منتظر تھی کیونکہ جو اس کے کرنے کے کام تھا، وہ پرنس کر رہا تھا۔

پرنس کے خیالات وہی تھے جو لیڈی صوفیہ نے منتقل کیے تھے کہ جب اپنے پیارے کسی تکلیف سے گزر رہے ہوں تو ہر پل انہیں اپنی قربت اور وابستگی کا احساس دلانا چاہیے۔ یہ وہ خوشی ہوتی ہے جو مرنے کے بعد نیک فرشتوں کی صحبت سے بھی نہیں مل سکتی۔

نرسیں ہیلپرز ہوتی ہیں...... رشتہ نہیں...... روح کو ہمیشہ رشتوں سے آسودگی حاصل کرنے کی تمنا ہوتی ہے۔

”آپ آئن اسٹائن کے ان خیالات کو اتنی بار دُہرا چکی ہیں کہ میں خوفزدہ ہو کر اپنا جائزہ لینے لگتا ہوں کہ میں کتنا جینئس ہوں اور کتنا اسٹوپڈ۔“ پرنس نے ہلکے پھلکے مذاق سے لیڈی صوفیہ کا موڈ تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔

”پرنس شہپر علی خانزادہ کبھی اسٹوپڈ نہیں ہو سکتا۔ میں یہ بات مذاق میں بھی سننا پسند نہیں کروں گی۔ تم نے لائف پارٹنرشپ کے لیے جس لڑکی کی طرف دیکھا ہے وہ بہت امیزنگ ہے۔ جب سے اسپتال آئی ہوں اسی بات پر غور کر رہی ہوں......“ لیڈی صوفیہ اب بیڈ پر دراز ہو چکی تھیں اور آنکھیں موند کر گہری، گہری سانسیں لے رہی تھیں۔

”میں تو تمہیں پریشرائز کر رہی ہوں...... میرا ردِعمل یقیناً تمہارے لیے تکلیف کا باعث ہوگا...... اس کا مطلب ہے تاریخ دُہرا رہی ہوں...... میرے سسر اور تمہارے fore father نے یہی تو کیا تھا۔ کیا تم بھی اپنی دادی کو اسی طرح یاد کرو گے جس طرح میں اس ظالم اور ڈکٹیٹر کو یاد کرتی ہوں۔“ بولتے، بولتے لیڈی صوفیہ ایک دم خاموش ہو گئیں......

پرنس کو ایک خوشگوار سی حیرت نے آلیا تھا۔

یہ تو معجزہ ہو گیا...... معجزے کمال محبتوں میں ہی ہوتے ہیں...... ایک طاقت ور روحانی مسرت کا احساس تھا جس میں وہ بھیگتا جا رہا تھا۔ لیڈی صوفیہ نے ابھی تک پرنس کا ہاتھ پوری قوت سے اپنے ہاتھ کی گرفت میں لیا ہوا تھا...... اور گرفت کی مضبوطی کا احساس ہی تھا کہ پرنس نے اپنا ہاتھ آزاد کرانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ پرنس اپنی مقناطیسی نظریں لیڈی صوفیہ پر جمائے منتظر تھا کہ وہ مزید کوئی خوب صورت کلمات ادا کریں۔

”میرا خیال ہے ہمیں حماد حسین کو انوالو کرنا چاہیے۔“ وہ زیرِ لب گویا ہوئیں۔

پرنس نے چونک کر دیکھا۔

”سفینہ، حماد حسین کے توسط سے ہی ہمارے سامنے آئی ہے۔ اچھا ہوگا کہ جب ہم سفینہ کو پروپوز کرنے اس کے گھر جائیں تو حماد حسین ہمارے درمیان موجود ہوں۔ he is a gentle man۔“ پرنس نے حیرت و مسرت کی انتہا پر روحانی ترقی کا ایک اور زینہ طے کیا تھا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ الحمدللہ آپ کی طبیعت بہت بہتر ہے۔“ پرنس نے شادمانی کے نوخیز جھونکوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بے ساختہ و برجستہ کہا تھا۔

”الحمدللہ......!“ جواب میں لیڈی صوفیہ کی طرف سے بہت اختصار سے کام لیا گیا تھا۔

☆☆☆

”تم مجھ سے کوئی اور بات نہیں کر سکتیں؟“ سفینہ بہت سنجیدگی سے ماہین سے مخاطب تھی۔

’’تم سمجھ رہی ہو میں کوئی مذاق ... کر رہی ہوں...... تمہارے سر کی قسم...... پرنس کی دادی تمہیں بہت یاد کر رہی تھیں، جب میں نے ان سے وعدہ کیا کہ جب سفینہ کراچی میں ہوگی تو میں اسے لے کر آپ سے ملنے ضرور آؤں گی...... پتا ہے پھر انہوں نے کیا کہا......؟‘‘ ماہین بہت پُرجوش محسوس ہو رہی تھی۔

’’کیا کہا......؟‘‘ سفینہ نے یوں سوال کیا جیسے کوئی اس کی کنپٹی پر پستول رکھ کر بلوا رہا ہو۔

’’انہوں نے کہا۔ good promise‘‘ ماہین نے والہانہ بتایا۔

’’یہی کہنا تھا انہوں نے...... اور پھر کیا کہتیں......‘‘ سفینہ نے سرد و سپاٹ لہجے میں الٹا سوال کر دیا۔

’’ہوں، پوز دے رہی ہو...... وہ ہماری نانو کیا کہتی تھیں۔‘‘ ماہین نے رک کر حافظے پر زور دے کر اپنی نانو کا کوئی قولِ زریں سفینہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہا۔

’’نانو، جو بھی کہتی ہوں گی، بہت اچھا ہی کہتی ہوں گی۔‘‘

’’ہاں...... یاد آ گیا...... دل میں لڈو پھوٹنا...... دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔‘‘ ماہین کے جوش و خروش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

’’کتنی بورنگ سویٹ کا نام لیا ہے تم نے...... کل آ رہی ہو ناں......؟ سیٹ تو کنفرم ہے۔‘‘ سفینہ نے الگ ہی موضوع چھیڑ دیا۔

’’تم کیا شے ہو یار...... پرنس کی دادی تمہیں یاد کر رہی ہیں۔‘‘ ماہین اب بری طرح چڑ گئی۔

’’اوکے...... کبھی ان سے ملاقات ہوئی تو تھینکس بول دوں گی، انشاء اللہ کل میرے کان کھانے کے لیے تم اس روم میں موجود ہوگی...... تب تک کے لیے اللہ حافظ......‘‘

سفینہ کی طرف سے سلسلہ منقطع ہوا تو ماہین سوچنے پر مجبور ہوگئی...... کہ اس کے انداز غیر معمولی ہیں...... مگر کیوں......؟

’’میں سفینہ کے معاملے میں بہت sensitive ہوں۔ اپنی ان آنکھوں سے میں نے اس کی آنکھوں میں پرنس کا عکس دیکھا ہے۔‘‘

حیرت تھی اور ان گنت سہمے ہوئے سوال بھی......

☆☆☆

سفینہ دل پر منوں بوجھ لیے لاہور آئی تھی...... زندگی کا بڑا انوکھا تجربہ ہوا تھا...... کچھ پانے سے پہلے ہی کھو دینے کا شدید احساس...... شاور لے کر قدرے تازہ دم ہوئی تھی کہ ماہین نے پھر دکھتی رگ پکڑ کر نڈھال کر دیا۔

اس نے بے شمار انگلش ناول پڑھے تھے...... مشرق و مغرب کی شاعری بھی پڑھی تھی۔ اولیولز کے نصاب میں شامل اردو کی مشکل ترین (اس کے حساب سے) کتاب پڑھتے ہوئے اسے اچانک کلاسک ادب کے مطالعے سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اور انہی دنوں میں اس نے لارڈ بائرن کے یہ خوب صورت الفاظ بھی پڑھے تھے۔

’’عورت اپنے پہلے جذبے میں اپنے چاہنے والے کو چاہتی ہے پھر اسے سچ مچ محبت ہو جاتی ہے۔‘‘

اس نے مخلوط تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی تھی، اب بھی کر رہی تھی۔ بے شمار کلاس فیلوز جن میں اکثریت پوش علاقوں سے تعلق رکھتی تھی۔ سماجی لحاظ سے اس کے ہم پلہ تھے۔ بہترین اشیا اور کاروں کا استعمال کرتے تھے، راڈو، رولیکس سے کم برانڈ کی رسٹ واچز نہیں پہنتے تھے۔ کوالٹی کا پرفیوم استعمال کرتے تھے...... شہر کے مہنگے ترین سیلون میں بال ترشواتے تھے...... تقریباً سب ہی پاسپورٹ ہولڈر تھے۔ آئے دن ایک سے ایک خوش شکل سامنے بھی آ جاتا تھا...... مگر وہ ان سب سے یوں گزرتی آ گئی تھی جیسے پانی ڈھال کی طرف بہتا چلا جاتا ہے۔ اس نے پرنس کی آنکھوں میں اپنے لیے وہ جذبہ پایا تھا جو اس سے پیشتر اس کی زندگی کے تجربات میں شامل نہیں تھا۔

شوق، جستجو، والہانہ پن، آنکھوں میں دل کے کہیں پڑ لئے ڈالنے کے واضح اشارے، وہ اتنی احمق نہیں تھی کہ نگاہ کے پیغام کو سمجھنے کی غلطی کی رعایت دے دیتی پھر...... زارا کا اسکیچ؟ وہ کیوں زارا کو پینٹ کر رہا ہے...... ادھورا اسکیچ اس بات کی گواہی تھا کہ اس میں بہت جلد رنگ بھر دیے جائیں گے...... اس نے تو زارا کی بے ساختہ فطرت کے سبب اس نکتے پر بھی غور کیا تھا کہ شاید زارا نے کسی بے ساختگی کے لمحے میں پرنس سے اپنا اسکیچ بنانے کی فرمائش ہی کر دی ہو۔ مگر دل نے اس خیال کو مسترد کر دیا تھا۔ پرنس اپنے منفرد اسلوب کا یکتا مصور تھا...... وہ کسی کی فرمائش پر اپنا وقت قربان نہیں کر سکتا تھا۔ وہ عظیم تخلیق کار تھا، ٹرکوں، رکشوں پر پینٹنگ کرنے والا ہنر مند نہیں تھا۔ پھر جیسے ہی ذہن میں ''پھر'' آتا فوراً پُھر سے اڑ جاتا۔

''مجھے اس ٹرانس سے نکلنا ہوگا۔ میں بہت پریکٹیکل ہوں...... یہ سب کچھ ایک حادثے کی طرح بھلانا ہوگا۔ لیکن میرے ساتھ اب ایک عجیب سی بات ہونے لگی ہے۔ سوتے، سوتے میری گہری نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ کوئی میرے ذہن پر دستک دے کر جگاتا ہے۔ کئی بار تو یہ اتفاق ہی محسوس ہوا...... مگر جاگنے کے عمل میں اتنی باقاعدگی اور یکسانیت ہے کہ اب تو جاگتے ہی میں خوف میں مبتلا ہو جاتی ہوں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ بات تو میں ماہین سے بھی شیئر نہیں کر سکتی۔ مذاق اڑا، اڑا کر میرا ناطقہ بند کر دے گی۔ اماں سے ہر بات کر سکتی ہوں...... مگر اماں پریشان ہو جائیں گی۔ کچھ کر تو نہیں سکیں گی۔'' سوچتے، سوچتے درحقیقت وہ شل ہو گئی......

''پرنس کی دادی نے یونہی پوچھ لیا ہوگا...... ماہین کو تو بس بہانہ چاہیے......'' وہ بیڈ پر اوندھی گر گئی۔ یوں جیسے آناً فاناً ساری توانائیاں زائل ہو گئی ہوں۔ آنکھیں بند کرتے ہی ذہن کے پردے پر پرنس مسکرا رہا تھا۔

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

''میں تمہارے بارے میں نہیں سوچنا چاہتی...... یہ مجھے کیا ہو رہا ہے...... میں اتنی کمزور تو نہیں ہوں۔'' وہ اپنی کیفیت سے بری طرح پریشان ہو رہی تھی۔

☆☆☆

پھولوں سے بھرے پودے کی طرف اس کی توجہ تھی مگر توجہ صرف ایک پھول پر مرکوز تھی۔ جو پھولوں کے گچھوں سے قدرے الگ تھلگ نظر آ رہا تھا...... اتنا کھل کر کھلا تھا گویا پھٹ پڑا تھا...... یکسوئی قائم ہوتے ہی پھول سفینہ کے چہرے میں ڈھل گیا...... وہ اتنا منہمک تھا کہ سفینہ کی پلکوں کو انگلی سے چھو سکتا تھا۔

''تم میرے تصور سے جنگ کر رہی ہو سفینہ...... مسلسل مسترد کر رہی ہو...... تمہاری دکھ بھری بیزاری سے میرے دل پر ہلکی سی ضرب پڑتی ہے...... ایسی ضرب کو عام انسان وہم و اندیشے کا نام دیتے ہیں مگر میں پُرسکون، پُراعتماد سفینہ کی زندگی میں یکایک آ جانے والے دکھ کی کھوج میں ہوں، یہ دکھ کہاں سے گفٹ ہوا ہے۔ سفینہ کے ذہن میں سکون ہوگا تو میرے احساسات خود بخود خوب صورت ہو جائیں گے۔ میں سرشاری سے محروم ہوں تو اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ سفینہ کے ذہن میں ہلچل ہے...... اچھی لڑکی تم کیوں پریشان ہو؟ میں تو پہلی ملاقات سے لے کر آخری ملاقات تک ایک ہی حال میں ہوں، کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ تم میرے گھر آئیں تو گھر میں داخل ہونے سے پہلے مجھ سے باتیں کرتی رہیں...... تمہاری باتیں بہت خوب صورت تھیں۔ تمہاری طرح...... پھر کچھ ہوا...... میرا ذہن خالی ہو گیا...... تم جاتے ہوئے وہ نہیں تھیں جو آتے ہوئے تھیں۔ اس کا مطلب ہے تبدیلی کی وجہ...... یہیں...... اس گھر میں...... میرے آس پاس ہے۔''

اس خیال کے ساتھ ہی اس نے چونک کر آنکھیں کھول دی تھیں...... اور یک دم عجیب سی ڈھونڈ، تلاش لاحق ہو گئی تھی......

جیسے گوری نے ساجنا کو ''گم شدہ بالا'' بریلی کے بازار میں تلاش کرنے کی ڈیوٹی تفویض کر دی ہو...... کہ بالا ضرور

گم ہوا ہے مگر ڈھونڈ کر تم ہی نے لانا ہے۔ وہ بڑے بےکل انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

''رات میں نے کافی غور کیا...... ایک ہی بات سمجھ آئی کہ ہمیں اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' لیڈی صوفیہ ہلکا پھلکا ناشتا کرنے کے بعد اب بہت پُرسکون و مطمئن انداز میں بات کر رہی تھیں۔ پرنس نے بڑی بے آرام رات گزاری تھی۔ لیڈی صوفیہ نے ہزار کہا کہ وہ گھر جا کر آرام کرے...... مگر بوڑھی دادی کا بڑھاپا اسے اندیشوں میں مبتلا رکھتا تھا۔ وہ ایک پل کے لیے ان سے دور ہونے پر راضی نہیں ہوا۔ روم میں ایک ہی اٹینڈنٹ رک سکتا تھا پرنس نے لیڈی صوفیہ کی فلپائن خدمت گار انجیلا کو رات گھر بھیج دیا تھا۔

ایک اور فکر بھی تھی کہ پرنس کو قریب نہ پا کر وہ گھر جانے کے لیے اصرار نہ کرنے لگیں۔ اسپتال میں رکنے کی وجہ سے وہ اپنے معمولات سے ہٹ گیا تھا۔ صبح نماز کے بعد ہلکی پھلکی ایکسرسائز ضرور کی تھی مگر یکسوئی میسر نہ ہونے کی وجہ سے مراقبہ نہیں کر سکا تھا۔ جس کا وہ ایک مدت سے عادی تھا۔

لیڈی صوفیہ کی بات سنتے ہوئے وہ غائب دماغی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ بس خالی، خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھتا رہ گیا...... لیڈی صوفیہ کسی خوشگوار تصور کے زیرِاثر تھیں، وہ پرنس کی طرف یکسوئی سے متوجہ نہیں تھیں...... نیند پوری ہو جانے کی وجہ سے بہت تروتازہ دکھائی دے رہی تھیں۔ اسپتال کا مخصوص بلیو چیک کا لبادہ پہنے ہوئے...... مدتوں بعد ظاہری آرائش سے بے نیاز...... بس اپنی ہی دُھن میں مگن تھیں۔ کمرے میں برقی روشنیاں گل تھیں...... نئے سویرے کے تمام تر آثار ماحول میں واضح تھے۔

''میں حماد حسین سے بات کرتی ہوں، وہی ہماری میٹنگ ارینج کر سکتے ہیں کیونکہ وہ commen friend ہیں۔'' وہ اب پہلو بدل کر نسبتاً زیادہ آرام دہ حالت میں بیٹھ گئی تھیں۔ پرنس ہنوز خالی الذہن ان کی طرف بس تکتا جا رہا تھا۔

''ایک میٹنگ تو فارمل ہوگی...... ہم ایک دوسرے سے introduce ہوں گے۔ پھر میں سفینہ کی مدد کو دونوں بچیوں کے ساتھ ڈنر پر انوائٹ کروں گی...... میری میموری ٹھیک کام کر رہی ہے ناں...... سفینہ کی فیملی میں اس کی مدر اور ایک ینگر سسٹر ہی ہے ناں......؟'' لیڈی صوفیہ نے بات کرتے، کرتے اچانک تصدیق چاہی۔

اب پرنس متحیر سا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بات مکمل بھی ہو گئی تھی اور سمجھ بھی آ گئی تھی۔

گرینڈ مام نے رات بھر میں سارے راستے طے کر لیے۔

وہ یہی سوچتا رہا کہ آگے بڑھنا ہے یا رک جانا ہے......

''so hurry'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا...... حیرت اب خوشی کے احساسات میں منتقل ہو رہی تھی...... دادی کے لیے دل میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔

اتنی آسانی سے...... وہ اس کے قریب ہونے جا رہا ہے؟ یہ عشق کی کرامت ہے یا کوئی امتحان درپیش ہے؟ عشق کی انتہا پر اندیشے ضرور حملہ آور ہوتے ہیں۔

''میں بیس سال کی عمر میں تمہیں شادی شدہ دیکھنا چاہتی تھی...... ستر سال گزارنے کے بعد انسان کو کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے...... میں تمہارے بچوں کو انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ مگر کئی سال خاموشی سے گزر گئے کچھ بھی نہیں ہوا...... اب میں ہائیلی رسک پر ہوں...... اور خوشی منانے کے لیے بے چین ہو چکی ہوں...... اب کوئی بیریئر اور رکاوٹ برداشت نہیں کروں گی۔'' لیڈی صوفیہ کا اندازِ کلام حتمی اور دوٹوک تھا۔

''آپ کی خوشی میرے لیے اپنے تمام ضروری کاموں سے زیادہ اہم ہے......'' پرنس نے سرخوشی کی کیفیت میں لیڈی صوفیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ہلکا سا دبایا۔

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

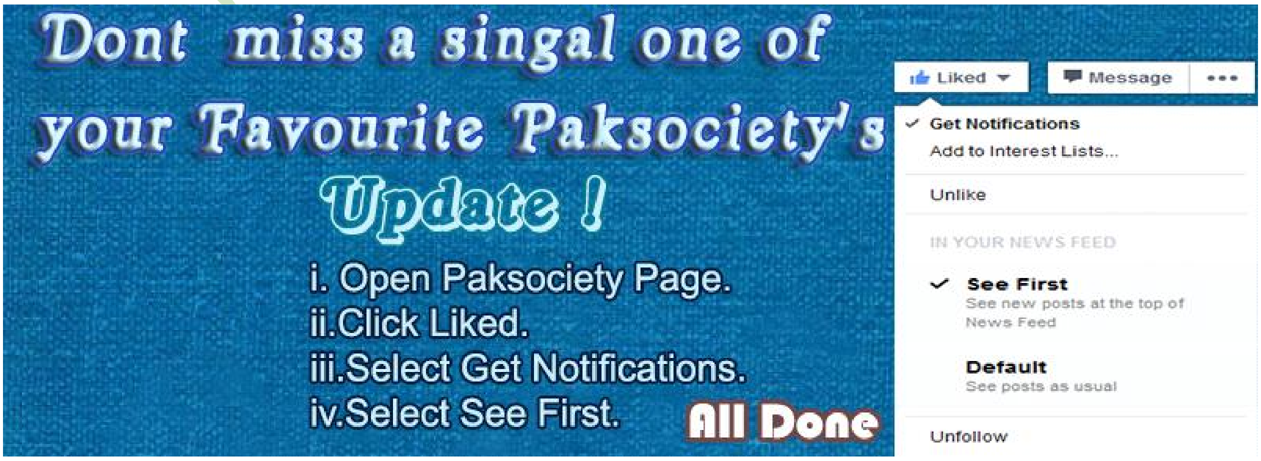
Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !
Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow
All Done

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.

’’تم نے so hurry کہہ کر مجھے حیران کر دیا۔ تمہیں تو مجھ سے زیادہ جلدی ہونی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ کوئی دوسرا خیال مجھے قابو کر لے اور میرا فیصلہ کمزور پڑ جائے...... میں بالکل بھی دیر کرنا پسند نہیں کروں گی۔ ہم آج دوپہر سے پہلے اپنے گھر چلے جائیں گے......‘‘ لیڈی صوفیہ کا انداز دوٹوک تھا۔ پرنس ایک دم سٹپٹا گیا۔

’’گرینڈ مام......ڈاکٹرز کی ایڈوائز......‘‘

’’I do not care......ڈاکٹرز میری عمر میں اضافہ کرنے والی کوئی میڈیسن نہیں دے سکتے...... یہ بونس کی سانسیں تو تمہاری خوشی دیکھنے کے لیے ملی ہیں...... تمہیں آس پاس کوئی میرا ہم عمر دکھائی دیتا ہے؟‘‘ لیڈی صوفیہ کے سوال نے پرنس کو لاجواب کر کے رکھ دیا...... جواب میں کچھ نہ سوجھی تو لیڈی صوفیہ کی ہتھیلی کی پشت پر ایک بوسۂ عقیدت و محبت ثبت کر دیا...... الوہی مسرت کے احساسات نے دھڑکنوں کو بانسری کی دُھن میں تبدیل کر دیا تھا۔ ایسے سُر جو فطری حسن سے مالا مال وادیوں میں کہیں بکھرا کرتے ہیں۔

☆☆☆

تاجور تو ریسیور کان سے لگائے حیرت سے پتھر ہی بن گئی تھیں۔

’’لیکن حماد بھائی، سفینہ تو لاہور جا چکی ہے...... میرا خیال ہے ماہین بھی آج چلی جائے گی۔ مجھے لیڈی صوفیہ سے ملنے پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ میرے لیے تو یہ اعزاز ہے۔‘‘ وہ چند لمحات کے توقف کے بعد بہت محتاط انداز میں گویا ہوئیں...... ان کے خیال میں حماد حسین کی بات ابھی ادھوری تھی، وہ سننا چاہتی تھیں کہ لیڈی صوفیہ کو یک دم ان سے ملنے کا خیال کیونکر آ گیا......؟

وہ خود طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھتی تھیں مگر سفینہ نے جو کچھ ان کے رہن سہن، گھر بار کے بارے میں بتایا تھا وہ بہت دلچسپ اور حیرت انگیز تھا۔ وہ کسی طور خود کو ان کا ہم پلہ نہیں سمجھتی تھیں۔

شہر کا رئیس ترین خاندان اور اکلوتا وارث...... دور تک تنازعہ نہ چپقلش ایک پُرسکون، ہموار زندگی۔

’’تو پھر آپ کی اجازت سے میں انہیں آج شام یا رات کا وقت دے دوں......؟‘‘ حماد حسین پوچھ رہے تھے۔

’’آج......؟ ارے نہیں یہ تو کچھ زیادہ ہی جلدی ہو گیا...... ابھی تو میں آفس آئی ہوں، ان کو گھر بلانے سے پہلے ان کے شایانِ شان انتظام بھی کرنا ہوگا...... بلکہ میں تو یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اگلے ویک اینڈ پر سفینہ کو بلا لیتی ہوں۔ وہ بھی موجود ہوگی تو بہت اچھا لگے گا...... اکثر وہ گھر میں ہونے والے اسپیشل ڈنرز میں موجود نہیں ہوتی۔‘‘ وہ اتنا کہہ کر رک گئی تھیں...... انہیں یہ جاننے کی بے چینی تھی کہ لیڈی صوفیہ، سفینہ کی غیر موجودگی میں ان سے ملنے کا ارادہ کیوں کر بیٹھی ہیں۔ اسی لیے رک گئیں کہ حماد حسین کچھ ایسا کہہ دیں کہ حیرت ختم ہو جائے اور ایک اچھے سے ڈنر کی تیاری شروع ہو جائے۔

’’عموماً دعوت کی غرض و غایت کے اثرات تقریب سے آشکار ہوتے ہیں۔ اگر وہ محض ملاقات کی غرض سے آ رہی ہیں تو بھی اچھا ہے لیکن اگر وہ سفینہ کی خاطر یہ تکلیف یا زحمت اٹھانا چاہ رہی ہیں تو بہت زیادہ خصوصی اہتمام ہونا چاہیے۔ اور اس پہلی ملاقات کا تاثر بہت مثبت اور گہرا ہونا چاہیے۔‘‘

’’بات یہ ہے بھابی صاحبہ...... یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں کہ وہ آپ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہیں۔ بس انہوں نے فون پر خواہش ظاہر کی تو میں نے کہہ دیا کہ آپ سے بات کر کے ہی کنفرم کر سکتا ہوں۔‘‘

اٹھتے ہوئے سرخوشی کے جذبات جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔

’’اچھا......‘‘ وہ اب قدرے گم صم کیفیت میں گویا ہوئیں...... اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں...... ورنہ حماد حسین کو وجۂ ملاقات ضرور بتائی جاتی۔

’’اب آپ کیا کہتی ہیں......؟‘‘ حماد حسین پوچھ رہے تھے۔

’’میں آج کا شیڈول دیکھ کر بتا سکوں گی کہ اگر شام کو کوئی اہم میٹنگ نہ ہوئی تو میں جلدی گھر جا سکوں گی...... تھوڑا بہت انتظام تو کرنا ہوگا۔‘‘ وہ سوچتے ہوئے گویا ہوئیں۔

سجے بنے نوکر چاکر والے گھر میں مہمانوں کے لیے بس مینیو دیکھا جاتا ہے، متوسط طبقے کے گھر کی طرح نہ دھلائیاں ہوتی ہیں نہ چادریں تبدیل ہوتی ہیں۔

''ٹھیک ہے پھر میں آپ کی کال کا انتظار کروں گا...... السلام علیکم......'' حماد حسین کی طرف سے رابطہ منقطع ہوگیا تھا۔ مگر تاجور کو لامتناہی خیالات نے آلیا تھا۔

☆☆☆

''اٹھو میری بستی کے بے حسوں کو جگا دو
ستر سال سے سو رہے ہیں خدا کے لیے جگا دو
قبر میں جا کر کیا کرکٹ کھیلو گے؟
سنو ان آدھی موت والے مردوں کو جگا دو
سارا سرمایہ سمیٹ کر بھی رونا دھونا
ٹیکس کیوں دیں ٹول کیوں دیں کوئی اور سزا دو
اُف ان بوڑھے جوانوں پر کچھ تو رحم کرو
روٹی کپڑا مکان نہ سہی اولڈ ہوم ہی بنا دو
انجینئر، ڈاکٹر، پروفیسر بن کر بھی کیا ہو گا
زندہ آدمی کچھ تو کرلے چلو دولھا ہی بنا دو''

ساحل اپنی تازہ ترین انقلابی شاعری سیتا کو سنا رہا تھا۔ جو ہنس، ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئی جاتی تھی۔

"what a funny poetry" اس نے آنکھیں مسلتے ہوئے بہ مشکل ہنسی روک کر کہا۔ ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

''آپ میری شاعری کی انسلٹ کر رہی ہیں مس سیتا...... یہ ایک ریفارمر کا وژن ہے۔ آپ جوک سمجھ رہی ہیں؟ اچھا چلیں چھوڑیں میں سچ مچ آپ کو ایک جوک سناتا ہوں......'' اس نے سیتا کے سامنے ڈٹتے ہوئے ہلکے پھلکے موڈ میں بات کی تھی مگر سیتا کے چہرے پر یک دم سراسیمگی ٹپکنے لگی تھی...... وہ جلدی سے اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی تھی۔

ساحل کو اس اچانک تبدیلی کی وجہ سمجھ نہیں آئی...... وہ اپنی ترنگ میں تھا۔

''ارے آرام سے بیٹھ کر سنیں...... جوک سنیں گی تو خود بخود اچھل پڑیں گی۔'' سیتا نے جلدی سے دراز کھولی اور بند کرتے ہوئے یوں گویا ہوئی جیسے تھوک نگل رہی ہو۔

''گڈ مارننگ میم!''

اب ساحل کو لگا جیسے نیلے پیلے کارڈز دکھانے کے بعد آج لال کارڈ دکھایا جائے گا۔ وہ سمجھ گیا کہ تاجور تشریف لے آئی ہیں۔ اس نے بہت مہارت سے خود کو سنبھالا اور پلٹ کر بہت مؤدبانہ انداز میں سر خم کر کے تاجور کو سلام عرض کیا۔

''السلام علیکم میم......''

''وعلیکم السلام...... ماشاءاللہ...... gala ہو رہا ہے...... دن میں۔''

''نو میم...... میں سسٹم آن کر رہی تھی۔''

''نہ کہ یہ صاحب آپ کو اپنی افلاطونی شاعری سنانے بیٹھ گئے...... مسٹر ساحل...... جو وقت کی قدر کرتے ہیں...... وقت ان کی قدر کرتا ہے۔ بے حسوں کو جگانے کا کام اللہ پر چھوڑ دیں...... مگر برائے مہربانی خود جاگ جائیں۔ ساڑھے آٹھ بجے آفس شروع ہوجاتا ہے، آپ نو بجے تک پوئٹری فرماتے رہتے ہیں۔ honesty is the best policy'' یہ کہہ کر تاجور قائدانہ طمطراق سے چلتی اپنے روم کی

طرف بڑھ گئی تھیں۔

”ہے بھگوان...... میم نے شروع سے سنا ہے...... انہوں نے فرسٹ لائن کوٹ کی ہے۔“ سیتا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔

”چلو اچھا ہوا انہوں نے میرے سب اشعار سن لیے...... ویسے پیسے آفر کر کے بھی سناتا تو نہ سنتیں......“ وہ بولتا ہوا سیدھا جا کر اپنی چیئر پر گرا...... مگر انٹر کام کی گھنٹی نے اسے دو پل چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔

☆☆☆

”پاپا مجھے ائر پورٹ چھوڑنے آئے تھے...... راستے میں اتنی thrilling news سنائی کہ مجھے پلین میں بیٹھ کر بھی لگ رہا تھا کہ میں پلین میں اُڑ نہیں رہی چل رہی ہوں۔“ ماہین اتنی پُر جوش اور حیران تھی کہ سفینہ کو سنجیدگی سے اس کا نوٹس لینا پڑا۔

”بائی داوے، پلین اڑتا ہے یا پسنجرز......؟“ سفینہ اپنے گیلے بال انگلیوں سے سلجھاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”اچھا بس...... لائرز کی طرح پوائنٹس اٹھانے کی ضرورت نہیں، خبر سنو......“ ماہین نے ٹوکنے پر کوفت کا مظاہرہ کیا تھا۔

”سناؤ۔“ سفینہ نے کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے نارمل انداز میں کہا۔

”پرنس اور پرنس کی دادی جان صاحبہ، آپ کے گھر جانا چاہتے ہیں، تاجور آنٹی سے ملنا چاہتے ہیں۔“

سفینہ کو توقع نہیں تھی مگر ماہین نے واقعی دھماکا کر دیا تھا۔ انگلیاں بالوں میں پھنسی رہ گئیں...... وہ ششدر کھڑی ماہین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ روشنی زمین کے گرد ایک سیکنڈ میں آٹھ مرتبہ چکر لگاتی ہے۔ اس کے دماغ کے گرد دس مرتبہ گھوم گئی تھی۔

”کیا وہ سو رہی ہے۔ کوئی خواب دیکھ رہی ہے؟ آناً فاناً اتنی جلدی جیسے کوئی ایمرجنسی ڈکلیئر ہوئی ہو۔

”لیکن میں تو یہاں ہوں......؟“ اس نے اپنی ششدر نگاہیں موڑتے ہوئے خود سے سوال کیا۔

”ارے اس طرح کیا دیکھے جا رہی ہو؟ مارے خوشی کے بات ہی کرنا بھول گئیں؟“ ماہین نے شوخی سے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ چونک کر رخ موڑ گئی۔

”خوشی...... اس میں خوشی کی کیا بات ہے؟“ وہ سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی۔ نظر کے سامنے پرنس کے اسٹوڈیو کا منظر گھوم گیا...... سامنے زارا کا اسکیچ بھی تھا۔

”میں تو لاہور میں ہوں...... کیا زارا نے ان کو گھر آنے پر مجبور کر دیا...... اس سارے قصے میں میرا کیا حصہ ہے؟“ وہ ابھی تک منجمد احساسات کے ساتھ سوچ رہی تھی۔ ایک نامانوس درد کی لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔

”لو...... خوشی کی بات کا آغاز تو ہوا...... لگتا ہے پرنس کی دادی تم سے بہت امپریس ہیں۔ پرنس کے تو پاپا کے ساتھ بزنس میں شیئرز ہیں...... ہمارے ہاں تو آج تک نہیں آئیں...... تمہیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں...... ظاہر ہے تم ان سے ملیں، باتیں ہوئیں...... اور وہ تمہارے گھر تک آنے پر رضامند ہو گئیں۔“

ماہین غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے یہ امر البتہ باعثِ حیرت تھا کہ سفینہ مسلسل اس کی طرف سے رخ پھیرے ہوئے تھی۔ وہ بڑی توجہ سے اس کی پشت کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ہوں...... آ جائیں تو ان کے آنے کی وجہ بھی پتا چل جائے گی...... اماں فون پر ہی بتا دیں گی۔“ سفینہ کو بھی اپنے غیر معمولی رویّے کا اندازہ ہو رہا تھا، وہ خود کو نارمل کرنے کی حتی الامکان کوشش کر رہی تھی۔

”میں تو سمجھ رہی تھی کہ تمہیں یہ خبر سنا کر تمہاری خوشی کی انتہا دیکھوں گی...... مگر تم نے تو بور کر کے رکھ دیا...... ایک دم ٹھس......“ ماہین نے کوفت سے منہ بنایا اور بیڈ پر اوندھ گئی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

''وہ آ رہی ہیں...... تم نے بس یہی تو بتایا ہے ناں...... ان کے آنے کی وجہ تو نہیں بتائی...... میں خواہ مخواہ خوشی سے ناچتی نظر آؤں...... کوئی عقل کی بات ہے۔'' سفینہ یہ کہتے ہوئے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''بھئی وجہ تو تب ہی پتا چلے گی جب وہ پہنچیں گی...... لگتا ہے کوئی سرپرائز دینے آ رہی ہیں۔'' اب ماہین کے لہجے میں شوخی بھی تھی اور شرارت بھی۔

''سرپرائز......!'' سفینہ کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔

''ہاں ہو سکتا ہے۔'' سفینہ نے ہیئر برش اٹھا کر یوں تولا جیسے مزید بات کرنے سے پہلے الفاظ تول رہی ہو۔

''میں تمہیں یہ نیوز فون پر بھی سنا سکتی تھی...... مگر سوچا...... گفٹ کے طور پر پیش کروں گی سارے راستے پیٹ میں درد ہوتا رہا۔''

''اب ٹھیک ہو گیا؟'' سفینہ نے خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کی...... اور زبردستی مسکرائی تھی...... مگر اب ماہین کی آنکھیں بند تھیں اس نے سفینہ کی مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ وہ جیسے پردے پر کوئی فلم دیکھنے میں محو تھی۔

''درد تو ختم ہو گیا...... مگر خبر سنا کر مزہ نہیں آیا...... کبھی، کبھی تو بہت بور کرتی ہو تم۔'' ماہین نے کہتے ہوئے کروٹ لی۔ ''اب تھوڑا سا سونے کی کوشش کروں گی...... ایسی تھرل دوڑ رہی تھی کہ سونے کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔''

''تم سو جاؤ...... مجھے فرزین سے نوٹس لینا ہیں...... ایک گھنٹے میں واپس آ جاؤں گی۔'' سفینہ نے یوں کہا جیسے کسی قید سے رہائی پائی ہو...... کھل کر سانس لی ہو۔

☆☆☆

''مجھے شاعری وغیرہ سے کچھ خاص دلچسپی نہیں ہے...... یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ اپنے ضروری کاموں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ کچھ دیر کے لیے اچھی سی کتاب کا مطالعہ کر لیا جائے۔'' تاجور بہت عام اور قدرے مہربان انداز میں شرمندہ، شرمندہ سی ساحل سے ہمکلام تھیں جو بڑی ہی شرمندگی ظاہر کرنے کی کوشش میں دُہرا ہوا جا رہا تھا۔

''لیکن جب کبھی موقع ملتا ہے میں تھوڑا بہت مطالعہ ضرور کرتی ہوں۔'' تاجور نے گلاس اٹھا کر ساحل کی طرف دیکھا اور دو چار گھونٹ پانی پی کر واپس رکھ دیا۔

''ایک مرتبہ میں نے جون ایلیا کی بہت مزے کی بات جانے کس کتاب میں پڑھی، ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا مگر بات اتنی سچی تھی کہ دل کو لگی اور یاد رہ گئی......'' تاجور نے بغور ساحل کی طرف دیکھا جو اندر سے سہما جا رہا تھا کہ تاجور جیسی مصروف خاتون بات کو اتنا طول کیوں دے رہی ہیں جو کہنا چاہتی ہیں کہہ کیوں نہیں دیتیں؟

''جون ایلیا کہتے ہیں یا کہہ گئے ہیں...... کہ ہم صبح سے شام تک ہزاروں باتیں کرتے ہیں...... اگر بولے گئے تمام الفاظ کو سمیٹ کر تولا جائے تو ان میں سے کام کے چند الفاظ ہی نکلیں گے...... باقی سب بکواس یعنی ہم لوگ کتنی بکواس کرتے ہیں اور بکواس کرتے تھکتے نہیں ہیں۔''

''واہ جھاڑ پلانے کا کیا کلاسک''...... اسٹائل ہے......'' ساحل نے شرمندگی کی انتہا پر گویا تاجور کو سراہا تھا۔

''ڈیوٹی ٹائم میں بکواس کرنا تو یوں بھی اخلاقی جرم ہے...... کیونکہ آپ کو اسی ٹائم کا pay کیا جاتا ہے۔''

''آئی ایم سوری میم...... ایسا روز نہیں ہوتا...... یہ اتفاق ہے۔'' ساحل نے وضاحت و معذرت کرنے کی کوشش کی مگر تاجور نے درمیان ہی میں ٹوک دیا۔

''یہ اتفاق ہی تو ٹرننگ پوائنٹس ہوتے ہیں مسٹر امیر الدین......'' تاجور ہمیشہ اسے اس کے نام سے مخاطب کرتی تھیں تخلص کو کبھی درخور اعتنا نہ جانا تھا نہ ان کے نزدیک تخلص کی کوئی اہمیت تھی۔

''ٹرننگ پوائنٹس؟'' ساحل نے گھبرا کر تاجور کی طرف دیکھا...... کیا وہ اس چھوٹی سی غلطی پر کوئی بڑا فیصلہ کرنے

جارہی ہیں؟ اس نے دم سادھ لیا...... نظر سے بھی سوال نہ کیا۔

''میں اپنے آفس میں یہ سب کچھ بھی پسند نہیں کروں گی...... میں اپنے ورکرز کو دوسروں سے زیادہ پے اس لیے کرتی ہوں کہ مجھے کام میں کوالٹی چاہیے۔ وقت ضائع کرنے والے لوگ کام نمٹاتے ہیں...... کوالٹی نہیں دیتے۔ میں تو آپ کی قابلیت دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ ہماری نئی فیکٹری چار، پانچ مہینوں میں پروڈکشن شروع کردے گی۔ اور وہاں اسٹاف ابھی مکمل نہیں ہے...... فیکٹری میرے گھر سے بہت فاصلے پر ہے، مجھے ایسا منیجر چاہیے جو مالک کی طرح اس فیکٹری کو وقت اور توجہ دے سکے۔''

اب ساحل نے حیرت سے نظر اٹھا کر تاجور کی طرف دیکھا تھا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا وہ اسے چارج شیٹ پکڑا کر خدا حافظ کہنے جارہی ہیں۔ یہاں تو ترقی دینے کی بات ہورہی تھی۔

''اس میں تو کوئی شک نہیں...... آپ میں بہت قابلیت ہے اور بے شمار لوگوں کی طرح آپ اپنی قابلیت کا صحیح استعمال نہیں کرتے۔'' نفاست سے طنز کیا گیا تھا جو اس نے اس کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا تھا۔ کیونکہ اب تو پروموشن کی باتیں ہورہی تھیں۔

''آپ مجھے موقع ضرور دیں...... تین ماہ میری پرفارمنس چیک کریں اگر میں آپ کی توقعات پر پورا نہ اتر سکوں تو اتنی اچھی جاب ڈیزرو ہی نہیں کرتا۔''

''گڈ...... آپ نے مجھے فیصلہ کرنے سے بچالیا...... ناامید کرنے کی صورت میں اپنے لیے خود ہی سزا بھی تجویز کرلی۔ یہاں آپ مجھے assist کررہے ہیں، وہاں آپ بااختیار منیجر ہوں گے...... آپ کو کمپنی سے کار، فیول، پانچ ہزار روپے فون کی مد میں تیس ہزار رینٹ بھی دیا جائے گا...... یہ ابھی کی بات ہے...... اگر فیکٹری سے وہ منافع ملنا شروع ہوگیا جس کی توقع کی جارہی ہے تو اس منافع میں آپ کو بھی شامل کیا جائے گا۔ یعنی آپ کوالٹی آف لائف کی طرف جائیں گے۔'' تاجور بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

ساحل کو اپنے کانوں پر یقین آکر نہیں دے رہا تھا...... موقع میسر نہیں تھا دل تو چاہ رہا تھا خود کو چٹکی کاٹ کر دیکھے کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔

''میم میری ساری بھاگ دوڑ کوالٹی آف لائف کے لیے ہے۔ مجھے ایسا گولڈن چانس ملے گا تو میں کیوں لوز کروں گا۔ موقع بار، بار تو نہیں ملتا...... اور پھر آپ نے اتنی بڑی بات کہہ دی کہ جو فیکٹری کو مالک کی طرح چلائے...... یہ تو بہت بڑا آنر ہے۔ میں یہ چانس ضرور avail کروں گا۔'' ساحل نے بہت پُرجوش انداز میں گویا کسی عہد نامے پر دستخط کیے تھے۔ اس وقت تو خوشی سے اس کی وہ حالت تھی کہ وہ وہاں سے بھاگ کر کسی کھلی فضا میں رقص کرنا چاہتا تھا۔ جس وقت سے اس کی طلبی ہوئی تھی...... خوف سے خون خشک ہورہا تھا۔ مگر اب صورتِ حال مختلف ہوچکی تھی۔

''ہمارے پارٹنر جاوید صدیقی صاحب آپ کو سارے معاملات سمجھائیں گے۔ شروع میں آپ ان ہی کی supervision میں کام کریں گے۔ جب آپ کام سمجھ جائیں گے تو پوری آزادی کے ساتھ اپنے اختیارات استعمال کریں گے۔''

''تھینک یو میم......'' بے پایاں مسرت کا احساس بے قابو کیے دے رہا تھا۔ اب اسے تاجور کے کمرے سے نکلنے کی جلدی تھی...... بہت دیر سے باوقار سنجیدہ شخصیت کا روپ دھارے، دھارے حالت غیر ہونے لگی تھی۔

''اب آپ اپنا کام کریں...... سیکنڈ ہاف میں ہمارے گروپ آف کمپنیز کے تمام منیجرز کے ساتھ ایک میٹنگ شیڈول ہے، اس میٹنگ میں آپ بھی ہمیں جوائن کریں گے...... یہ فرسٹ اسٹیپ ہوگا۔''

بظاہر ساحل جینٹل مین کے انداز میں کمرے سے رخصت ہوا...... درحقیقت سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا...... وہ خود کو یقین دلانے کی عجلت میں تھا کہ واقعی اس کے خوابوں کو تعبیریں ملنے کا وقت آگیا ہے۔

اس کے کمرے سے باہر جاتے ہی تاجور نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

”ایک توانائیوں سے بھرپور جوان کو ضائع ہونے سے بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ نئے لوگوں کو آزمانے سے بہتر ہے کہ اس صحت مند دماغ کو درست سمت میں چلنے کا موقع دوں......“ وہ خاصی پُرسکون نظر آرہی تھیں۔

اور اس سے آگے بھی کچھ سوچ رہی تھیں، دیکھ رہی تھیں، اسی لیے سونے کو کسوٹی پر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

”George Barnard Shah نے بہت خوب صورت بات کہی ہے۔ you see things, you say, why? but I dream things that never were, and I say why not?“ (آپ اشیا کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ کیوں ہیں یعنی ان کے ہونے کی وجہ پر سوال ہے اور میں تو ان اشیا کو دیکھ کر بھی جو صرف خواب میں دیکھیں، حقیقت میں کبھی نہیں دیکھیں کہتا ہوں کہ کیوں نہیں ہو سکتیں؟)

”خواب ہو یا حقیقت انسانی ذہن کی گرفت میں جو کچھ آ سکتا ہے۔ وہ زندگی کا حصہ ہے۔ زندگی کے محدود دائرے میں امکانات ہی تیر سکتے ہیں۔ جن امور یا اشیا کا تصور نہیں کیا جا سکتا وہ زندگی سے ماورا تو کچھ ہو سکتی ہیں۔ زندگی کا حصہ نہیں ہو سکتیں۔ جو کبھی سوچا نہیں ہوتا...... اچانک سامنے آجاتا ہے۔“ لیڈی صوفیہ ایک از خود رفتگی کی کیفیت میں دیوار گیر Painting پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پرنس سے مخاطب تھیں۔ پرنس اسٹوڈیو سے باہر آیا ہی چاہتا تھا کہ لیڈی صوفیہ وارد ہو گئیں اور یہ اطلاع دینے کے بعد کہ وہ حماد حسین سے اپنی خواہش کا اظہار کر چکی ہیں کچھ دیر بعد ان کا جواب متوقع ہے...... وہ سفینہ کے اچانک سامنے آنے اور اہمیت اختیار کرنے پر فلسفیانہ غور و فکر کر رہی تھیں۔

پرنس نے چور نگاہوں سے اس طرف دیکھا جہاں اس کے خیال میں زارا کا رف اسکیچ ابھی تک چھپا ہوا تھا اور وہ اپنے تئیں آخری کام کے طور پر اسے ضائع کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ لیڈی صوفیہ اسٹوڈیو میں چلی آئیں...... اس وقت اس کی ذہنی حالت ایسی تھی کہ وہ مسلسل اسکیچ کے خیال کے ہی حصار میں گھرا ہوا تھا۔ یوں بھی وہ جس وقت بھی دل کی طرف متوجہ ہوتا تھا...... اسے زارا کے رف اسکیچ کا خیال بہت شدت سے آتا تھا...... اس کی سمجھ سے بالاتر تھا کہ سفینہ کے دلنشیں تصور کے ساتھ اسے یہ رف اسکیچ کیوں یاد آنے لگتا تھا۔ اس کے خیال میں بہتر یہی تھا کہ اسے جلد از جلد ضائع کر دیا جائے۔

”شاید اسی لیے یہ مثل مشہور ہے کہ جو Couples جنت میں ساتھ تھے وہ دنیا میں آکر ایک دوسرے کو تلاش کرتے ہیں۔“ لیڈی صوفیہ دھیرے سے ہنس پڑی تھیں۔ مدت بعد ذرا کھل کر ہنسی تھیں تو اپنی جگہ پر قدرے لرزسی گئی تھیں اور اپنی چھڑی کو مضبوطی سے تھاما تھا۔

”آپ کو نظر نہ لگ جائے آج آپ بہت "energetic" فیل ہو رہی ہیں۔“ سفینہ کے ذکر سے نگاہ کے سامنے دور تک مرغزار کھل اٹھے تھے۔

اور اس سے بھی بڑی خوشی یہ تھی کہ گرینڈ مام خوش نظر آرہی تھیں۔ آج نہ انہوں نے دوسری جنگ عظیم کی کسی خاص یادداشت کو دُہرایا تھا، نہ نم آنکھوں سے اپنے محبوب مرحوم شوہر کی کسی ادا پر تبصرہ کیا تھا...... پرنس نے بھی انہیں مزید تر و تازہ کرنے کی کوشش کی...... یہ بہت خوشگوار تبدیلی تھی۔

”ہاں...... مجھے گنتی کے یہ چند لمحے مزید ملے ہیں...... مجھے موت سے کبھی خوف نہیں آیا...... موت کا تصور تو میرا دوست ہے...... میں تو اللہ سے یہی دعا مانگتی رہی ہوں کہ بس اتنا وقت ضرور مل جائے کہ میں تمہیں مکمل دیکھوں......“

”آپ کو جب ڈھیر ساری خوشی ملے گی تو عمر میں بھی خود بخود اضافہ ہوگا...... ابھی آپ میرے سامنے موت ووت کی باتیں نہ کریں......“

”ڈیئرسن...... موت ہی تو حقیقت ہے...... باقی سب فسانہ...... اور میری موت تو بہت ہی خوشگوار ہوگی انشاء اللہ...... کب کے بچھڑے کب ملیں گے...... جب ملیں گے تو ٹوٹ کر ملیں گے...... کبھی جدا نہ ہونے کے لیے ملیں گے...... کوئی ڈکٹیٹر ہمارے درمیان نہ ہوگا۔ ”نازی کتوں“ (جرمن فوج) کی پہنچ سے دور ہوں گے...... جہنم ان پر اس طرح حملہ آور ہوگی جس طرح یہ پولینڈ پر حملہ آور ہوئے تھے اور پوری دنیا کو آگ میں جھونک دیا تھا......“

وہی ہوا جس کا ہمیشہ خطرہ رہتا تھا...... خوشی کی انتہا پر اعلیٰ درجے کی قنوطیت (ڈپریشن) وہ اپنی جگہ کھڑی بید کی طرح لرزنے لگی تھیں۔

پرنس نے جلدی سے بزر کا بٹن پش کر کے انجیلا کو طلب کیا...... اور خود لیڈی صوفیہ کو تھام کر آرام دہ کرسی پر بٹھایا۔ وہ اپنی سانسوں کو مرتب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ آنکھیں بند تھیں۔ سلوٹوں سے پٹی پیشانی پر ننھی ننھی پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

اس نازک صورتِ حال میں بھی اس کے دل پر ہلکا سا دباؤ پڑا...... اور ذہن فوراً زارا کے اسکیچ کی طرف گیا۔

اس نے اسٹوڈیو کے داخلی حصے کی طرف دیکھا جہاں سے انجیلا نے نمودار ہونا تھا پھر اس طرف دیکھا جہاں اس کے خیال میں زارا کا اسکیچ شیٹس کے نیچے ابھی تک دبا ہوا تھا...... انجیلا اپنے مستعد انداز میں چلتی ہوئی اندر آچکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تازہ جوس کا گلاس تھا جو فیروزے اور زرقون سے مرصع چاندی کی کشتی میں رکھا گیا تھا...... اس نے گلاس ٹیبل پر رکھا اور لیڈی صوفیہ کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔

"are you ok mam?" وہ بہت شائستگی سے انہیں متوجہ کر رہی تھی...... پرنس بغور دیکھ رہا تھا...... لیڈی صوفیہ نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔

"ok just fine" وہ پرنس کی طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکرائیں۔

”تم نے دیکھا موت اور زندگی کے درمیان کتنا فاصلہ ہے...... اتنا کہ سوئی کی نوک رکھنے کی جگہ نہیں...... oh my God...... میں پھر واپس آگئی...... تمہارے لیے، سفینہ کے لیے...... my beloved Safeena......“ انہوں نے سفینہ کے لیے ہوائی بوسہ ارسال کیا۔

یہ اسکیچ ابھی تک اس نے ضائع کیوں نہیں کیا؟ کیوں ذہن بار، بار اس طرف جا رہا ہے...... یہ بھی کوئی یاد رکھنے یا یاد آنے والی بات ہے...... وہ بھی ان خوب صورت لمحات میں......؟

انجیلا نے فریش جوس لیڈی صوفیہ کو پلانا شروع کر دیا تھا...... بالکل اسی طرح جیسے بچے کو نیا، نیا گلاس سے پانی پلانا شروع کرتے ہیں۔

اس نے ایک گم صم نظر دونوں پر دوڑائی پھر نرم روی سے چلتا اسٹوڈیو کے اس حصے کی طرف گیا جہاں اس کے خیال میں زارا کا اسکیچ چھپا ہوا تھا۔ اس نے شیٹ اٹھا کر دیکھا وہ اسکیچ وہاں نہیں تھا۔ اس نے عجب وحشت زدہ انداز میں شیٹوں کے نیچے اِدھر اُدھر اسے تلاش کرنا شروع کر دیا لیکن اسکیچ وہاں ہوتا تو ملتا۔ اس وقت اس کی عجب کیفیت ہو رہی تھی وہ اس بات سے بھی خوف زدہ تھا کہ کہیں وہ اسکیچ لیڈی صوفیہ کے ہاتھ تو نہیں لگ گیا تھا۔ بالآخر وہ اسکیچ کی تلاش کی کوشش میں ناکام ہو کر بے حال سے انداز میں اپنی مخصوص نشست پر آبیٹھا اس نے آنکھیں موند لیں اور سر کرسی کی پشت سے ٹکالیا۔ یکا یک اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اس نے فوراً آنکھیں وا کیں سامنے انجیلا، لیڈی صوفیہ کی ناز برداری میں مصروف تھی۔ وہ جھماکا اس کی یادداشت کا امتحان تھا۔ اسے یاد آ گیا کہ زارا کا مطلوبہ اسکیچ جو وہ ڈھونڈ، ڈھونڈ کر بے حال ہو چکا ہے، اسے تو وہ کب کا ضائع بھی کر چکا۔ اس نے ایک گہری سانس بھری مگر اگلے ہی لمحے وہ اپنی یادداشت کی کمزوری پر حیرت زدہ تھا کہ کیا اس کی یادداشت اس حد تک جواب دے چکی ہے کہ اپنے ہاتھوں ٹکڑے، ٹکڑے کر کے ڈسٹ بن میں ڈالنے والا اسکیچ وہ پاگلوں کی طرح تلاش

کررہا تھا۔ جس دن سے سفینہ اپنے بدلے ہوئے انداز یہاں سے لے کر گئی ہے اسے لگتا تھا کہ وہ اپنا دل ودماغ کہیں رکھ کر بھول گیا ہے۔

جیسے کوئی طلسم تھا جس نے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا...... طبیعت کے بوجھل پن میں کمی ضرور واقع ہوئی مگر مکمل چھٹکارے کا احساس نہیں ملا تھا...... وہ روحانی مسرت جو اوسان کو ہمیشہ پُرسکون اور درست رکھتی تھی اس کی بہت کمی محسوس ہورہی تھی۔

☆☆☆

''ابھی میں نے کچھ فیصلہ نہیں کیا...... کیونکہ مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ لیڈی صوفیہ ہمارے گھر آئیں اور سفینہ موجود نہ ہو...... کیونکہ وہ سفینہ کے حوالے ہی سے اس کی ماں یعنی مجھ سے ملیں گی۔''

تاجور، زارا سے تازہ ترین صورتِ حال پر اظہارِ خیال کررہی تھیں قطع نظر اس کے کہ اس وقت زارا کی کیا کیفیت ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں کافی کا مگ تھا، دوسرے سے وہ فرائز کھارہی تھی...... وہیں رک گئی...... تاجور نے جو کہا اسے سماعت کا دھوکا لگا۔

''میں نے حماد حسین سے کہہ دیا تھا کہ اپنا شیڈول دیکھ کر ہی کچھ کہہ سکتی ہوں...... بہت ڈبل مائنڈ ڈ ہورہی ہوں۔'' تاجور نے خاصے وقفے کے بعد چائے کا گھونٹ بھرا...... تاجور نے آج روز کے معمولات ضرور نمٹائے تھے مگر اضافی کام کرنے کا بالکل موڈ نہیں بنا اور ذرا جلدی گھر آگئی تھیں۔

''آپ پرنس شہپر کی گرینڈ مدر کی بات کررہی ہیں؟'' زارا کا سکتہ بڑی مشکل سے ٹوٹا۔

''اسٹوپڈ تم اس وقت in نہیں ہو...... کہاں پہنچی ہوئی ہو......؟'' تاجور کو بہت ہی کوفت ہوئی...... وہ تو ویسے بھی کم گو تھیں بلاضرورت بات ہی نہیں کرتی تھیں اب بڑے اہتمام سے بیٹی سے share کرنے بیٹھیں تو یہ ردِعمل ظاہر ہوا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا اماں...... وہ لوگ ہمارے گھر کیوں آرہے ہیں؟''

''آ نہیں رہے...... آنا چاہتے ہیں۔''

''ویسے تو اگر کسی کا لڑکا شادی کے قابل ہوتا ہے تو ہر لڑکی کو خاص نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جوڑ بنانے کی کوشش رہتی ہے...... ہوسکتا ہے، سفینہ ان کو پسند آگئی ہو اور وہ اس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہ رہی ہوں...... possiblities تو یہی بن رہی ہیں۔'' تاجور نے جو کچھ کہا...... زارا کو سننا پڑا...... اس لیے کہ کان کھلے ہوئے تھے بہری نہیں تھی وہ مگر اندر دبکے ہوئے انا کے کوڑیا ناگ نے پوری قوت سے لہرا کر دل پر ڈنک مارا...... بڑی عجیب صورت حال ہورہی تھی...... ماں کے سامنے ایک بہن کا ردِعمل دینا بھی ازبس ضروری تھا اور خود پر قابو پانا بھی محال تھا۔

''شاید اسی وجہ سے وہ سفینہ کی غیر موجودگی میں بھی آنے کو تیار ہیں...... خاندانی اور بہت معزز ہیں...... مگر لائف اسٹائل کا فرق بھی بہت ہے...... اس موقع پر مجھے پرنس ڈیانا یاد آرہی ہے...... جس نے پروٹوکول لائف سے تنگ آکر تاج وتخت ٹھکرادیا تھا...... حد سے زیادہ پابند زندگی برداشت کرنا آسان نہیں ہے۔''

''بات یہاں تک پہنچ گئی۔ اماں تو شادی، رخصتی، ڈیانا، لیانا، پتا نہیں کیا کیا سوچنے لگیں۔ نہیں نہیں...... پرنس تو میرا آئیڈیل ہے...... سفینہ کو اس سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے۔ وہ تو اس فیملی سے کانٹیکٹ میں نہیں ہے۔ فون نمبر تک نہیں ہے اس کے پاس۔'' وہ بہت کچھ برداشت کرتی آرہی تھی...... اپنی خامیوں کو خامیاں ہی نہیں گردانتی تھی۔ بس ماں سے شکوہ کناں ہی رہتی تھی کہ وہ سفینہ کو ہر معاملے میں فوقیت واہمیت دیتی ہیں۔

''عجیب الجھن میں پڑگئی ہوں...... وہ آنا چاہ رہی ہیں، میں انہیں سفینہ کا انتظار کرنے کا بولوں...... جبکہ حماد حسین کہہ رہے تھے وہ لیڈی صاحبہ کو بتاچکے ہیں کہ سفینہ لاہور جاچکی ہے۔''

اندر بادِ سموم کے جھکڑ چل رہے تھے۔ پوری ہستی ہل کر رہ گئی تھی۔

''سب کچھ سفینہ ہی کو ملے...... پرنس بھی۔'' اس کے ناپختہ ذہن نے تاریک اور گہری کھائیوں میں چھلانگ لگا دی۔

''اماں ...... لیڈی صاحبہ کو آنے دیں...... وہ اپنی will سے آرہی ہیں تو آنے دیں، ایک بار آئیں گی تو کیا دوسری بار نہیں آئیں گی۔ میں ان کو بہت اچھی طرح انٹرٹین کروں گی...... اتنا شاندار گیسٹ ہمارے گھر آئے گا تو ہم کتنا انجوائے کریں گے۔ آپ ضرور انوائٹ کریں...... honestly میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی انہیں بور نہیں ہونے دوں گی۔ میں فائن آرٹس کی اسٹوڈنٹ ہوں...... میں بہت اچھی کمپنی دے سکتی ہوں۔ آفٹر آل پرنس آرٹسٹ بندہ ہے۔ فیمس پینٹر...... (مشہور مصور) ہے۔'' زارا ایک دم بہت پُرجوش ہوگئی تھی...... حیرت و تفکر، بے چینی، الجھن کی کیفیات سے باہر آچکی تھی...... بلکہ بہت مطمئن اور خوش نظر آرہی تھی۔

''ہوں...... سفینہ تو ویسے بھی شاید دو ماہ تک نہیں آئے گی...... اب اتنا طویل انتظار کرانا بھی معقولیت نہیں۔ میں حماد حسین کو کہہ دیتی ہوں کہ وہ کل کا رکھ لیں۔''

''حماد انکل اور آنٹی بھی آئیں گے اماں......؟'' زارا نے بے ساختگی سے سوال کیا تھا یوں جیسے ان کا آنا اس پر بوجھ بنے گا۔

''شیور وہی تو ان دونوں کو لے کر آئیں گے...... آخر تعارف تو انہوں نے ہی کرانا ہے...... میری تو ان سے یہ پہلی ملاقات ہوگی۔''

''ماہین تو شاید ابھی یہیں ہے اماں...... پھر تو وہ بھی ضرور آئیں گی......'' زارا کو کچھ متوقع ناگواریاں تنگ کرنے لگیں۔

''نہیں، وہ چلی گئی ہے۔''

''اوہ......'' زارا کو یہ چند الفاظ بہت ہی پسند آئے...... ہلکی پھلکی سی ہو کر مسکرائی۔

''چلو ٹھیک ہے پھر میں حماد حسین کو فون کر کے کنفرم کر دیتی ہوں......'' وہ سوچتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں...... غالباً اب وہ ڈنر کی تیاری سے متعلق سوچنے لگی تھیں۔ زارا ان سے پہلے اٹھ کر تقریباً بھاگتی ہوئی اپنے بیڈروم میں آگئی۔ اور بڑے پیار سے پرنس کی تخلیق کردہ پینٹنگ پر ہاتھ پھیرا......

''اب مزہ آئے گا۔ تمہیں تھینکس تو بولوں گی سفینہ...... تصویر میں لائی تھی مصور کو تم لا رہی ہو۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔

چھوٹی سی عمر میں بڑی، بڑی خواہشیں...... لمبی، لمبی امیدیں...... جاگتے میں خواب...... ذہانت کو عیاری میں بدل دیتے ہیں۔

وہ سفینہ سے عمر میں تقریباً چار سال چھوٹی تھی۔ مگر صفت عیاری سے متصف ہونے کے باعث چالیس سال بڑی تھی۔

ابھی اس اعلیٰ درجے کی منفی خصوصیت کا ادراک شاید اسے خود بھی نہیں تھا۔ جو دل کہتا ہے...... وہ چاہیے، اس سے زیادہ دماغ کو مداخلت کی اجازت نہیں تھی کہ بس وہ خواہش پوری کرنے کے راستے سلجھائے دونوں کے حیاتیاتی اجزائے ترکیبی میں نفس و روح کا واضح فرق تھا......

نفس اپنے سوا کچھ نہیں دیکھتا......

روح سارا عالم اپنے اندر دیکھتی ہے......

(جاری ہے)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

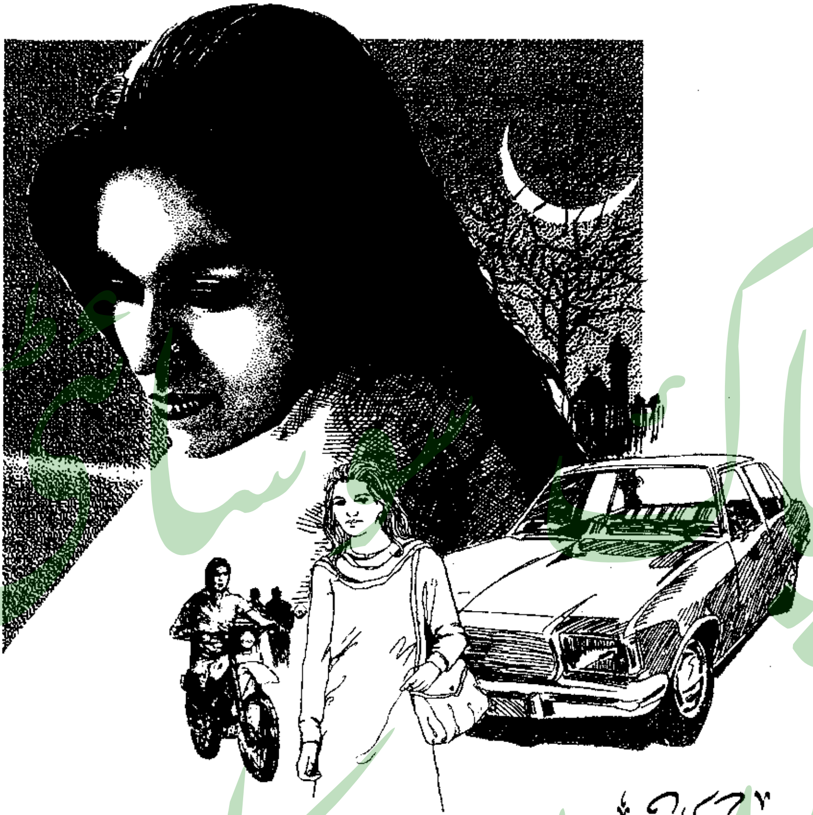

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اماں کی عید

رضوانہ پرنس

"ہالہ دیکھو تو سہی اماں کتنی دیر سے تمہیں پکار رہی ہیں، تم پتا نہیں کہاں بزی ہو۔" سرمد کے پکارنے پر ہالہ نے جلدی سے آخری روٹی توے سے اتار کر ہاٹ پاٹ میں رکھی اور پسینہ پونچھتی ہوئی باہر آ گئی۔

"کہاں رہ گئی تھیں یار، اماں کا ذرا بھی خیال نہیں تمہیں۔" سرمد نے بہت جھنجلا کر اسے دیکھا تو ہالہ کا دل بجھ سا گیا۔ گویا اس نے اس کی حالت نظر انداز

اماں۔

کر دی تھی۔

''آپ دیکھ نہیں رہے میں کچن سے نکل کر آ رہی ہوں، روٹیاں پکا رہی تھی۔'' سرمد نے اس کا تپا ہوا لہجہ نوٹ کیے بغیر اسے طنزیہ نظروں سے گھورا۔

''تم زبردستی ہر کام اپنے اوپر کیوں لاد لیتی ہو ہالہ...... ماسی سے پکوانے میں آخر کیا قباحت ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تمہیں سگھڑ بیوی بننے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔''

''کیا کروں محبوبہ تو میں اب رہی نہیں، سوچتی ہوں سگھڑ بیوی بن کر ہی شاید مجھے آپ کی تھوڑی سی محبت مل جائے۔'' آنسو پیتے ہوئے اس نے بہت ہی ضبط کے ساتھ جواب دیا اور اماں کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

ہالہ اور سرمد کی لو میرج تھی۔ بڑا ہی طوفانی قسم کا عشق ہوا تھا دونوں کو ایک دوسرے سے...... ہالہ سوچتی تھی کہ اگر سرمد نہ ملا تو شاید وہ جی نہ پائے گی جبکہ سرمد کی تو سانس ہی رکنے لگتی تھی یہ سوچ کر کہ خدانخواستہ ہالہ کسی اور کی نہ ہو جائے۔ لیکن مسئلہ تھا اسٹیٹس کا...... ہالہ کے ڈیڈی ایک بہت بڑی مشہور فرم میں جنرل منیجر تھے۔ کراچی کے سب سے پوش علاقے میں وہ اپنے خوب صورت بنگلے میں بڑی پرتعیش زندگی گزار رہی تھی۔ اس سے چھوٹی ایک بہن اور پھر سب سے چھوٹا ایک بھائی تھا جو گھر بھر کا لاڈلا بھی تھا۔ ہالہ اپنی چھوٹی سی فیملی میں مگن رہنے کے ساتھ، ساتھ اپنی دو بے حد کلوز فرینڈز بینش، اور انعم سے بھی دور نہیں رہ پاتی تھی۔ ہر ویک اینڈ ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی پروگرام بنانا لازمی ہوتا۔ بڑی خوب صورت اور بے فکری کی زندگی تھی اس کی۔ لیکن کبھی، کبھی انسان کو پتا بھی نہیں چلتا اور وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی میٹھی شہد جیسی زندگی میں ڈھیر سارا نمک گھول دیتا ہے۔ ایسا ہی کچھ ہالہ کے ساتھ بھی ہوا۔ سرمد سے اس کی پہلی ملاقات بہت فلمی انداز میں ہوئی اور وہ ویسے بھی فلموں اور ڈراموں کی کچھ زیادہ ہی شیدائی تھی۔ اسے اپنی زندگی کا رنگین سا موڑ جیسے خوابوں کی دنیا میں لے گیا۔ اپنا آپ اسے کسی ہیروئن۔ سے کم محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ اس دن اس کا ڈرائیور چھٹی کر گیا۔ عرفان صاحب فرم کی کسی میٹنگ کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہوئے تھے اور اس کو انعم کی سالگرہ میں بہرحال جانا ہی پڑا جو اسی شام میں تھی۔ پھر امی کی بہت خوشامد کرنے کے بعد بالآخر اسے خود کار چلا کر جانے کی اجازت مل ہی گئی۔ بات یہ نہیں تھی کہ امی نیرو مائنڈڈ تھیں بس آج کل کے حالات نے انہیں کافی خوفزدہ کیا ہوا تھا۔ چونکہ انعم کا گھر زیادہ دور نہیں تھا، اس لیے بھی امی نے زیادہ فکرمندی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

وہ ڈیک پر خوب صورت سا گیت سنتے ہوئے بڑی سُبک رفتاری سے کار ڈرائیو کر رہی تھی کہ اچانک ہی کار ایک دھچکے سے رک گئی۔ پہلے تو اسے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ آخر یہ ہوا کیا ہے۔ تبھی موٹر سائیکل پر سوار ایک نوجوان اس کے پاس آ کر رکا وہ جو کچھ پریشانی اور ہراساں سی کار اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہی تھی.... ایک موٹر سائیکل سوار کو جو یوں اپنی کار کے پاس رکتے دیکھا تو اس کا ننھا سا دل خوف سے دھک، دھک کرنے لگا اور ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔ کتنے ڈھیر سارے قصے سن رکھے تھے، اس نے ایسے موٹر سائیکل والوں کے جو لوٹ مار کرنے کے ساتھ، ساتھ گولی مارنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ تبھی جب بہت آہستگی کے ساتھ اس نوجوان نے اپنا ہیلمٹ اتارا تو وہ ایک لمحے کو جیسے کسی ٹرانس میں آ کر یک ٹک اسے دیکھتی رہ گئی۔

سیاہ گھنے بال ہیلمٹ کے اترتے ہی اس کی پیشانی پر بکھر آئے تھے۔ وہ اپنی بڑی، بڑی سحر انگیز آنکھیں اس کے چہرے پر جمائے نہ جانے کیا پوچھ رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا پھر جلدی سے اپنے حواسوں میں واپس آتے ہوئے اس نے غور سے سننے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ وہ اس کی پرابلم کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

"توبہ کتنی زیادہ کشش ہے اس شخص کے چہرے پر کہ بندہ اپنے حواس سے ہی بیگانہ ہوجائے۔" دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اس نے کچھ گھبرا کر جواب دیا۔

"پتا نہیں میری کار کو کیا ہوگیا ہے، چلتے چلتے ایک دم بند ہوگئی۔"

"ٹھیک ہے مس گھبرائیں نہیں، میں انجن چیک کرلیتا ہوں۔" نوجوان نے بڑے مہذب انداز میں اس سے کہا تو وہ کچھ شرمندہ سی ہوگئی۔ پھر جتنی دیر وہ بونٹ پر جھکا خرابی دور کرنے کی کوشش کرتا رہا وہ بہت مطمئن سی سیٹ پر بیٹھی رہی۔ ڈر کہیں دور غائب ہوگیا تھا اور ایک خوب صورت سے تحفظ کے حصار میں وہ اپنے آپ کو مقید تصور کررہی تھی۔

یہ تھی ان کی پہلی خالصتاً فلمی ملاقات جو ان کے ہمیشہ کے لیے ایک ہوجانے کی موجب بنی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے سیل نمبر لیے..... فون پر باتوں کا سلسلہ شروع ہوا جو آہستہ آہستہ ملاقاتوں میں بدلتا گیا۔ دونوں کا اس بات پر پختہ ایمان تھا کہ ڈرائیور کی بیماری اور کار کا خراب ہونا دراصل قدرت کا ان دونوں کو ملوانے کا ایک بہانہ تھا۔ ورنہ بھلا کیسے دو اجنبی یوں حیرت انگیز طریقے سے ایک دوسرے سے مل سکتے تھے۔ دونوں نے ہی قدرت کے اس فیصلے کو کچھ ایسے اپنی محبت کی شدت میں سمویا کہ پھر راہ میں حائل رکاوٹوں کی بھی پروا نہیں کی۔ سرمد نے ہالہ کو اپنے بارے میں ہر بات بہت سچائی سے بتادی تھی۔ وہ مقامی بینک میں منیجر تھا۔ گلشن اقبال کے ایک درمیانے درجے کے فلیٹ میں اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ ایک مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ اس کا ایک ہی بھائی تھا عدیل جسے خوش قسمتی سے دبئی میں کافی اچھی جاب مل گئی تھی۔ اور پھر وہیں اسے ایک لڑکی پسند آگئی۔ اماں اور بھائی کی اجازت سے وہیں اس نے شادی کرلی تھی جس میں اماں اور سرمد نے بھی شرکت کی تھی۔ ٹکٹ اور ویزے کا بندوبست عدیل نے ہی کیا تھا کہ اپنی اماں اور بھائی کے بغیر شادی کرنے کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ سرمد اور اماں کو شیبا اور اس کے گھر والے بہت پسند آئے تھے خاص طور پر اماں تو بہت مطمئن اور خوش واپس لوٹی تھیں۔ پھر ہالہ کی ایما پر سرمد اپنی ماں کے ساتھ ہالہ کے والدین سے ملا۔ سرمد صاحب کو تو بظاہر اس رشتے میں کوئی خاص خرابی نظر نہیں آئی سوائے اس کے کہ ان کے اور سرمد کے اسٹیٹس میں نمایاں فرق تھا۔ لیکن انہوں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی البتہ شاہینہ یعنی ہالہ کی امی کو یہ ہی فرق کافی گراں گزرا تھا۔ اپنی ہونے والی سمدھن سے.. بھی وہ بالکل امپریس نہیں ہوئیں۔ بہت ہی سیدھی سادی سی خاتون تھیں وہ...... جن کے لباس سے بھی انہیں غربت ٹپکتی محسوس ہورہی تھی۔ لیکن پھر بیٹی کے آنسو اس کی ضد اور بھوک ہڑتال نے انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیا۔ اور یوں ہالہ دلہن بن کر سرمد کے چھوٹے سے فلیٹ میں اور اس کی.... بے رنگ زندگی میں ایک جگمگاہٹ بن کر آگئی۔

نئی نئی شادی کا خمار تھا۔ ہالہ کو تو یہ چھوٹا سا فلیٹ بھی جنت کا ایک ٹکڑا سا لگتا تھا۔ ساس بھی بہت اچھی لگ رہی تھیں اور اپنے من چاہے ساجن کا ساتھ تو جیسے ہر دم اسے خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولا جھلائے رکھتا۔ البتہ اس کی عزیز از جان دوستوں کو سرمد تو بالکل ایک ہیرو جیسا ہی لگا لیکن انہیں اس کا فلیٹ بالکل نہیں بھایا۔

"یار تم سرمد بھائی سے کہو ناں کہ وہ ڈیفنس یا کلفٹن میں کوئی اچھا سا اپارٹمنٹ لے لیں، سچ بہت دور ہوگئی ہو تم ہم لوگوں سے اور پھر یہ فلیٹ اتنا چھوٹا سا ہے ہم freely ہنس بول بھی نہیں سکتے۔ لگتا ہے جیسے تمہاری ساس سر پر بیٹھی ہماری باتیں سن رہی ہیں۔" اس دن بینش نے بیزار ہوکر سرگوشی میں جب یہ بات ہالہ سے کہی تو وہ بے ساختہ ہنس دی۔

"اُفوہ، تم تو ہتھیلی پر سرسوں جمارہی ہو۔ ابھی میری شادی کو ایک ہی ماہ تو ہوا ہے۔ بھئی انشاء اللہ میں آہستہ آہستہ سرمد کو ذہنی طور پر یہاں سے شفٹ ہونے پر تیار کرلوں گی۔" لیکن ایسا ہوا نہیں...... اماں

کے سب قریبی رشتے داران کے آس پاس ہی قیام پزیر تھے۔ ہالہ نے ایک بار باتوں، باتوں میں یونہی شفٹ ہونے کا خیال ظاہر کیا تو اماں ہتھے سے ہی اکھڑ گئیں۔

"آئے ہائے میں تو مر کر بھی ڈیفنس میں نہ رہوں، قسم سے ہالہ مجھے تو وہ زندوں کا قبرستان لگتا ہے۔ ہر طرف ایک ہو کا عالم نظر آرہا ہوتا ہے۔ سب اپنے بڑے، بڑے بنگلوں کے اندر مست مگن رہتے ہیں، پڑوس میں کون ہے کیسا ہے، جی رہا ہے یا مر رہا ہے کچھ خبر نہیں ہوتی۔ ارے یہاں کی رونقیں دیکھو، کبھی دل گھبرا نہیں سکتا تمہارا۔ اور پھر میرے سب رشتے دار یہاں پر قریب، قریب ہیں۔ وہاں اتنی دور کون آئے گا مجھ سے ملنے۔ ارے مجھے جیتے جی مرنے کا کوئی شوق نہیں۔" اتنا لمبا لیکچر سننے کے بعد اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا کہ کبھی اماں کے سامنے ڈیفنس کا نام تک ہونٹوں پر نہیں لائے گی لیکن سرمد کا بہر حال وہ برین واش کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھائے رکھتی تھی لیکن وہ بھی جیسے اماں کی ہی زبان بولنے لگتا۔ اس سلسلے میں تو بہت ہی ذہنی مطابقت تھی دونوں ماں، بیٹے میں...... لیکن پھر بھی ہالہ ہمت نہیں ہار رہی تھی۔ پتھر پر مسلسل پانی پڑتا رہے تو آخر اس میں بھی سوراخ ہو ہی جاتا ہے اور وہ اسی محاورے پر کاربند تھی۔ محبت اور نئی، نئی شادی کا خمار بتدریج اترتا جارہا تھا۔ سرمد محبوب کے درجے سے اتر کر اب ایک ٹیپکل شوہر کے روپ میں اسے کبھی حیران سا کردیتا۔ وہ خوب صورت جملے، وہ وارفتگی سب نہ جانے کہاں کھو گئے تھے۔ لو میرج جس زور شور سے کی تھی جب اس محبت کے حسن پر زندگی کی اصل حقیقتوں کا بھیانک عکس پڑنے لگا تو اسے اپنی امی کی نصیحتیں یاد آکر جیسے پچھتانے پر مجبور کرنے لگیں۔ جس زمانے میں وہ سرمد کے عشق میں پاگل ہو رہی تھی انہی دنوں میں مسز جلیل اپنے لندن ریٹرن بیٹے کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ امی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسی دن ہالہ کا نکاح عاطف سے کردیں کہ عاطف دوبارہ لندن سیٹل ہونے جارہا تھا اور مسز جلیل اسے اس بار اکیلے نہیں بھیجنا چاہ رہی تھیں۔ امی نے کیسے، کیسے حسین نقشے کھینچے تھے لندن کی زندگی کے...... وہاں کی رنگین اور حسین فضاؤں کے لیکن اس کے سر پر تو سرمد کے عشق کا بھوت سوار تھا۔ اسے سوائے سرمد کے نہ کچھ نظر آتا تھا اور نہ کچھ سوجھتا تھا۔ بس وہ یہی سمجھی تھی کہ اگر سرمد اسے نہ ملا تو وہ مر جائے گی اور جب سرمد ہمیشہ کے لیے اسے مل گیا تو جیسے جینے کا مزہ ہی نہیں آرہا تھا۔ بڑی لگی بندھی اور خشک سی زندگی گزار رہی تھی وہ۔ یہ نہیں تھا کہ سرمد کی محبت میں کوئی کمی آئی تھی لیکن ہالہ کو تو اسی محبوب کی کمی ستاتی رہتی جو اس کی آنکھوں میں ڈوب کر شاعرانہ باتیں کیا کرتا تھا۔ لیکن اب تو زیادہ تر اس کی گفتگو مہنگائی، اماں کی بیماری، آفس کی ٹینشن اور ایسے ہی دوسرے مسئلے مسائل کے گرد گھوما کرتی۔ کبھی کبھار اگر اس کے اندر وہ ہی پرانا سرمد جاگ اٹھتا بھی تو اماں کی پکار پر وہ اپنے خوب صورت جملوں کو ادھورا چھوڑ کر جی اماں کہتا ہوا ان کے کمرے کی طرف لپک جاتا اور وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔ ابھی کچھ دن پہلے اماں نے بڑی دل گرفتگی کے ساتھ اسے بتایا تھا کہ "سرمد کو بچپن سے صرف یہی شوق تھا کہ وہ اپنی بیوی کے ہاتھ کی پکی ہوئی گرم، گرم روٹیاں کھائے گا۔"

"بچپن سے......؟" ہالہ نے بہت حیرت سے پوچھا۔

"اے ہاں تو اس میں حیرانی کی کیا بات ہے، جب میں اس کے ابا کو کھانے کے ٹائم تازہ روٹیاں بنا کر دیتی تھی تو وہ بڑی معصومیت سے کہتا تھا کہ میری بیوی بھی مجھے روٹیاں پکا کر کھلائے گی۔" اماں نے برا مان کر وضاحت سے بتایا تب نہ جانے کیوں اسے ان روٹیوں میں ہی کچھ پیارے سے رنگین لمحے چھپے ہوئے نظر آئے۔ جب وہ اپنی چھن، چھن کرتی چوڑیوں کے ساتھ روٹی پکا رہی ہوگی تو اپنی من چاہی خواہش پوری ہوتی دیکھ کر وہ اپنی آنکھوں میں پہلے جیسی وارفتگی سمو کر اس کے کانوں میں کوئی شوخ سی پیار بھری سرگوشی کرے گا اور وہ آٹے بھرے ہاتھوں سے اسے پرے

دھکیل دے گی...... دو تین دن اس نے خاموشی سے ماسی سے روٹیاں پکانے کی ٹریننگ لی تھی اور آج سنڈے والے دن کچن میں روٹیاں بناتے ہوئے کتنی بار اس نے دروازے کی جانب دیکھا تھا لیکن اس بے مہر نے ایک بار بھی کچن کا رخ نہیں کیا تھا بلکہ اس وقت روٹیاں پکانے پر اسے بلاوجہ سنا بھی دی تھیں۔ وہ کچھ الجھی ہوئی سی اماں کے کمرے میں آ گئی۔

”آپ تو کہہ رہی تھیں سرمد کی بچپن سے خواہش تھی بیوی کے ہاتھ کی پکی روٹیاں کھانے کی۔“ اس نے بہت روہانسی آواز میں ان سے پوچھا تو وہ اسے دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دیں جو پسینے میں شرابور انہیں شکوہ کناں نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”ارے تو میں نے یہ کب کہا تھا کہ جون کے چلچلاتے مہینے میں تم اس کا یہ شوق پورا کرنے کھڑی ہو جاؤ...... سردیوں تک کا انتظار کر لیتیں۔“ اماں کے جواب پر وہ تپ کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ سرمد موبائل کانوں سے لگائے مسکراتا ہوا... اندر آ گیا۔

”لو عدیل تم خود ہی اماں کو یہ خوش خبری سنا دو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے سیل اماں کو تھما دیا۔ ہالہ نے سوالیہ نظروں سے سرمد کی جانب دیکھا تو وہ خوشی سے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ بولا۔ ”عدیل اور شیبا عید کرنے پاکستان آ رہے ہیں۔“

عدیل کے آنے کی خبر سن کر جہاں سرمد اور اماں بہت خوش تھے وہاں ہالہ کو بھی کافی ایکسائٹمنٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اسے شیبا اور عدیل سے ملنے کا شوق بھی بہت تھا۔ کیونکہ اس کی شادی کے دنوں میں اتفاق سے شیبا کے پاؤں میں فریکچر ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی عدیل کی فرم میں بھی کچھ مسئلوں میں گھری ہوئی تھی جس کی وجہ سے دونوں ہی میاں بیوی شادی میں شریک ہونے سے رہ گئے تھے سو اب ان کے آنے کی خبر نے جیسے سارے گھر میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑا دی تھی۔ تین چار دن بعد رمضان شروع ہونے والے تھے۔ اور ان لوگوں کی آمد پچیس رمضان تک متوقع

خواب سراب
عشق کی جنوں خیزیوں میں اٹھنے والے انتہائی قدم کا لرزہ خیز انجام...... آخری صفحات پر **ناہید سلطانہ اختر** کی سوغات
سیوا سے سنبھا تک
مختلف تاریخی ادوار کے بکھرتے رنگوں کا احاطہ کرتی ایک اور خوبصورت تحریر...... **ڈاکٹر ساجد امجد** کے قلم کی روانی
باغی
مثبت اور منفی رویوں کے درمیان دلچسپ معرکہ آرائی...... خوبصورت پیار کے رشتوں کے درمیان علم بغاوت بلند کرنے والے رویوں کی انوکھی داستان...... ایک یادگار تحفہ
وقت
وقت کی بھول بھلیوں اور چال چلن کا قصہ...... وہ جو اپنے مرکز سے ہٹ کر ایک نئی دنیا کی تلاش میں چل نکلا ہے...... دیکھیے قسمت اسے کہاں لے جاتی ہے۔ **حسام بٹ** کے قلم سے خوبصورت داستان

اگست 2017ء کا شمارہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
مزید
خطوط کی محفل، محفل شعر و سخن اور ملک صفدر حیات کی تفتیش
ان سب کے علاوہ
منظر امام۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید۔ زویا اعجاز۔ تنویر ریاض۔ سلیم انور اور علی اختر کی دلچسپ تحریریں آپ کی منتظر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

تھی۔ شادی کے بعد یہ ہالہ کی پہلی عید آرہی تھی۔ اور اتفاق سے شیبا کی بھی اپنے سسرال میں یہ پہلی ہی عید تھی۔ سو اماں کی خوشی دیدنی تھی۔ گھر میں ایک خوشگوار سی فضا بکھری ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ اماں نے اسی وقت ہالہ سے کل شاپنگ پر جانے کا پروگرام طے کرلیا کہ رمضان میں وہ گھر سے بہ مشکل تمام ہی نکلتی تھیں۔ اس کے علاوہ عدیل کا کمرا بھی تو سیٹ کرنا تھا۔ جس کے لیے نئی بیڈ شیٹ اور پردوں کے علاوہ کچھ اور ضروری چیزیں بھی خریدنا تھیں اور یہ کمرا اماں کا تھا جسے وہ وقتی طور پر عدیل کے لیے سیٹ کرنا چاہ رہی تھیں۔ اور خود اماں اس چھوٹے سے کمرے میں شفٹ ہونے کا سوچ رہی تھیں جس میں گھر کے کچھ غیر ضروری سامان کے علاوہ ہالہ کے جہیز کی کچھ نہ استعمال ہونے والی چیزیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ سرمد نے سختی سے ان کے اس آئیڈیا کی مخالفت کی۔

''نہیں اماں، آپ کیوں اپنے کمرے سے دور ہورہی ہیں، ویسے بھی اس چھوٹے سے روم میں آل ریڈی سامان رکھا ہوا ہے۔''

''ارے تو سامان کچھ اِدھر اُدھر شفٹ ہوسکتا ہے۔ ایک بیگ ہی تو رکھنا اور پھر صرف دس دن کی بات ہے، ہلے گلے میں پتا بھی نہیں چلیں گے۔'' اماں نے فوراً ہی اس کا اعتراض رد کردیا تھا کہ انسان جب دل سے خوش ہوتا ہے تو اسے تپتی دھوپ بھی گھنے سائے جیسی لگتی ہے۔

''نہیں اماں، آپ ہمارے کمرے میں شفٹ ہوجائیں۔ میں لاؤنج میں سوجایا کروں گا۔ آپ ہالہ کے ساتھ......'' سرمد کی بات پوری ہونے سے قبل ہی اماں نے اسے ڈانٹ دیا۔

''دماغ تو نہیں خراب ہوگیا ہے تمہارا جو یوں الٹے سیدھے مشورے دینے بیٹھ گئے ہو۔ بس میں نے جو کہہ دیا ہے سو کہہ دیا ہے۔'' اماں کے حتمی لہجے پر سرمد کو چپ ہوجانا پڑا لیکن نہ جانے کیوں ہالہ کے دل میں اس کا یہ مشورہ کانٹا بن کر چبھ گیا۔

یعنی ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی یہ دونوں دس دنوں کے لیے ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے۔ وہ اپنے دل کی کوئی بات اپنے پریتم سے نہ کر پاتی جبکہ دوسرے کپل کو پوری پرائیوسی حاصل ہوتی۔ اس نے یہی گلہ جب سرمد سے کیا تو وہ جیسے ہتھے سے ہی اکھڑ گیا۔

''حد کرتی ہو تم بھی ہالہ...... کتنی چھوٹی سوچ ہے تمہاری...... ارے وہ لوگ مہمان ہیں ہمارے، کیا دس دن کے لیے تم یہ چھوٹی سی قربانی نہیں دے سکتی تھیں۔ اماں سے سبق لو جنہوں نے کتنی فراخ دلی سے میرا یہ مشورہ رد کردیا۔ تمہیں تو چاہیے تھا کہ تم بھی اماں سے اصرار کرتیں لیکن تم تو اس وقت بھی منہ سیے بیٹھی رہیں۔'' وہ اس سے کچھ ایسا خفا ہوا کہ صبح اسے خدا حافظ کہے بنا آفس چلا گیا۔

وہ بجھے دل کے ساتھ اماں کو شاپنگ پر لے کر گئی۔ دونوں ساس بہو نے شاپنگ سینٹر میں ٹھیک ٹھاک وقت گزارا۔ ہالہ نے وہیں انہیں اچھا سا لنچ بھی کروادیا۔ اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر کھانے کے دوران انہیں اپنا بیڈ روم بھی رہنے کے لیے آفر کردیا جسے انہوں نے محبت بھری نرمی کے ساتھ رد کردیا۔ شام کو سرمد جب گھر آیا تو اماں نے بہت خوشی، خوشی اسے ساری شاپنگ دکھائی جس میں عدیل اور سرمد کے شلوار سوٹوں کے علاوہ دونوں بہوؤں کے عید کے خوب صورت جوڑے بھی شامل تھے۔

''وہ اماں ساری چیزیں زبردست ہیں۔ اور بھئی یہ پردے اور بیڈ شیٹ بھی بہت خوب صورت ہیں، چلیں اس بہانے آپ کا کمرا بھی خوب صورت ہوجائے گا۔''... سرمد نے انہیں چھیڑا تو وہ مسکرادیں۔

''ارے مجھے تو اپنا یہ کمرا ایسے ہی بہت پیارا لگتا ہے۔ اور جانتے ہو آج تمہاری بیوی مجھ سے کیا اصرار کرتی رہی۔'' اماں کی بات پر اس نے گھبرا کر ہالہ کی جانب دیکھا جو بہت خاموش سی بیٹھی تھی۔

''کیا اصرار کررہی تھی یہ؟'' اس نے بہت ہی

بے دلی سے پوچھا کہ ہالہ سے اس کے خراب موڈ کی وجہ سے کسی اچھی بات کی توقع جو نہیں تھی اور پھر اماں کے جواب نے اسے جیسے ایک غیر متوقع سی خوشی سے سرشار کر دیا۔ اس نے بہت پیار سے ہالہ کی جانب دیکھا لیکن ہالہ نے خفگی سے منہ موڑ لیا۔ سرمد نے ماں کی نظر بچا کر شرارت سے اس کا دوپٹا گھسیٹا لیکن وہ بے نیازی سے بیٹھی رہی۔ پھر وہ شام اسے پھر انہی دنوں میں لوٹا گئی جب سرمد کی محبت اپنے اندر بہت وارفتگی سمیٹے ہوتی تھی اور اس کی خوب صورت سرگوشیاں اسے کسی اور دنیا میں لے جاتی تھیں۔ آج وہ بالکل پہلے جیسا سرمد اسے محسوس ہو رہا تھا۔ کتنے دلکش انداز میں وہ اسے منا رہا تھا۔ ہالہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایسے ہی اسے مناتا رہے وقت بس یہیں تھم جائے۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ سرمد اس کی اس بات کو اتنا زیادہ سراہے گا اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ اسی دن سرمد سے زیادہ اماں کو اپنا بیڈروم دینے پر اصرار کرتی، اس کے ڈیڈی ٹھیک ہی تو کہتے تھے کہ شوہر کے دل میں معدے کے ذریعے نہیں بلکہ اس سے وابستہ رشتوں کو عزت اور محبت دینے سے جگہ بنتی ہے۔ اسے اپنے ڈیڈی پر بے اختیار پیار آ گیا اور اتفاق یہ بھی ہوا کہ دوسرے ہی روز اس کے امی، ڈیڈی فری اور عاشر کے ہمراہ اس سے ملنے چلے آئے۔ وہ تو ویسے ہی کل سے ہواؤں میں اُڑ رہی تھی اپنی پیاری سی فیملی کو دیکھ کر مزید نہال ہو گئی۔ امی ان لوگوں کو پہلی رمضان کو افطار کی دعوت دینے آئی تھیں۔

''ارے بہن اتنی بھی جلدی کیا ہے، پورے مہینے کا رمضان ہے انشاء اللہ کسی بھی دن آ جائیں گے۔'' اماں نے مسکراتے ہوئے کہا تو شاہینہ ہنس دیں۔

''بھئی ہماری بیٹی کے بغیر یہ ہمارا پہلا رمضان ہوگا تو ہم نے سوچا کم از کم پہلے روزے کی شروعات تو کچھ رونق سے ہو اور ایک بات بھی ہے۔''

شاہینہ کے آخری جملے پر سب ہی نے تجسس سے انہیں دیکھا تو احسن صاحب نے کن انکھیوں سے ہالہ کو دیکھتے ہوئے، شاہینہ کی بات کو آگے بڑھایا۔

''اصل میں میرے چھوٹے بھائی نے اس بار ہمیں عید کرنے کے لیے سنگا پور بلایا ہے۔ ہم لوگ پندرہ رمضان تک اس کے پاس چلے جائیں گے۔'' اپنی بات مکمل کر کے انہوں نے ہالہ کی جانب دیکھا جس کا چہرہ حسبِ توقع اتر سا گیا تھا۔ احسن صاحب کو ایک عجیب سے دکھ کا احساس ہوا جانتے تھے کہ ہالہ کو سنگاپور دیکھنے کا کتنا شوق ہے، وہ ہمیشہ اس سے وعدہ کرتے لیکن ہر بار کسی نہ کسی وجہ سے پروگرام ٹل جاتا۔ اور یہ لوگ کہیں اور گھومنے نکل جاتے۔ اب یہ بھی اتفاق تھا کہ ان کا چھوٹا بھائی اپنی فیملی کے ساتھ چار ماہ قبل سنگاپور شفٹ ہوا تھا۔ اور اس کے بے پناہ اصرار پر انہیں یہ پروگرام بنانا پڑا تھا۔ احسن اور شاہینہ کا دل شدت سے چاہا تھا کہ وہ سرمد اور ہالہ کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں لیکن جانتے تھے کہ ہالہ کی اپنے شوہر اور ساس کے ساتھ یہ پہلی عید ہے۔ شاہینہ نے کہا بھی کہ وہ ہالہ کی ساس سے بات کر کے دیکھتی ہیں لیکن احسن نے بہت سختی سے انہیں منع کر دیا تھا۔

''نہیں شاہینہ، ایسا سوچنا بھی مت...... عید کا موقع ہے، بھلا سرمد اپنی ماں کو عید پر تنہا چھوڑ کر ہمارے ساتھ کیسے جا سکتا ہے۔ ہالہ کی ساس نہ جانے کتنے ارمان دل میں لیے بیٹھی ہوں گی اپنی نئی نویلی بہو کے لیے۔ انشاء اللہ میں انہیں کچھ عرصے بعد ضرور وہاں گھومنے پھرنے کے لیے بھیجوں گا۔'' انہوں نے یہ ہی بات اس وقت بھی ہالہ سے کہی تو وہ دھیمے سے ہنس دی۔

''ارے نہیں ڈیڈی آپ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں، اس عید پر ہم ویسے بھی بہت بزی ہوں گے۔ سرمد کے چھوٹے بھائی عدیل اپنی بیوی کے ہمراہ یہاں عید کرنے آ رہے ہیں۔''

''اوہو، یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔'' احسن کو جیسے دل سے خوشی ہوئی۔ اور پھر جب باتوں، باتوں میں انہیں یہ پتا چلا کہ اماں اپنا بیڈروم ان لوگوں کے لیے سیٹ کر رہی ہیں تو انہوں نے فوراً ہی اپنے بنگلے کی آفر

کر دی۔

''ارے بھئی راضیہ باجی، آپ بھی کمال کرتی ہیں، آپ میری بڑی بہن کی طرح ہیں اور بہنوں کے لیے ان کے بھائی کے گھر ہمیشہ حاضر رہتے ہیں۔ آپ ہرگز اپنا کمرا نہیں خالی کریں گی۔''

''کیا مطلب؟'' سبھی نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''بھئی ان دنوں ہم لوگ سنگاپور میں ہوں گے اور ہمارا گھر خالی ہوگا۔ ڈرائیور، گاڑی خانساماں سب آپ کے لیے ہروقت حاضر رہیں گے۔ بس آپ اپنے بیٹوں اور بہوؤں کے ساتھ انجوائے کیجیے گا۔'' ان کی اس آفر پر سرمد نے بے اختیار اماں کی جانب دیکھا جو نفی میں سر ہلا رہی تھیں۔

''نہیں احسن میاں، یہ بالکل مناسب نہیں اور نہ ہی مجھے اچھا لگے گا۔'' انہوں نے فوراً ہی دوٹوک انداز میں انکار کر دیا۔ کمرے میں ایک لمحے کو سناٹا چھا گیا۔ احسن ایک لمحے کو چپ سے ہوگئے۔ شاہینہ کو اپنی سمدھن کا یہ انداز ذرا بھی نہیں بھایا جبکہ سرمد بھی سر جھکا کر رہ گیا۔

''سوری راضیہ باجی اگر آپ کو برا لگا ہے میں نے بہت اپنائیت سے صرف اور صرف ایک بھائی ہونے کے ناتے اپنی بہن سے یہ فرمائش کی تھی لیکن میں یہ بھول گیا تھا کہ آپ کی نظر میں بس میں ایک سمدھی ہی ہوں۔'' پتا نہیں ان کے لہجے میں کیا تھا کہ اماں شرمندہ سی ہوگئیں۔ تب ہالہ نے جلدی سے اٹھ کر اماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''پلیز اماں، مان جائیں ناں ورنہ ڈیڈی کا دل ٹوٹ جائے گا۔ ویسے بھی یہ لوگ سنگاپور مزے کرنے جارہے ہیں تو ہم کیوں نہ ان کے بنگلے میں اپنی چھٹیاں انجوائے کریں۔ عید منائیں، پلیز، پلیز اماں۔'' کتنے ملتجی انداز میں وہ ان سے کہہ رہی تھی اماں نے بے اختیار اسے گلے سے لگاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تو سب کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

احسن اور شاہینہ اپنی لاڈلی بیٹی کے چہرے پر بکھرتی خوشی دیکھ کر پُرسکون ہوگئے ورنہ ان کا دل سنگاپور.... جاتے ہوئے اپنی بیٹی کے لیے کڑھ رہا تھا۔ اور یوں پندرہ رمضان کے بعد ہالہ، اماں اور سرمد کے ساتھ اس بنگلے میں چلی آئی جو کبھی اس کا اپنا گھر ہوتا تھا۔ لیکن آج میکا کہلاتا تھا۔ ہالہ نے اماں کو یہاں لانے سے پہلے خود اپنی نگرانی میں ان کا کمرا ٹھیک کروادیا تھا۔ شاہینہ اس کی اتنی ایکسائٹمنٹ پر ہنس رہی تھیں۔

''ہالہ ہم لوگ ناحق تمہارے سنگاپور نہ جانے پر کڑھ رہے تھے تم تو اس سے زیادہ خوش یہاں آنے پر ہورہی ہو۔'' ان کے چھیڑنے پر وہ بھی ہنس دی۔

''پتا ہے امی میں سوچ رہی ہوں کہ اماں جب پندرہ دن یہاں آکر رہیں ہوسکتا ہے کہ انہیں ڈیفنس اچھا لگنے، لگے دل لگ جائے ان کا یہاں اور وہ پھر یہاں گھر لینے کو تیار ہوجائیں۔'' شاہینہ نے اس کے خیالی پلاؤ بنانے پر مسکرا کر اسے دیکھا تھا لیکن بولیں کچھ نہیں حالانکہ دل بہت چاہا کہ اس سے پوچھیں کہ شادی سے پہلے تو تمہارے لیے سرمد کا محلّہ دنیا کی سب سے خوب صورت جگہ تھی۔ اس کا چھوٹا سا فلیٹ تمہیں کسی جنت کا خطہ لگتا تھا پھر اب کیوں اس جگہ واپس آنا چاہ رہی ہو جس کی اہمیت سرمد کی محبت کے سامنے صفر تھی۔ انہوں نے گہری سانس لے کر اپنا دھیان ہالہ کی طرف مبذول کرلیا جو اب عدیل اور شیبا کے کمرے کی سیٹنگ کے بارے میں انہیں دیکھ کر کچھ مشورہ دے رہی تھی۔ شاہینہ اور احسن نے جانے سے پہلے جیسے اپنے بنگلے کو ہالہ اور اس کے سسرال والوں کے لیے ایک ہالی ڈے ریزورڈ کا روپ دے ڈالا تھا۔ ہالہ نے بہت فخریہ اماں کو ان کا بیڈروم دکھایا۔ بے حد خوب صورتی سے ڈیکوریٹ کیا ہوا کمرا اماں کو اچھا لگا۔ ایک طرف ان کی نماز کی چوکی بھی سیٹ کردی تھی۔

''بیٹا یہ تو بہت بڑا اور کشادہ کمرا ہے۔ میں اکیلی تو اس میں کہیں گم ہوجاؤں گی۔'' ان کی بات پر ہالہ اور سرمد بے اختیار ہنس دیے۔

''اماں اگر آپ گھبرا رہی ہیں تو میں نذیراں سے

کہوں گی کہ وہ آپ کے کمرے میں سو جائے۔'' ہالہ نے فوراً ہی اس کا حل پیش کر دیا۔ کچھ دیر اماں کے پاس بیٹھنے کے بعد وہ دونوں اپنے کمرے میں آ گئے۔ ہالہ کے چہرے پر بکھری خوشی کو سرمد نے دلچسپی سے دیکھا۔

''آج تو تمہارے چہرے پر کچھ ایسی جگمگاہٹ بکھری ہوئی ہے کہ نظر نہیں ٹھہر رہی۔'' سرمد نے کچھ ایسی وارفتگی سے کہا کہ ہالہ بے اختیار شرما گئی۔

''ہاں سرمد، ہم لوگ ان دنوں کو خوب انجوائے کریں گے۔ نہ کھانے پکانے کا جھنجٹ، نہ بجلی کے جانے کا خدشہ...... اماں کے روزے بھی آرام سے گزر جائیں گے ٹھنڈے، ٹھنڈے سے کمرے میں۔ اور پھر شیبا اور عدیل کتنا کمفرٹیبل فیل کریں گے یہاں۔'' وہ بچوں جیسی خوشی سے کہہ رہی تھی۔ سرمد کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔

''ہالہ تم نے میری محبت میں کتنی بڑی قربانی دی ہے، اتنی پُرآسائش زندگی چھوڑ کر میرے چھوٹے سے فلیٹ میں چلی آئیں۔ جہاں بجلی جاتی ہے تو جنریٹر نہیں ہوتا۔'' سرمد کے لہجے میں چھپے دکھ کو محسوس کر کے ہالہ خجل سی ہو گئی۔

''سوری سرمد، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میں آپ کو لیٹ ڈاؤن کروں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ڈیڈی ہمیں ڈیفنس میں گھر دلانے کو کہہ رہے ہیں لیکن میں نے اماں کی خاطر منع کر دیا۔'' اس نے روہانسی آواز میں صفائی دینے کی کوشش کی تو سرمد ہنس دیا۔

''ارے میں نے تو بس ایسے ہی کہہ دیا تھا بلکہ تمہاری محبت کی قدر مزید بڑھ گئی ہے میرے دل میں۔'' سرمد نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تو ہالہ نے سکون کی سانس لی ورنہ انجانے میں وہ اپنے احساسات سرمد پر ظاہر کر بیٹھی تھی۔

شام کو افطار کے وقت خانساماں نے میز کو بہترین افطاری سے کچھ ایسے سجایا کہ اماں تو حیران ہی رہ گئیں۔

''ارے کیا آج اور لوگوں بھی بلایا ہے افطار پر؟'' اماں کے سوال پر ہالہ ہنس دی۔

''نہیں اماں، آج تو آپ ہی مہمانِ خصوصی ہیں، آج پہلا روزہ کھول رہی ہیں آپ اس گھر میں یہ امی، ڈیڈی کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہا جا رہا ہے۔'' ہالہ نے پیار بھری شوخی سے انہیں جواب دیا تو وہ سرمد کی جانب دیکھ کر مسکرا دیں۔ اتنی خاطر اور پزیرائی پر وہ خوش ہونے کے ساتھ، ساتھ شرمندہ بھی ہو رہی تھیں۔

''اماں جب عدیل اور شیبا بھی آ جائیں گے تو پھر مزید رونق ہو جائے گی۔'' سرمد رات کو گرین ٹی پیتے ہوئے اماں سے گپ شپ کر رہا تھا جبکہ ہالہ لیپ ٹاپ پر سنگاپور اپنی فیملی سے باتیں کر رہی تھی۔

''ہاں بیٹا، میں تو دن گن، گن کر کاٹ رہی ہوں، ان کے آنے کے۔'' اماں کے لہجے میں مامتا امڈ آئی۔

''اماں یہ بھی اللہ کی مصلحت تھی کہ ان لوگوں کے آنے سے پہلے ہم لوگ یہاں شفٹ ہو گئے۔ ماشاءاللہ ......سے آپ کی وہ بہو بھی بہت ویل آف فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم لوگوں نے دیکھا تو ہے اس کا طرزِ زندگی۔ اماں بہت اچھا امپریشن لے کر جائے گی شیبا یہاں سے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' اماں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور اماں ہمارے عدیل کی مزید عزت بڑھے گی، اس کی سسرال میں۔ اماں آپ کو برا تو نہیں لگ رہا ہے ناں یہ سب کچھ...... دیکھیے گا انشاء اللہ آپ کو بہت شاندار گھر بنوا کر دوں گا میں۔'' وہ بڑے جذب سے کہتا ہوا اماں کو بہت معصوم سا لگ رہا تھا۔

رمضان اپنے اندر روزوں کی برکت لیے بڑی تیزی سے عید کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ہالہ کی زندگی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اسے جیسے اس کا پرانا سرمد واپس مل گیا تھا۔ ماحول کی تبدیلی نے دونوں کو ایک دوسرے سے مزید قریب کر لیا تھا۔ اور پھر اماں کو مطمئن اور خوش دیکھ کر ہالہ کو پورا یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ جلد..

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ہی اپنے ایریا میں واپس لوٹ آئے گی۔ نزیراں، اماں کے کاموں کے لیے ایک پیر سے کھڑی رہتی۔ سحری اور افطار کے لیے وہ بس وقت پر ٹیبل پر آجاتیں جہاں سجے ہوئے لوازمات ان کے منتظر ہوتے۔ اب تو عدیل اور شیبا کے آنے میں کچھ ہی روز رہ گئے تھے۔ اس دن سرمد آفس سے واپس آیا تو ہالہ خوب صورت لباس میں ملبوس بالکل تیار کھڑی تھی۔

''خیریت، کہاں کی تیاری ہے بھئی؟'' سرمد نے تعریفی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''اگر آپ کو روزہ نہیں لگ رہا ہو تو ذرا میرے ساتھ بینش کے گھر تک چل سکتے ہیں۔ وہاں انعم بھی آرہی ہے، آج ہم سب دوستوں کا ساتھ روزہ کھولنے کا پروگرام ہے۔''

''لیکن آپ سب لڑکیوں کے درمیان بھلا میں کیا کروں گا۔'' سرمد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''واپس آجایئے گا، روزہ تو آپ اماں کے ساتھ ہی کھولیں گے۔''

''او کے جناب...... چلو اماں سے پہلے مل لوں۔ پھر چلتے ہیں۔'' وہ دونوں ہنستے مسکراتے اماں کے کمرے میں داخل ہونے ہی والے تھے کہ ان کی آنسوؤں میں ڈوبی آواز سن کر وہیں دروازے پر ٹھٹک کر رک گئے۔ وہ موبائل پر اپنی پرانی دوست صفیہ سے باتیں کر رہی تھیں۔

''سچ صفیہ بڑا دل گھبراتا ہے میرا یہاں پر...... اللہ کی قسم کبھی، کبھی دل چاہتا ہے کہ چپکے سے بھاگ کر اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں چلی جاؤں۔'' ان کے ان جملوں پر سرمد نے بے حد حیران ہو کر ہالہ کی جانب دیکھا جو خود بھی ششدر کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔

''ارے نہیں صفیہ، میری بہو تو بہت پیاری ہے، بہت محبت سے مجھے یہاں لائی ہے۔ بے حد خیال کر رہی ہے میرا لیکن میں کیا کروں مجھے پھر بھی عجیب سی گھٹن محسوس ہوتی رہتی ہے یہاں پر۔'' پتا نہیں دوسری طرف سے صفیہ نے کیا کہا تھا اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔

''رمضان تو مجھے یہاں آنے سے پہلے والے دنوں میں لگتا تھا جب میں اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں افطار کے وقت اپنے ہاتھوں سے گرم، گرم پکوڑے تل کر میز پر رکھتی تھی اور سرمد شوق سے انہیں کھاتا تھا۔ میں اور ہالہ دن میں بیٹھ کر سوچتے تھے کہ آج افطار پر کیا بنایا جائے۔ یہاں تو بس ہر چیز تیار مل جاتی ہے کچھ مزہ ہی نہیں ہے کسی بات میں، نہ محلے سے افطاری آتی ہے نہ جاتی ہے۔ کوئی رونق نظر ہی نہیں آتی۔'' سرمد جیسے شاکڈ کے سے عالم میں اماں کی باتیں سن رہا تھا جبکہ ہالہ کا چہرہ بھی اترا جا رہا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو صفیہ، اپنے بچوں کی خوشی کی خاطر میں نے اپنے سینے پر صبر کی سل رکھ لی ہے۔ عدیل اور شیبا کا کمرا بہت ہی خوب صورت سیٹ کیا ہے ہالہ نے۔ وہ دونوں بہت سکون اور مزے میں رہیں گے یہاں حالانکہ میری یہ شدید خواہش تھی کہ میں اپنا کمرا سیٹ کر کے ان لوگوں کو دوں۔ میرے فلیٹ میں رونق سی بکھر جائے۔ میں بلڈنگ میں رہنے والوں کو فخریہ اپنے گھر بلا کر اپنی بہوؤں سے ملواؤں...... ارے نہیں صفیہ خبردار جو تم نے میرے بچوں سے کچھ کہا۔ خدارا ان کی عید مت خراب کرنا۔ یہ میرے بچوں کی خوشی ہے، کون سا ہمیشہ کے لیے میں یہاں پر آگئی ہوں یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے۔''

سرمد ایک دم پلٹا اور تیز، تیز قدموں سے اپنے کمرے میں آگیا۔ ہالہ بھی گھبرا کر اس کے پیچھے چلی آئی۔ سرمد بہت خاموش سا صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہالہ بجھے دل سے اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ سرمد نے اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھا اور بے اختیار اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔

''سوری ہالہ، میں جانتا ہوں کہ اماں کی باتوں سے تم بہت ہرٹ ہوئی ہو لیکن اگر اسی بات کو تم اپنے

اوپر رکھ کر سوچو تو تمہیں اماں سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ دیکھو ناں تم جس ماحول کی عادی ہو اس میں واپس آ کر کتنی خوش اور کھلی کھلی سی نظر آتی ہو اور وہی ماحول اماں کے لیے گھٹن کا باعث بن رہا ہے۔ تم دونوں کے یہ جذبات، یہ احساسات وقت اور حالات کا تقاضے ہیں، میری جان آج میں تم سے وعدہ کر رہا ہوں کہ بہت جلدی تمہیں وہ سب کچھ دوں گا جس کی تم عادی ہو لیکن یہ سب ماں کا دل دکھا کر نہیں بلکہ ان کی دعاؤں کی چھاؤں میں ہی ہمیں مل سکتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' ہالہ نے اپنی آنسوؤں سے بوجھل پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''ہالہ اگر پودے کو اپنی جڑ سے اکھاڑ کر کہیں اور لگا دیا جائے تو وہ مرجھا جاتا ہے اور میں تمہیں اور اماں کو کبھی مرجھانے نہیں دوں گا لیکن اس کے لیے آج تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ اس وعدے کے صدقے میں جو میں نے تم سے ابھی کیا ہے۔'' اس نے دزدیدہ نظروں سے ہالہ کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں آنسو موتی کی طرح چمک رہے تھے اور سوالیہ نظریں سرمد کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''ہالہ، ہم آج ہی اپنے فلیٹ میں واپس چلے جائیں گے اور پھر ہم دونوں مل کر اماں کا کمرا عدیل کے لیے سیٹ کریں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ عدیل ہمارے فلیٹ میں ہی اترے۔ اماں کے کمرے میں رہے۔ وہ گرم، گرم پکوڑے اپنے ہاتھوں سے بنا کر ہمیں کھلائیں، بلڈنگ میں افطاری بھیجیں۔ رمضان کی رونقوں کی عادی ہیں میری اماں اور ہمیں زبردستی انہیں اپنی پسند کی زندگی نہیں دینی چاہیے۔ کتنے عرصے بعد ان کا بیٹا ان کے پاس آ رہا ہے اور وہ محض اپنے بچوں کی خوشی اور آرام کی خاطر اسے اپنے گھر میں ویلکم نہیں کر پا رہیں۔ یہ زیادتی ہے ان کے ساتھ۔'' سرمد کے جملے کے ساتھ ہالہ کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ کتنے پلان بنائے تھے اس نے گھومنے پھرنے کے، اپنی دوستوں کو بلانے کے، دل بھر کر انجوائے کرنے کے اور سب سے بڑھ کر اس کا یہ خواب بھی چکنا چور ہو گیا تھا کہ اماں یہاں گھر لینے پر تیار ہو جائیں گی۔ سرمد بھی تو کتنا بدل گیا تھا۔ اس خوب صورت نئے ماحول میں......

ٹپ ٹپ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ سرمد نے جیسے اس کے دکھ کو محسوس کر لیا اس کی سوچوں کو پڑھ لیا۔

''ہالہ میں تمہارے ان آنسوؤں کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ میں تمہیں اس سے زیادہ پُر آسائش زندگی دینے کی کوشش کروں گا۔ دنیا کی ساری خوشیاں تمہارے قدموں میں نہ لا کر ڈالیں تو بس تم مجھ سے محبت کرنا چھوڑ دینا۔ وقت کے ساتھ، ساتھ میری ہر کامیابی' میری ہر ترقی پر اماں کا ذہن اور ان کے خیالات بھی آہستہ، آہستہ بدلتے جائیں گے، وہ فخر محسوس کریں گی اپنے بیٹے کے اسٹیٹس پر...... سب کچھ بدل جائے گا ہالہ بس مجھے تھوڑا وقت دو اور ہاں تمہاری ان حسین آنکھوں میں ڈوب کر یہ وعدہ بھی کر رہا ہوں کہ میں ہمیشہ تمہارا محبوب بن کر رہوں گا۔ بس کبھی، کبھی شوہر کا روپ دھار لینے کی اجازت درکار ہوگی تم سے۔'' اس نے آخری جملہ کچھ اتنے مزے سے کہا کہ ہالہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ گلابی رخساروں پر آنسوؤں کی لڑیاں اور ہونٹوں پر چمکتی ہنسی سرمد کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے دھوپ میں بارش ہو رہی ہو۔ اس نے بہت پیار سے ہالہ کو دیکھا۔

''ہالہ ہم اپنی پہلی عید اپنے گھر میں ہی منائیں گے۔ آؤ ہم یہ خوش خبری چل کر اماں کو بھی سنا دیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ان کی عید تو رمضان میں ہی ہو جائے گی۔''

''لیکن ان کی یہ عید مجھے اس وقت کسی سوگ جیسی کیوں محسوس ہو رہی ہے۔'' یہ فقط ہالہ نے دل میں ہی سوچا تھا بھلا منہ سے کہہ کر اپنے پریتم کے خوب صورت وعدوں کی ڈور کو خود اپنے ہاتھوں سے کاٹنا تھا کیا۔

☆☆☆

ناولٹ

من جاں بازم

سحر ساجد

دسواں حصہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

وہ حسبِ عادت کھڑکی میں کھڑی تھی۔ رات کا وقت تھا، گل سونے کے لیے کمرے میں آئیں، ایک نظر اس کی پشت کو دیکھا اور پھر خاموشی سے آگے بڑھ گئیں۔ وہ جانتی تھی کہ ممی کمرے میں آچکی ہیں، اس نے بے ساختہ سر جھکایا، چند لمحوں کے لیے سوچا اور پھر گہری سانس بھر کر مڑی تھی۔ یوں جیسے خود کو تیار کیا ہو...... وہ چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی ان تک آئی تھی۔

''ممی......'' بے حد آہستگی سے پکارا۔ گل نے ٹیبل لیمپ آن کیا...... اسے سرہانے کھڑا... دیکھا اور پھر خود کو گھسیٹ کر بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگائی تھی۔

''کیا بات ہے موی......؟ یوں کیوں کھڑی ہو؟'' اور وہ ان کے ساتھ جا کر نیم دراز ہوگئی۔ سر ان کے کندھے پر اور بازو ان کے گرد لپیٹ لیا۔ گل خاموشی سے اس کے بالوں کو سہلانے لگیں۔ وہ کیسے نہ جانتیں کہ موی کچھ کہنا چاہتی ہے۔

''آپ میری ملٹری مین سے شادی کرنا چاہتی ہیں ناں ممی......؟''

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

جنّت کے پتے
نمرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM
مصحف
نمرہ احمد
www.Paksociety.com
نمل
نمرہ احمد
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
آبِ حیات
عُمیرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM
ہم سفر
فرحت اشتیاق
داستان ایمان فروشوں کی
جلد اول
التمش
بن روئے آنسو
فرحت اشتیاق
www.paksociety.com
عبداللہ
ہاشم ندیم
پیرِ کامل
عمیرہ احمد
متاعِ جاں ہے تو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM
من و سلویٰ
Man-o-Salwa
www.paksociety.com
عمیرہ احمد
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM
خدا اور محبت
ہاشم ندیم
بارش
شمیرا حمید
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
ٹوٹا ہوا تارہ
سمیرا شریف طور
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
قراقرم کا تاج محل
نمرہ احمد

"ہاں……"

"تو پھر سمعیہ آنٹی کے بیٹے سے کردیں۔"

گل کا چلتا ہاتھ ساکت ہوا اور انہوں نے بے اختیار اس کا سر اٹھا کر چہرہ دیکھا تھا۔ انہوں نے کچھ کہا نہیں تھا…… کہہ ہی نہیں سکی تھیں۔ بس شاکڈ ہو کر اس کا چہرہ تکتی رہیں۔

"I love him اچھا لگتا ہے وہ مجھے…… ممی بس یہ بات مان لیں…… آئندہ کبھی ہاں پھر کبھی میں آپ کو تنگ نہیں کروں گی ممی…… میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی…… معلوم نہیں یہ کیسے ہوا…… مگر بس ہو گیا…… اور اب مجھے لگتا ہے اتنے سالوں بعد…… اتنے بہت سے سالوں کے بعد…… کوئی خوشی، کوئی سکون، راحت، سکھ میرے لیے زمین پر اتارا گیا ہے۔ مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ میرے پیر زمین پر ہیں…… میں معلق نہیں ہوں، وہ کیسا ہے؟ کیسا نہیں…… معذور ہے، نارمل نہیں…… بلیو می ممی!…… مجھے فرق نہیں پڑتا، وہ مومنہ کی خوشی کا نام ہے اور بس…… دیکھیں ممی…… دیکھیں میں آج آپ سے مانگ رہی ہوں۔ پلیز ممی…… پلیز……" آواز مدھم مگر جذبات سے پُر…… لہجہ وہ کہ گل نے کبھی آج تک اسے اس لہجے، اس انداز اور اس ٹون میں بات کرتے دیکھا نہ سنا…… ٹیبل لیمپ کی زرد مدھم روشنی میں وہ اس کا جھکا سر…… بھنچے ہونٹ دیکھ سکتی تھیں۔ بے ساختہ انہوں نے ہاتھ سے پکڑ کر اس کا چہرہ اٹھایا۔

"تم سچ کہہ رہی ہو؟ کوئی نیا ڈراما تو نہیں؟ جھوٹ بھی تو ہو سکتا ہے۔"

اور مومنہ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کا ہاتھ چہرے سے ہٹایا اور اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"میں تو کسی ملٹری مین سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی ممی اور وہ کیپٹن ہے…… آج، کل، پرسوں…… ترسوں…… کسی نہ کسی ایک دن اسے آرمی کو دوبارہ سے جوائن کرنا ہی ہے تو……؟ اور پھر کون چاہے گا۔ کون سی لڑکی ایسی ہوگی جو کسی وہیل چیئر پہ بیٹھے شخص کے ساتھ زندگی گزارنا چاہے گی، ایسی زندگی کے بارے میں کون سوچتا ہے ممی…… کون……؟ میں یہ کہہ رہی ہوں تو یہ آپ کو ڈراما لگتا ہے…… جھوٹ لگتا ہے، آپ خود سوچیں…… یہ ڈراما کیسے ہو سکتا ہے، جھوٹ کس طرح سے بولا جا سکتا ہے…… یہ معجزہ ہے ممی…… معجزہ……" گل نے یک دم اِک تکلیف کا شکار ہو کر اس کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ نکالا تھا…… چند لمحے وہ خاموش رہیں۔

"تو اسی لیے تم نے سمیعہ سے دوستی کی……؟" انہوں نے سرد آواز میں پوچھا تھا۔

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی تھی۔

"جی……"

"اور ہمایوں…… وہ…… اس سے منگنی……؟"

"آپ کے لیے…… صرف آپ کے لیے…… میں جانتی تھی کوئی بھی حیدر کے لیے نہیں مانے گا۔"

"لیکن جب ہم ہمایوں سے رشتہ ختم کرنا چاہ رہے تھے تب بھی تم بضد تھیں مومی اور اب تم پھر میرا دماغ خراب کررہی ہو……" انہیں گرم، گرم پسینے آرہے تھے…… بے ساختہ انہوں نے دوپٹے کے پلو سے خود کو ہوا دی تھی۔

"وہ بھی آپ لوگوں کی وجہ سے…… آپ لوگ کبھی نہیں مانتے…… اور میں ہمایوں سے شادی کر کے اس سے دور ہو جانا چاہتی تھی۔ یوں سمجھیں میں اسے replace کردینا چاہتی تھی۔" وہ کہہ رہی تھی اور گل اب ماتھے پہ ہاتھ رکھے بے دم، سر جھکائے بیٹھی تھیں۔

"مومنہ…… تمہیں ساری دنیا میں بس ایک وہ ہی شخص ملا تھا پسند کرنے کو…… نارمل نہیں ہو تم…… بالکل بھی نہیں ہو…… تم پاگل ہو…… پاگل……" دکھ، الجھن اور بے چینی سے وہ دبی آواز میں غصے سے بولی تھیں۔

اور مومنہ…… وہ ان کی اس بات پر ہلکا سا ہنس دی تھی۔ اور یہ الگ بات کہ وہ ہنسی کہیں سے نہ لگتی تھی۔

☆☆☆

"I love him..."

اور جب اس نے یہ سمیعہ سے کہا تو......تو سمیعہ کا دل چاہا کہ وہ رکھ کر اسے تھپڑ دے ماریں۔

کیا وہ نہیں جانتی تھیں اس کے اعلیٰ خیالات کے بارے میں... ملٹری کے بارے میں......فوجیوں کے بارے میں......وہ ہی خیالات جن کا اظہار بانگِ دہل کرتی آئی تھی۔

کیا وہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ ہمایوں سے شادی کرنے پر بضد تھی؟ اور اس کے بعد وہ اگر انہیں یہ کہتی ہے کہ وہ ان کے بیٹے سے محبت کرتی ہے تو وہ اسی قابل تھی کہ اس کے منہ پر رکھ کر الٹے ہاتھ کا ایک طمانچہ دے مارا جاتا۔

"مومی......! یہ میرے بیٹے کی زندگی ہے، کوئی ایڈونچر نہیں ہے، کل تک تم فوجیوں سے نفرت کرتی تھیں آج یکا یک ایک رات میں محبت کہاں سے اُگ آئی؟"

اور وہ ان کے تپے ہوئے انداز پر مسکرا دی تھی۔

اس کے بعد......اس کے بعد اس نے سمیعہ کو بھی وہی کہا تھا جو اس نے اپنی ماں کو کہا تھا۔

ساری بات سننے کے بعد... سمیعہ عجیب نظروں سے اُسے دیکھتی رہیں۔ اور جب بولیں تو......

"یہ ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں......؟ وجہ......؟" اس سوال پر وہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ اب وہ اسے کیا بتاتیں کہ وجہ کیا تھی اور کون تھی؟

☆☆☆

مومی نے جو بات کہی تھی اور اس بات کے کہنے میں وہ جتنی سنجیدہ نظر آتی تھی...... یہ چیز سمیعہ کو پریشان کر رہی تھی۔ گھر میں آگے پریشانی کم تھی کیا......اور وجہ منزہ اور اس کی صحت...... وہ ابھی گھر لوٹی ہی تھیں کہ منزہ کو لاؤنج میں سر پکڑے بیٹھا دیکھا تھا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" وہ کچھ تشویش سے آگے بڑھیں۔

"معلوم نہیں ممی...... سر پھٹ رہا ہے۔" اور جب منزہ نے یہ کہتے ہوئے چہرہ اٹھایا تو......تو......

"مائی گاڈ......منزہ اپنا چہرہ تو دیکھو......کیسے سرخ ہو رہا ہے، اٹھو فوراً اٹھو تمہارا بی پی ہائی ہو رہا ہے......فوراً چلو ڈاکٹر کے پاس......" انہوں نے ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر نہ کی تھی اور اسے لے کر اسی حلیے میں ڈاکٹر کے پاس پہنچی تھی۔

پھر اسے پورا دن اسپتال میں انڈر آبزرویشن رکھا گیا تھا اور یہ ایک دن کی بات نہیں تھی...... یہ آئے روز ہونے لگا تھا۔ اس کا بی پی کسی طرح سے کنٹرول نہیں ہو پا رہا تھا۔ روزانہ کی ڈرپس اور اسپتال کے چکر الگ......

سمیعہ کو ہوش کیسے رہتا......ایسی کسی چویشن میں جب ایک عدد اور آکورڈ سچویشن کا سامنا کرنا پڑ جائے تو......

انہیں مومنہ کی بات بھولی نہیں تھی...... بھول بھی کیسے سکتی تھی...... اور وہ بھلا دی جانے والی بات بھی نہیں تھی۔ اور پھر مومنہ خود بھی تو تھی......سب کچھ تازہ رکھنے کے واسطے......

"آنٹی مجھے آپ سے ملنا ہے۔" جب وہ منزہ کی وجہ سے کافی دن واک پہ نہ جا سکیں تو مومی کا میسج آیا تھا۔

اور اس ایک میسج کو پڑھ کر سمیعہ کو سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ کیا رسپانس کریں۔ جو بھی تھا...... مومی انہیں کتنی بھی عزیز سہی مگر یہ سچ تھا، حقیقت تھی...... بس اس دن کی بات کے بعد سے وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھیں...... انہوں نے میسج کا کوئی جواب نہیں دیا......اور یہ اچھا نہیں کیا تھا۔ بہتر یہ ہی ہوتا کہ وہ جواب دے دیتیں۔

صبح قریب گیارہ بجے کا وقت تھا۔ حیدر اس دن معمول سے زیادہ لیٹ اٹھا تھا۔ وہ خود اس کا ناشتا بنا کر اس کے کمرے میں لے کر گئی تھیں۔ ناشتے میں جو کا دلیہ یا پھر کارن فلیکس یا پھر اسی قسم کا ہلکا پھلکا ناشتا...... سیریلیز وغیرہ......وہ وہیل چیئر پر تھا......اور بیٹھے رہنے سے غذا صحیح طور پر ہضم نہ ہو پاتی تھی۔ اور پھر وہ اس کے پاس ہی بیٹھی رہیں۔ اچانک کھلے دروازے پر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دستک ہوئی اور جب وہ دستک ہوئی تو سمیعہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ متوجہ ہونے پر انہیں کس کی شکل دیکھنے کو ملے گی۔

اسے دیکھ کر ان کی سانس باہر ہی نہیں آسکی تھی۔ وہ اندر ہی کہیں گم ہوگئی تھی۔ حیدر نے ایک لاشعوری نظر سے اسے دیکھا اور بس......

''مومنہ تم......'' وہ حواس باختہ سی نظر آئیں۔

اس کا کیا تھا...... حیدر کے سامنے ہی کچھ بول دیتی تو......

''میں نے آپ سے ایک بات کہی اور آپ یوں مجھ سے چھپ کر بیٹھ گئیں جیسے میں اپنی بات آپ سے گن پوائنٹ پر منوانے والی ہوں...... آپ نے میرے sms کا جواب تک نہیں دیا...... آنٹی......'' اس کے یوں بھڑک جانے پر حیدر نے حیرت کا شکار ہوکر اسے دیکھا اور پھر ممی کو......

مومی کا چہرہ بے حد سرخ تھا اور سمیعہ ہونق...... ہوگیا تھا ناں وہ ہی جس کا ڈر تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے مومنہ...... مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں تمہیں کیا جواب دوں......''

''تو یہ ہی کہہ دیتیں جو ابھی مجھے کہہ رہی ہیں۔'' وہ بہت رُوڈ ہو رہی تھی۔ بدتمیز ہوکر بولی تھی۔ حیدر کو سخت ناگوار گزرا......

''آپ کو تمیز نہیں ہے کسی سے بھی بات کرنے کی۔''

''نہیں ہے۔'' بات ختم کرنے کی دیر تھی کھٹ سے جواب آیا تھا...... لو بھئی چلو تم سکھا لو تمیز مومنہ کو......

اُس کے منہ پھاڑ کر ''نہیں ہے'' کہنے پر حیدر اس کا منہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔

''کیسے، کیسے لوگوں کو آپ نے دوست بنا رکھا ہے ممی......'' غصہ اب کسی طور تو نکالنا ہی تھا۔

اور سمیعہ بوکھلا کر اس کی طرف پلٹیں۔

''تمہارا معاملہ نہیں ہے یہ حیدر، تم بیچ میں مت آؤ......'' وہ ذرا رعب سے ڈپٹ کر بولیں۔

اور حیدر منہ کھول کر انہیں دیکھنے لگا...... وہ ان کا فیور کر رہا تھا اور وہ......

''آپ بتا کیوں نہیں دیتیں کہ معاملہ ان کا ہی ہے......'' اور سمیعہ نے عین اپنے پیچھے وہ غصیلی آواز سنی تھی اور یک دم خاموشی سی پھیل گئی تھی۔ وہ سر پکڑ کر بیڈ پر گرنے والے انداز میں بیٹھی تھیں اور حیدر وہ کبھی ممی کو دیکھتا اور کبھی مومنہ کو...... اور مومنہ...... وہ یہ کہنے نہیں آئی تھی...... باخدا وہ ایسا کرنے نہیں آئی تھی۔

اسے آنٹی پر غصہ تھا، وہ بس وہی نکالنے آئی تھی اور یہ غصے، غصے میں منہ سے اچانک، بلا ارادہ، لاشعوری طور پر پھسل نکلا تھا۔ وہ کہہ کر منہ پر ہاتھ رکھ کر دو قدم پیچھے کو ہٹی اور تیز، تیز قدموں سے چلتے ہوئے تقریباً بھاگنے کے سے انداز میں اس گھر سے نکل گئی تھی۔ یہ کیا بکواس کی اس نے......

☆☆☆

''ممی وہ کیا بات کر رہی تھی؟'' اس کے جانے کے بعد کئی لمحے وہاں سناٹا چھایا رہا تھا۔ وہ وھیل چیئر کو چلاتا ہوا ان تک آیا تھا۔

''حیدر مجھ سے ابھی مت پوچھو......''

''نہیں...... آپ مجھے ابھی بتائیں گی...... یہ ہو کیا رہا ہے؟ ایسے امیچور...... پاگل دماغ لوگوں کو دوست بنائیں گی تو یہ ہی کچھ ہوگا ناں......'' اور سمیعہ نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر گہری سانس لی تھی...... سارا چہرہ تپنے سا لگا تھا۔

''ممی...... ایسی بھی کیا بات ہے جو آپ مجھے نہیں بتا سکتیں۔'' سمیعہ نے زچ ہوکر اسے دیکھا۔

انہیں اس کا متوقع ری ایکشن ڈرا رہا تھا۔ عادل ان کا بہت ہی سوفٹ نیچرڈ بیٹا تھا...... مگر حیدر ذرا سخت مزاج تھا...... اور اب......

''کم آن ممی...... اب آپ مجھے غصہ دلا رہی ہیں۔'' وہ ذرا برہمی سے بولا۔

''وہ انٹرسٹڈ ہے تم میں...... شادی کرنا چاہتی ہے تم سے......؟'' وہ یک دم بولیں اور پھر آخری جملہ حلق میں پھنس سا گیا تھا۔

اور اس بات پر اس کا ری ایکشن غیر متوقع تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک شاکڈ ہوا کر انہیں دیکھتا رہا اور پھر......

”نان سینس...... وہ تو پاگل ہے ہی...... اور آپ جانتی ہیں کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔“ وہیل چیئر کا رخ موڑ کر...... وہ ایک دفعہ پھر سے ناشتا کرنے لگا تھا یوں جیسے یہ بات اس کے نزدیک اتنی بھی اہمیت نہیں رکھتی تھی کہ اس کے لیے چند لمحے رک کر سوچا بھی جائے۔

☆☆☆

یہ ہنگامہ خیز صبح تھی۔ اور اس صبح کی رات بھی اپنے ساتھ ایک بڑی خبر لائی تھی۔

کرنل صاحب اس دن صبح کے ڈاکٹرز کے ساتھ میٹنگ میں تھے اور جب وہ واپس آئے تھے تو ان کے پاس اچھی خبر تھی۔

حیدر اب سرجری کے لیے بیرون ملک جا سکتا تھا۔ یہ خبر گو کہ اچھی تھی مگر پھر بھی اپنے اندر ایک اداسی کا عنصر بھی رکھتی تھی۔ یہ آپریشن رسکی بھی تو تھا۔ خطرہ بھی تو تھا۔ نروسرجری تھی...... عام سی بات نہیں تھی۔ complications کا خطرہ بہر حال موجود تھا۔ سب سے زیادہ خوش حیدر ہی تھا۔ اس نے بڑی محنت کی تھی...... بڑی محنت...... ایکسر سائز، تھراپی، اپنی ڈائٹ کا دھیان...... اس نے صحت مند ہونے کے لیے یہ سب نہیں کیا تھا...... اس نے یہ سب صرف اس دن کے لیے کیا تھا...... اسے یہ سرجری کروانی ہی تھی ہر حال میں...... ہر صورت میں......

وہ ساری عمر یوں وہیل چیئر پر محض ایک ”ڈر“ کا شکار ہو کر نہیں بیٹھ سکتا تھا کہ معلوم نہیں سرجری کامیاب ہو یا نہ ہو...... وہ اس ڈر کے باعث ساری عمر کی معذوری نہیں کاٹ سکتا تھا اور اب بھی...... اب بھی تو کچھ کلیئر نہیں تھا۔

ہوسکتا تھا کہ وہ ساری عمر کے لیے پیرالائز ہو جائے اور یہ بھی تو ممکن تھا کہ آپریشن کامیاب نہ ہوسکے...... کچھ بھی ہوسکتا تھا...... کچھ بھی...... لیکن پھر بات وہ ہی...... وہ اس کچھ بھی ہونے کے ڈر سے یہ چانس ضائع نہیں کر سکتا تھا۔

یہ فائٹ تھی اور وہ ہار نہیں مان سکتا تھا۔ اس نے یہ کب سیکھا تھا۔ انتظامات کرتے، کرتے ابھی کافی وقت لگنا تھا لیکن یہ طے تھا کہ کرنل صاحب اس کے ساتھ جائیں گے...... عادل وہ تو پہلے ہی آن ڈیوٹی تھا...... نہیں جا سکتا تھا...... یہ خبر سن کر سب اچانک چپ سے ہو گئے تھے۔

منزہ اٹھ کر چلی گئی...... سمیعہ آنسوؤں پر قابو نہ پاسکیں...... اور کرنل صاحب...... ایک گہری سانس بھر کر انہوں نے صوفے کی بیک سے سر ٹکایا تھا۔ اور حیدر نے وہیل چیئر کا رخ اپنے کمرے کی طرف موڑ لیا تھا۔

زندگی میں ایک مقام آتا ہے کہ آپ کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں بچتا...... کچھ بھی نہیں...... اتنا بھی نہیں کہ آپ آگے بڑھ کر کسی کے کندھے پر ایک گرم جوش سی تھپکی دے کر اسے حوصلہ دے سکیں۔

وہ سب...... سب ہی اپنی، اپنی جگہ بہت تھک چکے تھے۔ وہ ایسی ہی تھکن کا شکار تھے کہ جہاں ہاتھ اٹھ کر کسی بھی اپنے کے کندھے تک جا نہیں پاتا۔ وہ پہلو میں ہی گرا رہتا ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ کبھی، کبھی کسی بھی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی ماسوائے ایک پُرخلوص، گرم جوش سی...... حوصلہ دلاتی تھپکی کے......

☆☆☆

”موسم بہت اچھا ہو رہا ہے...... آجائیں پارک آپ کو بلا رہا ہے۔“ یہ میسج مومنہ کی جانب سے آیا تھا کس کو...... یہ بتانے کی ضرورت نہیں گرمیوں کے دن آچکے تھے...... راتیں چھوٹی اور دن گرم اور لمبے۔

اس دن کے بعد سے انہوں نے مومنہ سے بات کیا اسے اپنی شکل دکھانا گوارا نہ کیا تھا۔ وہ ناراض تھیں۔ مومنہ کو کوئی شک نہیں تھا۔ لیکن وہ کیا کرتی...... وہ بھی ناراض تھی۔

سمیعہ کے تو گھر میں ہی کچھ ایسے حالات ہو گئے تھے کہ واک کرنے کا ٹائم ملتا تھا نہ دل کرتا...... منزہ کی سچویشن کے ساتھ، ساتھ اب حیدر کی متوقع سرجری......

اور وہ تھک چکی تھیں۔ اور ایسے وقت میں موی کا یہ میسج آیا تو...... تو انہیں اپنی ناراضی بھاپ بنتی دکھائی دی تھی...... وہ بچی تھی...... سمیعہ تو بچی نہیں تھیں...... انہیں اپنے بچگانہ طرزِ عمل پر یک دم حیرت ہوئی تھی۔ وہ بھی بچی کے ساتھ بچی بن گئی تھیں اور ایسا ہوتا ہے، ہم انجانے میں لاشعوری طور پر اپنے دوستوں...... صحبت میں رہنے والوں کی عادتیں، رویّے کسی حد تک ایڈاپٹ کر ہی لیتے ہیں۔

''افضل، افضل میرے fleets لاؤ......'' وہ سیڑھیاں سے اترتے ہوئے بولیں...... اور ان کا یہ جملہ گھر کے درودیوار نے کافی دیر بعد سنا تھا۔

حیدر نے بھی اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے یہ جملہ سنا تھا اور جب تک وہ اپنی وہیل چیئر خود سے چلاتا باہر لایا وہ جا چکی تھیں۔

''یہ ممی بھی ناں......'' وہ بڑبڑایا تھا...... وہ جان گیا تھا کہ اتنے دنوں بعد وہ یوں ہی تو واک پہ نہیں جا رہی تھیں۔ یقیناً یہ ''شیطانی کال'' تھی۔

☆☆☆

اسے دیکھتے ہی انہیں خوشگوار سا احساس ہوا تھا۔ وہ اچھے خاصے انسانوں والے حلیے میں تھی۔ گلابی کڑھائی والی سفید شرٹ اور بلیک جینز پہنے ہوئے تھی۔ آج اسٹول کے بجائے شیفون کا سفید ہی دوپٹا تھا۔ دوپٹے کو گلے میں ایک بل دے کر دونوں پلو آگے کو پھینک رکھے تھے۔ بال کمرے سے ذرا اوپر آتے ہوئے آج پونی ٹیل میں بندھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ بچی آج منہ دھو کر آئی تھی۔ وہ اچھی لگ رہی تھی۔

''دل چاہ رہا ہے کہ کھینچ کر تھپڑ تمہارے منہ پر دے ماروں۔'' وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر مصنوعی خفگی سے بولیں۔

''منہ حاضر ہے۔'' اس نے گھٹنوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر جھک کر گال آگے کیا۔

''ہٹو پرے......'' چار انگلیوں سے اس کے گال پر ٹہوکا دیتے ہوئے انہوں نے اسے پیچھے کیا تھا...... اور اس عمل میں غصے سے زیادہ پیار چھلکتا تھا۔

وہ ہنس دی۔ سمیعہ اب آگے، آگے جا رہی تھیں...... دوپٹے کا کراس بنا کر سائڈ پر گرہ لگائی ہوئی تھی...... پاؤں میں سرخ فلیٹس اور تیز، تیز چلتے ہوئے وہ واک کرنے کے فل موڈ میں تھیں۔ موی بھاگ کر ان کی ہم قدم ہوئی۔

''پھر اس دن کیا ہوا......؟ کتنی چیزیں ٹوٹیں......؟''

''میرا بیٹا بدتمیز نہیں ہے...... تمہاری طرح......''

''اچھا...... مجھے تو آج تک تمیز نظر نہیں آئی۔''

اور اس بات پر گھور کر اسے دیکھا گیا تھا۔

''کیا کہا پھر آپ کے تمیزدار بیٹے نے......؟''

''نان سینس......''

''کیا نان سینس......؟'' وہ دونوں چلتے، چلتے باتیں کر رہی تھیں...... اس بات پر سمیعہ گہری سانس بھر کر رکیں۔

''میں نے کہا کہ مومنہ تم میں انٹرسٹڈ ہے...... اس بات کے جواب میں اس نے کہا...... نان سینس......''

اور وہ یک دم ٹھس ہو کر رہ گئی تھی۔

''موی تم میں لڑکیوں جیسی کوئی بات نہیں ہے لیکن تمہاری سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تم نیچرل ہو، تھوڑی سی جنگلی، بہت سی کڑوی...... رُوڈ...... بدلحاظ لیکن تم نیچرل ہو...... پیور ہو......'' انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر ایک غیر متوقع بات کی تھی۔

موی انہیں دیکھتی رہی اور یہ جانچنے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ آگے کیا کہنے والی ہیں۔

''بات صرف میری تمہاری ہوتی تو اور بات تھی لیکن حیدر، وہ...... موی بات یہ ہے کہ حیدر......''

''مجھے ایک دفعہ ان سے بات کرنے دیں۔'' اس نے بے قراری سے بات کاٹی تھی۔ یوں جیسے وہ جان گئی تھی کہ سمیعہ آگے کیا بولنے والی ہیں۔

سمیعہ بے اختیار چپ ہوئیں...... وہ بولنے ہی نہیں دے رہی تھی۔

''وہ تم سے بات بھی نہیں کرے گا...... اور تمہاری بات سننے پر راضی بھی نہیں ہوگا...... مومنہ وہ......'' وہ

نرم لہجے میں، تھوڑی سی شرمندگی سے بولیں۔ یوں جیسے اسے ہرٹ نہیں کرنا چاہ رہی ہو۔

''سوواٹ......؟'' وہ ان کی بات کاٹ کر بولی۔ مومی ہرٹ نہیں ہوتی تھی...... سمیعہ یہ نہیں جانتی تھیں۔

اس نے ''سوواٹ'' یوں کندھے اچکا کر کہا کہ سمیعہ الجھ کر اسے دیکھنے لگیں۔

''کیا ضروری ہے کہ آپ انہیں یہ بتائیں کہ اس پارک میں کوئی ان سے بات کرنے، ملنے آنے والا ہے۔''

وہ ایک لمحے کے لیے اس کی بات نہ سمجھ سکی تھیں۔ اور جب سمجھیں تو...... تو بے ساختہ ایک مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل سی گئی تھی...... اچھا ہے مل لے وہ حیدر سے۔

''ڈن......؟'' مومی نے ہاتھ بڑھا کر پوچھا۔

''ڈن......'' اور سمیعہ نے ہاتھ ملا کر کہا تھا۔

☆☆☆

گل نے جب حبیب کو مومی کے نئے مسئلے کے بارے میں بتایا تو وہ...... وہ متھے سے ہی اکھڑ گئے تھے۔

''مذاق بنایا ہوا ہے اس لڑکی نے ہماری زندگیوں کو...... جب جی میں آیا...... جو جی میں آیا کہہ دیا...... کبھی خودکشی تو کبھی جذباتی بلیک میلنگ...... یہ آخر ہمیں کب سکون لینے دے گی؟''

اور گل منہ پر ہاتھ رکھ کر سر جھکائے یوں ہو گئیں جیسے کہ سارا قصور انہی کا ہو...... عائلہ نے بے اختیار ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

''یہ اس گھر میں رہنے لائق نہیں...... صرف پاگل خانے میں رہنے لائق ہے۔'' انہیں کبھی اتنا غصہ نہیں آیا تھا۔

''ممی پر کیوں شاؤٹ کر رہے ہیں چاچو، مجھ سے بات کریں......'' وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی تھی۔

اور وہ طیش سے اسے اترتے دیکھتے رہے۔

وہ فوراً...... سیدھی اِدھر نہیں آئی تھی۔ پہلے وہ کچن میں گئی...... پانی کا گلاس بھرا اور پھر گلاس لے کر ان تک آئی تھی۔

''بیٹھ جائیں چاچو اور پانی پئیں...... غصہ ٹھنڈا ہوگا۔''

اور حبیب ہاتھ مار کر پانی کا گلاس گرا بھی نہیں سکے تھے...... یہ ان کی کلاس نہیں تھی۔ انہوں نے غصے سے ہی سہی...... مگر پانی کا گلاس لے لیا تھا۔ بیٹھ کر پانی پینے کے بعد...... وہ گلاس ہاتھ میں تھامے یوں بیٹھے رہے جیسے خود پر کنٹرول کر رہے ہوں۔

مومی نے آہستگی سے ان کے ہاتھ سے گلاس لیا اور ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ ایک سرد سانس بھرتے ہوئے وہ ان کے عین سامنے بیٹھی تھی۔

''قانوناً، شرعاً اور اخلاقاً چاچو مجھے اپنی مرضی سے شادی کرنے کا حق ہے ناں؟''

''بالکل ہے......'' حبیب نے جھٹکے سے سر اٹھا کر کہا تھا۔ ''شادی کرنے کا حق ہے...... کنویں میں چھلانگ لگانے کا نہیں......''

''اور یہیں پہ آکر میرا آپ سے اختلاف ہو جاتا ہے...... آپ ہمیشہ جذباتیت کی پٹی باندھ کر ہی کیوں دیکھتے ہیں؟ ایک منٹ کے لیے اپنی آنکھوں سے یہ پٹی ہٹائیں اور مجھے دیکھیں۔'' سنجیدہ مگر تلخ لہجے میں کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے۔

''مجھ میں کیا ہے؟ کیا......؟ کتنے لوگوں نے ریجکٹ کیا تھا...... آپ کو تو معلوم بھی نہیں ہوگا...... مگر میں نے انگلیوں پر گن رکھا ہے...... پھر جب کوئی فیملی پسند کرتی بھی ہے تو اپنے بیٹے کی دوسری بیوی کے طور پر اور میں تو تب بھی راضی تھی...... اعتراض آپ لوگوں کو ہی تھا...... اور اس کے بعد ہوگا کیا؟ پھر سے وہی سلسلہ پھر سے ریجیکشن...... وہ معذور ہے تو کیا؟ میں آپ کو نارمل نظر آتی ہوں کیا......؟

''we complement each other'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''چلیں ہم حیدر کو اٹھا کر سائڈ پر کر دیتے ہیں، آپ اپنی چوائس بتائیں...... تیمور...... اس کی تو شادی ہو چکی اور...... اور کون......؟'' وہ اب صوفے کی بیک سے اطمینان سے ٹیک لگائے، ان کے ''اور کون'' کے جواب کی منتظر تھی۔

اور حسیب چاہ کر بھی ''اور کون'' ڈھونڈ نہ سکے......

''مان لیں چاچو...... ذاکرہ باجی کے سسر کا ظرف بڑا تھا۔ فیملی میں سے گر کسی نے پوچھنا ہوتا ناں تو اب تک پوچھ چکا ہوتا...... سبھی کو موی کے گنوں کا بہت اچھی طرح سے پتا ہے۔''

اور اس نے جیسے حظ اٹھایا تھا۔

''آپ لوگ میری شادی کسی ملٹری مین سے ہی کرنا چاہتے تھے ناں...... ناؤ واٹ......؟ مسئلہ کیا ہے اب؟ اس کی معذوری......؟ ہونہہ'' اس نے تنفر سے ہونہہ کی تھی۔

''آرمی ایک فیملی ہے، آرمی یہ ہے، آرمی وہ ہے...... فضائیہ ایسی فضائیہ ویسی...... blah blah blah...... وہ بھی تو اسی فیملی کا حصہ ہے چاچو جس کے قصیدے آپ دن رات پڑھتے ہیں...... تو پھر اب ......اب آپ اسے اپنی بیٹی کا رشتہ دینے میں اتنے متامل کیوں ہیں...... کیوں؟ کیا لمبے چوڑے آرمی آفیسرز ہی سب کو بھاتے ہیں، اٹریکٹ کرتے ہیں؟ وہ آفیسر جو حادثوں کا شکار ہو کر کسی ڈس ایبلٹی کا شکار ہو جاتے ہیں وہ محض صرف تمغوں، تعریفوں، ستائش کے چند الفاظ کے قابل ہی رہ جاتے ہیں کیا؟ اور بس......؟ زندگی تمغوں اور تعریفوں سے نہیں گزرتی چاچو...... کچھ عملی قدم تو اٹھانا ہی پڑتا ہے ناں......'' اور حسیب یقین نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے پاس جواب میں کہنے کے لیے...... ایک پتھر جیسی بات بھی نہیں ہو سکتی تھی...... وہ ہی بات جو وہ موی کے منہ پر دے مارتے۔

اس نے کچھ اس طرح سے...کڑواہٹ گھولی تھی تلخ حقائق بیان کر کے کہ ان کا چہرہ بے اختیار سرخ ہوا تھا۔

''وہ واقعہ تو آپ کو یاد ہوگا ہی...... وہ ہی تین سپاہیوں والا...... جس میں ان تینوں نے ایثار کرتے ہوئے پانی ایک دوسرے کو پلانا چاہا تھا۔ آج حالات تھوڑے مختلف سہی لیکن جنگ آج بھی ہے...... دہشت گردی محاذ ہے اور آپ سے ڈیمانڈ ایثار کی ہے۔ آپ کے ساتھی کو...... آپ کے ایثار کی ضرورت ہے چاچو اور اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

وہ اپنی آخری بات کہہ کر اٹھ گئی تھی۔

اور ان سب کو اس طرح سے کر کے چھوڑ گئی تھی کہ کوئی بھی...... کچھ کہہ نہ سکا تھا۔

لیکن اتنے حقائق کے پیش کرنے کے باوجود ایک جذباتی تقریر جھاڑ دینے کے باوجود موی کے گھر والے اتنی ہمت خود میں نہیں پاتے تھے کہ وہ ...اس پروپوزل کے لیے ہاں کہہ سکیں۔ یہ مشکل تھا...... تکلیف دہ تھا...... اور بڑے حوصلے کا کام تھا...... یہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اور جب یہ بات ...... یہ معاملہ سعد تک پہنچا تو اس نے جو کہا وہ سب کو ششدر کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس نے کہا۔

''چاچو...... موی ہمارے جسم کا وہ حصہ ہیں کہ جسے کانٹا بھی پڑے تو ہاتھ دل پر پڑتا ہے...... لیکن یہ حصہ اب اس قابل ہی رہ گیا ہے کہ اسے کاٹ کر الگ کر دیا جائے...... تکلیف ایک حد تک برداشت کی جاتی ہے۔'' وہ سر جھکائے مغموم لہجے میں بول رہا تھا۔

حسیب نے دم بخود ہو کر اسے دیکھا......

''ہم کب تک آپ کے سہارے زندگی گزاریں گے چاچو...... موی کو اپنی زندگی شروع کرنے دیں...... جیسی بھی سہی...... ان کی مرضی...... کیا ہم نے چاہا تھا کہ بابا شہید ہو جائیں؟ یہ ہمارا قصور نہیں تھا...... موی کب تک ہم سے تاوان وصول کرتی رہیں گی...... کب تک......؟''

گل اور حسیب دونوں ہی تعجب سے پُر نظروں کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے۔

سعد کب اتنا بڑا ہوا...... معلوم ہی نہیں ہوا...... پتا ہی نہیں چلا...... اور وہ اتنا بڑا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

وہ ابھی، ابھی منزہ کو اسپتال سے ڈرپ لگوا کر آئی تھیں...... اس کی حالت سنبھلی تو وہ سو گئی...... اور جب وہ سو گئی تو انہیں سکھ کی سانس آئی تھی۔ شام کا وقت ہونے والا تھا۔

"افضل پانی تو پلانا....." صوفے پر بے حد تھکے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے آواز دی تھی۔

انہیں دیکھ کر حیدر نے ٹی وی کا والیوم آہستہ کیا اور پھر وہ اس وقت صوفے پر ہی بیٹھا ہوا تھا..... سمیعہ بھی اس کے پاس آکر بیٹھی تھیں۔ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے، وہ اب اپنی پیشانی مسل رہی تھیں۔

"آنٹی جی..... پانی۔"

"اف......ضل...... آنٹی۔" تھکے سے انداز میں بے اختیار اسے ٹوکا اور پھر پانی کا گلاس پکڑا تھا۔

حیدر بے ساختہ مسکرایا تھا ان کے ٹوکنے پر۔

"آپ تھک گئی ہیں ناں....." اس نے پیار سے ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ انہوں نے مدھم سی مسکراہٹ سے اسے دیکھا..... ایسی مسکراہٹ جس میں اعتراف کا عنصر نمایاں تھا۔

اور پھر گلاس پاس کھڑے افضل کو واپس دیا تھا۔

ایک دفعہ پھر سے انہوں نے صوفے پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کی تھیں۔

"چلو حیدر..... باہر چلتے ہیں۔" اسی طرح سر ٹکائے..... وہ رخ بدل کر یک دم اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

"let ' s get some fresh air"

اور پھر خود ہی اس کے گھٹنے پر ہاتھ مار کر بولی تھیں۔

"طاہر، طاہر کیپٹن صاحب کی وہیل چیئر لاؤ....." اگلا آرڈر حیدر کے اٹینڈنٹ کو جاری ہوا تھا۔

اور حیدر انکار نہ کرسکا تھا..... وہ تھکی ہوئی تھیں..... ایک واک کے بہانے خود کو ریلیکس کرنا چاہتی تھی۔ وہیل چیئر پر بیٹھنے کے بعد وہ دونوں باہر آئے تھے۔ رخ پارک کی جانب تھا۔ حیدر خود وہیل چیئر چلا رہا تھا۔ اور وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے پارک جا رہے تھے۔

☆☆☆

"السلام علیکم.....!" وہ دونوں ہی..... بیک

جواہر پارے

☆ دولت مندی کی مستی سے پناہ مانگو یہ ایک ایسی لمبی مستی ہے جس سے بڑی دیر کے بعد ہوش آتا ہے۔

☆ عقلمندی وہ ہے جو کم بولے زیادہ سنے۔

☆ زندگی کو غنیمت جانو یہ عنقریب تم سے لے لی جائے گی۔

☆ اللہ کی بہترین نعمت مخلص دوست ہے۔

☆ انسان کو چار چیزیں بلند کرتی ہیں، علم، خوش کلامی، کم گوئی، اور مثبت طرز فکر۔

☆ مایوسی انسان کی سب سے بڑی دشمن اور خدا کا عذاب ہے۔

☆ پھولوں کی خواہش رکھنے والے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ گلاب کی نرم، نرم پتیوں کے نیچے کانٹے بھی ہوتے ہیں۔

☆ نیک بننے کی خواہش کرو جیسا کہ حسین بننے کی کوشش کرتے ہو۔

☆ اچھے کاریگر کو روزگار تلاش کرنے کے لیے کسی دور دراز ملک میں نہیں جانا پڑتا۔

☆ دانا لوگ، احمقوں سے تکرار نہیں کرتے۔

☆ ہر قہقہے کے پیچھے آنسو اور آنسوؤں کے پیچھے زخموں اور آہوں کی جلن ہوتی ہے۔

☆ کسی کو اتنا نہ چاہو کہ اس کی جدائی برداشت نہ ہو سکے۔

☆ زیادہ نہ ہنسا کرو اس سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔

☆ جہاں جاؤ وہاں اپنی خوشبو چھوڑ آؤ تاکہ لوگ اچھے الفاظ میں یاد کریں۔

☆ جو لوگ میانہ روی اختیار کرتے ہیں وہ کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔

مرسلہ: نگہت غفار، کراچی

وقت اس آواز پر متوجہ ہوئے تھے۔ وہ بینچ پر بیٹھی تھیں۔

''وعلیکم السلام ......موی، کیسی ہو بیٹا......؟''

اس کا ہاتھ پکڑ کر انہوں نے اسے اپنے ساتھ ہی بٹھالیا تھا......حیدر نے ذرا چبھتے ہوئے انداز میں انہیں دیکھا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں...... آپ سنائیں۔'' وہ اب سیمعہ سے باتیں کررہی تھی۔

''حیدر، موی تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے۔'' کچھ دیر بعد انہوں نے مڑ کر حیدر سے کہا تھا۔

''میں نے آپ کو کہا بھی تھا...... کہ کم از کم آپ کچھ میچورٹی کا ثبوت دیجیے گا لیکن...... آپ عورتیں...... آپ سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔'' وہ بچہ نہیں تھا...... جو سمجھ نہیں پاتا کہ اس کے ساتھ کیا، کیا گیا تھا۔

''دیکھو، میری بات سنو اور ذرا تحمل سے سنو...... میں اسے کچھ کہتی...... اس نے میری بات کا یقین کرنا تھا نہ ہی تم سے بات کرنے کی ضد چھوڑنی تھی۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ تم اس کی بات سن لو اور بات ختم کردو...... اس کے بعد نہ وہ ضد کرے گی، نہ تم تنگ ہوگے۔ بی میچور حیدر...... تم جانتے تو ہو یہ کس قدر وائلڈ ہے کچھ بھی کہہ دیتی ہے۔ کچھ بھی کرگزرتی ہے۔'' اور آخری بات ذرا سا جھک کر سرگوشی کے سے انداز میں کہی گئی تھی۔

''ممی......! جب کچھ......''

''حیدر پلیز...... یہ بولتی رہے گی تم دھیان مت دینا لیکن تھوڑی دیر...... تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ......'' انہوں نے یک دم اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بات کاٹی تھی۔ انداز التجا لیے ہوئے تھا۔

''کیا پاگل پن ہے یار......'' وہ بیزار ہوکر... بڑبڑایا۔ اور رخ بدل کر دوسری جانب دیکھنے لگا تھا......

سیمعہ نے مسکرا کر موی کو اشارہ کیا اور موی نے جواباً آنکھ ماری تھی۔ سیمعہ اک لمحے کے لیے سٹپٹائیں اور پھر اس کا گال تھپتھپا کر واک کے لیے اٹھ گئیں۔

موی نے ایک گہری سانس بھر کر حیدر کو دیکھا۔ رخ موڑے سختی کا سا تاثر لیے...... وہ ساری دنیا سے بیزار اور بے حد اکھڑ نظر آتا تھا۔

''میں آپ کو پروپوز کرنا چاہتی ہوں۔''

''کیوں......؟ مجھ میں کون سے سرخاب کے پر لگے نظر آئے آپ کو؟'' اسے موی کی کسی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہنا تھا مگر اس کے یوں براہِ راست بول دینے سے وہ اچانک ہی تپا تھا۔

''مجھے آپ میں کوئی سرخاب کے پر جڑے ہوئے نظر نہیں آتے...... آپ بس میرے لیے پرفیکٹ ہیں۔''

اور اس بات پر حیدر نے اسے تیز نظروں سے دیکھا۔

''آپ اس طرح سے مت دیکھیں...... let me clear زندگی میں ہر ایک کو سہارے، لائف پارٹنر کی ضرورت ہوتی ہے، آپ کو بھی ہے اور مجھے بھی...... آپ سے کون شادی کرے گا...... کوئی بھی نہیں...... اور میں...... میری بھی ہو ہی جائے گی...... شاید 35 سال کی عمر میں...... یا پھر 40، 42 سال کی عمر میں...... ایسی کوئی خوبیاں نہیں ہیں مجھ میں...... منگنی میری ٹوٹ چکی ہے اور جس سے ہوئی تھی وہ بھی ماشاءاللہ...... سے ایک شادی بھگتا چکا تھا۔ تو جب تک میری شادی ہوگی یا ہونے کے چانسز نظر آنا شروع ہوں گے تب تک، تب تک میری ممی...... ہاں ممی مر جائیں گی...... وہ بہت بیمار ہیں، ڈاکٹرز کہتے ہیں ان کا مسئلہ صرف ڈپریشن ہے اور ان کے ڈپریشن کی وجہ میں ہوں۔ میں اپنی ماں کو مرتا نہیں دیکھ سکتی۔ ایک ضرورت آپ کی ہے...... ایک میری ہے اور ضرورتیں بڑی منہ زور ہوا کرتی ہیں...... اتنی کہ یہ بھوک بن جاتی ہیں...... میں آپ کو مجبور تو نہیں کرسکتی...... ایک آپشن آپ کے سامنے رکھا ہے...... اگر آپ چاہیں تو......'' اس نے بے اختیار بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

حیدر کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح کے حقائق اس کے سامنے رکھے گی۔ وہ اس سے کسی فضول اور بے تکی بات کی توقع کررہا تھا۔

''آئی ایم سوری......'' چند لمحے اس کا چہرہ جانچتے

کے بعد اس نے ٹھنڈے، بے تاثر لہجے میں کہا تھا۔

اور مومی کو لگ پتا گیا تھا کہ ”انکار“ کیا کرتا ہے۔ ”کیا اب بھی نہ......“ وہ منہ کھول کر اسے تکنے لگی۔

”آپ میری واحد امید ہیں، اتنے شارٹ نوٹس پر کسی اور کو کہاں سے ڈھونڈوں...... آسمان سے بھی گر نہیں سکتا، زمین سے بھی اُگ نہیں سکتا...... یوں تو مت کریں۔“ وہ لاچار نظر آئی۔ جیسے رونے والی ہوگئی۔ ٹھنڈے، ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ اس انکار نے وہ ہی کیا تھا...... جو پیٹ میں اچانک قوت سے پڑنے والا گھونسا کرتا ہے۔ مومی نے بے ساختہ ہونٹ چبانے شروع کر دیے تھے۔

”تو آپ گدھے کو باپ بنا رہی ہیں؟“ حیدر نے حظ اٹھایا۔

”پلیز...... ایسا نہیں ہے۔“

”تو...... تو کیسا ہے؟“ حیدر ذرا جو متاثر ہوا ہو......

”اب کیا کرے؟ کیا کہے؟“ مومی چند لمحے پریشانی سے اسے دیکھتی رہی اور پھر سر جھکایا۔ حیدر نے تف کے انداز میں سر جھٹکا اور وہیل چیئر کو حرکت دی ہی تھی کہ...... وہ یک دم ٹھٹک کر رک سا گیا۔ وہ آواز......

”دو کے درمیان تیسرا وہ...... تین کے درمیان چوتھا وہ...... چار کے درمیان پانچواں اور پانچ کے درمیان چھٹا...... وہ کہ جسے میں اور آپ اللہ کہہ کر پکارتے ہیں...... وہ کہ جو ہر سو، ہر جا، ہر مکاں...... لامکاں...... ہر طرف، ہر سمت حاضر ہے...... وہ جو ابھی ٹھیک اسی پل میرے اور آپ کے درمیان بھی حاضر ہے اور اسی حاضر کو گواہ بنا کر میں کہتی ہوں، میں قسم کھاتی ہوں کہ مومنہ مجیب عالم آپ سے وفا کرے گی اور تاحیات کرے گی...... مومنہ کبھی آپ سے بیزار نہیں ہوگی، وہ ہو بھی کیسے سکتی ہے...... کیونکہ آپ مومنہ کی ضرورت ہیں۔“ اور اس نے سر اٹھایا۔

”اور کیونکہ مومنہ...... ہنیا نہیں ہے۔“ اور پھر سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ اور وہ ٹھٹھرے ہوئے تاثر کے ساتھ اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ اپنی وہیل چیئر کو حرکت نہیں دے سکا تھا، وہ ہل نہیں سکا تھا، وہ کیسے بیچ میں لے آئی کیسے؟ اللہ کو......؟ ساری باتیں، مات، سارے وعدے ہیچ لفظ بے معنی اور جملے کھوکھلے...... وہ کیسے اپنے اور اس کے درمیان لے آئی تھی...... رب کو...... وہی کہ جو تمام گواہوں سے معتبر ترین گواہ...... افضل ترین شہادت...... وہ ہی کہ جس کے نام کی قسم کے علاوہ اور کوئی قسم نہیں...... تمام تر حوالوں سے عظیم ترین حوالہ...... وہ اللہ عزوجل، وہ اس کی کسی ایک بات سے ذرا سا...... اتنا سا بھی نہیں متاثر ہوا تھا اور وہ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔

لیکن...... لیکن...... یہ اس نے کیا کر ڈالا...... کیا کہہ دیا...... وہ اگلی سانس نہیں لے سکا تھا۔ مزاحمت کی حرکت کیا، مزاحمت کے طور پر دو لفظ تک بول نہیں سکا تھا۔

یہ آخر ہوا کیا تھا؟ کیا......؟ مومنہ نے اس پر سے نظریں ہٹائیں، سر جھکایا اور پھر ڈھیلے پڑتے وجود کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے سر جھکائے کھڑی رہی اور پھر جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے...... سر جھکائے ہی...... سست قدموں کے ساتھ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

حیدر اسے جاتا دیکھ سکتا تھا۔ اس کی نظروں کی گرفت میں مومی کی پشت تھی...... اور وہ کچھ نہ کرسکا۔ اس پر ہونے والا آخری وار سخت تھا۔

وہ ہنیا کو کیسے جانتی تھی...... کیسے؟ اور یہ تکلیف دہ تھا۔ تکلیف جو سن کر دینے کی صلاحیت سے بھرپور تھی۔

”حیدر......“ سمیعہ نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور یک دم اِک تیز روشنی کا جھماکا ہوا۔

”ممی...... ہاں ممی...... اور بھلا وہ کیسے جان سکتی تھی؟“

”مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔“

”حیدر میں......“

”پلیز......“ اور اس کے پلیز کہنے میں اتنی طاقت تھی کہ سمیعہ ہونٹ بھینچ کر دو قدم پیچھے ہٹیں لیکن پھر بھی وہ وہاں سے گئی نہیں تھیں وہ کیسے اسے یوں اکیلا چھوڑ کر جاسکتی تھیں۔ وہ بس اس کی پشت پر چند قدموں کے فاصلے پہ...... ایک سنگی بینچ پر جا کر بیٹھ گئی تھیں۔

افق کناروں پر پھیلی شفق...... رات کی سیاہی میں مدغم ہونے لگی...... گلے ملنے کی تیاری کرنے لگی۔

زخم، وہ کہ جن کا منہ اک ریاضت سے بند کیا گیا تھا۔ یک دم ہی اُدھڑ سے گئے تھے...... اور جب وہ یوں اُدھڑے تو انہوں نے اپنا آپ.... دکھلا دیا کہ وہ تو کبھی سلے ہی نہیں تھے۔ مندمل ہوئے ہی کہاں ہیں؟ ہرے کے ہرے ہی تھے۔

درد ہو دل میں تو دوا کیجے
دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجے

☆☆☆

کاش کہ اس پر بجلی گر پڑتی...... آسمان ٹوٹ پڑتا...... وہ اندھی ہو جاتی...... سماعت کھو دیتی یا پھر کم از کم ذہنی توازن ہی قائم نہ رہتا...... ان سب میں سے کچھ بھی ہو جاتا مگر وہ نہ ہوتا جو ہوا تو یوں ہوا...... قیامت تو ایک ہی دن آتی ہے لیکن وہ اس سے کم بھی نہیں تھی جو خبر بن کر اس پر ٹوٹی تھی۔

''حیدر کے جسم کا بایاں حصہ مفلوج ہو گیا تھا۔'' اور کیا ظلم تھا کہ ہر دفعہ اسے دیکھنے اسپتال میں وزٹ کرنے آنے پر ایک مزید تکلیف وہ چیز اس کے سامنے آجاتی تھی۔ اس دن بھی...... اس دن بھی وہ اس سے کوئی بات بھی نہیں کر سکی تھی۔ وہ الٹے قدموں پھر سے لوٹا دی گئی تھی۔ کہاں سے وہ حوصلہ لاتی...... وہ ضبط لاتی...... پہاڑ جیسی ہمت جمع کرتی کہ جس کے بل پر وہ حیدر کے سامنے کھڑی ہو سکتی، یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اتنی اس کی طاقت نہیں تھی۔

وہ اس طرح سے گھر میں داخل ہوئی تھی کہ عنبرین نے ٹھٹک کر اسے دیکھا تھا۔

''ہنیا......'' انہوں نے پیار سے پکارا۔

اور وہ تو سماعتیں کھو کر ہی آرہی تھی...... وہ سیڑھیاں چڑھتی گئی۔

''ہنیا...... ہنی......'' اور کمرے کا دروازہ دھاڑ سے بند ہو گیا تھا۔

قدموں نے گرا سے اسپتال سے گھر اور گھر سے اپنے کمرے میں پہنچا دیا تھا تو کمال کام کیا تھا...... اور اب...... وہ لڑکھڑا کر بیڈ کے کنارے کا سہارا لیے... ہوئے زمین پر گری تھی...... اور...... اور چھن سے آنکھوں کے آئینے میں وہ خواب آن اترا۔

وہ بے ساختہ خوفزدہ ہوئی تھی...... لیکن خوف اگلے ہی پل میں بھک سے اڑ کر غائب ہوا تھا...... یوں جیسے کسی نے کوئی منتر پڑھ کر پھونکا تھا۔

اس نے بے یقینی سے اپنے جسم کے بائیں حصے کو دیکھا...... تو وہ...... وہ اس کے جسم کا حصہ نہیں تھا...... تو یہ حیدر کے ساتھ ہونا تھا۔ حیدر کے ساتھ......

تو پھر خواب میں وہ کیوں...... اس نے کیوں خود کو اس حالت میں گرفتار دیکھا...... کیوں؟

اور جب وہ پلٹی تھی جب اس نے درد سے تکلیف سے حیدر کو پکارا تھا تو......

دکھ، بے یقینی، الجھن...... تکلیف اسے محسوس ہوا کہ کم از کم آج تو ضرور ہی سر کی کوئی نس پھٹ پڑے گی...... کم از کم آج تو ضرور ہی...... سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے...... کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے... اس تکلیف دہ حالت سے...... مر جانا کہیں زیادہ آسان تھا۔

لیکن فی الوقت حقیقت یہ تھی کہ مرنے کا سکھ اتنی جلدی کہاں نصیب ہوتا ہے...... زندگی...... خوش آمدید...... کہ تجھے سہنا ہی پڑتا ہے...... چاہے پنجوں کے بل گزارنی پڑے، تجھے گزارنا ہی پڑتا ہے...... تو زندگی تجھے خوش آمدید......

☆☆☆

اور پھر یوں ہوا کہ اس خواب نے...... اسے اسیر کر لیا۔ وہ اسی خواب کے ہاتھوں جیسے گرفتار ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے اندر محض اس خواب نے اتنی بے چینی، اتنی بے قراری بھر دی تھی کہ یوں لگتا تھا کہ اسے آگ کے شعلوں پر کھڑے رہنے کا حکم صادر ہو گیا ہو۔

وہ گاڑی لے کر نکل جاتی اور کہاں، کہاں کی خاک نہیں چھانی تھی... اس نے...... عاملوں، پیروں، فقیروں، بابا لوگوں کے ہاں...... مسجدوں کے

مولوی...... گھروں میں درس قرآن پڑھانے والی عورتیں...... دم درود کرنے والے اور والیاں کہاں، کہاں کی خاک نہیں چھانی تھی اس نے...... محض اس خواب کی تعبیر کے لیے...... لیکن...... تعبیر...... ابھی نہیں علم میں آنی تھی...... ابھی جاننے کا وقت نہیں آیا تھا۔

سو جتنی بھی خاک چھان لیتی...... در بدر پھر لیتی...... پاؤں خاک آلود کر لیتی...... تعبیر گر نہیں ملنا تھی ......تو نہیں ملنا تھی......

وہ سب جگہیں جہاں پر وہ تعبیر کی تلاش میں گئی تھی...... یہ نہیں تھا کہ وہاں سے کچھ ملتا نہ تھا...... سب کچھ نہ سہی کچھ تو ضرور ہی کہتے تھے۔ جادو ہے، تم دونوں پہ کسی نے کروا رکھا ہے...... سخت آفت آنے والی ہے۔ تمہیں کوئی بڑی بیماری لاحق ہونے والی ہے اور تمہارا منگیتر تمہیں چھوڑ جائے گا...... تم مرنے والی ہو...... چھوڑ و بی بی کچھ بھی نہیں ہے...... شیطان کا وسوسہ ہے اور بس...... صدقہ خیرات کیا کرو...... نماز پڑھا کرو اور پردے کی پابندی کیا کرو...... اور ہنیا کو اچھی طرح سے سمجھ میں آ گیا تھا کہ جتنے منہ ہوتے ہیں ناں تو اتنی ہی باتیں بھی ہوتی ہیں۔

کسی دو کی رائے تو آپس میں ملتی ناں...... کچھ تو تسلی، سکون ذرا سی راحت کا سامان ہوتا...... مگر یہ ہوتا تو کیسے ہوتا کہ ابھی یہ نہیں ہونا تھا۔

”ہنیا کہاں ہے کافی دنوں سے اس نے چکر ہی نہیں لگایا۔“ عنبرین کے اسپتال آنے پر سمیعہ نے مسکرا کر مگر پریشان لہجے میں پوچھا تھا۔

”کیا......؟“ عنبرین کو ٹھیک ٹھاک جھٹکا لگا تھا۔

”وہ تو روز گاڑی لے کر نکل جاتی ہے۔ میں سمجھی یہیں آتی ہوگی۔ وہ یہاں نہیں آتی ہے؟“ وہ حیران تو تھیں ہی...... پریشان بھی کچھ کم نہ ہوئیں۔

”نہیں...... وہ یہاں تو کافی دن سے نہیں آئی۔“ سمیعہ الٹا تعجب سے بولی تھیں۔

”میرے خدا...... تو پھر وہ جاتی کہاں ہے؟“ عنبرین اب تشویش سے کہہ رہی تھیں۔

سمیعہ انہیں کیا جواب دیتیں...... وہ تو خود لاعلم تھیں اور پھر اس دن...... جب وہ تھک ہار کر گھر آئی تو...... شانوں پہ دوپٹا پھیلا ہوا...... مگر دوپٹے کے پلو برابر نہ تھے۔ شانے ڈھلکے ہوئے، بالوں کی چٹیا شاید کئی دن پہلے بنائی گئی تھی...... لباس کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی...... دونوں ہاتھ پہلو میں گرے ہوئے اور بائیں ہاتھ میں ہینڈ بیگ کا اسٹریپ اور بیگ لٹکتا ہوا زمین کو چھو رہا تھا۔

”تم کہاں تھیں ہنیا؟“ اور اس سخت اور چبھتے انداز میں پوچھے جانے والے سوال پر اس نے تھک کر ماں کو دیکھا۔

”اسپتال......“ اس کا گلا بیٹھا ہوا تھا...... وہ یقیناً روتی رہی تھی۔

”میں ابھی اسپتال سے ہی آئی ہوں......“ انہی چبھتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے عنبرین بولی تھیں۔

اور ہنیا نے بے ساختہ گلے سے کچھ نیچے اتارا...... چہرے پہ کوئی اور تاثر نہیں ابھرا تھا۔ وہی تھکن کا سا تاثر جم کر رہ گیا تھا۔

”تو تم اب جھوٹ بولو گی ہم سے؟“ اور ان کا لہجہ منہ پر تھپڑ مارتا تھا۔

”امی پلیز...... میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔“ اس نے بیچارگی سے جواب دیا۔

”حالت دیکھی ہے اپنی...... کیا سے کیا ہو گئی ہو...... تم واحد، اکلوتی اولاد ہو ہماری...... آگ میں نہیں پھینک سکتے تمہیں...... آئی سمجھ......؟“ اٹھ کر بے اختیار اس کی طرف آتے ہوئے انہوں نے دانت پیس کر کہا...... نہ صرف کہا بلکہ اس کی کہنی پکڑ کر ایک جھٹکا بھی دیا تھا۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھتی رہی...... یوں جیسے سمجھ ہی نہیں پائی ہو۔

”آپ کیا کہہ رہی ہیں امی......؟“

عنبرین نے سختی سے اس کے دونوں شانوں کو تھاما۔

”وہ دنیا میں آخری بچ جانے والا مرد نہیں...... جس کے لیے تم یوں خوار ہوتی رہو...... حالت دیکھو ذرا

اپنی...... ٹھیک ہے اتنی لمبی کورٹ شپ میں اٹیچمنٹ ہو ہی جاتی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ یوں زندگی کو برباد کر کے رکھ دیا جائے۔''

اور اس کی حیرت و ناسمجھی کی کیفیت ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ لیکن نہیں ہو سکی تھی۔

''امی.. آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟'' اور عنبرین نے ایک نظر اسے دیکھا اور اس کے شانوں پر سے اپنا دباؤ ہٹا لیا۔ انہوں نے ذرا توقف کا مظاہرہ کیا۔

''تمہارے ابو اور میں نے یہ ہی فیصلہ کیا تھا کہ ہم وقت گزرنے کا انتظار کریں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ حیدر کس قدر سنبھل سکتا ہے، اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کریں گے...... چھ ماہ گزر چکے ہیں ہنیا اور وہ ابھی تک اسٹیبل نہیں ہو سکا...... ہو گا بھی یا نہیں...... کیا کہہ سکتے ہیں...... تمہاری...... صرف اور صرف تمہاری اٹیچمنٹ کی وجہ سے ہم کچھ اور دیر انتظار کریں گے...... اس کے بعد بھی وہ ٹھیک نہیں ہوا تو ہنیا...... زندگی ایک اسی شخص پہ ختم نہیں ہو جائے گی۔ ایک دوسرے نسبتاً بہتر راستے کی گنجائش اور موقع...... ہمیشہ انسان کے پاس ہوتا ہے...... ہم تمہاری زندگی برباد نہیں ہونے دیں گے۔ اور چاہے یہ تم خود ہی کیوں نہ کرنا چاہو......'' ان کا لہجہ مضبوط تھا اور لہجے کی مضبوطی بتاتی تھی کہ فیصلہ اٹل تھا۔

وہ گر پڑنے کے سے انداز میں دو قدم پیچھے کو ہٹی...... بیگ ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر بے یقینی...... یک دم اچانک سارے لفظوں کو ہڑپ کر گئی تھی۔

تنفس، اپنی نارمل رفتار برقرار نہیں رکھ پایا تھا...... وہ کچھ کہنا چاہتی تھی...... مگر ہونٹ لرز کر رہ گئے...... بار، بار گلے کو تر کرنے کی کوشش میں وہ کچھ اور خشک ہو جاتا تھا۔

وہ، وہیں سیڑھیوں پر ہی ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے معلوم ہوا تھا کہ آنسو جب بہہ جاتے ہیں تو کمال کرتے ہیں...... اور جب یہ نہیں ہوتا تو تب بھی کمال ہوتا ہے...... اس نے اچھی طرح سے جان لیا تھا۔

''ہنیا...... ہنیا......'' عنبرین نے گھبرا کر اس کا چہرہ تھپتھپایا تھا اور اس نے تنفر سے ان کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

☆☆☆

ثنا سیدھی اس کے کمرے میں گئی تھی۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ کیپٹن صاحب دھوپ انجوائے کرنے باہر لان میں گئے ہیں۔

وہ دبئی میں تھیں جب یہ حادثہ ہوا تھا اسے کہیں سے معلوم ہوا تھا۔ مگر یوں اب تک آنا اس کے لیے ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اپنی پہلی فرصت میں اسے دیکھنے آ گئی تھی۔ سن گلاسز لگائے لان کے کنارے پر کھڑے ہو کر اس نے حیدر کو ڈھونڈنا چاہا تھا۔ اور اس کام کے لیے اسے ذرا سی بھی مشکل کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس وقت اسپتال کے لان میں ایک ہی وہیل چیئر موجود تھی۔

وہ یک دم قدم آگے نہیں بڑھا سکی تھی۔ گاگلز کے پار اک بے اختیاری کے عالم میں...... اِک دل کو جکڑ کر رکھ دینے والی کیفیت کے ساتھ وہ حیدر کو دیکھتی رہی تھی۔ آنسو پھسل کر ٹھوڑی تک آ گئے تھے...... چند ثانیے بعد اس نے گاگلز اتارے...... ہاتھ سے اپنے گالوں کو صاف کیا...... آسمان کی طرف منہ کر کے ایک گہری سانس لی اور خود کو اس تکلیف دہ لمحے سے گلے ملنے کے لیے تیار کیا تھا۔

''واہ...... کیپٹن صاحب' آپ چلتے تھے تو اِک عالم فنا ہوا کرتا تھا۔ آج اِدھر بیٹھ کر کتنوں کے دلوں کو برباد کرنے کا ارادہ ہے؟'' وہ بہ مشکل خوشگوار انداز میں بولتی ہوئی، مسکراتی ہوئی حیدر کے سامنے آئی تھی۔ اک عرصہ ہو گیا تھا ثنا سے ملے ہوئے...... حیدر نے فوراً آواز نہیں پہچانی تھی...... سورج کی روشنی کی وجہ سے اسے آنکھیں میچ کر سامنے کھڑے وجود کو دیکھنا پڑا تھا۔ اور نظروں نے ایک مسکراتی' بے حد سفید رنگت والی لڑکی کو دیکھا تھا...... جس کی نظروں میں افسوس تھا نہ ہمدردی بس اِک ملاحت تھی جو کہ برس' برس جاتی تھی۔

''اوئے تم...... ثنا تم یہاں کیسے......؟'' وہ بے یقینی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

طور پر خوش ہوا تھا۔

''کیسے ہیں آپ؟'' ثنا ہنستے ہوئے کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

''تمہارے سامنے ہوں۔''

''کتنی لڑکیوں کو پٹا چکے ہیں اب تک......؟ سنا ہے اِک عرصے سے یہیں پہ پڑاؤ کر رکھا ہے...... کمرا تو روز سرخ، سرخ گلابوں سے بھر جاتا ہوگا...... ہے ناں...... !'' وہ ذرا سی آگے کو جھکی شرارت بھری راز داری سے پوچھ رہی تھی۔ اور وہ کھل کر ہنس پڑا۔

''تم تو جانتی ہی ہو...... میں تو محض تم سے ملنے...... پیزا شاپ تک آیا کرتا تھا...... اور تم نے شادی کر کے ایسا دل توڑا کہ بس کمرا اب سرخ گلابوں سے بھرے یا پیلے پھولوں سے۔ زندگی میں وہ مزہ اب کہاں......'' سیر کو سوا سیر ٹکرا تھا۔

ثنا قہقہہ لگا کر ہنسی تھی۔

''خیر ہے کیپٹن صاحب......؟ اتنے پھیل کیوں رہے ہیں...... اور وہ آپ کی big cry baby کہاں ہے؟ آ کر ذرا آپ کو لگام تو دے...... اس نے ایک ہی نظر دیکھنا ہے اور آپ نے اس بات سے.... بھی مکر جانا ہے کہ سامنے کرسی پر کوئی لڑکی بھی بیٹھی ہوئی ہے اور چاہے وہ ثنا ہی کیوں نہ ہو۔'' حیدر کی مسکراہٹ ذرا سی سمٹی تھی۔

''تم سناؤ...... ہزبینڈ تو روز مار کھاتا ہوگا تم سے......''

''توبہ کریں...... اس ایک بات کی تیاری آپ کر چھوڑیں...... ہاتھ بڑا بھاری ہے اس کا...... اس نازک سے کندھے نے بڑے وار سہہ رکھے ہیں۔'' وہ اب اپنے کندھے کو تھپتھپا کر بولی تھی۔ شگفتگی عروج پر تھی۔

''چھوڑو یہ باتیں ہوتی رہیں گی، کیا لوگی؟ چائے یا کافی......؟''

''کچھ بھی پلا دیں فی الحال...... میں تو کھانا کھا کر جانے کے موڈ میں ہوں۔'' بیگ کو کرسی کے پاس نیچے رکھتے ہوئے وہ کرسی پر ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی تھی۔

شام عید

دردبھرا دن گزرا ہے
کرب کی شام گزاری ہے
اُڑ گئے آس کے سارے پنچھی
تھے منتظر گل و گلزار
اوڑھ لیا سب نے اداسیوں کا پیراھن
بنا کے اشکوں اور آنسوؤں کے ہار
دم توڑ گئے لمحے انتظار کے
سنواری تھی زندگی نے جو
مرادوں کی آکاس بیل
ڈھل گئی وہ
یاس و ناامیدی کے سائے میں
تب ہم نے بھی تھک ہار کے
لگا کے سینے سے تصویر تیری
خود کو بہلا کے بن تیرے
ساعتِ شامِ عید نکھاری ہے
یوں عید ہم نے گزاری ہے

کاوش: فصیحہ آصف خان، ملتان

غزل

بات یہاں بے بات بنائی جاتی ہے
کب کوئی الجھن سلجھائی جاتی ہے
شہر میں خاموشی ہے جیسے قبرستان
پھر بھی یہاں کیوں آگ لگائی جاتی ہے
خوشبو کی حسرت میں تڑپا دل میرا
غیروں کی بستی مہکائی جاتی ہے
ظلمت بانٹنے والوں کا دیکھو یہ فریب
صبح ہمیں پیہم دکھلائی جاتی ہے
باغ فرح کو سبز لگیں اچھے کیسے
رنگ دِگر میں ہر شے پائی جاتی ہے

فریدہ لاکھانی فرح۔ سڈنی، آسٹریلیا

حیدر نے مسکرا کر اپنے اٹینڈنٹ کو اشارہ کیا تھا۔

”ہنیا ہے کہاں؟ کافی دنوں سے میرا ابھی رابطہ نہیں ہوا...... آج آئے گی اِدھر؟ یا ہو کر چلی گئی؟“

”تم بیٹے کو ساتھ نہیں لائیں...... سنا ہے باپ پر نہیں گیا...... سو بے حد ہی کیوٹ ہوگا......“ اور اس ایک بات پر ثنا ہنس نہیں سکی تھی...... اس نے الجھ کر حیدر کو دیکھا تھا...... وہ مسلسل ہنیا کے ذکر کو اوائڈ کر رہا تھا۔

"some thing wrong Haider"

تشویش سے کہتے ہوئے یک دم وہ کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھی تھی۔

”نہیں...... اب ایسا بھی کچھ غلط نہیں ہوا۔“ بے پروائی سے...... ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا گیا۔ ثنا کا دل دھک کر کے رہ گیا تھا۔ جو ذہن میں امڈ، امڈ کر آ رہا تھا...... یقین کر لیے جانے کے قابل نہیں تھا۔

”ہنیا اسپتال نہیں آتی؟“ اور جب وہ یہ پوچھ رہی تھی تو دھڑکنیں ارتعاش کی بدترین حالت میں تھیں۔

حیدر آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھتا رہا اور پھر گہری سانس بھر کر نظریں پھیریں۔

”آئی تھی۔“ اس نے مدھم لہجے میں جوب دیا۔

”تھی......؟ کیا مطلب تھی؟ اور آئی تھی...... تو کیا وہ اب نہیں آتی......؟“

"Haider what,s wrong yaar"

اور ثنا یک دم...... قابو سے باہر ہو کر لاؤڈ ہوئی تھی۔

☆☆☆

امی کی بات کا یہ اثر ہوا کہ اس نے روزانہ اسپتال جانا شروع کر دیا تھا...... اور یہ اس کے غصے کا اظہار تھا...... لیکن اسپتال جا کر ہوا کیا تھا؟ اس نے حیدر کو بیک بون پین کی وجہ سے پسینے میں نہاتے دیکھا تھا، کراہتے دیکھا تھا، وہ ہراساں ہو جاتی...... منہ پر ہاتھ رکھ کر سسکیاں دباتی اور کمرے سے باہر نکل جاتی پھر سارا وقت وزیٹرز لاؤنج میں بیٹھے گزار دیتی...... سمیعہ آتیں...... اسے دلاسے دیتیں کہ ”اب ٹھیک ہے، ڈاکٹرز نے انجیکشن دے دیا ہے۔ تم ایک دفعہ اس سے مل لو......“ لیکن وہ...... نفی میں سر ہلاتی رہتی۔

اس نے حیدر کو بیڈ سے اٹھنے اور اٹھ کر بیٹھنے سے بھی معذور ہوتے دیکھا تھا۔

دو، دو لوگ اسے سنبھالتے تھے...... سمیعہ اور کرنل صاحب الگ سے تھے اور کبھی عادل بھی...... کبھی یوں بھی ہوتا...... وہ کمرے کی کسی دیوار سے ٹیک لگائے یک ٹک اسے دیکھے جاتی۔

سمیعہ اسے سیریلز کھلاتیں، اس کا منہ صاف کرتیں...... اس سے چھوٹی، چھوٹی باتیں کرتیں اور وہ بے حسی سے محض دیکھتی رہتی۔

”ممی اسے کہیں کہ یہاں مت آیا کرے......“ حیدر نے ایک دن شاؤٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”تماشا دیکھنے آتی ہے کیا؟“ وہ پھٹ پڑا تھا۔

اور ہنیا منہ پر ہاتھ رکھے روتے ہوئے کمرے سے باہر بھاگ گئی تھی۔ حیدر سے کچھ کہتی، کچھ بولتی، تسلی کی بات اس کے ساتھ کھڑے ہونے کا اظہار...... لفظ اپنے اندر اتنی ساری انرجی رکھتے ہیں کہ کیا کسی دوا یا انرجی پیک میں ہوگی۔

”لفظ اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ اپاہج خود کو ٹانگوں پر کھڑا محسوس کرتا ہے۔ وہ روح رکھتے ہیں جو کہ جب پھونکی جاتی ہے...... تو وجود زندگی کو جان لیتا ہے...... لفظ معجزہ ہیں...... وہ شفا والی پھونک ہیں کہ جس سے کوڑھ، جذام جیسی تکلیف بھی رفع ہو جاتی...... اور جہاں لفظوں کی ضرورت ہوتی ہے پھر وہاں خاموشی، کم ہمتی کی بدترین مثال بن جاتی ہے...... خاموشی پھر وہاں زہر قاتل بن کر رہ جاتی ہے۔ انفیکشن کی سی شکل اختیار کر لیتی ہے خاموشی سے کام سنورتے نہیں...... بگڑتے ہی ہیں...... کبھی وہ گود میں ہاتھ رکھے۔ ان پر نظریں جمائے...... عجیب گم صم سے انداز میں بیٹھی رہتی تھی...... بالکل ٹھس ہو کر...... حیدر کے دل کی دھڑکن اکثر تیز ہو جایا کرتی تھی اتنی کہ وہ شدید گھبراہٹ کا شکار ہو جاتا تھا...... تنفس بگڑ جاتا، پسینے میں نہا جایا کرتا تھا۔ وہ نرسوں کو بھاگتے دیکھتے رہتی...... ڈاکٹر کو تیزی سے

آتا دیکھتی رہتی...... اس کے بازوؤں میں...... سوئیاں کھبتی دیکھتی اور اسے ذرا سی بھی تکلیف کا احساس نہ ہوتا...... بزدل...... کم ہمت...... بے حس......

تب اس کو یہ ہی تین نام دینے کو دل کرتا تھا۔

سمیعہ کو بھی اب اس پر غصہ آنے لگا تھا۔ وہ ریلیف نہیں...... تکلیف کا باعث بن رہی تھی...... سب کچھ ہوتا یوں دیکھتی رہتی جیسے سامنے کوئی تین سوا تین گھنٹے کی فلم چل رہی تھی اور بس......

کرنل صاحب بھی پیار سے، نرمی سے، دبے، دبے لفظوں میں اسے آنے سے منع کر چکے تھے۔ وہ اس کے ماں، باپ کا رویّہ جانچ رہے تھے اور بہت اچھی طرح سے جانچ رہے تھے۔

لیکن ہنیا کو تو جیسے آسیب نے جکڑ لیا تھا۔ گھر والوں سے لڑ کر آئی تھی اور یہاں جس کے لیے آتی تھی۔ تو اس کے لیے کیا کرتی تھی......؟ وہ بھی ایسا ہی ایک دن تھا...... وہ کچھ بھی تو نہیں کر پاتی تھی۔ وہ یوں ہی کمرے میں رکھے صوفے پر گم صم ہاتھوں پر نظریں جمائی بیٹھی تھی۔ سمیعہ کو اس دن محسوس ہوا کہ شاید وہ حیدر سے اکیلے میں کچھ کہنا چاہتی ہو...... یوں سب کے سامنے وہ نہ کہہ پاتی ہو...... تو وہ اسے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھیں...... اور اسے...... اسے یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کمرے میں اکیلی ہے۔

حیدر اب نسبتاً بہتر حالت میں تھا......

وہ چند لمحے اسے نظریں جھکائے بنا دیکھتا رہا...... سوچتا رہا، جانچتا رہا۔

”ہنیا......“ اس نے پکارا اور وہ بری طرح سے ڈر کر متوجہ ہوئی تھی۔ اس نے حیدر کو دیکھا اور پھر خالی رہ جانے والے کمرے کو......

”اِدھر آؤ......“ حواس بحال کرنے میں تھوڑا وقت صرف ہوا...... اور وہ پھر اسی ٹھس سے...... بے حس سے انداز میں اٹھ کر اس تک آئی تھی۔

”اپنا ہاتھ دکھاؤ ذرا......“ اور حیدر کے اس لہجے پہ ساری بے حسی بھک کر کے اڑ گئی تھی۔

”حیدر، میں...... میں بہت تھک گئی ہوں...... مجھ سے اور لڑا نہیں جاتا...... یہ، یہ کیا ہو گیا ہے۔“ وہ اچانک ہی کہہ کر...... سسک کر، رو پڑی تھی۔

حیدر نے رخ بدل لیا...... اس کا رونا بے اثر تھا۔

وہ یوں ہی روتی رہی......

”اپنا ہاتھ دکھاؤ ہنیا......“ تھوڑی دیر بعد ہی اس نے...... اسی لہجے میں وہ ہی سوال دُہرایا تھا۔

ہنیا کے آنسو تھمے...... دل دھک کر کے رہ گیا......

وہ ایسا کیوں کہہ رہا تھا...... کیوں؟ اس نے اپنا لرزتا ہاتھ آگے کیا تھا...... وہ ہی کہ جس میں ڈائمنڈ رنگ پہن رکھی تھی۔

حیدر نے رک کر اس کے کانپتے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پڑی اس انگوٹھی کو دیکھا تھا۔ وہ انگوٹھی نہیں تھی...... تعلق تھا...... رشتہ تھا...... مان تھا...... وہ انگوٹھی نہیں تھی...... وہ، محبت تھی...... محبت کی علامت تھی۔

لمحے سرک، سرک کر اپنا وجود کھونے لگے تھے۔ اور وہ اس کے لرزتے ہاتھ کو، اس رِنگ کو دیکھتا رہا...... بڑی ہمت چاہیے تھی۔ بڑی ہمت اس ایک کام کے لیے......

لیکن...... حیدر نے اپنا سیدھا ہاتھ بڑھایا...... شہادت کی انگلی اور انگوٹھا...... رنگ کے اوپر نیچے رکھتے ہوئے اس نے وہ رنگ اتاری...... مٹھی میں اسے لیا اور سر تکیہ پر گراتے ہوئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”تم اب جاؤ ہنیا......“ اس نے مدھم آواز میں کہا۔

ہنیا کی نظریں ابھی تک اپنے ہاتھ کی انگلی پر ہی تھیں۔ وہاں اب رنگ نہ تھی...... مسلسل اسے پہنے رکھنے کی وجہ سے ایک نشان سا باقی رہ گیا تھا۔ اور وہ اسی نشان کو دیکھے جا رہی تھی کہ اس نے وہ جملہ سنا......

”تم اب جاؤ ہنیا......“

اور اس آواز پر اس نے سر اٹھا کر حیدر کو دیکھا تھا۔

وہ کتنی دیر اس کے زرد پھیکے، کمزور، نقاہت زدہ چہرے کو دیکھتی رہی...... اور پھر بے یقینی سے دوبارہ اپنے ہاتھ کو دیکھا۔

”سب کچھ...... سب کچھ ختم ہو جاتا...... ختم کر

دینا اتنا آسان تھا کیا……؟ اتنا ہی……؟" اس کا ہاتھ پہلو میں جا گرا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا…… کیوں کیا حیدر……؟" مارے رنج کے آواز ہموار نہ نکل سکی تھی۔ وہ تلخی سے مسکرایا، اسے دیکھا یوں جیسے کسی بچے کی احمقانہ بات پہ اسے دیکھا جاتا ہے۔

"جب کبھی زندگی کو سمجھنے کے قابل ہوئیں ناں تم…… تو تب…… ٹھیک تب تم یہ سوال خود سے کرنا…… جواب بڑی آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔"

اسے دیکھتے ہوئے…… اس لہجے میں کہا گیا کہ ہنیا نے خود کو عیاں ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ خود کو برہنہ ہوتا محسوس کیا تھا۔ اس چہرے کو یک دم باطن کی تہ سے ابھر کر…… ظاہر ہوتے دیکھ لیا تھا۔ جسے وہ ابھی تک خود سے بھی چھپائے ہوئے تھی…… اور اس کے جانے کے بعد حیدر نے مٹھی کھول کر ہتھیلی پر رکھی اس رنگ کو دیکھا…… "تو اسے کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ بائیں ہاتھ کو سامنے کرنے کا کہہ رہا تھا…… کیسے……؟"

تم سے الفت کے تقاضے نہ نبھائے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے
دل کے ماروں کا نہ کر غم کہ یہ اندوہ نصیب
زخم بھی دل میں نہ ہوتا تو کراہے جاتے
کم نگاہی کی ہمیں خود بھی کہاں تھی توفیق
کم نگاہی کے لیے عذر نہ چاہے جاتے
کاش اے ابرِ بہاری ترے بہکے سے قدم
میری امید کے صحرا میں بھی گاہے جاتے
لذتِ درد سے آسودہ کہاں دل والے
ہیں فقط درد کی حسرت میں کراہے جاتے
دی نہ مہلت ہمیں ہستی نے وفا کی ورنہ
اور کچھ دن غمِ ہستی سے نباہے جاتے
تم سے الفت کے تقاضے نہ نبھائے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

ایک تو ہوتی ہے محبت
اور ایک ہوتے ہیں اس کے تقاضے
اور محبت ہے کیا چیز…… خود اپنے ہی تقاضوں کے سامنے……

☆☆☆

دیکھنے والوں کو یوں ہی لگتا تھا کہ وہ زمین پر چلتی ہے، چلو ذرا سی چال ہی بے ڈھنگی ہے ناں…… رکھتی قدم تو زمین پر ہی ہے ناں…… لیکن یہ تو ہنیا ذوالفقار کو ہی معلوم تھا کہ وہ کس معلق کیفیت کا شکار تھی…… کیسی مشکل سے پیروں کو زمین پر جما کر رکھنے کے قابل ہوئی تھی۔

گاڑی تک بھی اللہ ہی جانے کیسے آئی…… کوئی غیبی مدد ہی تھی جو وہ گھر تک پہنچ گئی تھی اور سامنا ہو گیا تھا ماں اور باپ سے…… وہ اسے پریشرائز کرتے تھے کہ وہ اسپتال نہ جایا کرے وہ کسی قیمت پر بھی اس کی شادی حیدر سے نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بارہا اس سے یہ کہتے رہے کہ وہ حیدر کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی…… نہیں اٹھا پائے گی…… گھر سے لڑ کر جاتی، یہ کہہ کر جاتی، وہ یہ کر سکتی ہے، تعلق نبھا سکتی ہے۔

اور ہوتا کیا…… اسپتال کے بستر پر پڑے حیدر کی حالت اس کے منہ پر تھپڑ مارتی تھی…… چند لفظ بھی نکلتے نہ تھے…… اور وہ اسے سنبھالے گی؟ تعلق نبھائے گی؟ ہونہہ، بزدل، کم ہمت، بے وفا…… اور ہنیا نے ثابت کر دیا کہ ہاں وہ یہ بوجھ نہیں اٹھا سکے گی۔ وہ تھک جائے گی اور ایک وقت آئے گا جب وہ حیدر سے بیزار ہو جائے گی…… یہ ہونا تھا، ہو کر ہی رہنا تھا…… حیدر کی معذوری کسی تیسرے فرد کی طرح ان دونوں کے درمیان آ چکی تھی۔ اور حیدر…… اس نے کیسے جان لیا تھا؟

اس کی زندگی میں ایک رات آئی…… وہ ہی جو کہ بالوں کی سیاہی کو سفیدی میں بدل کر رکھ دیتی ہے…… اس رات نے اسے وہ نظر عطا کی کہ اس نے مستقبل کو دیکھ لیا…… ہنیا کو جانچ لیا اور اس کے اندر تک اتر کر اس کے ذہن کو پڑھ لیا تھا اس نے اس کا وہ چہرہ دیکھ لیا تھا کہ جو ہنیا نے خود بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک جذباتی، کمزور لڑکی تھی…… آسائشوں، سہولتوں کی عادی…… کم ہمت اور بزدل…… وہ مضبوط عورت

نہیں تھی۔ وہ سختیاں نہیں سہہ سکتی تھی۔ ایک فوجی کو کم از کم لائف پارٹنر کا انتخاب محبت کی بنیاد پر نہیں کرنا چاہیے۔ کم از کم ایک فوجی کو ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ہنیا کو کسی امتحان میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ کسی سخت صورتِ حال کے سامنے لا کھڑا کر دینا نہیں چاہتا تھا۔

وہ اپنے ساتھ اسے باندھ کر کیسے اس کی زندگی خراب کرتا...... وہ مجبور تھا...... زندگی کو سمجھتا تھا اور ہنیا کو بھی...... محبت تھی اس سے کوئی مذاق تھوڑی تھا۔ وہ عجب بے ہمتی سے ماں، باپ کو دیکھتی رہی۔

”خوش ہو جائیں آپ لوگ...... سب ختم، ختم سب......“ آواز بھرا گئی۔ لیکن اس نے آنسو نہ بہنے دیے۔

”ختم ہو گیا سب کچھ......“ حلق میں بے طرح سے کچھ چبھتا تھا۔ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی...... بے ڈول چال چلتی...... تھکے ہوئے انداز میں کسی بڑھیا کے سے انداز میں گرل کو تھام کر ایک، ایک سیڑھی چڑھتی گئی تھی...... حیدر نے اس کے لیے بہت آسان کر دیا تھا یہ کام...... دروازے کی ناب پہ ہاتھ جما کر دروازہ کھولا......

اور خالی سی نظروں کے ساتھ اپنے کمرے کو دیکھنے لگی تھی۔

پھر...... پھر یک دم اِک منظر اِک لمحہ...... اِک پل روشنی میں لپٹا ہوا...... اس کی آنکھوں میں، ذہن کے پردوں پر بلنک کرنے لگا تھا۔

”کارڈ......“ درشتی سے کہا گیا تھا۔

اور چند لمحوں میں حیدر کا کارڈ سامنے تھا۔

اس نے جھپٹ کر وہ کارڈ پکڑا تھا۔ مٹھی میں دبایا تھا۔

اور ہاتھ کی مٹھی میں ٹھیک اسی وقت وہ ہی چبھن تازہ ہوئی تھی...... اس نے آہستگی سے ہاتھ کو اٹھا کر سامنے کیا تھا۔ ہتھیلی نظروں کے سامنے پھیلائی تھی...... وہ اب خالی تھی...... بالکل خالی...... اس نے تو وقت کے ہاتھوں سے جگنو چھینا تھا۔ سیاہ بختی میں کب بدلا...... کب......؟ آنسو لکیروں کی صورت بہنے لگے

اور جب وہ یوں ہتھیلی کو پھیلا کر دیکھ رہی تھی...... تو نظروں کی گرفت میں انگلی کا نشان آیا تھا۔

اس نے ٹرانس کی سی کیفیت میں ہاتھ کو الٹا کیا...... نشان نہیں جایا کرتے...... داغ، زخموں کی گواہی ہوا کرتے ہیں...... وہ لڑکھڑا کر دیوار کے ساتھ جا لگی تھی۔ ہاتھ کے نشان پہ نظریں جمائے، وہ گھٹتی ہوئی نیچے بیٹھتی چلی گئی تھی۔ گھٹن بڑھ رہی تھی۔ دل پر دباؤ ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا...... وہ کیا تھا، کیا تھا وہ...... جو کہ جان لے لینا چاہتا تھا۔ وہ چیخ کر، دہاڑیں مار، مار کر رونا چاہتی تھی کہ آج محبت، حقیقت کے سامنے ہار آئی تھی وہ لیکن...... اس میں اتنی بھی ہمت اتنی سی بھی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ دہاڑیں مار، مار کر اِک محبت کو ہی رو لیتی...... اس نے تڑپ کر اس نشان پر اپنے ہونٹ رکھے اور بلک، بلک کر رو دی تھی۔ وفا بڑی سخت شے ہے...... اس کے لیے جان مارنا پڑتی ہے، یہ ہر کسی کے ماتھے پر یوں ہی نہیں چمکتی...... کہ اس کے لیے جان مارنا پڑتی ہے جان......

☆☆☆

ثنا کو حیدر نے کچھ نہیں بتایا تھا...... وہ سیدھی ہنیا کے پاس آئی تھی اور ہنیا...... اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر اِک پل کو ٹھٹکی اور پھر بے ساختہ اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔

”ثنا...... میں نے چھوڑ دیا اسے چھوڑ دیا......“ وہ بولتی جاتی اور روتی جاتی تھی۔ ثنا اس کی کہی بات کو سمجھ نہ سکی۔ اس نے زبردستی اسے خود سے الگ کیا...... اور کندھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کیا تھا۔

”کیا......؟ کیا کہا تم نے؟“ اور اب ہنیا اپنا جملہ دُہرا نہ سکی تھی...... اس نے تکلیف سے آنکھیں بند کی تھیں...... ثنا چند لمحے اسے دیکھتی رہی...... تعجب سے بے یقینی سے...... اِک دھچکا کھا کر......

”تم نے، تم نے......“ اور پھر وہ سر پکڑ کر بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھی تھی۔ یہ وہ آخری بات بھی نہیں تھی کہ جس کی توقع وہ کرتی...... ہنیا بھی اس کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ خاموش، سوگوار اور ثنا اب منہ پر ہاتھ رکھے بے حد رنجیدہ نظر آئی تھی۔

"کیوں.....؟" اس نے ہنیا کو دیکھے بغیر پوچھا۔

"امی اور ابو نہیں چاہتے تھے۔"

"اور تم.....؟" ثنا نے تیز لہجے میں اب کی بار اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

ہنیا نے بے اختیار حلق سے نیچے کچھ اتارا.....

"جب اس نے میرے ہاتھ سے رنگ اتاری تو ثنا ایک دفعہ میرا بھی جی چاہا کہ میں اس کا منہ نوچ لوں.....اس کی جرأت کیسے ہوئی مجھے خود سے دور کرنے کی.....کیسے؟ مگر میں نہ کہہ سکی معلوم ہے کیوں؟" اور ثنا نے اِک نظر اسے دیکھا۔ اور ہنیا نے منہ کھول کر آنکھیں بند کرکے اِک گہری سانس اندر اتاری۔

"اتنے بہت سارے دن اس کے ساتھ گزارنے کے بعد جب میں نے اسے بیڈ پر دیکھا، جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ خود سے کچھ بھی کرنے سے قاصر ہے تو ثنا.....مجھ پر یک دم اِک بڑا بھیانک انکشاف ہوا تھا۔ میں اسے سنبھال نہیں سکتی تھی۔ میں اس سے بیزار ہو جاتی ثنا، تھک جاتی.....اور جب میں اس سے بیزار ہو جاتی، تھک جاتی تو کیا یہ اس کے لیے زیادہ تکلیف دہ نہ ہوتا..... یہ زیادہ تکلیف دہ ہوتا ثنا..... میں اس سے شادی کے بعد بیزار ہو کر اسے چھوڑ دیتی۔"

اور ثنا.....اس نے بے حد عجیب نظروں سے ہنیا کو دیکھا تھا۔ وہ.....وہ ہنیا تو نہ تھی کہ جسے وہ بچپن سے جانتی تھی۔ ہاں یہ واقعی ہی میں وہ ہنیا نہ تھی۔ یہ اس کی ذات کا وہی پہلو تھا کہ جسے ہم اپنے آپ سے چھپا کر رکھتے ہیں اور عیاں نہیں ہونے دیتے کہ یہ ہم ہیں۔ ثنا اس کے چہرے کو دیکھتی رہی اتنی دیر کہ ہنیا کے نقش بگڑنے سے لگے تھے اور پھر بے حد تھک کر اس نے اپنی آنکھوں کو مسلا تھا۔ اپنا بیگ اٹھایا، اسے کندھے پر ڈالا اور وہ ہنیا کی طرف مڑی تھی۔

"تم نے بالکل ٹھیک کیا ہنیا..... بالکل ٹھیک، تمہاری جگہ کوئی بھی دوسری لڑکی ہوتی تو وہ بھی ٹھیک یہی کرتی سو تمہارا فعل اتنا قابل اعتراض نہیں ہے لیکن یو نو واٹ تم کبھی بھی.....اب کے بعد کبھی بھی ویسی خوشی، ویسی راحت، ویسا سکون اور ویسی محبت محسوس نہیں کر سکو گی، ہاں اب کبھی نہیں اور اس کا فیصلہ تم نے خود کیا ہے ہنیا.....تم نے خود۔" ثنا نے کہا اور کہہ کر رکی نہ تھی۔

ایک حقیقت یہ تھی کہ حیدر معذور ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ اب زندگی گزارنا مشکل تھا، آسان نہ تھا۔ ہاں یہ کٹھن تھا، بے حد کٹھن مگر دوسری حقیقت وہ تھی کہ جو ثنا اسے ابھی ابھی بتا کر گئی تھی۔ وہ اسے تصویر کا دوسرا رخ دکھا کر گئی تھی اور ہنیا.....اس میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس ایک بات پر پچھتا ہی لیتی اور کچھ نہ سہی وہ پچھتا ہی لیتی۔

میں نہ مل سکوں جو تم سے میری جستجو نہ کرنا
تمہیں میری ہی قسم ہے میری آرزو نہ کرنا

☆☆☆

اور جب مومی نے کسی لڑکی کو حیدر کی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے دیکھا تو وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کون تھی..... وہ کوئی اور نہیں ثنا تھی.....تب تک حیدر کو موٹرائزڈ وہیل چیئر نہیں ملی تھی۔ یہ بعد میں اسے آرمی نے دی تھی۔

ثنا جتنا عرصہ پاکستان میں رہی وہ مسلسل حیدر کو دیکھنے جاتی رہی.....اور کبھی بھولے سے بھی اس نے ہنیا کا ذکر نہیں کیا تھا۔ نہ کوئی بات پوچھی.....نہ وجہ دریافت کی۔

وہ جانتی تھی کہ اِک مقام آئے گا کہ وہ دونوں، وہ دونوں ہی اپنی زندگیوں کے اس شگاف کو پُر کرنے کے اہل ہو چکے ہوں گے.....گو کہ محبت کا دکھ، اِک نامعلوم کسک کی طرح ان کی زندگیوں پر حاوی رہے گا مگر پھر بھی وہ اپنی، اپنی زندگیوں کو نارمل طریقے سے گزارنے کے اہل ہو ہی جائیں گے.....تو اسے اس وقت کا انتظار تھا کہ جب زخم مندمل ہو جایا کرتے ہیں۔ تو ان دونوں نے ایک دوسرے کو چھوڑ دیا، چھوڑ دیا.....وہ کہ جو اِک دوسرے سے محبت کرتے تھے.....تو انہوں نے محبت کو چھوڑ دیا.....کیا واقعی.....؟

(باقی آئندہ)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

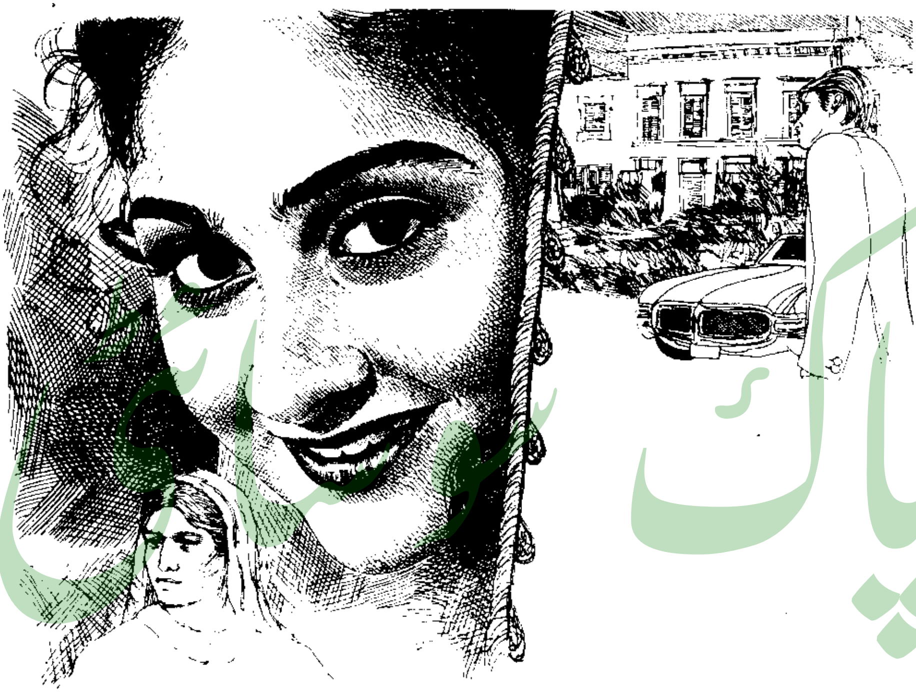

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

مہر ماہ

عقیلہ حق

آج عید کا دن تھا۔ ابھی، ابھی سب عید گاہ سے واپس آئے تھے، وہ چند لمحے تک ڈرائنگ روم کے باہر کھڑی گلاس ڈور سے اندر کا منظر دیکھ رہی تھی...... کچھ مرد انجانے بھی بیٹھے تھے...... وہ شش و پنج میں تھی اندر جائے یا نہیں......

پھر سب کے چہروں سے اس کی نظر پھسلتی ہوئی ان۔ کاغذوں پر جا ٹھہری جنہیں باہمی رضا مندی سے بھرا جا رہا تھا۔ اسے ایک لمحے کے لیے اپنی سانس رکتی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

کیسا لمحہ ہوتا ہے...... زندگی آر یا پار...... چند لمحوں میں حقدار بدل جاتے ہیں لیکن حقدار بدلنے سے پہلے اسے کچھ کہنا تھا، اس کی گرفت دروازے کے ہینڈل پر سخت ہوگئی پھر اس نے آہستگی سے دروازہ کھول کر کمرے کے اندر قدم رکھ دیا۔ سب بے حد محو تھے۔ کسی کو اس کے آنے کی خبر تک نہیں ہوئی۔

''میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

☆☆☆

''ویسے میری سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی۔''

''ایک بات؟ ارے میرے بھائی تمہاری سمجھ میں کبھی کوئی بات آئی بھی ہے۔ اور سمجھ میں آئے بھی کیسے...... سمجھ میں آنے کے لیے بھیجا ہونا چاہیے اور ماشاءاللہ تمہارا تو دماغ اوپر ہی رہ گیا اور تم نیچے چلے آئے۔''

''ایکسکیوزمی...... میڈم یہ آپ نے بھائی کس کو کہا......'' رضا نے مسلسل بولتی ندا کو ٹوکا۔

''محلے والوں کو، ارے تم کو کہا ہے اور کس کو......'' علی نے فلور کشن گھسیٹ کر سر کے نیچے رکھتے ہوئے مزہ لیتے ہوئے، آنکھ دبا کر کہا۔

''مجھ کو......'' اس نے سینے کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے درد بھرے لہجے میں ندا کو دیکھتے ہوئے علی سے پوچھا۔

''ہاں تجھ کو میرے بھائی تجھ کو اور اگر تجھ کو دل کا دورہ پڑ رہا ہے تو پلیز ڈیلے کردے کیونکہ آج کل شادیوں کا سیزن ہے ورنہ تیرے جنازے میں آج سارے مرد سوٹ اور لڑکیاں ماتھے پر بندیا سجائے، غرارے پہن کر گھوم رہی ہوں گی۔''

''بھاڑ میں جاؤ تم دونوں۔'' ندا جو ایک طرف بیٹھی بیڈ شیٹ کو پنیں لگا کر پلاسٹک میں پیک کر رہی تھی جل کر سارا کام ادھورا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی اور پیچھے رضا اور علی کا قہقہہ اس کا دور تک پیچھا کرتا رہا۔

☆☆☆

''ماشاءاللہ دلہن تم نے تو بہت تیاری کر رکھی تھی، واہ بھائی واہ......'' تائی اماں نے ٹرنک سے جوڑے نکالتی سلمیٰ بیگم سے توصیفی انداز میں کہا۔

''جی بھابی جان، ہماری اماں کہا کرتی تھیں بیٹی کے پیدا ہوتے ہی اس کی رخصتی کی تیاری شروع کردو...... اب حسن تو مجھ سے ہمیشہ کہتے تھے کہ بھئی ایک ہی تو میری بیٹی ہے کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی بس جب اس کی شادی کا وقت آئے گا آپ لسٹ بنا کر دے دینا میں خرید لاؤں گا...... لیکن میں بس سن لیتی تھی، ہم چھ بہنیں تھیں اور ہماری شادیوں پر ہمارے ابا کو صرف بارات کا کھانا یا فرنیچر کا انتظام کرنا پڑا۔ تار، تار ہماری اماں اللہ ان کو کروٹ، کروٹ جنت نصیب کرے نے گھر سے نکالا تھا۔'' سلمیٰ بیگم نے جیٹھانی اور دوسری گھر کی عورتوں کو بتایا۔

سلمیٰ بیگم اور حسن مرزا کی ایک ہی تو بیٹی تھی نتاشا...... نتاشا کی آج رخصتی تھی، بس کہتے ہیں ناں بیٹی کی بارات اور مہمان کی آمد کسی وقت بھی ہوسکتی ہے، صرف چار دن پہلے حسن مرزا کے دوست ان کے گھر آئے، برسوں سے وہ کینیڈا میں مقیم تھے، ان کا ایک ہی بیٹا تھا ڈاکٹر حیدر...... حیدر کینیڈا میں ایک معروف اور بے حد مصروف ہارٹ سرجن تھا۔ ان کی فیملی بس ملنے آئی تھی، وہ رمضان کا ستائیسواں روزہ تھا۔ اور عید کے دوسرے دن ان کی واپسی تھی انہیں نتاشا اس قدر پسند آئی کہ وہ افطار ڈنر نتاشا کی منگنی میں تبدیل ہوگیا اور جواد صاحب مع فیملی اس وقت تک نہ اٹھے جب تک دو دن بعد انہیں نکاح کی تاریخ نہیں دے دی گئی۔ کوئی بہانہ، کوئی حیلہ کام نہیں آیا۔ سلمیٰ بیگم اور حسن مرزا جوائنٹ فیملی سسٹم سے جڑے تھے سو اسی وقت سارے لوگ جمع ہوگئے اور یوں انکار کی کوئی گنجائش نہیں بچی۔

☆☆☆

محبت کدہ...... اختیار مرزا کا محبت کدہ تھا، ہزار گز کے وسیع رقبے پر پھیلے اس خوب صورت گھر کے چار حصے تھے، اختیار مرزا کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔

بڑے بیٹے عباد مرزا اور ان کی بیگم خدیجہ تھیں، ان

کے تین ہی بیٹے تھے۔ رضا...... جو ایم بی اے کرنے کے بعد ایک پرائیویٹ کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔

جواد...... جو ڈاؤ میڈیکل سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد آج کل ہاؤس جاب میں مصروف تھا اور سعد...... وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے UK میں تھا۔

منجھلے بیٹے سجاد مرزا کی دو بیٹیاں ندا، جویریہ اور ایک بیٹا ذیشان تھا۔ ندا کراچی یونیورسٹی کی طالبہ تھی، جویریہ کالج جاتی تھی اور ذیشان سی اے کر رہا تھا۔

سب سے چھوٹے حسن مرزا اور سلمیٰ بیگم کی بس ایک ہی بیٹی تھی نتاشا، جس نے اسی سال بی ایس سی کیا تھا۔ اختیار مرزا کی دونوں بیٹیاں، بھائیوں سے چھوٹی تھیں۔ فرحت خاتون اور مسرت خاتون گوکہ دونوں کی شادیاں ہم پلہ خاندانوں میں ہوئی تھیں لیکن پھر بھی اختیار مرزا نے گھر کے برابر میں ایک پانچ سو گز کا پلاٹ لے کر دونوں بیٹیوں کو بنوا کر دے دیا تھا۔ فرحت خاتون کی چار بیٹیاں تھیں، مسرت خاتون کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ یوں اختیار مرزا ایک درخت کی طرح اپنی ساری شاخوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ چند سال پہلے ہی یکے بعد دیگرے ان کا اور ان کی بیگم کا انتقال ہوا تھا...... اب گھر کے بڑے عباد مرزا تھے، ان کے فیصلے کی وہی حیثیت تھی جو اختیار مرزا کے فیصلوں کی تھی۔ سارا گھرانا بہت محبت اور اتفاق سے رہتا تھا، لوگ اس گھرانے کے اتفاق اور محبت کی مثالیں دیتے تھے۔

یہ اتفاق اور محبت ہی تو تھا کہ حسن مرزا اگرچہ بیٹی کی شادی چار دن میں کرنے کو تیار نہیں تھے لیکن بڑے بھائی اور بھابی نے سمجھایا کہ اچھے رشتے سے انکار کرنا بری بات ہوتی ہے اور بیٹی کی شادی کے اسباب اللہ خود پیدا کرتا ہے۔ یوں نتاشا جو کل موبائل فون سے بیٹھی سیلفیاں لے رہی تھی مایوں بٹھا دی گئی...... لیکن سلمیٰ بیگم کی تیاریاں دیکھ کر تو سارا خاندان ششدر رہ گیا، چار دن تو بڑی بات انہوں نے تو اس طرح بیٹی کا جہیز جمع کر رکھا تھا کہ چار گھنٹوں میں بھی عزت سے بیٹی کو بیاہ دیتیں۔

واقعی ایک سگھڑ عورت سارے خاندان کی آن ہوتی ہے سلمیٰ بیگم نے ثابت کر دیا تھا۔

☆☆☆

’’پتا ہے کتنی دیر ہوگئی تم لوگوں کو، سب بڑے ناراض ہو رہے تھے۔‘‘ نتاشا نے نمرہ سے کہا جو پارلر سے بالوں کو آئرن کروانے کے باوجود بار، بار بالوں میں کھڑی برش کر رہی تھی۔

’’یار تم ہی سوچو عین شب قدر میں تمہاری منگنی ہوئی، تمہاری منگنی نہ ہوئی پاکستان کی آزادی ہوگئی۔ پھر تم تو مزے سے ایک کونے میں جا بیٹھیں اور ہم نہ تو روزے چھوڑ سکتے ہیں اور نہ ہی تیاری۔‘‘ نمرہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر ایک بار پھر اپنے لمبے بالوں میں برش پھیرا۔

’’اور درد بھری کہانی یہ ہے کہ یہ لڑکے تو جا کر ہینگروں میں کب سے لٹکے سوٹ اور شیروانیاں خرید لیں گے لیکن ہم لوگ ......اُف ہم لوگ ہم کیا کریں، میرے ٹیلر نے تو عید کا جوڑا نہیں سیا...... وہ نتاشا کی بارات کا سوٹ اللہ کرے وقت پر دے دے......‘‘ ندا کا لہجہ ایسا پریشان تھا کہ نتاشا بے ساختہ ہنس دی۔

’’ہنسو، ہنسو...... خوب ہنسو پھر اپنے ڈاکٹر صاحب کو ہماری کہانیاں سنانا۔‘‘ عمیرہ، ندا کے ہنسنے پر جل ہی تو گئی۔

’’ارے بھئی نتاشا کو طعنے کیوں مارے جا رہے ہیں، تم اپنے ڈاکٹر صاحب کو سنا دو، میں تو تمہارے لیے ہنسنے کو بھی تیار ہوں اور رونے کو بھی۔‘‘ جواد نے بالکل وحید مراد کی طرح عمیرہ کی پشت پر سے گردن نکال کر کہا۔

’’یہ تم لوگ کہاں سے ٹپک پڑے۔‘‘ عمیرہ نے نک سک سے تیار لڑکوں کو دیکھ کر کلستے ہوئے کہا...... آج وہ لوگ حیدر سے ملنے اور اس کا سامان لے کر جا رہے تھے...... انہیں روزہ وہیں افطار کرنا تھا......

’’اور مسٹر نئے، نئے ڈاکٹر صاحب جتنا آپ سال بھر میں نہیں کماتے اتنا ایک درزی صرف رمضان میں کماتا ہے، آئی بات سمجھ میں۔‘‘ عمیرہ نے جل کر جواد کے بخیے اُدھیڑ دیے۔

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد
نمرہ احمد
فرحت اشتیاق
قُدسیہ بانو
نگہت سیما
نگہت عبدُاللّٰہ
رضیہ بٹ
رفعت سراج

صائمہ اکرام
سعدیہ عابد
عفت سحر طاہر
تنزیلہ ریاض
فائزہ افتخار
سباس گُل
رُخسانہ نگار عدنان
اُمِ مریم

عُشنا کوثر سردار
نبیلہ عزیز
فائزہ افتخار
نبیلہ ابر راجہ
آمنہ ریاض
عنیزہ سید
اقراء صغیر احمد
نایاب جیلانی

اشفاق احمد
نسیم حجازی
عنایت اللّٰہ التمش
ہاشم ندیم
مُمتاز مُفتی
مُستنصر حُسین
علیمُ الحق
ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

''سوچ لو ایک دن تمہیں اس ڈاکٹر کے پاس آنا ہوگا۔'' ذیشان نے جواد کا پسینہ پونچھتے ہوئے اسے سہارا دیا۔

''اللہ نہ کرے...... اور تم تو ذیشان دفع ہی ہو جاؤ، میری سمجھ میں نہیں آتا تم نے سی اے کیسے کرلیا۔ یقیناً تم وہی ہو، جن کی مارکس شیٹ چیک ہونے کے بعد جعلی نکلتی ہے۔''

''بھئی چلو دیر ہو رہی ہے...... ندا کہاں ہو تم، مجھ سے گاڑی کا گیئر نہیں بدلا جا رہا۔'' رضا نے کمرے میں داخل ہو کر، اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے بے قراری سے پوچھا۔

''افسوس رضا بھائی آپ کو دیر ہوگئی، ندا کافی دیر پہلے آپ کے ابا جان یعنی تایا ابا کے ساتھ جا چکی ہے اور اگر اب بھی آپ کی گاڑی کا گیئر نہیں بدلے تو آپ پلیز رکشے میں چلے جائیں......'' نتاشا نے پہلے کرن لگے دوپٹے سے سر کو ڈھانپتے ہوئے کشن کو واپس کاؤچ پر رکھتے ہوئے پریشان کھڑے رضا سے کہا۔

''اوہو...... بی مینڈکی کو بھی زکام ہوا......'' رضا نے محبت سے نتاشا کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میری بہن، گھر میں اِدھر اُدھر سے پتھر آرہے ہیں خدا کے واسطے ندا کو ان پتھروں سے بچاؤ، جب گھر میں مجھ جیسی اینٹ موجود ہے تو یہ بڑے باہر کے پتھروں کو کیوں منہ لگا رہے ہیں۔'' رضا نے اتنی بیچارگی اور بے بسی سے کہا کہ نتاشا بے ساختہ ہنستی چلی گئی اور پھر رضا بھی ہنس دیا۔

سب لوگ جا چکے تھے اور نتاشا مسکراتے لبوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ سارے گھر کو سمیٹتی پھر رہی تھی......

☆☆☆

''ماشاء اللہ بیگم صاحبہ کو شادی کے لیے آج ہی کا دن ملا تھا۔'' ساری لڑکیوں نے منہ بسورے۔ ''اور وہ حیدر بھائی جب ان سے کہا میرے بھائی اپنے ٹکٹ ذرا آگے کروا لو تو پتا ہے کیا جواب دیا محترم نے۔ کہنے لگے......'' ندا نے پھولی ہوئی سانسوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا۔

آج عید تھی...... نمازِ عید کے بعد نتاشا کا حیدر کے ساتھ نکاح تھا اور شام میں میریٹ میں اس کی بارات کا ڈنر تھا لیکن وہ تمام لڑکیاں اور بیچارے لڑکے بھی جو خاندان کی پہلی شادی کو بے حد انجوائے کرنا چاہتے تھے، الجھ کر رہ گئے تھے، لڑکے تو پھر بھی ریڈی میڈ لے آئے لیکن لڑکیاں جو شرارے، غرارے پہننے کے خواب دیکھ رہی تھیں سب بیچاریاں منہ لٹکائے پھر رہی تھیں، اوپر سے کسی کو ہیئر اسٹائل بنوانا تھا تو کسی کو میک اپ کروانا تھا اور پارلر رات بھر مہندی رت جگا منا کر بند پڑے ان کا منہ چڑا رہے تھے۔

''میں تو یہ کہہ رہی ہوں مامی جان جب آپ نے نتاشا کا جہیز جمع کیا تو بارات ولیمے میں پہننے کے لیے ہمارے جوڑے کیوں نہ صندوق میں رکھے۔'' نمرہ نے روتی صورت بنا کر الماری میں کچھ ڈھونڈتی سلمیٰ بیگم سے کہا تو وہ مسکرا دیں۔

ویسے سلمیٰ بیگم بہت کم مسکراتی تھیں لیکن آج کل مسکراہٹ جیسے ان کے چہرے پر چسپاں ہو کر رہ گئی تھی۔ انہوں نے پلٹ کر منہ بسورتی نمرہ اور باقی لڑکیوں کو دیکھا، تو ہنس دیں۔

''میری بچیوں تم بھی میرے لیے نتاشا جیسی ہی ہو، مجھے اندازہ ہوتا کہ نتاشا کا نصیب محاورتاً نہیں حقیقت میں چار دن میں کھلے گا تو یقین مانو، میں تم لوگوں کے کپڑے بھی تیار رکھتی لیکن بیٹا ماشاء اللہ ایک سے بڑھ کر ایک جوڑا ہے تم لوگوں کے پاس...... کوئی سا بھی پہن لو، ماشاء اللہ سب اچھی لگو گی۔''

''خیر کپڑے تو تم لوگ پہن ہی لوگی لیکن یہ تمہاری شکلوں کا کیا ہوگا؟ ان پر تو رمضانوں کی وجہ سے جو روزہ دار پر رونق آتی ہے، وہ بھی نہیں آئی، خدا کی قسم، مجھے یقین ہے تم لوگ تیار ہو کر بھی پہاڑی بکریاں ہی لگو گی۔'' جواد نے نمرہ کو دیکھتے ہوئے بلکہ دل ہی دل میں اسے سراہتے ہوئے چھیڑا۔ ''کاش نمرہ تم جان سکتیں تم کتنی پیاری ہو۔'' جواد سوچ کر رہ گیا۔

''تم تو خاموش رہو۔ نئے، نئے ڈاکٹر...... اور

یہ تم عیدگاہ سے اتنی جلدی کیسے آ گئے، مجھے یقین ہے تم گئے ہی نہیں، بس گلی کے نکڑ سے چکر لگا کر آ گئے ہو۔'' نمرہ جل کر بولی۔

''ارے بھئی پتا نہیں تم لوگ کہاں سے کہاں بات لے جاتے ہو، ہاں تو میں بتا رہی تھی۔'' ندا نے دونوں ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر نتاشا کی طرف دیکھا۔ ''پوچھو گی نہیں کیا، کہا حیدر بھائی نے؟''

''بتاؤ کیا کہہ رہے تھے وہ۔'' نتاشا نے شرماتے ہوئے پوچھا۔

''وہ......اوہو...... وہ، کس کے، کون کے...... نتاشا مجھے تم سے لفظ ''وہ'' کی امید نہیں تھی۔'' عمیرہ نے دائیں آنکھ دبا کر ہنستے ہوئے نتاشا کی کمر پر دھپ مارا۔

''ہائے......وہ۔''

''وہ دن کب آئے گا جب کوئی ہم کو بھی وہ کہنے والی آئے گی۔ جب کوئی سرہانے بیٹھ کر کہے گی، جلدی اٹھیے، میں آپ کے بغیر ناشتا نہیں کروں گی۔'' ذیشان نے لرزتے ہوئے دیوار کو تھاما اور پھر آنکھوں میں دنیا بھر کا درد بھر کر خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔

''دفع ہو تم سب...... میں اب کچھ بول ہی نہیں رہی، خدا کی قسم ایک بات کرنا، دشوار ہو گیا۔'' ندا جل ہی تو گئی۔

''خبردار جو کسی نے اب ایک لفظ بھی بولا...... اب جو بولے گا اسے میری لاش پر سے گزرنا ہوگا، ندا کو کوئی اکیلا نہیں سمجھے، میں ہوں ناں...... بولو ندا...... بولو۔'' رضا نے علاؤ الدین کی جذباتیت کو بھی پیچھے دھکیل دیا یقیناً اگر فلمی ناقدین اسے دیکھ لیتے تو.... اسے نگار ایوارڈ ضرور ملتا......

''تم تو اپنا منہ بند ہی رکھو......'' ندا جل کر بولی۔

''تو پتا ہے نتاشا، حیدر بھائی کہنے لگے، میں چاہے ٹکٹ چار ماہ آگے کروالوں لیکن نتاشا سے شادی ابھی ہی کروں گا۔ میں نے کہا اور جو ہم نہ کریں......تو کہنے لگے، نہ کریں آپ، میں نتاشا کو اٹھوالوں گا......''

ندا نے ہنستے ہوئے شرماتی، لجاتی نتاشا کو چھیڑا۔

''اوئے مستقبل کے دولھا بھائی نے ایسا کہا۔'' جواد چلّایا۔

''میرا گھوڑا نکالو، حیدر بھائی نے ہم سب کی غیرت کو للکارا ہے۔'' ذیشان باہر کی طرف دوڑا۔

اور نتاشا بے ساختہ ہنستی چلی گئی۔

☆☆☆

''آج کی عید بھی کتنی خوب صورت عید ہے، واقعی انسان کو نہیں پتا ہوگا اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے......ابھی چند گھنٹوں بعد نکاح اور پھر شام کو رخصتی......''

دل کی اتھل پتھل کچھ سوچنے ہی نہیں دے رہی تھی

''امی تو بالکل اکیلی رہ جائیں گی، بابا تو اس قدر مصروف رہتے ہیں میں انشاء اللہ روز......امی اور بابا کو فون کیا کروں گی......اور......''

''بیٹا چلو شاور لے لو......'' سلمیٰ بیگم کی آواز نے اس کی سوچوں کا تسلسل توڑ دیا۔

سلمیٰ بیگم ہاتھ میں نفیس سے کام والا گلابی رنگ کا سوٹ لیے کھڑی تھیں۔ سلمیٰ بیگم کے خاندان میں جب دلہن مایوں کا سوٹ اتار کر شاور لینے جاتی تو اسے گلابی رنگ کا جوڑا پہنایا جاتا جو پھر دلہن نکاح کے بعد بارات کے جوڑے سے بدل لیتی۔

نتاشا کو بے ساختہ اپنی ماں پر پیار آ گیا کہ انہوں نے اس کے لیے کپڑے، کپڑے گلابی سوٹ بھی تیار کروالیا تھا وہ کوئی ارمان کوئی کسر چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں...... وہ بے ساختہ آگے بڑھی اور ماں کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔

سلمیٰ بیگم آہستگی سے اس کی کمر سہلانے لگیں گو کہ آنسو ان کا بھی چہرہ گیلا کر رہے تھے، اکلوتی بیٹی کی رخصتی......کوئی مذاق نہیں تھا......

''ارے دلہن تم یہاں کھڑی ہو اور یہ نتاشا بیٹا تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں، بیٹا تیار ہو، نکاح کے پیپرز تیار ہو رہے ہیں، ابھی کچھ دیر میں تمہاری مرضی معلوم کرنے آنے والے ہیں، تمہارے ابا اور تایا وغیرہ۔''

خدیجہ بیگم نے پیچھے سے آ کر آہستگی سے سلمیٰ بیگم کی کمر تھپتھپائی تو وہ آہستگی سے اس سے علیحدہ ہو گئیں۔

''کیا کہا آپ نے بھابی جان...... نکاح کے پیپرز تیار ہو رہے ہیں۔'' سلمیٰ بیگم نے دوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف کرتے ہوئے خدیجہ بیگم سے پوچھا...... اور پھر ان کی نظر خاموش بیٹھی حناشا کے چہرے پر جم سی گئی۔

☆☆☆

''یہ ہوتی ہے شادی جس کے خواب لڑکی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی دیکھنے لگتی ہے، مائیں پیدائش سے لے کر اور رخصتی تک بس ایک ہی جملہ کہتی رہتی ہیں...... پرائے گھر جانا ہے، میاں کے گھر جا کر جو چاہے کرنا، میاں کا گھر اور میاں......''

اس نے بیڈ کے دوسرے کنارے پر تکیے پر سر رکھے اس خوبرو مرد کو دیکھا جو آج اسے بیاہ کر لایا تھا، اور پھر اپنا حق وصول کر کے انتہائی پُرسکون نیند سو رہا تھا۔

دراصل مرد نے عورت کے ساتھ سونا ہی سیکھا ہے جس دن مرد، عورت کے ساتھ جاگ لیا اس دن وہ عورت کو اور اس کے سارے دکھوں کو سمجھ لے گا...... وہ جو سیج پر بیٹھی اپنی مدح سرائی...... بہت سی محبتوں کا انتظار کر رہی تھی، خالی ہاتھ رہ گئی۔ اس نے کلائی میں پہنے ان کنگنوں کو دیکھا جو بظاہر اس کی منہ دکھائی تھی۔ پہلی، پہلی محبت کا پہلا، پہلا تحفہ تھا لیکن اسے وہ اپنی قیمت لگے۔ اس کی آنکھیں نہ جانے کیوں پانی سے بھر گئیں...... جنہیں وہ خوش اسلوبی سے پی گئی۔ اور یوں نئی زندگی کی ابتدا آنسوؤں کے پینے اور برداشت سے شروع ہو گئی۔

☆☆☆

یہ نہیں تھا کہ زندگی میں کسی نے اس کی طرف قدم نہیں بڑھایا تھا۔ اس کے ساتھ چلنے کی کوشش نہیں کی، اس کے قدموں تلے اپنا دل نہیں رکھا تھا۔ یہ سب ہوا لیکن وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو اپنے وجود کے ساتھ، ساتھ اپنے دل، جذبات، احساسات حتیٰ کہ الفاظ بھی اس انجانے شخص کے لیے سنبھال کر رکھتی ہیں جو اُن کی زندگی میں اللہ پاک نے لکھ دیا...... جو اُن کا شوہر ہوگا...... وہ اکثر کہتی کہ پاکیزہ مرد کی خواہش کرنے سے پہلے خود پاکیزگی کی سرحدوں پر کھڑے رہو...... یوں سارے ارمان و جذبات لیے...... آج جب وہ سیج پر آ کر بیٹھی تھی تو وہ بہت خوش تھی، یہ رشتہ اس کے ماں باپ کی پسند سے طے ہوا تھا اور وہ اپنے بڑوں کی رضا میں راضی تھی۔

لیکن ہر وقت کتابوں میں گم رہنے والی لڑکی یہ بھول گئی تھی ہر کسی کو پورا آسمان نہیں ملتا......

وہ زندگی سے بھرپور لڑکی تھی...... اس نے صرف محبتیں وصول کی تھیں۔ اسے سرد مہری، غصہ، شکایت اور نفرت جیسے لفظ کا تو پتا ہی نہیں تھا وہ ماں، باپ کی بہت پیاری بیٹی تھی۔ بے حد لاڈلی، بہت زندہ دل...... اور جب اس کا رشتہ ایک بھرے خاندان میں طے ہوا تو وہ بے حد خوش تھی، اسے رشتے ناتے اچھے لگتے تھے۔ لمبے، لمبے دسترخوان پر بیٹھے گھر کے افراد ہنستے مسکراتے چٹکلے چھوڑتے، کھانا کھاتے لوگ اسے اچھے لگتے تھے۔

لیکن اس کے میاں جی ویسے تو بہت با ادب، خوش اخلاق تھے لیکن نہ جانے کیوں اس کے ساتھ ان کا رویہ بہت سرد تھا، کمرے سے باہر اور کمرے کے اندر وہ دو مختلف شخصیتیں رکھتے تھے۔

''بیٹا، شادی کے بعد انا کو اٹھا کر گہرے سمندروں میں پھینک دینا۔ جو عورتیں انا کا طوق گلے میں لٹکائے پھرتی ہیں ان کے گھر نہیں ہوتے، وہ ساری زندگی مکانوں میں رہتی ہیں، تم گھر بنانا...... تاکہ گھر کی چھت کا تم کو احساس ہو اور اچھے گھروں میں ہی اچھی اولادیں پروان چڑھتی ہیں۔

دیکھو بیٹا ہم جب دوسرے گھر جاتے ہیں تو وہاں موجود ہر شخص کی اپنی جگہ اور اپنا مقام ہوتا ہے، نئی آنے والی لڑکی کو اپنی جگہ خود بنانی ہوتی ہے، اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم کہاں بیٹھنا چاہتی ہو، سب کے دلوں میں یا پھر گھر کے کسی کونے میں...... اور کوئی بھی مقام حاصل کرنے کے لیے قربانیاں دینی پڑتی ہیں...... اور

بیٹا جو لڑکیاں دس لوگوں کو بدلنے کی کوشش کرتی ہیں، وہ ہمیشہ ناکام رہتی ہیں۔ سارے گھر کو بدلنے کی کوشش میں ہلکان ہونے کے بجائے تم بدل جانا...... سسرال میں وہی لڑکیاں کامیاب ہوتی ہیں جو بغیر تردد کے اپنے آپ کو سسرال کے ماحول میں ڈھال لیتی ہیں۔“ وہ انہیں بغور سن رہی تھی۔

”ہم نے تمہیں بہت محبت سے پالا ہے۔ تم نے کہا دن تو ہم نے کہا دن، تم نے کہا رات تو ہم نے کہا رات...... لیکن بیٹا یہ تمہارے باپ کا گھر ہے جو چاہے محل ہو یا جھونپڑی۔ ہر باپ اپنی حیثیت اور استطاعت کے مطابق بیٹی سے محبت کا اظہار کرتا ہے...... تم اس گھر میں بیٹی کے عہدے کے ساتھ پیدا ہوئی تھیں لیکن اب تم جس گھر جا رہی ہو وہاں بیٹی پہلے سے موجود ہے تم بہو ہو، اب تمہیں وہاں کی بیٹی بننا ہے، کیسے بننا ہے اس کا فیصلہ تم خود کرو گی۔

”سسرال کی بات ہمیشہ سسرال میں چھوڑ کر آؤ گی...... جو لڑکیاں ہر بات آ کر میکے میں کہتی ہیں وہ کبھی بیٹیاں نہیں بنتیں وہ آخری سانس تک بہو رہتی ہیں اور تم جانتی ہو، بہو پرائی ہوتی ہے...... ہمیشہ اپنی مٹھی بند رکھنا کہ بند مٹھی لاکھ کی اور کھل گئی تو خاک کی۔“ وہ اپنی زندگی کا نچوڑ آج اپنی بیٹی کو دے رہی تھیں۔

”اپنی تکلیفیں، پریشانیاں اور مسائل کو خود حل کرنے کی کوشش کرنا کہ دشمن سنے گا تو خوش ہوگا اور جو دوست سنے گا تو رنجیدہ ہوگا تو کوشش کرنا کہ نہ دشمن کو ہنسنے کا موقع دو اور نہ ہی دوست رنجیدہ ہو...... جب کوئی پریشانی ہو کوئی مسئلہ ہو تو اس سے کہنا جس کے پاس سارے مسئلوں کا حل ہے اور وہ ہے اللہ رب العزت کی ذات...... تمہارا دولہا ساری زندگی ملک سے باہر رہا ہے، یقیناً اس کا مزاج بھی یہاں کے مردوں کے مزاج سے فرق ہوگا بیٹا اس فرق کو تم کیسے ختم کرتی ہو، برداشت کرتی ہو، نظر انداز کرتی ہو، یہ میری اور تمہاری امی کی تربیت کا امتحان ہوگا۔ کیونکہ ساری زندگی کی محنت اور تربیت کے بعد ہم تمہیں امتحان گاہ میں بھیج رہے ہیں، ضروری نہیں کہ پرچہ out of syllabus ہو لیکن پھر بھی تمہاری کامیابی ہماری سند ہوگی۔“ وہ خاموش بیٹھی ماں کی گفتگو صرف سن رہی تھی بلکہ لفظ لفظ جذب کر رہی تھی۔

☆☆☆

علی سامنے کاؤچ پر بیٹھے کوئی ٹاک شو اس قدر منہمک ہو کر دیکھ رہے تھے جیسے اس کمرے میں ٹی وی کے علاوہ کچھ نہیں اور وہ خوب صورت سے کپڑوں اور ہلکے، ہلکے میک اپ میں تیار بیٹھی شام سے علی کا انتظار کر رہی تھی، آنکھیں بند کر کے اپنے ابا کی وہ باتیں یاد کرنے لگی کہ جس دن اس نے مایوں کا پیلا کرن لگا دوپٹا پہنا تھا تو ابا اور اماں اس کے کمرے میں آئے تھے اور پھر ابا نے کپکپاتا ہوا ہاتھ اس کے جھکے ہوئے سر پر رکھ کر اس سے چند باتیں کرنے کی اجازت مانگی تھی۔

☆☆☆

”اوہو...... آج تو آپ بہت ہینڈسم لگ رہے ہیں...... چلیں مووی دیکھ کر آتے ہیں۔“ علی جیسے ہی گھر آئے اس نے بہت محبت سے ان کی کمر کے گرد بازو حمائل کر کے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”ہٹیں، مجھے کوٹ اتارنے دیں۔“ علی نے آہستگی سے اس کے ہاتھ ہٹائے۔

”نہیں بس کوئی چینج نہیں کر رہا بلکہ دیکھیے اسے کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے، آج میں نے بھی بلیک سوٹ پہنا ہے، میں نے امی جان سے بھی پوچھ لیا تھا، وہ کہہ رہی تھیں چلی جانا۔ چائے تیار ہے بس آپ چائے پی لیں پھر چلتے ہیں۔“ اس نے محبت سے علی کے کالر پر ہاتھ کی چاروں انگلیاں پھیرتے ہوئے ایک محبت بھرے استحقاق سے کہا۔

”کیا بچپنا ہے، میں بہت تھکا ہوا ہوں، آپ کو کہیں جانا ہے تو ڈرائیور ہے آپ چلی جائیں، پلیز میرے ساتھ یہ بچوں والی حرکتیں مت کیا کریں......“ علی نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ ہٹائے۔

چھناکے سے اس کا دل کرچی، کرچی ہوا۔ ایک،

ایک ٹکڑا جسم میں کھب گیا لیکن وہ خاموش رہی...... بلکہ کمال فنکاری سے اس نے زخمی مسکراہٹ کو جلد ہی ایک دل آویز مسکراہٹ میں بدل لیا۔

''چلیں کوئی بات نہیں، آپ چینج کر لیں، اچھا آپ سب کے ساتھ چائے پییں گے یا آپ کی چائے کمرے میں لے آؤں۔'' اس نے کمرے سے نکلتے، نکلتے پلٹ کر نرم مگر زخمی لہجے میں علی سے پوچھا۔

''نہیں، میں باہر آرہا ہوں۔ اماں، ابا میرا انتظار کرتے ہیں۔'' علی کہتا ہوا واش روم میں چلا گیا۔

''صرف امی......ابو......'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا آنکھ میں آیا آنسو دوپٹے کے پلو سے پونچھا، ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں برش پھیرا لپ اسٹک کا ہلکا سا شیڈ لگایا اور پرفیوم کا اسپرے کر کے کمرے سے باہر نکل گئی کہ وہ جانتی تھی۔ بند مٹھی لاکھ کی اور جو کھل گئی تو خاک کی......

☆☆☆

علی کا رویہ اس کے ساتھ بہت سرد تھا، کبھی، کبھی وہ علی کو ہنس کر چھیڑتی کہ اگر چار عورتوں کے بیچ میں مجھے کھڑا کر دیا جائے تو شاید آپ مجھے پہچان بھی نہیں سکیں گے کہ کبھی آپ نے اتنے غور سے تو مجھے نہیں دیکھا......اور علی اس کی بات کا جواب دینا بھی پسند نہیں کرتا۔

اس کی بھری پری سسرال تھی، سب ایک دوسرے سے محبت کرتے ایک دوسرے کا خیال رکھتے، اس نے بھی بے حد خدمت، محبت اور تابعداری سے اپنا مقام بنا لیا تھا۔ لیکن جس کی وجہ سے وہ اس گھرانے کا حصہ بنی تھی، اس کے لیے اس کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ یہ بھی نہیں تھا کہ علی کی زبردستی شادی کی گئی ہو یا اسے کوئی اور پسند ہو، ایسا کچھ نہیں تھا......لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود علی ان مردوں میں سے تھا جو عورت کو اپنے پیر کی جوتی، اپنی محکوم اور وہ قابلِ دسترس کھلونا سمجھتے تھے کہ جس سے جب دل چاہا کھیل لیے اور جب دل چاہا اچھال کر الماری کے اوپر پھینک دیا۔ لیکن پھر بھی وہ روز علی کے آنے سے پہلے تیار ہوتی، سارے دن کی تھکن کو بھول کر اس کے آگے پیچھے گھومتی رہتی۔

''آپ کو کوئی کام نہیں ہے کیا؟''

وہ جو سارے کام نمٹا کر ساس، سسر کو ان کے کمرے میں گرم دودھ کا گلاس دے کر چائے کا کپ تھامے علی کے برابر والے صوفے پر آ کر بیٹھی تھی کہ وہ مووی دیکھ رہے تھے اور اتفاقاً یہ اس کی بھی فیورٹ مووی تھی نے پلٹ کر پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' وہ حقیقتاً حیران ہوئی۔

''بھئی کم از کم مووی تو آرام سے دیکھنے دیا کریں۔ ہر جگہ آ کر آپ بیٹھ جاتی ہیں حد ہوتی ہے۔'' علی نے غصے سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آف کیا اور میز پر سے کتاب اٹھا کر پڑھنے لگے۔

اسے ایسا لگا گویا تو کاٹو بدن میں خون نہیں......

''ارے بھئی دیکھیے جو ہماری بیٹی کہے گی اس گھر میں وہی ہوگا بس......'' ابا کا جملہ اسے بہت برے وقت پر یاد آیا۔

اس کا دل چاہا دھاڑیں مار، مار کر رونے لگے لیکن وہ چپ ہوگئی اس کے دونوں ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست ہوگئے...... وہ چند لمحوں تک خاموش نظروں سے اس شخص کو دیکھتی رہی......جس کے لیے وہ اپنے ماں، باپ دوست، احباب رشتے دار، سہیلیاں سب چھوڑ کر آگئی تھی۔

جس کی پسند کو اس نے اپنی پسند بنا لیا تھا، جس کے گھر والوں کو وہ اپنے گھر والوں پر فوقیت دیتی تھی، جس کے گھر کے کچن میں وہ سارا، سارا دن کھڑی سب کی فرمائشیں پوری کرتی رہتی تھی کس کے لیے؟

کس کی وجہ سے؟

اس شخص کے لیے جو تین لفظ کہہ کر اسے یہاں لے آیا تھا۔ اور پھر تین لفظ کہہ کر اسے یہاں سے نکال بھی سکتا تھا۔ یہ بات وہ اکثر جتاتا تھا۔

لیکن تین لفظوں کا طعنہ دینے والے یہ کم ظرف بھول جاتے ہیں ان تین لفظ کا سوال روزِ حشر ان سے

بھی ہوگا کہ اللہ کی ایک بندی ان کے حوالے کی گئی تھی۔

کیا انہوں نے ان تین لفظوں کا پاس رکھا اور......

''کیا ہوا......اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں۔''

وہ جو خیالات میں غرق نہ جانے کیا، کیا سوچے جا رہی تھی علی کی آواز پر چونکی۔

''کچھ نہیں......'' وہ مسکرائی۔ اور ٹھنڈی چائے کا کپ لے کر کمرے سے باہر نکل گئی کہ کسی کونے کھدرے میں بیٹھ کر ابھی رونا بھی تھا۔

☆☆☆

اللہ پاک نے اسے ننھی سی گڑیا دی تو ایک لمحے کو وہ لرز کر رہ گئی کہ بیٹیاں سب کی طرح اسے بھی پیاری تھیں لیکن بیٹیوں کا نصیب......؟

گھر، مکان، جائداد، زیورات، ملازمین کی فوج سب بیکار ہے اگر عورت کے دامن میں اس کے مرد کی محبت اور قدر نہ ہو۔ وہ ایک آئیڈیل بیوی تھی۔ ایک مثالی بھاوج تھی شاید ساس سسر، دیور، نندیں تو بہت ساری لڑکیوں کو قدر دان مل جاتے ہوں اس کی تو جیٹھانیاں، ان کے بچے، نندیں ان کی سسرال والے سب ہی اس سے محبت کرتے......

جب کبھی اس کے ماں، باپ آتے اور اس کی ساس محبت بھرے لہجے میں اس کی تعریفیں کرتیں، ان کی تربیت کو سراہتیں، اس لمحے اس کا دل چاہتا فخر سے مسکراتی ماں اور باپ کے سینے سے لگ کر بہت روئے اور کہے ابا...... آپ کی عزت سنبھالتے، سنبھالتے میں چلتی پھرتی لاش بن گئی ہوں۔

عورت کو نازک مخلوق کہا جاتا ہے اور پھر وقت رخصت ان کے سروں پر خاندانوں کی عزت، ماں، باپ کی تربیت اور ماں کی وزنی گٹھریاں رکھ کر رخصت کر دیا جاتا ہے اور وہ گٹھریاں کہ جن کے وزن سے بیچاریوں کے سر اور کندھے ٹوٹنے لگتے ہیں۔ لیکن وہ سنبھالے رہتی ہیں۔

کبھی ان وزنی گٹھریوں کو ان کے سروں پر سے اتار کر ان کے کندھے ہلکے کر کے ان کی طرف دیکھو تو صبر، برداشت اور دکھ کی ایک داستان ان کی زخمی مسکراہٹ کے پیچھے نظر آئے گی اور جس دن آپ لوگ اس تحریر کو پڑھ لیں گے تو پھر عورت کو صنف نازک کہنا چھوڑ دیں گے۔

☆☆☆

وہ محبت کی فطرت پر بنی تھی۔ اس نے زندگی بھر لوگوں سے صرف محبت کی تھی۔ بے لوث...... بے غرض محبت......لیکن...... لیکن شاید اس کے نصیب میں شوہر کی محبت نہیں تھی۔

علی، اپنی بیٹی کو بہت چاہتے، ہر وقت بس بیٹی کے آگے پیچھے پھرتے، ننھی سی گڑیا سارے گھر کی لاڈلی تھی......وہ خود بھی اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتی۔

لیکن جب بھی وہ علی کو بیٹی کی شرارتوں پر بعض اوقات بے جا ضد پر، ہنستے مسکراتے دیکھتی تو اس کا دل چاہتا کہ وہ کہے ہر باپ اپنی بیٹی کو اتنی ہی محبت سے پالتا ہے، میں بھی کسی کی بیٹی ہوں، اپنی بیٹی کے لاڈ اٹھاتے وقت تمہیں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ کسی اور کی بیٹی تمہاری ایک محبت بھری نظر......ایک محبت بھرے جملے...... کے لیے ترستی ہے۔

''دیکھیں بھئی مجھے نہیں پتا صحیح کیا ہے، غلط کیا ہے بس جو میری بیٹی کہہ رہی ہے بس وہ صحیح ہے۔'' آج جب اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی بیٹی کے غصے کی شکایت شوہر سے کی تو اس نے گردانا بھی نہیں الٹا اسے ہی ڈانٹ دیا۔ اور وہ خاموش ہو گئی۔

بہت عرصہ ہوا اس نے اپنے اوپر ایک چپ سی طاری کر لی تھی۔ ایک ایسی چپ جو ہر وقت دہاڑیں مار، مار کر روتی تھی۔ اس کی آہیں اور بین سونے نہیں دیتے تھے۔

ساس، سسر، اللہ کو پیارے ہو گئے۔ چھوٹے بچے بڑے ہو گئے تو خود بخود سب کے کچن علیحدہ ہو گئے اب اکثر شام کو علی کے پاس جب وہ چائے کا مگ لے کر بیٹھتی۔ شام کا ہی وہ وقت ہوتا جب علی کو وہ سارے دن کی روداد سناتی، کوئی مشورہ لینا بھی ہوتا کہیں دعوت پر جانا ہے اس کے علم میں لاتی وہ بولتی رہتی اور علی

کتاب کھولے پڑھتا رہتا لیکن اب وہ اس ذلت کی عادی ہوگئی تھی، سو وہ پروا نہیں کرتی اور آرام، آرام سے بات کرتی رہتی۔

بیچ، بیچ میں پوچھتی "آپ سن رہے ہیں ناں......" اور علی کتاب پر سے نظریں ہٹائے ایک لمبی ہوں کر دیتے اور وہ اس پر شکر ادا کرتی کہ چلو سن تو رہے ہیں...... اور جو کبھی بیٹی آجاتی تو کتاب کیا وہ اگر کوئی اہم کال بھی کر رہے ہوتے تو ڈسکنیکٹ کر دیتے اور بہت توجہ اور محبت سے اپنی بیٹی کی بات سنتے......

اور وہ دیکھتی رہ جاتی، بعض اوقات اس کی اہم بات کو اگنور کرتے اور بیٹی کے اسکول کا قصہ سننے بیٹھ جاتے، وہ چند لمحے خاموش بیٹھی رہتی اور پھر آہستگی سے اٹھ کر اپنے کاموں میں لگ جاتی۔

خلوت کے لمحات میں جب وہ علی کی ضرورت ہوتی، ان لمحوں میں بھی وہ احساسِ محبت سے محروم رہتی۔ عورت اللہ کی بڑی عجیب مخلوق ہے اسے لاکھوں کے مجمعے میں کھڑا کر دو اور اس کی نظر صرف اس شخص پر جا کر ٹھہرے گی جو اسے دیکھ رہا ہوگا اور وہ یہ بھی جانتی ہوگی کہ وہ اسے کس نظر سے دیکھ رہا ہے۔ وہ اکثر آئینے سے سوال کرتی......

"مجھ میں کیا کمی ہے؟"

سرو قد، میدے سے گندھا رنگ، بڑی، بڑی ذہین خوب صورت آنکھیں، سیاہ گھنیرے بال...... اعلیٰ تعلیم، بہترین حسب نسب، باکردار...... سلیقہ مند......

کوئی کھوٹ، کوئی کمی...... وہ ڈھونڈ نہ پاتی، اس لمحے کوئی اس کے کان میں کہتا۔

پاگل آئینے سے کیا پوچھتی ہے تو نہیں جانتی دلہن وہی جو پیا من بھائے، اور ویسے بھی یہ سب تقدیروں کے کھیل ہوتے ہیں روپ کی روئے اور کرم کی کھائے۔ اور آنسوؤں کے دو قطرے اس کے دل پر گر جاتے، کبھی، کبھی تو وہ سوچتی دل پر اتنے آنسو گرے ہیں، یقیناً ایک کنواں تو دل میں بھر ہی گیا ہوگا......

ایسا نہیں تھا کہ علی نے اس کا خیال نہ رکھا ہو، اس کو ہر چیز کا عیش آرام تھا۔ شاندار گھر، زیور، کپڑا، نوکر، چاکر لیکن وہ عزت جو ایک عورت کا حق ہوتی ہے وہ محبت جس کے لیے عورت سارے رشتے حتیٰ کہ ماں، باپ، بہن، بھائیوں کو بھی چھوڑ آتی ہے، وہ اسے کبھی نہیں ملی۔

علی بہت چھوٹی، چھوٹی باتوں پر اسے شرمندہ کر دیتا۔ اتنی معمولی، معمولی باتیں اسے جتاتا کہ وہ منہ دیکھتی رہ جاتی۔ پہلے اس کے میکے کی کمزوریاں ڈھونڈتا اور پھر اس کو جتاتا۔ وہ خاموش رہتی۔

ہر خاندان میں چھوٹی بڑی باتیں، چھوٹی بڑی کمزوریاں ہوتی ہیں، پرفیکٹ کوئی نہیں ہوتا...... بس اپنے، اپنے ظرف کی بات ہے مرد کہہ دیتا ہے، عورت اگنور کر دیتی ہے۔ محض سوچ کر رہ جاتی ہے۔

کبھی، کبھی اس کا دل چاہتا کہ ابا کے سینے میں سر چھپا کر کہے ابا آپ نے مجھے جتنی دعائیں دیں سب لگیں، آپ نے کبھی یہ دعا نہیں دی کہ اللہ مجھے قدر دان شوہر دے کیونکہ آپ سوچتے تھے کہ میری تو کوئی...... بے قدری کر ہی نہیں سکتا۔

ابا میں آپ سے کیسے کہوں؟ مجھے آپ کی اس دعا کی زندگی کے ہر قدم پر ضرورت پڑی ہے...... میری عزتِ نفس کو ایسا کچلا گیا ہے۔ مجھے اس، اس طرح نظر انداز کیا گیا ہے؟ مجھے ایسے، ایسے موقعوں پر شرمندہ کیا گیا ہے۔ آج اگر سوچتی ہوں۔ تو خود حیران ہوتی ہوں کہ یہ سب میں نے کیسے سہہ لیا، میں یونیورسٹی کی بیسٹ ڈبیٹر...... میرے سارے لفظ کہاں کھو گئے تو پھر میری نظر اپنی دوائیوں کے پاؤچ پر جا پڑتی ہے جس میں سے کئی رنگ برنگی چھوٹی بڑی گولیاں میں روز، صبح شام کھاتی ہوں اور اگر نہ کھاؤں تو......

اس کی اماں کہا کرتی تھیں بیٹا بند مٹھی لاکھ کی...... سو اس نے ہمیشہ اپنی مٹھی بند رکھی...... جوائنٹ فیملی ہونے کے باوجود کبھی اس نے بیڈ روم کی بات بیڈ روم سے باہر نہیں نکلنے دی۔

لوگ اس کی مثالی شادی شدہ زندگی کی مثال

دیتے...... آج وہ اپنی بیٹی کو رخصت کرنے جارہی ہے سارا گھرانا اس کے سلیقے پر انگشت بدنداں ہے، اس کی بیٹی اس کی طرح معصوم اور نبھانے والی ہے لیکن جس طرح اس نے اس کی پیدائش والے دن سے اس کی رخصتی کی تیاری شروع کردی تھیں اس نے اپنی دعاؤں میں ایک دعا بڑھالی تھی جو اسے کبھی نہیں دی گئی۔

اور میرے خیال سے آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے وہ دعا کیا ہوگی۔

☆☆☆

''ٹھہریے، میں سلمیٰ بیگم زوجہ حسن علی مرزا کچھ کہنا چاہتی ہوں۔'' سلمیٰ بیگم کے مضبوط لہجے اور اندازِ تخاطب نے کمرے میں موجود سارے مردوں کو حیران کردیا......

حسن علی مرزا نے حیرت سے بیوی کو دیکھا۔ جسے ساری زندگی انہوں نے ایک عورت سے زیادہ اہمیت نہیں دی...... جسے انہوں نے ایک بیوی، ایک ماں جیسی اہمیت کبھی نہیں دی۔ آج وہی سلمیٰ بہ آواز بلند ان پر اپنا حق جتا رہی ہے۔ وہ اپنی حیثیت خود بتا رہی ہے۔

''آج عید ہے، میری بچی کا نکاح ہے، میری وہ بیٹی جس کی پیدائش سے لے کر آج تک میں اس کے نیک نصیب اور خوشیوں کی دعا کرتی آئی ہوں۔ مجھے مہر میں کوئی روپیہ، پیسہ، زیور، کوٹھی، بنگلا، جائداد نہیں لکھوانی۔ ان میں سے کوئی بھی چیز عورت کی خوشی کی ضامن نہیں میں ہر سال عید پر نتاشا کو یونیک عید گفٹ دیتی ہوں اور اس عید پر بھی دینا چاہتی ہوں۔''

کہتے، کہتے وہ چند لمحے رکی، گھر کے مردوں کے علاوہ کچھ ظاہر ہے کچھ مرد نتاشا کی سسرال سے بھی آئے بیٹھے تھے۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی عباد مرزا بہت تحمل سے بھاوج کی بات سن رہے تھے جبکہ حسن علی مرزا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سلمیٰ بیگم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیں۔

''میں اپنی بیٹی کا مہر اپنی مرضی کا رکھوانا چاہتی ہوں۔'' سلمیٰ بیگم نے اپنے جیٹھ عباد مرزا سے مخاطب ہوتے ہوئے شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اتنے سرد لہجے میں کہا کہ حسن علی مرزا کو ایک عجیب سی ٹھنڈک اپنی ریڑھ کی ہڈی تک میں اترتی محسوس ہوئی۔

وہ بیوی جسے بند کمرے میں معمولی، معمولی باتوں پر انہوں نے مارا تک تھا۔ اور اس نے اُف تک نہیں کہا تھا۔ اور نہ ہی کسی کو بتایا تھا آج وہ بھرے کمرے میں سینہ تانے کھڑی تھی......

''آپ بھی سوچ رہے ہوں گے آج مجھے کیا ہوگیا۔'' سلمیٰ بیگم نے شوہر کی جیسے سوچ پڑھ لی، اتنی لمبی رفاقت میں انسان اتنا تو ہم مزاج ہو ہی جاتا ہے۔

''بتائیں آپ کیا مہر لکھوانا چاہتی ہیں، ہم وہی مہر ادا کریں گے۔'' جواد صاحب نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ آپ ایک ماں سے وعدہ کررہے ہیں......'' سلمیٰ بیگم نے بیٹی کے ہونے والے سسر سے وعدہ مانگا۔

''بالکل بھابی جان...... یہ میرا آپ سے وعدہ رہا۔''

''تو پھر میری بچی کے مہر میں عزت اور محبت لکھ دیں۔ صرف عزت اور محبت......'' کہہ کر سلمیٰ بیگم زندگی میں پہلی بار سب کے سامنے روتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

پورے کمرے میں خاموشی تھی، سب حیران نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، حسن علی مرزا کو اس تھپڑ کی جلن محسوس ہورہی تھی جو شادی کے بائیس سال بعد سلمیٰ بیگم کے لفظوں نے ان کے منہ پر مارا تھا۔

جواد صاحب نے سارے کمرے پر نظر ڈالی اور بہت مطمئن لہجے میں کہا۔

''لکھیے حق مہر...... محبت اور عزت......''

''ایک ماں کی اپنی بیٹی کے لیے دنیا کی سب سے منفرد عیدی۔'' کسی کے منہ سے نکلا اور حسن علی مرزا کا سر جھکتا چلا گیا۔

☆☆☆

ناولٹ

مُسافت

غزالہ عزیز

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کچھ لوگ بلا کے ضدی، ہٹ دھرم اور اپنی من مانی کرنے والے ہوتے ہیں، شاید وہ پیدائشی ایسے تھے یا پھر یہ شخصی عناصر رفتہ، رفتہ ان کی فطری نشو ونما کا حصہ بنے تھے جنہوں نے ان کی شخصیت کو مجموعی طور پر بگاڑ کے رکھ دیا تھا...... یہی نہیں بے حسی و بے پروائی کے ساتھ دوسروں کی ذات سے بے نیازی کی خامی بھی ان کے جملہ شخصی عناصر میں شامل تھی...... فطری نشو ونما میں وقت کے ساتھ پختگی آتی جاتی ہے پھر اس کے بعد ان یکجا عناصرِ ترکیبی کو کسی کی ذات سے الگ کرنا مشکل نہیں دشوار گن بھی ہو جاتا ہے...... جیسے ایک پختہ عمارت کی کلی تعمیر کے بعد اس میں نظر آنے والی کجی صاف نظر آنے لگے تو اس عمارت میں سے بدنما ہیئت والی اینٹوں (حصوں) کو نکالنے کی کوشش کی جائے تو پوری عمارت تو نہیں ڈھے جاتی البتہ عمارت کی ہیئت میں بگاڑ ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ انسانی شخصیت کی تعمیر بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ ایک، ایک اینٹ چن، چن کر ایک قابلِ دید فرد کی شخصیت سازی کی جاتی ہے۔ انسانی ہاتھ اس خام مٹی کو خوشنما سانچے میں ڈھالنے کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

صلاحیت رکھتے ہیں اور ماں ہی تو اللہ کی جانب سے وہ تخلیق کار ہوتی ہے جو اپنی اولاد کو مثالی سانچے میں ڈھالتی ہے۔ جو خاص تخلیقی عمل سے گزر کر انسانی وجود کو دنیا میں لانے کے بعد اس کی شخصیت کی تعمیر اپنے ہاتھوں سے کرتی ہے پھر اسے اچھی پرورش و تربیت کے سانچے میں ڈھال کر اس خام مشتِ خاک سے ایک مضبوط و مثالی عمارت تعمیر کرتی ہے۔ نور جہاں بیگم نے بھی یقیناً ہر ماں کی طرح اس کی شخصیت کی تعمیر اچھی بنیادوں پر کھڑی کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن شاید بعض انسانوں کی فطرت کو بدلنا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنے ماں، باپ کی اکلوتی اولاد نہیں تھے۔ ان سے بڑے ایک بھائی اور بہن بھی تھے۔ یوں وہ گھر میں سب بہن بھائی سے چھوٹے اور ماں، باپ کے لاڈلے تھے۔ شاید اسی لاڈ پیار نے انہیں ضدی اور خودسر بنا دیا تھا۔ اور کچھ ان کی فطرت میں بھی یہ عناصر شامل تھے۔ لہٰذا وقت کے ساتھ حالات نے بھی ان عوامل کی پرورش کی تھی۔ جنہوں نے سلیم احمد کو آگے چل کر ایک دوراہے یا پھر ایک بند گلی میں لا کھڑا کیا تھا، قید کر دیا تھا۔ اور اب ان کے اپنے فیصلوں نے اس نہج پر پہنچا کر بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنی عمرِ گزشتہ کا محاسبہ کر سکیں۔

☆☆☆

''آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے ہیں۔ یہ وقت اس قسم کا فیصلہ کرنے کا نہیں ہے۔ وہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔'' آسیہ بیگم نے سلیم احمد کو اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کی۔ جو بدستور اپنے فیصلے پر ڈٹے ہوئے تھے۔

''تم مجھے سمجھانے کی کوشش نہ ہی کرو تو بہتر ہوگا۔ تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے میں نے...... یہ عورتوں کے معاملات ضرور ہیں مگر میں انہیں تم سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ میں جو کر رہا ہوں بہت سوچ سمجھ کر ہی کر رہا ہوں۔ اور لڑکیوں کو جوان ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ صحن میں دیوار پر چڑھی بیلیں اتنی تیزی سے نہیں بڑھتیں۔ جتنی جلدی بیٹیاں جوان ہو کر ماں، باپ کے کاندھوں سے آلگتی ہیں۔ میں بیٹی کا باپ ہوں، مجھے ابھی سے اس کے مستقبل کی فکر کرنی ہوگی۔'' سلیم احمد نے بیوی کے سامنے اپنی سوچ کو واضح کیا تھا۔ جو انہیں اپنی سوچ کی بابت سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''لیکن ثانیہ ابھی میٹرک میں پڑھ رہی ہے۔ اتنی کم عمری میں اس کا رشتہ طے کرنا مناسب نہیں ہے۔ اور وہ بھی باقاعدہ منگنی......'' آسیہ نے اب اصل نکتۂ اعتراض اٹھایا تھا۔

''اسی لیے تو منگنی کر رہا ہوں۔ شادی نہیں...... کیونکہ ابھی وہ پڑھ رہی ہے۔ شادی کے لیے اس کی عمر بھی مناسب نہیں ہے۔'' اور آسیہ بیگم کے اعتراض پر سلیم احمد کی طرف سے برجستہ جواب آیا تھا۔ لیکن وہ پھر بھی بیوی کا نکتۂ اعتراض نہیں سمجھے تھے۔

''آپ آخر میری بات سمجھ کیوں نہیں رہے ہیں، شاہ زیب بھی ابھی پڑھ رہا ہے، کل کو اگر آگے جا کر دونوں بچوں کی سوچ میں فرق آگیا یا شاہ زیب ہی کی پسند بدل گئی تو کیا ہوگا۔ رشتے داری الگ خراب ہوگی اور بچوں کا مستقبل بھی...... اور ہماری تو بیٹی ہے، کل کو خدانخواستہ یہ رشتہ کسی وجہ سے ختم ہوگیا تو زیادہ نقصان ہماری بیٹی کا ہی ہوگا۔ اس لیے میں اتنی کم عمری میں بچوں کی زندگی کے اتنے بڑے فیصلے کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔'' آسیہ بیگم کی باتوں بلکہ اعتراض میں وزن تھا۔ لیکن رشتہ جڑنے سے پہلے ختم ہونے کی بات سن کر سلیم احمد کے مزاج بگڑنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

''خدا نہ کرے جو یہ رشتہ ختم ہو، کیسی اول فول منہ سے نکال رہی ہو۔'' وہ سخت لہجے میں بیوی سے مخاطب ہوئے۔ ''تم کیسی ماں ہو...... ارے ابھی تو منگنی ہوئی بھی نہیں ہے اور تم ٹوٹنے کے اندازے بلکہ قیافے لگانے بیٹھ گئی ہو۔''

سلیم احمد نے نروٹھے انداز میں کہا تو آسیہ بیگم کی ہمت ٹوٹنے لگی۔ وہ ان سے مزید بحث نہیں کر سکتی

تھیں۔ ان کی باتوں سے تو لگ رہا تھا کہ وہ مصمم ارادہ کر چکے ہیں۔

”مجھے تو سمجھ نہیں آرہا ہے تمہیں یہ سامنے کی بات نظر کیوں نہیں آرہی ہے کہ خاندان میں اور لڑکیاں بھی ہیں اور شاہ زیب جیسے لڑکے کے لیے ان لڑکیوں کے ماں، باپ بھی نظر لگائے بیٹھے ہیں مگر عطیہ بھابی صرف ہماری ثانیہ کو ہی بہو بنانا چاہتی ہیں اور تم چاہتی ہو میں اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے گنوادوں...... میں اتنا احمق ہرگز نہیں ہوں۔“ سلیم احمد نے قطعی لہجے میں کہا تھا۔

”اور میں پوچھتا ہوں، آخر برائی کیا ہے شاہ زیب میں...... اکلوتا بیٹا ہے اپنے ماں، باپ کا...... بچپن کا دیکھا بھالا ہے، عارف بھائی کے بزنس کا اکلوتا وارث ہے، میں نے تو فیصلہ کرلیا ہے، ثانیہ کا رشتہ شاہ زیب سے ہی ہوگا۔“ سلیم احمد نے حتمی اعلان کرتے ہوئے دوٹوک لہجے میں کہا تو آسیہ بیگم نے شوہر کو اس فیصلے سے باز رکھنے کی ایک آخری کوشش اور کر ڈالی۔

”دیکھیے سلیم صاحب...... میں آپ کے فیصلے کے خلاف نہیں ہوں بلکہ صرف یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ ثانیہ ابھی کم عمر اور ناسمجھ ہے، اگر کم عمری میں ہی زندگی کے بڑے رشتوں کا بوجھ اس کے کاندھوں پر آجائے گا تو اس کے شعور میں یہ بات بیٹھ جائے گی کہ آگے جا کر اس نے اپنی زندگی شاہ زیب کے ساتھ گزارنی ہے پھر اگر ان کے جوان ہونے پر ایسا نہ ہوسکا تو اس کے معصوم دل پر کیا بیتے گی۔ آپ تصویر کا دوسرا رخ کیوں نظر انداز کر رہے ہیں اور میں کوئی اپنی بچی کی دشمن تو نہیں ہوں مگر آپ کو......“

”بس آسیہ بیگم...... اس سے آگے کچھ مت کہنا...... میں خوشی کے موقع پر تمہیں کوئی بدشگونی کرنے نہیں دوں گا۔ کیونکہ جیسا تم سوچ رہی ہو ایسا کچھ نہیں ہوگا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ رشتہ اور مضبوط ہوجائے گا۔ عطیہ بھابی نے مجھ سے جواب مانگا ہے اور میں کل فون کر کے انہیں ہاں میں جواب دے رہا ہوں، ایک ہفتے بعد ثانیہ کی شاہ زیب سے منگنی ہوجائے گی۔ بس اب اس معاملے پر اور بحث نہیں ہوگی۔“

آسیہ بیگم کی پوری بات سننے سے پہلے ہی انہوں نے درمیان میں ٹوک کر انہیں چپ کرادیا تھا۔ اور وہاں سے اٹھ کر چل دیے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فیصلہ ہوگیا تھا۔ اب وہ نظرِ ثانی ہرگز نہیں کریں گے۔ لہٰذا آسیہ بیگم کے پاس مزید کچھ بولنے کا جواز نہیں رہا تھا۔

اور وہ اب وہیں پر بیٹھی سوچ رہی تھیں کہ سلیم احمد کی جلد بازی میں کیا جانے والا یہ فیصلہ ان کی بیٹی کے لیے درست ہوگا یا نہیں۔

عارف حسن بھی آسیہ کے ماموں زاد بھائی تھے مگر سلیم احمد سے ان کی اچھی دوستی تھی۔ دونوں گھرانوں میں شروع سے اچھے تعلقات تھے۔ جانے کب عطیہ بھابی نے سلیم صاحب کے سامنے ثانیہ کو بہو بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ جس پر انہوں نے اقرار کی صورت میں زبان دے دی تھی کہ ثانیہ ان ہی کی بہو بنے گی۔ آسیہ کو تو وہ صرف اپنا فیصلے سے آگاہ کر رہے تھے۔

عامر اور عاصم دونوں بیٹے ابھی کالج میں پڑھ رہے تھے۔ لہٰذا ان سے رائے یا مشورہ لینا مناسب نہیں سمجھا گیا تھا۔ ادر وہ دونوں بھی خالص شادی بیاہ کے معاملات میں کچھ بھی بولنے یا اپنی رائے دینے کو فضول ہی سمجھ رہے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ معاملات بڑوں کے طے کرنے کے ہوتے ہیں، لہٰذا ان کو ہی فیصلہ بھی کرنے کا اختیار ہوتا ہے اور پھر سلیم احمد کے فیصلے کی مخالفت کر بھی کون سکتا تھا۔ وہ شروع سے اپنے فیصلے منواتے بلکہ دوسروں پر ٹھونسنے کے عادی رہے تھے، لہٰذا دونوں بیٹے بھی اس معاملے میں اپنی رائے دینے کے بجائے خاموش ہی رہے اور فیصلہ ہوگیا۔ ثانیہ سے کسی نے پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی اور اس کی منگنی شاہ زیب کے ساتھ زیادہ دھوم سے نہ سہی مگر گھر کی ایک چھوٹی سی تقریب میں رسم کر کے نبٹادی گئی۔

ثانیہ عمر کے اس حصے میں تھی جسے لڑکپن ہی کہا جاتا ہے، اب چودہ، پندرہ برس کی کچی عمر ویسے بھی لڑکیوں کے خوابوں کی خوشنما دنیا میں ہمہ وقت گم رہنے کی ہوتی

ہے۔ جب چاند، تارے، جگنو اور تتلی غرض ہر خوب صورت شے من کو لبھاتی ہے اور سترہ، اٹھارہ سالہ شاہ زیب تو اس کم عمری میں بھی اچھا خاصا ہینڈسم اور خوش شکل تھا۔ پھر ثانیہ کو بھی نا سمجھی کی عمر میں اس فیصلے پر اعتراض نہیں ہوا تھا جو اس کے بڑوں نے کیا تھا۔ ویسے بھی وہ آسیہ بیگم کی ہر بات مان لیا کرتی تھی مگر سلیم صاحب کو ہر کسی سے اپنی بات منوانے کی عادت تھی۔

بہر حال رشتہ خوش اسلوبی سے طے ہوگیا تھا۔ اس لیے سلیم احمد بہت خوش تھے حالانکہ ان کی اپنی بہن رقیہ بانو اور بڑے بھائی کی بیوی ساجدہ بیگم ان کے اس اقدام سے سخت کبیدہ خاطر ہوئیں کہ آسیہ بیگم نے بالا ہی بالا بیٹی کا رشتہ کر طے کر کے منگنی بھی کر ڈالی۔ اور ان لوگوں کو کانوں کان خبر بھی نہیں لگنے دی۔ بس مٹھائی بھجوا کر اطلاع دے دی۔ رشتہ طے ہونے کی حالانکہ یہ تفصیل کون جانتا کہ آسیہ بیگم بیچاری تو خود شوہر کے فیصلے کو من وعن ماننے پر مجبور تھیں۔ اور منگنی بھی شاہ زیب کے ساتھ..... جس پر خاندان کی ساری جوان بیٹیوں کی ماؤں کی نظریں لگی ہوئی تھی کیونکہ سب آپس میں رشتے دار ہی تھے۔

سب آسیہ بیگم پر ہی معترض تھے، وہ بیچاری کیا جواب دیتیں۔ اس لیے اتنے سارے اعتراضات کرنے والوں کے ساتھ بحث کرنے کے بجائے انہوں نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی تھی۔ البتہ یہ آسیہ کی بدقسمتی تھی کہ سلیم احمد سوچے سمجھے بغیر اپنی بڑی بہن اور بھاوج کی باتوں پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرنے والے ایسے کاٹھ کے الو ثابت ہوئے جو دوسروں کی آنکھ سے دیکھتے اور دوسروں کے کانوں سے سننے کے عادی تھے۔ لیکن یہاں چونکہ اکلوتی بیٹی کے اچھے مستقبل کا معاملہ تھا۔ شاہ زیب اور اس کی فیملی اچھے اور خوشحال لوگ تھے، اپنے ہی خاندان سے تھے، جہاں ثانیہ سکھی رہ سکتی تھی۔ لہٰذا بہن اور بھاوج کی ناراضی اور اعتراض کے ساتھ روٹھنے، منانے کے مراحل انہوں نے خوش اسلوبی سے خود نبٹائے تھے، جانے کس طرح ہتھے سے اکھڑی بہن اور بھاوج کو منایا گیا تھا۔ آسیہ بیگم تو سب باتوں سے بے پروا ہو کر ایک طرف ہوچکی تھیں..... اسی میں عافیت بھی تھی۔ بڑی نند اور جیٹھانی ہمیشہ سے ان پر حاوی رہی تھیں۔ ان سے جیتنا آسان نہیں تھا۔ ویسے بھی آسیہ کی زندگی میں دوسرے بکھیڑے کم نہ تھے۔ جاب کے ساتھ گھر داری سنبھالنا آسان نہیں تھا۔ اوپر سے خاندان میں بسنے والی عورتوں کی تنقیدی باتیں، چپقلشیں..... آسیہ بیگم اس پل صراط سے بھی آسانی سے گزرنا چاہتی تھیں۔ جو ناممکن ہی تھا، آسیہ کے نوکری کرنے کو سب تنقید کا نشانہ بناتے تھے، کسی نے سلیم احمد سے کبھی کچھ نہیں کہا جو اپنے شاہانہ مزاج کے باعث بار، بار چھوٹی، چھوٹی باتوں پر ملازمت چھوڑ کے گھر بیٹھ جایا کرتے، وہ تو شکر تھا کہ آسیہ پروفیشنل نرس تھیں اور اب ایک سرکاری اسپتال میں ہیڈ نرس کے فرائض سرانجام دے رہی تھیں۔ جبکہ سلیم احمد پچھلے چار سال سے نوکری ختم ہوجانے کے باعث گھر بیٹھے تھے۔ لہٰذا گھریلو اخراجات کی کلی ذمے داری آسیہ بیگم کے نازک کاندھوں پر تھی۔ اور وہ تو شادی سے پہلے سے جاب کر رہی تھیں۔ شادی کے بعد بھی سلیم احمد نے انہیں جاب چھوڑنے کو نہیں کہا تھا۔ اور اب تو نہ جانے کتنے سال گزر گئے تھے اس دشت کی سیاحی میں مشقت بھرے شب و روز گزارتے مگر وہ اس ذمے داری کو بھی خوش اسلوبی سے نبھا رہی تھیں۔ البتہ گاہے بہ گاہے شوہر کو دوسری کوئی ملازمت ڈھونڈنے کے لیے یاد دہانی کرواتی رہتیں۔ کیونکہ دونوں بیٹے ابھی پڑھ رہے تھے..... اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لیے ابھی انہیں کئی سال درکار تھے۔

☆☆☆

آسیہ جس گھر میں بیاہ کر آئی تھیں وہاں ان کی ساس کے ساتھ سلیم احمد کے بڑے بھائی، بھابی رہتے تھے۔ سسر کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ آسیہ تو خیر گھل مل کر رہنے والی تھیں لیکن ساجدہ بیگم جلد ہی اپنے الگ گھر میں شفٹ ہوگئیں کیونکہ جس گھر میں وہ سب رہ رہے تھے وہ کرائے کا تھا۔ اور سلیم احمد کے بے پروا

مزاج کو دیکھتے ہوئے ساجدہ بیگم نے بڑی سمجھداری سے کام لیتے ہوئے اپنے شوہر سے علیحدہ گھر کا مطالبہ کردیا تھا۔ وسیم احمد کا اچھا چلتا ہوا بڑا میڈیکل اسٹور تھا۔ ساجدہ بیگم نے کچھ رقم بھی پس انداز کر رکھی تھی، کچھ رقم قرض کے طور پر اپنے بھائی سے لی تھی اور گھر کے قریب مناسب قیمت میں ملنے والے ایک سو بیس گز کے سنگل مکان کو خرید کر انہوں نے چند ہفتوں میں شفٹنگ بھی کرلی تھی۔

حالانکہ وسیم احمد تو چاہتے تھے کہ بینک سے قرض لے کر مکان کو ڈبل اسٹوری بنا کر سلیم اور اس کی بیوی آسیہ کو بھی اپنے ساتھ ہی رکھ لیں لیکن ساجدہ بیگم نے اس کی بھرپور مخالفت کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ابھی انہیں مکان کی خریداری پر لیے قرض کو چکانا ہوگا۔ دوسرے ایک گھر میں رہ کر ذرا سی اونچ نیچ ہوجانے پر تعلقات خراب کرنے سے بہتر ہے کہ الگ رہا جائے۔ اسی میں سب کی بہتری ہے۔ لہٰذا وسیم احمد نے جو مزاجاً صلح جو اور مصالحت پسندی کے حامل تھے بیوی کی بات مان لی تھی۔ ان دنوں وہ امید سے بھی تھیں لہٰذا وسیم احمد بیوی کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔ البتہ ایک ہی محلے میں گھر قریب ہونے کے باعث انہیں یہ اطمینان تھا کہ سلیم احمد اور اس کی فیملی ان کے پاس ہی رہے گی۔ اس کے بعد ساجدہ اور آسیہ کے یہاں پہلے بچے کی ولادت آگے پیچھے ہی ہوئی تھی۔ پہلے ساجدہ بیگم بیٹے کی ماں بنی تھیں، جس کا نام اسد رکھا گیا تھا۔ اس کے ایک ماہ بعد آسیہ نے بھی بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اور سلیم احمد نے اس کا نام عامر رکھا تھا۔ اور پھر دو سال بعد آسیہ کی گود میں عاصم آگیا تھا۔ سلیم احمد بہت خوش تھے۔ جبکہ ساجدہ بیگم، اسد کے بعد مزید بچوں کی خواہش رکھتی تھیں۔ لیکن چاہنے کے باوجود وہ اولاد کی مزید نعمت سے آئندہ چار سالوں تک محروم ہی تھیں۔ جانے خدا کی کیا مصلحت تھی، ساجدہ بیگم تو ہر طرح کا علاج اور ٹوٹکے آزما چکی تھیں پھر اللہ نے ناامیدی میں امید پیدا کی تھی۔ اور پھر امید سے ہوئیں تو خدا کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتی تھیں۔ پتا نہیں یہ آسیہ بیگم سے مقابلے بازی کی خواہش تھی یا واقعی انہیں مزید بچوں کی چاہ تھی۔ اور اس بار اللہ نے انہیں نعمت کے بعد رحمت سے نوازا تھا۔ اسد کی پیدائش کے چار سال بعد فاریہ اس دنیا میں آئی تھی۔ جسے ساجدہ بیگم نے تو پھیکے دل سے قبول کیا تھا۔ وہ اس بار بھی بیٹے کی خواہش رکھتی تھیں، البتہ وسیم احمد بیٹی کی نعمت پا کر بہت خوش تھے اور یہ اتفاق ہی تھا کہ فاریہ کے دنیا میں آنے کے چند ماہ بعد آسیہ اور سلیم کے گھر ثانیہ رحمت بن کر ان کی فیملی مکمل کر چکی تھیں۔ جبکہ فاریہ کی پیدائش پر کچھ پیچیدگیوں کے باعث ساجدہ بیگم مزید فیملی بڑھانے سے محروم ہوگئی تھیں، جس کا انہیں شدید صدمہ پہنچا تھا۔ لیکن قدرت کے فیصلوں کے آگے انسان بے بس ہوتا ہے اور ایسے وقت میں وسیم احمد کے ساتھ، ساتھ دیورانی آسیہ بیگم نے بھی ساجدہ بیگم کی بڑی دلجوئی کی تھی، یہ بھی سمجھایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد کی صورت میں اپنی نعمتیں عطا کر کے ان پر اپنا کرم کیا ہے، لہٰذا بندگی کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے رب کی نعمتوں پر شکر کر کے راضی ہوجائے لہٰذا دکھی اور مایوس ہونے کے بجائے انہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے جس کی عنایت کے طفیل وہ صاحبِ اولاد ہوئے ہیں...... اور بالآخر ساجدہ بیگم نے اس دکھ کو خدا کی مصلحت جان کر اس کی رضا کے آگے سر جھکا دیا تھا کہ اللہ نے انہیں بیٹے اور بیٹی دونوں نعمتوں سے نوازا ہے۔ لہٰذا ان پر اپنے رب کی عنایات کا شکر واجب ہے، یہ الگ بات کے ان کے دل میں ساری عمر یہ قلق رہا کہ آسیہ کے دو بیٹے ہیں، جو بڑھاپے میں سلیم احمد کے دو بازو بن کر ان کا وقار و مان بڑھائیں گے اور ساجدہ بیگم اس مان سے محروم رہی ہیں اور یہ خلش وقت گزرنے کے ساتھ ان کے دل میں کسک بن کر رہ گئی تھی۔ یہاں تک کہ وقت کے پنچھی کی پرواز تیزی سے بلندیوں تک پہنچ گئی، اور بچے جوان ہوگئے۔

فاریہ ان کی ایک ہی بیٹی تھی اور اس کی شادی کے لیے ہر ماں کی طرح ساجدہ بیگم نے بھی اونچے خواب

دیکھ رکھے تھے، کہنے کو تو عارف حسن، آسیہ کے ماموں زاد بھائی تھے لیکن خاندانی تقاریب میں ساجدہ اور وسیم صاحب کا بھی ان کی فیملی سے ملنا ملانا ہوتا تھا، شاہ زیب ان کا اکلوتا بیٹا تھا، جو شہر کے بہترین کالج میں پڑھ رہا تھا۔ عارف حسن کا گارمنٹس کا بزنس تھا، ان کا گھرانا خاندان کے خوشحال گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ لہٰذا ساجدہ بیگم کی خواہش تھی کہ فاریہ کی شادی شاہ زیب سے طے ہو جائے۔ یہی نہیں بلکہ رقیہ بانو بھی اپنی منجھلی بیٹی سعدیہ کے لیے شاہ زیب کی خواہش رکھتی تھیں۔ مگر اب عطیہ بیگم کے فیصلے اور پسند نے سب کی امیدوں پر پانی پھیر دیا انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے پلی بڑھی اخروٹی بالوں اور بڑی، بڑی بادامی آنکھوں والی ثانیہ شروع سے ہی اچھی لگتی تھی۔ اور انہوں نے اسے اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اگرچہ ثانیہ ابھی میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔ اور شاہ زیب نے ایف اے کا ایگزام دیا تھا۔ جب عطیہ بیگم نے ایک روز سلیم احمد سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ پھر ان کی رضامندی پا کر وہ شوہر کے ساتھ باقاعدہ رشتہ لے کر آئی تھیں۔

آسیہ کو بھی یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ ان کی بیٹی اچھے، خوشحال اور ملنسار لوگوں میں بیاہ کر جائے گی۔ مگر وہ اتنی جلدی رشتہ طے کرنے یا منگنی کرنے کے حق میں نہیں تھیں...... جبکہ عطیہ بھابی کو اکلوتے بیٹے کی یہ خوشی منانے کی بہت جلدی تھی لہٰذا آسیہ بیگم کے اعتراض کے باوجود سلیم احمد نے عارف بھائی اور عطیہ بھابی کی خوشی کو مقدم رکھتے ہوئے شاہ زیب اور ثانیہ کی فی الحال منگنی کرنے پر آمادگی ظاہر کردی تھی۔ اور چونکہ وہ فیصلہ کر چکے تھے اس لیے آسیہ کے مزید اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی سلیم احمد زبان دے چکے تھے اور ہمیشہ سے اپنے فیصلے کرنے اور منوانے کے عادی رہے تھے۔ لہٰذا آسیہ بیگم کو اپنے پیپرز کی تیاری میں مصروف ثانیہ کو سمجھانا پڑا تھا۔ وہ بچی تھی اور ناسمجھ بھی...... آسیہ بیگم نے اسے بڑے پیار سے باور کرایا تھا کہ ابھی صرف منگنی کی جائے گی، شادی ان دونوں کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ہی ہوگی۔۔ اور ثانیہ ماں کی بات سمجھ گئی تھی۔ شاہ زیب سے اس کی کسی حد تک اچھی دوستی بھی تھی۔ خاندان کی تقاریب میں سب کزنز اکھٹے ہوتے تھے، ثانیہ بھی اکثر عطیہ بیگم کے گھر ماں کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ لہٰذا اسے اس رشتے پر اعتراض بھی نہیں تھا۔ آسیہ بیگم بھی اکلوتی بیٹی کا مستقبل محفوظ ہونے کے بعد بے فکر ہوگئی تھیں۔ مگر یہ اطمینان شاید بہت کم عرصے کے لیے تھا۔ جس کے بارے میں کسی نے گمان بھی نہیں کیا تھا۔ وہ ہوگیا تھا۔

☆☆☆

ثانیہ اور شاہ زیب کی منگنی کو ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ عطیہ بیگم شوہر کے ساتھ ان دونوں کا رشتہ ختم کرنے آ گئی تھیں۔ جانے کس حاسد کی نظر لگی تھی۔ آسیہ بیگم کے تو پیروں تلے زمین نکل گئی تھی۔ اتنی کم عمری میں بیٹی کا رشتہ طے ہو کر ٹوٹ جانا بہت برا شگون تھا، عطیہ کی بات سن کر وہ تو سکتے میں آ گئیں مگر سلیم احمد نے تو انہیں بری طرح لتاڑ کر رکھ دیا تھا۔ جنہوں نے ان کی بیٹی کی زندگی کو مذاق بنا دیا تھا۔ اور عطیہ بیگم اب رو، رو کر ان دونوں سے معافی مانگ رہی تھیں۔ بات ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ یہ رشتہ توڑنے پر مجبور ہو گئیں۔ مگر آسیہ بیگم کو بھائی، بھاوج سے اس بے رحمی کی امید نہیں تھی۔ وہ بھتیجی کی خاطر بھانجی کا رشتہ ختم کرنے چلے آئے تھے۔ جسے انہوں نے اپنی خوشی و رضا سے جوڑا تھا۔ اور اب عارف صاحب بھی ان سے معذرت کر رہے تھے۔

”میں بہت شرمندہ ہوں سلیم بھائی، اگر بچی کی زندگی اور خاندان کی رسوائی کا ڈر نہ ہوتا تو ہم کبھی یہ اقدام نہ کرتے۔ میں آپ لوگوں سے معذرت کرنے آیا ہوں، ہو سکے تو ہمیں معاف کر دیجیے گا لیکن اب شاہ زیب اور ثانیہ کے رشتے کو ختم ہی سمجھیں۔“

عارف صاحب نے سارے حالات ان کے گوش گزار کر کے اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے بڑی رسانیت سے معذرت طلب کی تھی اور آسیہ بیگم نے

ساتھ بیٹھے سلیم احمد کو کاٹ دار طنزیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ جیسے کہہ رہی ہوں کہ دیکھ لیا اپنی ضد اور من مانی کا نتیجہ...... حالانکہ سلیم احمد بھی اتنی کم عمری میں بیٹی کا رشتہ ٹوٹنے پر دلگرفتہ نظر آ رہے تھے، آسیہ کی شکایتی اور ملامتی نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر خود کو ہی قصوروار سمجھ رہے تھے۔ شاید جلد بازی میں ان سے غلط فیصلہ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ بھی ساری صورتِ حال جاننے کے بعد ان دونوں کے سامنے احتجاج کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اس لیے صبر کا کڑوا گھونٹ پینے پر مجبور ہو گئے لیکن آسیہ کا دل دکھا ہوا تھا۔ وہ چپ نہیں رہیں...... انہوں نے دونوں کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

”آپ لوگوں نے اچھا نہیں کیا عطیہ بھابی...... اگر آپ لوگ اتنے ہی مجبور تھے تو آپ کو میری بیٹی کے ساتھ اپنے بیٹے کا رشتہ جوڑنا نہیں چاہیے تھا۔ آپ کو اپنے بھائی کی بیٹی کی عزت و رسوائی کا بڑا خیال ہے...... مگر میری بیٹی کی جگ ہنسائی اور بدنامی کا کوئی لحاظ نہیں...... جو منگنی ٹوٹنے کے بعد بے قصور اور معصوم ہو کر بھی سارے خاندان میں بدنام ہو جائے گی۔ آخر لوگ میری بیٹی کی ذات پر ہی انگلیاں اٹھائیں گے ناں کہ اس میں ہی کوئی عیب ہوگا جو ماموں نے بیٹے سے رشتہ ختم کر دیا...... سچائی تو صرف آپ اور ہم جانتے ہیں۔“ آسیہ بیگم واقعی شدید ناراضی کا اظہار کر رہی تھیں۔ ان کی بات میں وزن بھی تھا، وہ اپنی بیٹی کے دکھ پر ملول تھیں کیونکہ اس رشتے کے ٹوٹنے کے ساتھ ان کی بیٹی کا معصوم دل بھی ٹوٹ جاتا تھا۔ آسیہ بیگم تو یہ سوچ کر ہی پریشان تھیں کہ ثانیہ کو اس رشتے کے ٹوٹنے کا پتا چلے گا تو اس کے معصوم دل پر کیا گزرے گی۔ وہ تو منگنی کے بعد ہفتوں، مہینوں میں نہیں، دنوں میں ہی خود کو یہ باور کرا چکی تھی کہ اس کی شادی شاہ زیب سے ہوگی۔ اسی لیے آسیہ بیگم، بھائی، بھاوج کی اس کھلی زیادتی پر خفا ہو رہی تھیں۔ وہ کیوں خاموش رہتیں، لوگوں نے تو بچوں کی شادی بیاہ کو کھیل سمجھ رکھا ہے، گڈے گڑیا کی طرح بیاہ رچایا۔ اور پھر دل بھر جانے پر توڑ دیا...... سلیم احمد بھی بیوی کی باتوں کی تائید میں شکوہ کناں نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے، انہیں کسی حد تک اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا مگر بیگم کے سامنے اعتراف کرنا نہیں چاہتے تھے جبکہ آسیہ بیگم دل ہی دل میں ابھی سے اپنی بیٹی کے ہونے والے نقصان کا حساب کتاب کرنے لگی تھیں۔ بیٹی کی ذات پر کم عمری میں ہی منگنی ٹوٹنے کا داغ لگ گیا ہے، اب چاہے وجہ کچھ بھی رہی ہو...... ہمارے معاشرے میں کسی لڑکی کا رشتہ ٹوٹنے کو ہی معیوب سمجھا جاتا ہے اور لڑکی کو ہی معتوب ٹھہرایا جاتا ہے جبکہ یہ ہے تو غلط مگر اس ذہنیت کا کیا، کیا جائے۔ آسیہ بیگم تو آگے کے حالات سوچ کر ہی رونے لگی تھیں۔ جس پر عطیہ بھابی اور عارف بھائی نے بے بسی سے انہیں دیکھا تھا۔ پھر عارف صاحب نے اپنا ہاتھ ان کے سر پر رکھ دیا تھا۔ وہ واقعی دکھی ہونے کے ساتھ شرمندہ بھی تھے۔

”میرا یقین کرو آسیہ بہن...... میں نے بہت مجبور ہو کر یہ فیصلہ کیا ہے، مجھے ہرگز بھی علم نہیں تھا کہ رمشہ بچپن سے ہی شاہ زیب کو پسند کرتی ہے اور اس سے رشتہ نہ ہونے پر مایوس ہو کر اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی ختم کرنے کی کوشش کرے گی۔ وہ تو شکر ہے کہ بروقت طبی امداد سے اس کی زندگی بچا لی گئی۔ ورنہ اس کی احمقانہ حرکت نے تو ہم سب کو جیتے جی مار دیا تھا۔ اگر خاندان میں اس کی خودکشی کی خبر پھیل جاتی تو ہم سب کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ بس اسی لیے بھائی کی عزت کی خاطر ہمیں شاہ زیب کا رشتہ ثانیہ سے ختم کر کے رمشہ سے طے کرنا پڑا ہے۔“ عارف صاحب کا جواز بھی معقول تھا، آج کل کے بچے ماں، باپ کو جانے کس، کس طرح آزمائش میں ڈال دیتے ہیں، بہرحال دونوں ان لوگوں سے شرمندہ تھے۔ اسی لیے عطیہ بھابی نے آسیہ کا ہاتھ تھام کر تسلی دینی چاہی تھی۔

”عارف ٹھیک کہہ رہے ہیں سلیم بھائی...... لیکن آپ لوگ فکر مت کریں، ثانیہ ہماری بھی بیٹی ہے اور میں خود اس کے لیے بہت اچھا رشتہ ڈھونڈوں گی۔“

''اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے بھابی...... اپنی بیٹی کا اچھا برا سوچنے کے لیے ابھی ہم زندہ ہیں، وہ لاوارث نہیں ہے لیکن جتنا برا آپ لوگوں نے میری بچی کے ساتھ کیا ہے میں اسے فراموش نہیں کروں گا، آپ لوگوں کی یہ جھوٹی تسلیاں ہمارے نقصان کا ازالہ نہیں کرسکتیں۔ کیونکہ سارے خاندان والوں کو ہمیں جواب دینا ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ لوگ یہاں سے تشریف لے جائیں اور یاد رکھیے گا آج کے بعد اس گھر اور گھر کے لوگوں سے آپ کو کائی تعلق نہیں ہوگا۔''

سلیم احمد کی برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس لیے وہ اپنا غصہ دباتے ہوئے صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، انہوں نے لمحوں میں سب کچھ ختم کردیا تھا۔ عطیہ بھابی اور عارف بھائی کے ساتھ آسیہ بیگم بھی شوہر کے اتنے شدید ردِعمل کو دیکھ کر سناٹے میں آگئیں، مانا کہ ان کے بھائی، بھاوج کی طرف سے زیادتی ہوئی تھی۔ مگر اس کے لیے وہ رشتے کے ہی سہی سگے ماموں زاد بھائی کو چھوڑ دینے کے حق میں نہیں تھیں۔ لیکن اس وقت شوہر سے اختلاف بھی ممکن نہیں تھا۔

وقت اور موقع محل کا تقاضا تھا کہ وہ خاموش رہیں، اس لیے بھائی، بھاوج کے کھڑے ہوتے ہی وہ بھی صوفے سے اٹھ گئیں۔ عارف بھائی اور عطیہ نے ایک ساتھ ان دونوں کی طرف دیکھا۔ انہیں سلیم احمد سے اتنے سخت رویّے کی امید نہیں تھی کہ وہ نہ صرف انہیں گھر سے جانے کے لیے کہہ دیں گے بلکہ رشتے ناتے توڑنے کا فیصلہ بھی کرلیں گے، لہٰذا عارف صاحب کو بھی سلیم احمد کے رویّے سے اپنی توہین کا احساس ہوا تھا۔ اس لیے انہوں نے بھی لہجہ بدل لیا۔

''ٹھیک ہے سلیم احمد...... اگر تم لوگوں کا یہی فیصلہ ہے تو ہمیں بھی زبردستی کی تعلق داری نبھانے کا شوق نہیں ہے، چلو عطیہ بیگم...... اب یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، بہت عزت افزائی کروالی ہم نے اپنی......''

اور آسیہ بیگم نے نم آنکھوں سے بھائی کی طرف دیکھا۔ جس میں مان ٹوٹنے کا شکوہ بھی تھا اور دکھ بھی......

مگر وہ آسیہ کی بھیگی آنکھوں کے تاثر کو نظر انداز کرکے بیگم کا ہاتھ پکڑ کے چلے گئے تھے۔ اور آسیہ بیگم کو لگا کہ اب انہیں ایک نئے جرم کی پاداش میں کٹہرے میں کھڑے مجرم کی آزمائش کا سامنا ہوگا کیونکہ عارف بہرحال ان کے بھائی تھے، اب انہیں ہی طعنے دیے جائیں گے۔

☆☆☆

ثانیہ کو منگنی ٹوٹنے کا علم ہوا تو وہ بھی ساکت رہ گئی۔ اسے یہ رشتہ ٹوٹنے کا یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شاہ زیب اس کے ساتھ.... بےوفائی کرکے اپنی کزن سے منگنی کرنے جارہا تھا۔ وہ تو ثانیہ کو پسند کرتا تھا۔ ماموں اور ممانی بھی بہت پیار کرتے تھے۔ پھر وہ اس کے ساتھ اتنی بڑی زیادتی کیسے کرسکتے تھے، اسے ماموں، ممانی ہی نہیں شاہ زیب پر بھی غصہ تھا۔ اور ماموں کی بھتیجی رمشہ سے تو اسے نفرت سی ہورہی تھی۔ جس نے شاہ زیب کو اس سے چھین لیا تھا۔ اور غصہ تو اسے اماں پر بھی آرہا تھا کہ جن کے کہنے اور سمجھانے پر وہ اس رشتے کے لیے تیار ہوئی تھی۔ اور اب جب وہ اس رشتے کو دل سے تسلیم کرچکی تو اسے ایک جھٹکے سے کچے دھاگے کی طرح توڑ دیا گیا۔ وہ واقعی بہت حساس ہورہی تھی۔

بیٹوں نے بھی پہلی بار اس معاملے میں زبان کھولتے ہوئے سلیم احمد کی ذات کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا تھا۔ انہوں نے آسیہ بیگم کے اعتراض کے باوجود اتنی جلدی ثانیہ کا رشتہ طے کردیا تھا۔ اور اب اس ضد اور جلد بازی کا نتیجہ بھی دیکھ لیا۔ ثانیہ ان کی اکلوتی بہن تھی، لہٰذا اس کے دکھ اور نقصان پر وہ بھی دکھی اور ملول تھے اور پہلی بار آسیہ بیگم نے بھی اپنے کمرے میں آکر شوہر سے شکوہ کرڈالا تھا۔

''دیکھ لیا آپ نے اپنی ضد کا انجام...... میں اسی لیے آپ کو منع کررہی تھی...... اتنی جلدی ثانیہ کو منگنی جیسے کمزور اور کچے رشتے کے بندھن میں مت باندھیں کیونکہ کم عمری میں جوڑے گئے رشتے اکثر کمزور و ناپائدار ثابت ہوتے ہیں مگر آپ نے میرے کسی

اعتراض کو درخور اعتنا نہیں جانا۔“

آسیہ کی شکایت بجا تھی...... سلیم صاحب کو بھی اپنی جلد بازی پر افسوس ہو رہا تھا۔ مگر وہ اپنی غلطی تسلیم کر کے بیوی کو خود پر حاوی ہونے دینے کی غلطی ہرگز نہیں کر سکتے۔ اس لیے الٹا انہی کو ملامت کرنے لگے۔

”ہاں تو مجھے کیا پتا تھا کہ تمہارے بھائی بھاوج اپنی زبان سے پھر جائیں گے، میں نے خود تو جا کر ان سے اپنی بیٹی کے رشتے کی بھیک نہیں مانگی تھی ناں‘ انہوں نے خود ثانیہ کے لیے میرے سامنے اپنی جھولی پھیلائی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ تمہارے نام نہاد عزت دار خاندان کے لوگوں کے سامنے زبان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ پھر تم کیا سوچ کر مجھے الزام دے رہی ہو‘ تمہاری نظر میں تو میری حیثیت پہلے ہی دو کوڑی کی ہے، گھر بیٹھ کر تمہارے کمائے ٹکڑوں پر جو پل رہا ہوں، کما کر کھلا رہی ہو...... تو خود مختاری کا رعب بھی جھاڑو گی...... اور ذلیل بھی کرو گی...... اور اب تو تمہارے بھائی، بھاوج بھی گھر آ کر ذلیل کر گئے ہیں...... جن کی وجہ سے میری بیٹی کی زندگی برباد ہو گئی ...... اور اب اس کا خمیازہ ساری عمر ہمیں اور اسے بھگتنا پڑے گا۔“ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے والی مثال بن گئی تھی۔ سلیم احمد اپنے قصور پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں الٹا بیگم کو ملامت کرنے لگے تھے۔ انہیں کیا پتا تھا کہ حالات اس طرح بگڑ کر ان کے خلاف ہو جائیں گے مگر شوہر کی طرف سے کمانے والی خود مختار عورت کا طعنہ تو جیسے برچھی کی طرح آسیہ بیگم...... کے دل میں گھسا ...... وہ نوکری اپنے گھر اور بچوں کے لیے کر رہی تھیں۔ کیونکہ سلیم احمد اپنی ذمّے داری نہیں نبھا رہے تھے۔ اگر وہ اپنے فرائض سے کوتاہی نہیں برتتے آتے تو انہیں کبھی گھر سے باہر نکل کر نوکری کرنی نہ پڑتی۔ پھر سلیم احمد انہیں کس بات کا طعنہ دے رہے تھے اور ہمیشہ سے مصالحت پسندی سے کام لینے والی آسیہ بیگم اس بار چپ نہیں رہیں۔

”آپ بار، بار مجھے خود مختار عورت کا طعنہ دے رہے ہیں جیسے یہ نوکری میں اپنے لیے اپنی مرضی سے کر رہی ہوں۔ اگر آپ نے اپنی ذمّے داریوں کو فرائض سمجھ کر ادا کیا ہوتا تو مجھے یہ نوکری کرنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی مگر میں جو کچھ کر رہی ہوں ناں وہ اس گھر اور بچوں کے لیے کر رہی ہوں اور میں نے کب کما کر کھلانے کا طعنہ دیا ہے جو آپ میری عمر بھر کی ریاضت پر پانی پھیر رہے ہیں۔“ بولتے، بولتے آسیہ بیگم کا گلا رندھ گیا تھا۔ اور سلیم احمد شرمندہ ہونے کے بجائے الٹا انہیں ہی ملامت کرنے لگے۔ ان کی دکھتی رگ پر انجانے میں آسیہ نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ جس پر سلیم احمد نے ناگواری کا اظہار کیا۔ ڈھٹائی اور بے حسی کی بھی کوئی حد نہیں تھی۔ اپنی غلطی پر پردہ وہ ڈالنے کے لیے وہ انہی کی ذات کو رگیدنے لگے۔

”ہاں تو ابھی تم اور کیا کہہ رہی ہو...... یہی ناں کہ گھر کی ساری ذمّے داری تم نے اٹھائی ہوئی ہے، میں تو ناکارہ ہوں، میں نے تو جیسے کبھی اس گھر اور بچوں کے لیے کیا ہی نہیں...... ارے ساری جوانی تمہارے اور بچوں کے لیے مزدوریاں کی ہیں میں نے، اب بڑھاپے میں نوکری نہیں ملتی تو کیا کشکول اٹھا کر بھیک مانگنے نکل جاؤں......“ وہ نہایت درشت لہجے میں بولے۔

وہ بات کو غلط رنگ دے رہے تھے اور آسیہ بیگم کو لگا جیسے اس لاحاصل بحث سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بات سے بات نکل کر بڑھتی چلی جائے گی۔ وہ ثانیہ کی طرف سے پہلے ہی پریشان تھیں، دوسرے غصے میں سلیم احمد کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ جو یقیناً گھر کے دیگر حصوں میں بھی پہنچ رہی تھی۔ تینوں بچے بھی صحن میں بیٹھے باپ کی لعنت ملامت سن رہے تھے۔ ثانیہ تو اپنا دکھ بھول کر سہم کر بھائیوں کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ جن کے لیے یہ تماشا نیا نہیں تھا۔ وہ بچپن سے دیکھتے چلے آ رہے تھے کہ کس طرح سلیم احمد اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں ان کی ماں کو موردِ الزام ٹھہرا کے خود بری الذمہ ہو جایا کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے بھی خاموش رہنے میں ہی

عافیت سمجھی تھی۔ ویسے بھی یہ میاں، بیوی کے آپس کے معاملات تھے، وہ بچے ہوکر ان میں دخل اندازی نہیں کرسکتے تھے۔ نہ ہی آسیہ بیگم نے ان کی ایسی تربیت کی تھی مگر ثانیہ بھی یہ سوچ کر دکھی ہو رہی تھی کہ اس کی وجہ سے ماں، باپ آپس میں جھگڑ رہے تھے جبکہ دوسری جانب اندر کمرے میں موجود آسیہ بیگم کو بھی بار، بار یہی خیال ستا رہا تھا کہ میاں، بیوی کے آپس کے اختلافات بچوں کے ذہنوں پر کیا اثر ڈال رہے ہوں گے۔ اس لیے ہمیشہ کی طرح آسیہ نے ہی مصالحت پسندی سے کام لیتے ہوئے بات ختم کرنی چاہی تھی۔ وہ بات کو سنبھالنا چاہ رہی تھیں۔

”مگر میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے اس لیے بات کو مزید بڑھانے سے بہتر ہے کہ اس بحث کو یہیں ختم کردیا جائے...... جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے، اب یہ سوچیں کہ ہم خاندان والوں کو اس رشتے کے ٹوٹنے کے بارے میں کیا جواب دیں گے۔“ آسیہ بیگم کے چہرے پر تفکر کے آثار تھے، جانتی تھیں اب تک یہ خبر سارے خاندان میں پھیل چکی ہوگی۔

”خاندان والوں کو کیا جواب دینا ہے، وہ میں خود دے لوں گا، تمہیں اس بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس ایک بات یاد رکھنا آج کے بعد تمہارا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ ثانیہ کے رشتے کے ساتھ ان سے تمہارا ہر رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔“ سلیم احمد نے اپنا دوٹوک فیصلہ سنایا تھا۔ اور تن فن کرتے کمرے سے باہر نکل گئے۔ اور پیچھے آسیہ بیگم تھکے ہوئے چٹختے اعصاب کے ساتھ بیڈ پر بیٹھی سوچ رہی تھیں کہ اولاد کا بھلا تو ہر ماں، باپ چاہتے ہیں، لیکن کبھی کبھی انسان کو کچھ فیصلے اللہ کی ذات پر بھروسا کر کے وقت پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ کیونکہ نصیب لکھنے والی ذات تو اللہ پاک کی ہے، جس نے ثانیہ کے نصیب میں جو بھی فیصلہ درج کیا ہوگا وہ وقت آنے پر سامنے آجاتا تھا۔ مگر جلد بازی اور عاقبت نا اندیشی میں سلیم احمد نے یہ اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ لہٰذا اب خسارہ اور خمیازہ تو ان ہی کے حصے میں آنا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے اپنے غلط فیصلے کی پشیمانی کا غبار آسیہ بیگم پر نکالا تھا۔ اور یہ سب ان کی نند اور جیٹھانی کے طفیل تھا جو ہمیشہ سے سلیم احمد کو بیگم کے خلاف مہرہ بنا کر استعمال کرتی رہی تھیں۔ اور ثانیہ کی منگنی ٹوٹنے کی خبر تو شاید عطیہ اور عارف کے ان کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی سارے خاندان میں بریکنگ نیوز بن گئی تھی۔ ان سے دو گھر چھوڑ کے ہی تو ساجدہ بیگم کا گھر تھا۔ اور اتنی بڑی خبر اُن سے بھلا کیسے چھپ سکتی تھی۔ لہٰذا فون پر بڑی بہن اور جیٹھانی صاحبہ نے بھی خوب اپنے دل کی بھڑاس سلیم احمد پر نکالی تھی۔ جس کا سارا غبار سلیم احمد نے بیچاری بیگم پر نکال دیا تھا۔ اور اپنا دل کا بوجھ ہلکا کر کے چلے گئے تھے لیکن آسیہ کو بیٹی کی فکر تھی۔ وہ لٹے ہوئے جواری کی طرح خالی ہاتھ، خالی آنکھوں کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی تھیں، اب لوگوں کے سوالوں کے سامنے کیا جواز پیش کریں گی۔ بیٹی کو کس طرح سنبھالیں گی۔

☆☆☆

دوسری جانب ثانیہ کی حالت بھی ماں سے مختلف نہیں تھی۔ خاندان میں ساری کزنز کو اس کی اور شاہ زیب کی منگنی کا پتا تھا، اب اس رشتے کے ٹوٹنے پر وہ سب کو کیسے فیس کرے گی۔ وہ شدید ٹینشن میں مبتلا تھی۔ اس لیے اسے بھی ساری غلطی باپ کی ہی لگ رہی تھی کیونکہ وہ اتنی سمجھدار نہیں تھی کہ صحیح اور غلط کا فیصلہ کرپاتی۔ مگر یہ سچ تھا کہ جذباتی طور پر اسے شاہ زیب سے منگنی ٹوٹنے کا دھچکا ضرور لگا تھا۔ دوسرے شاہ زیب کی خاموشی نے بھی اسے اندر تک ہرٹ کیا تھا۔ وہ اس کی بے وفائی پر دکھی تھی۔ اگر شاہ زیب اس کے لیے مخلص ہوتا تو ماں باپ کے فیصلے کے خلاف اس کے لیے اسٹینڈ لے سکتا تھا۔ مگر اس نے ماں، باپ کے فیصلے کو مان لیا تھا...... اور دوبارہ ثانیہ سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ اس کے لیے اس رشتے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ لہٰذا اس رشتے کا ٹوٹ جانا ہی

بہتر تھا۔ وہ شاہ زیب سے بہت شاکی تھی مگر ماں، باپ کے درمیان ہونے والے شدید جھگڑے اور باپ کے غصے کا سوچ کر اس نے صبر کرلیا تھا، سمجھوتا کرلیا تھا، قسمت سے حالات سے...... شاید یہی اس کی تقدیر میں لکھا تھا اور تقدیر کا لکھا مٹایا نہیں جا سکتا۔

☆☆☆

آسیہ اور سلیم کی لو میرج تھی...... آسیہ نرسنگ کا کورس مکمل کر کے نئی، نئی سرکاری اسپتال میں اپائنٹ ہوئی تھیں۔ سلیم احمد سے ان کی ملاقات اسپتال میں ہی ہوئی تھی۔ جہاں سلیم احمد کی بیمار والدہ ایڈمٹ تھیں۔ اتفاق سے آسیہ کی ڈیوٹی بھی ان ہی کے روم میں لگی تھی۔ وہ عام نرسوں سے ہٹ کر نرم مزاج اور ہمدرد لہجے میں بات کرتی تھی...... مریض کو اس کی بیماری سے خوف زدہ کرنے کے بجائے تسلی و حوصلے کو بڑھا کے اس کی پریشانی کم کرنے کی اپنی سعی بھی کرنا اپنے فرائضِ منصبی کا حصہ سمجھتی تھی۔ اور بیمار کی دلجوئی کرنا تو ویسے بھی ثواب کی بات ہے اور نور جہاں بیگم کو روز بروز بڑھتی شوگر اور بی پی نے حد سے زیادہ چڑچڑا بنا دیا تھا۔ ان کی شوگر بھی کنٹرول میں نہیں آرہی تھی۔ اور معاملہ اتنا سنگین ہوگیا تھا کہ نور جہاں بیگم کو اسپتال میں ایڈمٹ کرنا پڑا تھا۔ اور اب ڈاکٹروں کی کوششوں سے سارے معاملات کنٹرول میں آچکے تھے، خوش قسمتی سے وہ جس روم میں حالت بہتر ہونے کے بعد شفٹ ہوئی تھیں وہاں آسیہ کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی جو اپنی خوش خلقی، نرم مزاجی اور ہمدرد طبیعت کے باعث چند دنوں میں ہی سارے اسپتال کے اسٹاف میں اپنی نمایاں اور مریضوں میں ہر دل عزیز حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ویسے بھی کڑوی دوا سے زیادہ زبان کی شیرینی بھرا لہجہ اثر دکھاتا ہے۔ نور جہاں بیگم کے معاملے میں بھی یہی ہوا تھا۔ اور وہ بھی جلد ہی آسیہ کی شخصی خوبیوں سے متاثر ہو کر اس کی گرویدہ ہوگئیں......

جبکہ سانولے سلونے سلیم احمد تو پہلے ہی گوری چٹی، بڑی، بڑی آنکھوں والی آسیہ کی محبت میں مبتلا ہو چکے تھے۔ آسیہ شروع دن سے ہی ان کے دل کو بھا گئی تھی۔

الوداعی نظم

آپی انجم انصار کے لیے دو ماہ اپنا ذہن لگا کر خود لکھی ہے۔

وقتِ فرقت ہے آپا آپ یہاں سے جائیں گی
کتنی مشکل ہے جدائی آنسو بھی بہہ جائیں گے
ایسا اداریہ ایسا جلترنگ پھر کہاں سے لائیں گے
سندھی پنجابی ہو یا بلوچی سرحدی و کشمیری
پاکیزہ میں جگہ ملی بادشاہوں کی طرح
آپی انجم کے توسط سے ملا ہم کو بہنوں کی محفل سا گھر
آپ کے جیسی مدیرہ ہم پھر کہاں سے لائیں گے
آمنہ حماد اور نزہت اصغر سا بھی کوئی نہیں
یاد لے کر اگر کبھی ہم آپ کو پاکیزہ میں دیکھنے آئیں
کیا بنے گا جب صفحے پلٹ پلٹ کر بھی آپ کو نہ پائیں گے
کتنی مشکل ہے جدائی آنسو بھی بہہ جائیں گے

از: عظمیٰ زہری۔ اوستہ محمد، بلوچستان

لہٰذا چند دنوں بعد جب نور جہاں بیگم صحت یاب ہو کر اسپتال سے ڈسچارج کی گئیں تو انہوں نے آسیہ سے اس کا اتا پتا اور خاندان کے بارے میں ساری معلومات حاصل کرلی تھی، پھر سلیم احمد انہیں گھر لے آئے تھے، اس وقت سلیم احمد سے بڑے بھائی وسیم نوکری کی غرض سے پردیس میں مقیم تھے۔ لہٰذا یہاں ماں کی ساری دیکھ بھال اور علاج معالجے کا انتظام سلیم احمد نے ہی کیا تھا۔ ماں کے معاملے میں وہ مزاج کے خلاف بڑے ذمّے دار بن گئے تھے۔ یوں کچھ دن بعد گھر میں سلیم احمد کی شادی کا ذکر چھڑا تو نور جہاں بیگم اور سلیم احمد کا ووٹ آسیہ کے حق میں تھا۔ جبکہ رقیہ بانو (سلیم احمد کی بڑی بہن) ان کی شادی اپنی نند سے کروانے کا سوچے بیٹھی تھیں۔ انہیں کیا پتا تھا کہ ہمیشہ کا بے پروا اور لاابالی چھوٹا بھائی اپنے لیے لڑکی پسند کرنے کے معاملے میں اتنا ذمّے دار نکلے گا۔

دوسری طرف ساجدہ بیگم بھی اپنی ماموں زاد بہن کے لیے دیور کے رشتے کی آس لگائے ہوئے تھیں۔ مگر سب کی امیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔ اور ان کی لاکھ

DOWNLQADED FROM PAKSOCIETY.COM

کوششوں کے باوجود نور جہاں بیگم کے فیصلے اور سلیم احمد کی آسیہ کے لیے مستقل مزاجی کے سامنے کسی کی ایک نہ چلی۔ سلیم احمد ان دنوں ایک پرائیویٹ میڈیسن کمپنی میں نوکری کرتے تھے۔ لہٰذا آسیہ کے ماں، باپ کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا اور یوں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق صرف ایک ماہ کے اندر اندر آسیہ دلہن بن کر سلیم احمد کے گھر اور زندگی میں داخل ہوگئیں۔

نور جہاں بیگم نے انہیں چھوٹی بہو کا پورا مان دیا تھا۔ البتہ ساجدہ بیگم نے خندہ پیشانی کا بالکل بھی اظہار نہیں کیا تھا۔ ایک تو آسیہ ان کے لیے ایک ناپسندیدہ ہستی تھیں، دوسرے میاں کی طرف سے جدہ سے آنے والے ریالوں کے زعم میں وہ خود کو بہت اونچی شے سمجھنے لگی تھیں۔ جبکہ آسیہ کا تعلق عام سے غریب گھرانے سے تھا۔ لہٰذا وہ اپنی حیثیت اور شان سے آسیہ کو اپنی برتری کا احساس دلاتے رہنا چاہتی تھیں۔ دوسری جانب رقیہ بانو کے ارمانوں کو بھی چھوٹے بھائی کے فیصلے نے ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس لیے وہ بھی چھوٹی بھاوج کی طرف سے شروع سے دل میں کدورت پالے بیٹھی تھیں۔ لہٰذا آسیہ کی حیثیت کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہوئے اس کے ساتھ ہمیشہ ناروا سلوک رکھا گیا۔ اور اپنے عمر میں بڑے ہونے کا پورا استحقاق جماتے ہوئے آسیہ کو ہمیشہ یہ احساس دلایا جاتا رہا کہ ان کی نظر میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لہٰذا آسیہ کو بھی جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ اس گھر میں وہ صرف نور جہاں بیگم اور سلیم احمد کی وجہ سے ہی چھوٹی بہو کے درجے پر فائز ہے۔ باقی سب کے لیے ناپسندیدہ ہستی ہے۔ لہٰذا سلیم احمد کی محبت اور اپنی صلح جو... طبیعت کی خاطر انہوں نے حالات سے سمجھوتا کرتے ہوئے نند کے دونوں بھاوجوں کے ساتھ امتیازی سلوک کے باوجود رقیہ بانو کو ہمیشہ سلیم احمد کی بڑی بہن ہونے کی حیثیت سے عزت دی تھی۔ جنہوں نے آسیہ کی اس گھر میں حیثیت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ بہر حال وقت گزارنے کے ساتھ آسیہ بیگم کو اندازہ ہونے لگا تھا کہ شادی اپنی پسند سے کی جائے یا ماں، باپ کی رضامندی شامل کر کے کی جائے، دونوں صورتوں میں ایک جوا ہی ہوتی ہے، جس میں ہار، جیت کا سہرا مقدر کے سر ہوتا ہے اور آسیہ بیگم نے کبھی تقدیر سے شکایت نہیں کی تھی۔ اچھا برا جو بھی ملا تھا، نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے تو پورے خلوص کے ساتھ سلیم احمد سے رشتہ جوڑا تھا۔ جسے خوش اسلوبی سے نبھا بھی رہی تھیں۔ اب اگر وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ سلیم احمد کی وقتی جذباتیت (محبت) پر بے پروائی و بے حسی کی گرد جمنے لگی تھی تو اسے بھی نصیب کا لکھا سمجھا کر قبول کر چکی تھیں...... البتہ سلیم احمد سے وہ آج بھی روزِ اوّل کی طرح ہی محبت کرتی تھیں۔ اللہ نے انہیں اولاد کی بیش بہا نعمت سے بھی نواز دیا تھا۔ جن سے وہ بہت محبت کرتی تھیں...... اور جن کی خوشیوں کے لیے انہوں نے اپنی ذات کو وقف کر دیا تھا۔ شادی کے بعد بھی گھر اور جاب کی ذمّے داریوں کو نہایت خوش اسلوبی سے نبھا رہی تھیں۔ اگرچہ سالوں کی مسافت نے ان کے وجود کو شکستہ اور تھکن سے چور کر دیا تھا۔ مگر وہ یہ ذمّے داری تب تک اپنے کاندھوں پر اٹھائے رکھنا چاہتی تھیں...... جب تک عامر اور عاصم اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو جاتے...... ان کا سہارا نہیں بن جاتے۔

☆☆☆

”ارے بھیا...... ہمیں تو پہلے ہی پتا تھا...... اس رشتے کا یہی انجام ہونا تھا...... ارے...... بیٹیوں کے رشتے یوں چھپ چھپا کر نہیں کیے جاتے، خاندان کے بڑوں سے صلاح و مشورہ لیا جاتا ہے‘ چھان پھٹک کی جاتی ہے مگر تم لوگوں نے تو کسی کو اس قابل بھی نہیں سمجھا...... مشورہ کرنا تو دور رشتہ کرنے سے پہلے اطلاع ہی کر دیتے۔ بس چٹ رشتہ اور پٹ منگنی کرنے کے بعد خاندان میں بیٹی کا رشتہ کرنے کا اعلان کر دیا...... کیا ہم غیر یا سوتیلے تھے......؟“ رقیہ بانو کو اپنے جلے دل کے پھپولے پھوڑنے کا موقع مل گیا تھا۔ اور جواباً سلیم احمد جزبز ہو کر رہ گئے۔ مگر جواب تو دینا تھا۔ وہ ان کی

بڑی بہن تھیں مگر خود کو بھائیوں کی سرپرست سمجھنے لگی تھیں۔ اسی لیے باز پرس کر رہی تھیں۔

”اور کیا کرتا آپا...... بیٹی کا باپ ہوں اور بیٹیوں والے گھر میں رشتے تو آتے ہیں، عارف بھائی اور عطیہ بھابی نے خود رشتہ دیا تھا۔ اور عارف، آسیہ کا ماموں زاد بھائی ہے۔“ سلیم احمد نے جواباً کہا تو رقیہ بانو کو آسیہ بیگم کو رگیدنے کا موقع مل گیا تاکہ سارا قصور بھاوج کے سر ڈال دیں۔

”ہاں تو آسیہ کو تو ہمیشہ سے من مانی کرنے کا شوق ہے، وہ اپنے میکے والوں کے آگے کسی کو عزیز کیوں رکھے گی...... اور اس نے کب ہمیں اپنا بڑا سمجھا ہے... جو ہم سے صلاح و مشورہ کرتی...... اس نے تو ہمیں بھائی کی زندگی میں ہی دودھ سے مکھی کی طرح نکال پھینکا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس نے ضد کی ہوگی اس رشتے کے لیے۔“

رقیہ بانو نے بھائی کی پوری بات سنے بغیر قیاس آرائیاں شروع کر دی تھیں۔

”ویسے بھی چار جماعتیں پڑھ کر کمانے والی عورت شوہر کی جگہ خود کو خود مختار سمجھنے لگتی ہے، آسیہ کو بھی اپنی تعلیم اور کمائی پر گھمنڈ ہوگا...... اسی لیے تمہاری مرضی کی پروا نہیں کی ہوگی اس نے...... لیکن انجام کیا ہوا۔ اس کی من مانی سے جوان بچی کی زندگی پر داغ لگ گیا۔ اب منگنی ٹوٹے یا نکاح...... لوگ تو لڑکی کی ذات پر ہی انگلیاں اٹھاتے ہیں، لڑکی ہی کی بدنامی ہوتی ہے ناں......“

رقیہ بانو آج جیسے سارے حساب بے باق کرنے کے موڈ میں تھیں۔ وہی نند، بھاوج کی روایتی چپقلش، انہوں نے آسیہ کو کبھی دل سے بھاوج تسلیم نہیں کیا تھا۔ کیونکہ بھاوج کی جگہ تو وہ اپنی نند کو دینا چاہتی تھیں۔ انہوں نے تو ایڑھی چوٹی کا زور بھی لگا لیا تھا مگر سلیم احمد کی منہ زوری کے آگے کمزور پڑ گئیں...... اور ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئیں...... بہرحال اس سے پہلے کہ وہ آسیہ کی مخالفت میں مزید ہرزہ سرائی کرتیں سلیم احمد نے اعتراف کر لیا کہ یہ فیصلہ خالص ان کا تھا۔

”آپ آسیہ کو ناحق الزام دے رہی ہیں آپا...... وہ تو خود اتنی جلدی بیٹی کا رشتہ کرنے کے خلاف تھی۔ میں نے ہی اپنی مرضی سے ثانیہ کے لیے شاہ زیب کا رشتہ قبول کیا تھا۔“ اور بھائی کے منہ سے اگلی بات سن کر رقیہ بانو دھک سے رہ گئی تھیں...... وہ اتنی دیر سے آسیہ کو ہی موردِ الزام ٹھہرا رہی تھیں...... اس لیے شرمندہ ہونے کے بجا کھسیا کے رہ گئیں۔

”میں نے تو اپنی بیٹی کا بھلا ہی چاہا تھا، مجھے کیا پتا تھا کہ عارف بھائی اپنی زبان سے پھر جائیں گے لیکن میں نے بھی انہیں بخشا نہیں ہے، ثانیہ اور شاہ زیب کا رشتہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ہم نے ان دونوں سے سارے تعلق بھی توڑ دیے ہیں...... اب آسیہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔“

اور سلیم احمد کی اگلی بات نے رقیہ بانو کے دل کو تھوڑا سکون پہنچایا تھا۔ اسی لیے لوہا گرم دیکھ کر انہوں نے بھی چوٹ لگانے میں دیر نہیں کی...... اور جھوٹی ہمدردی جتاتے ہوئے اصل مدعا پر آ گئیں۔

”ارے بھیا...... مانا کہ منگنی ٹوٹنے کی خبر سارے خاندان میں پھیلنے کے بعد تمہاری بھی جگ ہنسائی ہوگی...... عارف اور عطیہ نے بہت برا کیا ہے...... لیکن تم فکر کیوں کرتے ہو...... برے وقت میں اپنے ہی کام آتے ہیں...... تم اپنا دل چھوٹا مت کرو، ثانیہ کو میں اپنے امجد کی دلہن بنانے کے لیے تیار ہوں...... پھر دیکھتی ہوں خاندان میں کس کی مجال ہوتی ہے جو میرے بھائی اور بھانجی پر انگلی اٹھا سکے۔“

اور رقیہ بانو کی زبان سے غیر متوقع بات سن کر سلیم احمد بھی چونکے بغیر نہیں رہے...... ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ثانیہ کے لیے امجد کا رشتہ پیش کریں گی۔

وہ امجد جو نہ صرف ثانیہ سے عمر میں پندرہ سال بڑا تھا بلکہ اس کی پہلے ایک منگنی بھی ختم ہو چکی تھی۔

”ارے ایسے کیا دیکھ رہے ہو بھیا...... آسیہ چاہے لاکھ ماس سے ناخن جدا کرنے کی کوشش کرے مگر ہماری رگوں میں ایک ہی ماں، باپ کا خون دوڑ رہا

ہے...... وہ ہمارے دلوں میں نفاق اور دوری نہیں ڈال سکتی اور تمہاری عزت کی خاطر تو تمہاری آپا کچھ بھی کرسکتی ہے، بس تم ہاں کردو...... تو میں کل ہی آکر رشتہ ڈال دیتی ہوں۔'' رقیہ بانو ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہوئے بڑی چالاکی سے بھائی کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہ رہی تھیں...... انہوں نے فوراً ہی اپنے نکھے، بیکار بیٹے کا رشتہ ثانیہ کے لیے پیش کردیا تھا۔ جو سارا دن گھر کی چھت پر کبوتر بازی کے شوق میں دن سے رات کیا کرتا تھا...... کوئی نوکری بھی نہیں تھی...... اور شاید یہی سوچ کر وہ گومگوں کی کیفیت میں مبتلا ہوگئے تھے کہ بڑی بہن کو کیا جواب دیں...... جبکہ بھانجے کی جملہ خصوصیات سے وہ بھی بخوبی واقف تھے......

میٹرک میں دوبار فیل ہونے کے بعد وہ عرصہ ہوا تعلیم کو خیر باد کہہ چکا تھا۔ باپ کی کریانے کی دکان تھی...... جس کی دیکھ بھال وہ اس بڑھاپے میں بھی خود کرنے پر مجبور تھے...... جس سے گھر کا دال دلیا چل رہا تھا۔ سو وہ بے فکری سے اپنی جوانی بیکار کے شوق میں برباد کررہا تھا۔ سلیم احمد کو خاموش دیکھ کر رقیہ بانو بھی ٹھٹکی تھیں...... اس سے پہلے کہ سلیم احمد، امجد کی بیکاری کو جواز بنا کر صاف انکار کرتے رقیہ بانو نے اپنے ترکش میں موجود سب سے زہریلا تیر چلایا تھا۔

''ارے بھیا...... تم کس سوچ میں گم ہوگئے ہو...... بیٹی کی عزت کا معاملہ ہے...... اب اس بدنامی کے بعد کون شریف خاندان ثانیہ کو اپنی بہو بنانے کے لیے آگے آئے گا...... میں تو تمہاری محبت میں امجد اور اس کے ابا سے صلح مشورہ کیے بغیر ہی رشتہ ڈال رہی ہوں...... اور تم پھر بھی سوچ میں پڑ گئے ہو۔''

رقیہ بانو نے بھی بھائی کو چاروں طرف سے گھیر کے بے بس کیا تھا تاکہ اسے کوئی راہِ فرار سجھائی نہ دے...... مگر سلیم احمد کا تذبذب بتا رہا تھا کہ وہ فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اس لیے رسانیت سے بولے تھے۔

''آپ کی محبت سر آنکھوں پر آپا...... لیکن ابھی میں بھی اتنی جلدی ثانیہ کا رشتہ طے کرنے کے حق میں نہیں ہوں...... ابھی وہ صرف میٹرک میں پڑھ رہی ہے۔ ویسے بھی جلد بازی میں ایک بار مجھ سے غلطی ہوچکی ہے، میں اسے دُہرانا نہیں چاہتا، آپ برا مت مانیے گا۔ میں آپ کی محبت کی قدر کرتا ہوں اور وقت آنے پر آپ کو جواب بھی مل جائے گا۔ لیکن ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا......'' سلیم احمد نے انکار کیا تھا اور نہ اقرار...... اس لیے رقیہ بانو نے بھی برا ماننے کے بجائے تحمل کا مظاہرہ کیا۔

''ٹھیک ہے بھیا...... ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے، تم اطمینان سے سوچ لو...... میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ یہ رشتہ جلدی طے ہوجائے۔ تاکہ خاندان میں باتیں بنانے والوں کا منہ بند کیا جاسکے...... آگے تمہاری مرضی ہے، میرے امجد کو رشتوں کی کمی تھوڑی ہے۔''

اور سلیم احمد کو بڑی بہن کا یہ انداز بھایا نہیں تھا۔

''آپ بے فکر رہیں آپا...... میری بیٹی میں بھی کوئی عیب نہیں ہے اور رہی بات خاندان والوں کی تو ان کو جواب دینے کے لیے میں کافی ہوں...... اس وقت مجھے اجازت دیں، میں آسیہ سے بات کرکے ہی آپ کو جواب دوں گا۔'' سلیم احمد اپنی بات کرکے اٹھ کھڑے ہوئے تھے...... لہٰذا رقیہ بانو نے بھی یہ سوچ کر اصرار نہیں کیا...... انہوں نے بھائی کی اچھی خاصی برین واشنگ کی ہے، اب ان کی بات بن ہی جائے گی۔ لہٰذا وہ سلیم احمد کے رخصت ہونے پر مطمئن ہوگئی تھیں۔

☆☆☆

جس بات کا ڈر تھا وہی ہوئی تھی...... سلیم احمد نے گھر آکر آسیہ بیگم کے سر پر جیسے بم ہی چھوڑا تھا...... وہ ثانیہ کا رشتہ امجد سے کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ آسیہ کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ رقیہ بانو اس سچویشن کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے کی کوشش کریں گی...... وہ سلیم احمد کو بیٹی کے مستقبل سے ڈرا کر اپنے نکھٹو...... بیٹے کے پلے باندھنے کی سازش کریں گی۔ اور وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ ثانیہ، امجد کو کتنا

ناپسند کرتی ہے اس کی چھچھوری، عامیانہ حرکتوں کی وجہ سے..... وہ کبھی اس رشتے کے لیے راضی نہیں ہوگی..... وہ تو پہلے ہی شاہ زیب سے رشتہ ٹوٹنے پر ماں، باپ سے خائف ہے، اب امجد کے رشتے کا سن کر جانے اس کا کیا ردِعمل ہوگا..... آسیہ بیگم کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ اسی لیے انہوں نے شوہر کو سمجھانے کی کوشش کی، کہیں وہ حتمی فیصلہ ہی نہیں کر لیں۔

''آپ کو تو فوراً بڑی آپا کو منع کر دینا چاہیے تھا۔ بھلا ثانیہ اور امجد کا کوئی جوڑ ہی کیا..... وہ ثانیہ سے عمر میں بہت بڑا ہے، دوسرے اس کے پاس نہ اچھی تعلیم ہے، اور نہ کوئی معقول نوکری ..... آخر آپ نے کیا سوچ کر بہن کو سوچ کر جواب دینے کی حامی بھری ہے۔''

سلیم احمد نے ناگواری سے آسیہ بیگم کو دیکھا۔

''تو تمہارا کیا خیال ہے، انہیں منہ پر انکار کر دیتا۔ ویسے بھی میں جس گھر میں بیٹی ہوتی ہے لوگ رشتہ تو دیتے ہی ہیں اور میں نے کون سا انہیں ہاں کہہ دیا ہے۔''

''انہیں ہاں کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، وہ جواب مانگیں تو صاف انکار کر دیجیے گا۔ ہمیں ابھی ثانیہ کا رشتہ نہیں کرنا ہے۔'' آسیہ بیگم نے برجستہ لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

''ایسے کیسے انکار کر دوں..... امجد جیسا بھی ہے، ہے تو گھر کا بچہ..... پھر اپنا خون بھی ہے..... بچپن سے دیکھا بھالا ہے اور شادی بیاہ کے لیے مرد کی عمر نہیں دیکھی جاتی۔ رہی بات نوکری کی تو آج نہیں تو کل صابر بھائی کا کاروبار امجد نے ہی سنبھالنا ہے۔ میں اس بارے میں سوچ کر ہی کچھ فیصلہ کر لوں گا۔''

شوہر کا جواب سن کر وہ سناٹے میں آ گئی تھیں۔ تو گویا ان کی نند نے تیر نشانے پر ہی لگایا تھا..... اور لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگانے میں بھی دیر نہیں کی..... نہ جانے کب سے وہ ثانیہ کو اپنی بہو بنانے کا سوچے بیٹھی تھیں..... اور آج... بالآخر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی تھی۔ مگر وہ بیٹی کے ساتھ دوسری بار ایک اور غلط فیصلے کے باعث اتنی بڑی زیادتی ہونے نہیں دے سکتی تھیں۔ اس لیے دو ٹوک لہجے میں شوہر کو ان کے فیصلے سے باز رکھنے کی ٹھانی۔

''نہیں سلیم صاحب..... آپ پہلے ہی ثانیہ کے لیے ایک غلط فیصلہ کر چکے ہیں..... اور اس کا انجام بھی دیکھ لیا ہے، امجد کسی بھی لحاظ سے ثانیہ کے لیے مناسب رشتہ نہیں ہے۔ اور میں جانتے بوجھتے آپ کو اپنی بیٹی کو کنویں میں دھکیلنے نہیں دوں گی۔ اور ثانیہ بھی اس رشتے کو کبھی قبول نہیں کرے گی۔''

بیگم کے لب و لہجے کی سختی سے وہ بھونچکا رہ گئے۔ انہیں آسیہ کے انداز پر غصہ آیا تھا۔ کچھ مردانہ انا کا زعم بھی تھا اور کچھ بڑی بہن کی تازہ برین واشنگ کا اثر تھا۔ سلیم احمد غصے سے بھڑک کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''تم ہوتی کون ہو، مجھے میرے فیصلے سے روکنے والی..... اپنی اس خود مختاری کا رعب مجھ پر جھاڑنے کی ضرورت نہیں ہے، تم اپنی کمائی کے زعم میں مجھ پر حاوی ہونے کی کوشش نہیں کرو تو اچھا ہوگا تمہارے لیے۔''

وہ بلاوجہ ہی بات کو غلط رنگ دے رہے تھے اور ان کے دبنگ لہجے پر تو چند لمحوں کے لیے آسیہ بھی خاموش ہو گئی تھیں۔

''اچھا ہوگا کہ تم مجھے صحیح اور غلط کا سبق پڑھانے کی کوشش نہ کرو..... تمہارے اپنوں کو تو آزما لیا ہے، اب اس گھر کی بدنامی کو میرے اپنے بچانا چاہتے ہیں تو تمہیں اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے۔'' اور ہمیشہ کی طرح ان کی آواز غصے سے بلند ہو کر کمرے سے باہر جا رہی تھی۔ اور کسی کام سے اُدھر آتی ثانیہ نے کمرے کے کھلے دروازے سے ماں، باپ کے درمیان ہونے والی تکرار لفظ بہ لفظ سن لی تھی۔ اس کے ابا کس بدنامی کی بات کر رہے تھے۔ آخر اس سارے معاملے میں ثانیہ کا کیا قصور تھا۔ جو وہ ایک بار پھر اپنی ضد اور انا پرستی کا شکار ہو کر پھر سے ایک غلط اور نامناسب فیصلہ کر کے ثانیہ کی زندگی پر مسلط کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو باپ کے روبرو جانے سے روک نہیں سکی تھی۔ پہلے بھی اس نے ماں، باپ کے فیصلے پر سر جھکایا

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
- ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
- کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ایڈ فری لنکس
- ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
- ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.

All Done

Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

http://paksociety.com

تھا۔ مگر اب باپ کی بے جا ضد اور انا پر خود کو قربان کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔

''امی ٹھیک کہہ رہی ہیں ابا...... امجد بھائی اور میرا کوئی جوڑ نہیں ہے اور آپ کس بدنامی کی بات کر رہے ہیں، آخر میں نے ایسا کون سا جرم کیا ہے، جس کی وجہ سے میری ذات کو بنا قصور معتوب ٹھہرایا جا رہا ہے۔''

اور بیٹی کو یوں روبرو دیکھ کر سلیم احمد کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں ابھر آئی تھیں۔ وہ ناگواری سے بیگم کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آسیہ کو بھی ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ ثانیہ باپ کے مقابل کھڑے ہو کر اتنی جراُت مندی سے اپنا مقدمہ لڑنے خود چلی آئے گی۔ انہوں نے بھی اسے خائف نظروں سے دیکھا تھا۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ بھلا شاہ زیب سے منگنی ٹوٹنے میں اس کا کیا قصور تھا جو وہ لوگوں کی نام نہاد باتوں کی پروا کرے۔ آخر...... رشتہ ٹوٹنے کی بدنامی صرف لڑکی کے حصے میں کیوں آتی ہے مگر شاید یہ مناسب موقع نہیں تھا۔ آسیہ بیگم خود بات کرنا چاہتی تھیں اور اب بیٹی کی باتیں سن کر سلیم احمد نے ملامتی نگاہوں سے آسیہ کی طرف دیکھا تھا۔

''اچھا...... تو یہ تربیت کی ہے تم نے بیٹی کی کہ وہ باپ کے سامنے کھڑے ہو کر اس کے فیصلے سے انکار کر سکے...... یہی تعلیم حاصل کر رہی ہے یہ اسکول جا کر کہ ماں باپ کی بے عزتی کر سکے۔''

ثانیہ نے اس الزام پر تڑپ کر باپ کی طرف دیکھا تھا۔

''نہیں ابا...... میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ اور آپ کا یہ فیصلہ میرے لیے قابلِ احترام ہے۔ اگر یہ فیصلہ درست ہوتا تو میں کبھی انکار نہیں کرتی۔ مگر یہ سراسر زیادتی ہے میرے ساتھ، میں نافرمانی نہیں کر رہی...... لیکن میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔ میں اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں اس لیے پلیز...... مجھے مجبور مت کریں۔''

آنسوؤں کی شورش میں اس کا گلا بولتے، بولتے رندھ گیا تھا۔

اگلے لمحے وہ پلٹ کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی اور سلیم احمد ہی نہیں آسیہ کے ہونٹوں پر بھی چپ لگ گئی تھی۔ کیونکہ ثانیہ نے کچھ بھی تو غلط نہیں کہا تھا لیکن وہ نادان یہ نہیں جانتی تھی کہ ہمارے معاشرے میں لڑکی چاہے زم، زم سے دھلی پاکیزہ کردار کی مالک ہو منگنی یا نکاح ٹوٹنے پر دنیا والے عورت ذات کو ہی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان کی بچی تو ابھی بہت کم عمر تھی۔ ان کی جلد بازی کے فیصلے نے اس کے کردار کو خاندان والوں کی نظر میں بے مول کر دیا تھا۔

لیکن آخر کب تک بے گناہ، معصوم لڑکیوں کے ماں، باپ لوگوں اور خاندان والوں کی باتوں سے گھبرا کر اپنی معصوم بے قصور بیٹیوں کو آزمائش کی سولی پر مصلوب کرتے رہیں گے۔ وہ سلیم احمد سے یہ سب باتیں کہنا چاہتی تھیں جو بڑی بہن اور خاندان والوں کے باتیں بنانے کے ڈر سے اپنی بیٹی کو ایک بے جوڑ رشتے کے بندھن میں باندھ کر اس کی زندگی برباد کرنا چاہتے تھے۔ مگر وہ شوہر کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکیں تو یک دم پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگیں۔ سلیم احمد جو ہوا بھرے غبارے کی طرح پھٹ پڑنے والے تھے بیوی پر اچانک آسیہ بیگم کو پھپک کر روتے دیکھ کر تھکے چٹختے اعصاب کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئے۔ بیٹی نے انہیں آئینہ دکھایا تھا۔ اس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا، شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ایک غلطی کے بعد وہ دوسری غلطی دُہرانے جا رہے تھے۔ رقیہ بانو کی باتوں نے ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو مفلوج کر دیا تھا اور شاید وہ بڑی بہن کے دباؤ میں آکر ان کی خاطر زبردستی اپنا فیصلہ منوا بھی لیتے۔ لیکن ثانیہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ جس کی خوشیاں انہیں بھی عزیز تھیں۔ ذرا سکون سے اس کی کہی باتوں پر غور کیا تو انہیں فوراً احساس ہو گیا کہ وہ غلطی پر ہیں...... وہ آسیہ بیگم کی طرف دیکھنے لگے۔ جن کی دبی، دبی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

(باقی آئندہ)

سسرال میں عید

کرن حنان اسمی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

وہ گہری نیند سو رہی تھی جب موبائل فون کا الارم چیخ، چیخ کر بجنے لگا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی، گھڑی کی طرف دیکھا جو صبح کے چار بجا رہی تھی۔

”ارے اتنی جلدی چار بج گئے! ابھی تو نیند بھی پوری نہیں ہوئی۔“ اس نے ایک نظر برابر میں لیٹے میاں صاحب پر ڈالی جو میٹھی نیند سو رہے تھے۔ رشک بھری ایک نگاہ وہ ان پر ڈالتی اٹھ کھڑی ہوئی اور کچن کی طرف چلی گئی۔ نیند سے برا حال تھا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو کچھ نیند کی

خماری کم ہوئی۔ یہ سسرال میں اس کی پہلی عید تھی۔ چھ ماہ پہلے ہی تو وہ بیاہ کر پیا گھر آئی تھی۔ میکے میں اس کی امی فجر کے وقت ہی اٹھ کر سوّیاں بنالیا کرتی تھیں اور جب وہ اٹھتی خوب ساری سوّیاں کھاتی اور امی کی تعریف کرتی لیکن آج بات الگ تھی اسے لگا جیسے وہ اس ایک سال میں بہت بڑی ہوگئی ہو۔ کل تک وہ امی کے ہاتھ کی سوّیاں کھایا کرتی تھی مگر آج اسے خود بنانی پڑ رہی تھیں۔

ایک لمحے میں سمٹ آیا ہے صدیوں کا سفر
زندگی تیز بہت تیز چلی ہو جیسے

امی کی یاد آتے ہی ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔ اس نے سوّیاں بنائیں، گھر صاف ستھرا کیا، سب کے کپڑے پریس کیے جو رات کو ہی لاؤنج میں رکھ دیے گئے تھے۔ تب تک چھ بج چکے تھے۔ مسجد میں عید کی نماز سات بجے ادا ہونی تھی ابھی وقت تھا، اس نے پہلے خود شاور لیا پھر میاں جی کو اٹھانے کے لیے گئی۔ وہ اب بھی اتنی ہی گہری نیند سو رہے تھے جیسا وہ انہیں چھوڑ کر گئی تھی۔ ''ارسلان کتنے ہینڈسم ہیں۔'' وہ چائے بنانے کچن میں چلی آئی۔

☆☆☆

گھر کے تمام افراد اٹھ چکے تھے۔ عید کی نماز کے لیے جانے سے پہلے تمام مرد حضرات کا منہ میٹھا کیا گیا۔ اب صوفیہ تیار ہونے لگی تو اس نے الماری سے پہلے وہ جوڑا نکالا جو اس کی امی اسے عیدی کے طور پر دے کر گئی تھیں۔ جوڑا انتہائی خوب صورت اور اس کی پسند کے عین مطابق تھا، اس نے جوڑے کو چوما اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ موٹے، موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ اسے شدت سے اپنا گھر یاد آرہا تھا۔ اس کا دل کیا وہ اڑ کر اپنے گھر چلی جائے اور اپنی ماں کے سینے سے جا لگے۔ یہ پہلی عید تھی جو وہ اپنے ماں، باپ، بہن، بھائیوں کے بنا گزارتی۔ وہ سوچوں میں گم تھی کہ اس کا موبائل بجا، اس نے جو اسکرین پر دیکھا تو امی جان کا نمبر تھا۔ سچ ہے دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اس نے لپک کر فون اٹھایا۔ آنکھوں میں چمک اور لبوں پر تبسم بکھر گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے فون کان سے لگایا اور شدتِ جذبات سے آواز رندھ گئی۔

''السلام علیکم امی جان! میں آپ کو ہی یاد کر رہی تھی۔'' وہ نم لہجے میں بولی۔

''وعلیکم السلام بیٹا! میں جانتی تھی کہ میری بیٹی مجھے یاد کر رہی ہے اس لیے فون کر لیا۔'' دوسری طرف سے بھی گرم جوشی سے جواب دیا گیا۔

''امی میری پیاری امی! آپ کو کیسے پتا چل جاتا ہے؟'' وہ ماں کے اچانک فون آنے پر حیران بھی تھی۔

''ماں ہوں ناں اس لیے پتا چل جاتا ہے، اچھا یہ بتاؤ سوّیاں بنالیں یا ابھی تک سو رہی تھیں۔'' انہوں نے ایسے ہی پوچھا جبکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ صبح ہی بنا چکی ہوگی۔

''جی، جی امی بنالی تھیں، آپ کو پتا ہے، میں آپ کی طرح صبح چار بجے ہی اٹھ گئی تھی۔''

''شاباش میرا بیٹا! مجھے فخر ہے اپنے بچوں پر، دیکھو بیٹا! یہ جو ماں، باپ کی عزت ہوتی ہے ناں یہ بیٹیوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور مجھے خوشی ہے کہ ان چھ مہینوں میں میری بیٹی نے کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا۔''

وہ اکثر اسے فون کر کے ایسے ہی سمجھایا کرتی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ آج صوفیہ نہ صرف اپنے شوہر کے بلکہ تمام سسرال والوں کے دل پر راج کر رہی تھی۔

''جی امی......'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اچھا اب تیار ہو جاؤ، تمہاری تیاری میں بھی ٹائم لگتا ہے۔'' ''میری بیٹی کو سجنے سنورنے کا جو بہت شوق ہے، خوش رہو میرا بیٹا ہمیشہ۔''

''جی، جی بہت۔'' اس نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کیا اور دوبارہ کپڑوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس نے الماری سے وہ جوڑا بھی نکالا جو ارسلان نے اسے عید کے لیے لا کر دیا تھا۔ یہ جوڑا بس نارمل ہی تھا جبکہ اس کی ماں کا لایا ہوا جوڑا بے حد خوب صورت تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ کیا پہنے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ امی والا جوڑا ہی پہنے مگر پھر اسے خیال آیا کہ ارسلان اس کے لیے بہت پیار سے لائے ہیں، کہیں

وہ برا ہی نہ مان جائیں۔ آخر کار فیصلہ ارسلان کے لائے جوڑے کے حق میں کیا گیا۔ وہ اس جوڑے میں بھی بلا کی خوب صورت لگ رہی تھی۔ خوب سجی سنوری، ارسلان کو بھی اس کا سجے سنورے رہنا اچھا لگتا تھا۔

”صوفیہ بیگم آج تو ارسلان تم پر فدا ہی ہو جائیں گے، گلابی رنگ میں تو تم کتنی حسین لگ رہی ہو۔“ وہ خود کلامی کر رہی تھی، ارسلان کب کمرے میں داخل ہوا اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ اس کا جو عکس آئینے میں نمودار ہوا تو وہ ایک دم گھبرا سی گئی۔

”آ......آ......آپ! کب آئے؟“ اس نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

”تب ہی، جب میری حسین و جمیل بیوی سنگار کر رہی تھی، سچ میں یار! تمہیں خدا نے کتنی فرصت سے بنایا ہے، دل کرتا ہے بس تمہیں دیکھتا ہی رہوں۔“ اس نے اس کی جھیل سی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا، وہ اس پر اس قدر جھکا تھا کہ اگر وہ خود کو نہ سنبھالتی تو شاید اس سے ٹکرا جاتی۔

”آپ بھی ناں۔“ وہ شرماتے ہوئے پیچھے ہٹی تو ارسلان نے اسے کھینچ کر اپنے سے قریب کر لیا۔

☆☆☆

سسرال میں اس کی پہلی عید اچھی گزر رہی تھی مگر اپنے گھر والوں کی یاد بھی اسے ستا رہی تھی، اس لیے وہ خود کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھے ہوئے تھی۔ اس نے مختلف قسم کے پکوان بنائے۔ جو بھی اس کے ہاتھ کا کھانا کھاتا اس کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکتا۔ ہاتھ میں ذائقہ اسے اپنی ماں سے ہی ملا تھا۔ وہ کھانا ٹیبل پر لگا کر کچن میں جانے لگی تو میاں جی کی آواز آئی۔

”صوفیہ! تھوڑی صبح والی سوّیاں بھی لے آنا۔“

”جی اچھا۔“ کہتی وہ کچن میں چلی گئی۔

”ارے بھائی جان! کچھ ہم معصوموں کے لیے بھی چھوڑ دیں، صبح سے دس بار آپ کھا چکے ہیں۔“ یہ ارسلان کے چھوٹے بھائی علی کی آواز تھی جو شرارتاً اسے چھیڑ رہا تھا۔

جولائی 2017ء کے رنگ سسپنس کے سنگ
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
مزید
خطوط کی محفل، محفل شعر و سخن اور
مرزا امجد بیگ کی کھوج کا نتیجہ

غرق محبت
محبت کے دل آزار معاملات...... جہاں کوئی راز پوشیدہ نہیں رہتا مگر حال دل کسی پر کھلتا بھی نہیں۔ آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل کا شاہکار

سلسلے وراثت کے
سورج ڈوبتا ہے اور پھر اگلے دن نکلتا ہے...... دراصل ڈوبنے اور ابھرنے کا حصہ ہی تاریخ ہے جبکہ بادشاہت اور وراثت کا سلسلہ بھی اتنا ہی پرانا ہے۔ ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم کی روانی

شیش محل
انتقام کی گہری کھائی سے نکلتے ہوئے حسرتوں اور کچھ خواہشوں کے درمیان گزرتے لمحات اور دلنشیں واقعات پر مشتمل اک دلربا داستان کا آخری پڑاؤ...... اسما قادری کے خیالات کی پرواز

وقت
دھیرے دھیرے اپنا رنگ جماتا اور کرداروں سے آنکھ مچولی کرتا ہوا یہ وقت مزید واقعات کی تخلیق کرتا ہے...... حسام بٹ کی حیرت انگیز تحریر

اس کے علاوہ
منظر امام، ظفر اقبال ظفر، کبیر عباسی، تنویر ریاض، سلیم انور اور شاکر لطیف کا دلچسپ انداز

DOWNLQADED FROM PAKSOCIETY.COM

"اب ارسلان بیچارہ کیا کرے، ہماری بہو نے سویاں بنائی ہی اتنی مزے کی ہیں۔" ابو جان ارسلان کی طرفداری کرنے لگے۔ صوفیہ کچن سے سویاں لے کر آئی تو ساس نے اس کا ہاتھ تھام کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

"بہو نہیں یہ تو بیٹی ہے ہماری، سچ میں بیٹا تم نے تو جیسے اس گھر میں آ کر چار چاند لگا دیے ہیں، نہ جانے ہم نے ایسی کون سی نیکی کی تھی جس کا صلہ اللہ پاک نے ہمیں تمہاری صورت دیا ہے۔" ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

"نہیں امی! آپ خود بہت اچھی ہیں، آپ سب بہت اچھے ہیں بس اسی لیے آپ کو میں بھی اچھی لگتی ہوں۔" اس نے ساس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اُف یہاں پر تو سب ہی ایموشنل ہو رہے ہیں، ارے بھائی کسی کو ہماری بھی فکر ہے، پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔" علی نے ایسے انداز میں کہا کہ سب ہنس پڑے۔ سب کھانا کھاتے رہے اور اس کی تعریف کرتے رہے۔ سب کھا چکے تو وہ تمام برتن اٹھا کر کچن میں دھونے کے لیے چلی گئی کیونکہ آج ملازمہ کی چھٹی تھی۔ کتنا فرق تھا سسرال کی عید میں۔ گھر میں تو وہ شہزادیوں کی طرح عید منایا کرتی تھی۔ عید کے دن تو وہ کچن کا کام کرنا خود پر حرام سمجھتی تھی۔ عام روٹین میں تو وہ تمام کاموں میں امی کا ہاتھ بٹاتی مگر عید کا دن تو جیسے اس کا دن ہوتا۔ اگر کبھی امی کہہ بھی دیتیں کہ برتن ہی اٹھا کر رکھ دو تو وہ بڑی بے فکری سے کہتی اپنے کمرے کی طرف بھاگ جاتی کہ نہ جی نہ آج عید ہے، آج تو ہم کوئی کام نہیں کریں گے۔

وہ سوچوں میں گم آہستہ، آہستہ برتن دھو رہی تھی کہ شیشے کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر کر ریزہ، ریزہ ہو گیا۔ وہ ایک دم چونکی اور فرش پر گرے کانچ اٹھانے لگی۔

"ارے کیا ہوا؟ لگی تو نہیں؟ کتنی بار کہا ہے کہ اتنا کام مت کیا کرو، پر تم سنتی کہاں ہو۔" ارسلان نے آ کر اس کے دونوں ہاتھوں کا جائزہ لیا۔ "شکر ہے خدا کا، تمہیں لگی نہیں، چلو شاباش کمرے میں جا کے آرام کرو، یہ میں کر لیتا ہوں۔"

"نہیں، ارسلان میں کر لیتی ہوں۔" وہ جانتا تھا کہ وہ نہیں مانے گی اس لیے وہ اس کا ہاتھ تھام کر کمرے میں لے گیا۔

"صوفیہ! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں، تم نے میری زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا ہے، کبھی اپنی محبت کم مت کرنا اور تم کبھی کوئی فرمائش کیوں نہیں کرتیں؟" اب وہ اس کے ہاتھ تھامے بڑے پیار سے کہہ رہا تھا۔

"اس لیے کہ آپ میری ہر فرمائش بنا کہے جو پوری کر دیتے ہیں، ویسے ارسلان ایک بات کہوں۔" وہ سر جھکائے ہوئے تھی۔

"ہاں، ہاں بولو یار۔" ارسلان کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں

"کچھ نہیں......"

"بتاؤ ناں یار کیا بات ہے؟" اس نے پھر اصرار کیا۔ وہ خاموش تھی کہ اس سے کیسے کہے کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے، اپنے امی، ابو بہن بھائیوں سے گلے لگ کر عید ملنا چاہتی ہے اسے سب کی یاد ستا رہی ہے اور پھر امی کے ہاتھ کی بنی سویاں وہ کھائے بنا کیسے رہ سکتی تھی۔ آنسو اس کی پلکوں کو بھگوتے ہوئے ارسلان کے ہاتھوں پہ جا گرے۔ اس نے چونک کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا اور پھر صوفیہ کو۔

"یہ سب کیا ہے صوفیہ! میری جان کیا ہوا ہے تمہیں؟ مجھے نہیں بتاؤ گی۔" وہ بے حد محبت سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں، آپ بتائیں شام کو کھانے میں کیا بناؤں؟"

"ارے میری پیاری بیگم! آج ہم کھانا باہر کھائیں گے، چلو اٹھو جلدی سے تیار ہو جاؤ، خوب گھومیں گے پھریں گے اور پھر تمہارے فیورٹ ریسٹورنٹ میں کھانا کھائیں گے۔" وہ اٹھا اور اسے الماری سے اسے وہی جوڑا نکال کر دیا جو اس کی امی دے کر گئی تھیں۔

"ارے کتنا پیارا گرین کلر ہے، تم یہی پہنو بہت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پیاری لگو گی۔'' تھوڑی دیر بعد وہ تیار تھی۔

وہ آٹو رکشا لے آیا تو دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ آج گرمی کچھ زیادہ ہی تھی اس نے اپنا سر ارسلان کے کاندھے پر ٹکا کر آنکھیں موندلیں۔ وہ کب نیند کی وادی میں چلی گئی اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ اس کی کھلی زلفیں ہوا کے زور سے بار، بار اس کے منہ پہ آرہی تھیں۔ ارسلان بھی اپنی انگلی کی پوروں سے اس کی پیشانی سے زلفیں ہٹاتا رہا۔ فاصلہ کب طے ہوا دونوں کو پتا ہی نہیں چلا۔

رکشا رکا تو اس نے ایک لمحے اپنی بیگم کو دیکھا اور دوسرے لمحے اپنے کندھے کو ہلایا۔

''بیگم صاحبہ اٹھیے منزل آگئی ہے اگر آپ چاہیں تو آٹو میں مزید ایک آدھا گھنٹا سو سکتی ہیں؟'' اس نے بیوی کو چھیڑنے کے سے انداز میں کہا۔

''نہیں، وہ پتا ہی نہیں چلا کب نیند آگئی۔'' وہ گھبرا سی گئی اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے آٹو سے اتارا باہر کا نظارہ ہی اور تھا، وہ حیران تھی اس نے ایک نگاہ گیٹ پہ ڈالی اور دوسری ارسلان پر۔

''بیگم چلیے، اندر سب انتظار کر رہے ہیں۔'' اس نے اسے حیران کھڑے دیکھا تو خود ہی ہاتھ تھام کر اندر لے گیا۔ وہ سب سے گرم جوشی سے ملی اور ساتھ، ساتھ تشکر بھری نگاہیں ارسلان پر بھی ڈالتی رہی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اچانک ملی خوشی کا اظہار کس طرح کرے۔

''امی سب سے پہلے اپنے ہاتھ کی بنی سوّیاں کھلائیں بہت مس کیا ہے میں نے انہیں۔''

''جی آپی! میں لاتی ہوں ابھی۔'' صبا سوّیاں لینے چلی گئی تو سب ہنسی مذاق کرنے لگے۔ کتنی خوشی تھی سب کے چہروں پہ...... یہ خوشی ارسلان نے سب کو دی تھی۔ صبا نے سوّیاں لا کر ان کے سامنے رکھیں تو صوفیہ جلدی جلدی ڈونگے سے ہی کھانے لگی۔

''ارے آرام سے آپی! سوّیاں کہیں بھاگ تھوڑی رہی ہیں۔'' صبا نے کہا تو سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''واہ آنٹی آپ تو بالکل صوفیہ جیسی سوّیاں بناتی ہیں بے حد مزیدار۔'' ارسلان نے کھاتے ہی آنٹی کی تعریف کی۔

''نہیں جناب امی میرے جیسی نہیں بلکہ میں امی جیسی بناتی ہوں۔'' صوفیہ نے سوّیاں کھاتے ہوئے کہا۔

باقی کا وقت انہوں نے وہاں ہی گزارہ۔ خوب باتیں ہنسی مذاق اور ہلا گلا چلتا رہا۔ صوفیہ کے چہرے پر خوشیوں کے رنگ ارسلان کی نظر سے چھپے نہیں رہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ بہت خوش تھا۔ رات کے کھانے کے بعد انہوں نے اجازت لی تو انہیں خوب دعاؤں میں رخصت کیا گیا۔

☆☆☆

''مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ آپ کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں؟'' وہ دھیمے انداز میں بول رہی تھی۔

''شکریہ کس بات کا میری جان؟'' وہ جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔

''وہ آپ مجھے سب سے ملانے گھر لے گئے تھے ناں اس لیے، مجھے لگا آپ مجھے آج نہیں لے کر جائیں گے، اس لیے میں نے بھی اصرار نہیں کیا تھا۔ پھر آپ کیسے سمجھ گئے کہ میں کیا کہنا چاہتی تھی۔'' وہ اس کے قریب بیٹھی سر جھکائے... بول رہی تھی۔

''یہ دلوں کی باتیں ہیں بیگم! انسان بِنا کہے ہی بہت کچھ سمجھ جاتا ہے، تم نے مجھے اتنا پیار، اتنی محبت دی، میرے گھر والوں کو اپنا سمجھا کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا، اپنی خوشی کے آگے میرے گھر والوں کو فوقیت دی ہے تو کیا میرا فرض نہیں بنتا کہ میں بھی تمہاری خوشی کا خیال رکھوں؟ ہم نے تو جناب بس اپنا فرض ادا کیا ہے۔'' ارسلان نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا تو اس کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''بس اسی مسکراہٹ پر تو ہم مرتے ہیں۔'' ارسلان نے اسے اپنے بے حد قریب کیا۔ یہ عید اس کی زندگی میں بہت پیار بھرے رنگ لے کر آئی تھی۔ ان کی مسکراہٹ کے ساتھ، ساتھ یہ عید بھی مسکرا اٹھی تھی۔

☆☆☆

www.paksociety.com

امرت!

شیریں حیدر

تخلیقِ کائنات سے لے کراب تک . . . کئی ادوار بدلے مگر عورت کی کہانی ہر دور میں لگ بھگ وہی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رشتوں کی ڈور میں باندھا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی تخلیق کے مقصد کو اور بھی خوب صورت بنائیں مگر اس کے پیدا کردہ دل میں جذبے بھی اسی کے پیدا کردہ تھے۔ محبت، نفرت، رشک، حسد، رنج، غصہ اور خوشی . . . اب ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم کس جذبے کو خود پر حاوی کرلیتے ہیں، یہ ہماری خصلت بن جاتا ہے اور ہماری کل شخصیت کا خلاصہ . . . یہی ہمارے کردار کی تعمیر کرتا ہے اور ہم اسی کا تاثر دوسروں پر عمر بھر کے لیے چھوڑتے ہیں۔ ہماری عادات صرف ہم پر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ کسی کی زندگی کا سفر کس طرح سہل یا کٹھن ہوتا ہے اس کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اُن کی زندگی کے اہم کردار ہوتے ہیں اور جن کا ہونا یا نہ ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ پیدائش سے لے کر اپنی موت تک رشتوں کی ڈور سے بندھے ہوئے کردار زندگی کو ہنس کر گزارتے ہیں یا رو کر، مشقت سے سانس لیتے ہیں یا خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے ہوئے اس کا سارا دارومدار ان سے وابستہ رشتوں پر ہوتا ہے۔ وقت بدل جاتے ہیں مگر کہانی وہی رہتی ہے اور اپنی باری سے اس میں مختلف کردار شامل ہوتے رہتے ہیں۔

زندگی کے انہی پیچ وخم اور نشیب وفراز سے نبرد آزما ہوتی ایک چشم کشا تحریر……

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

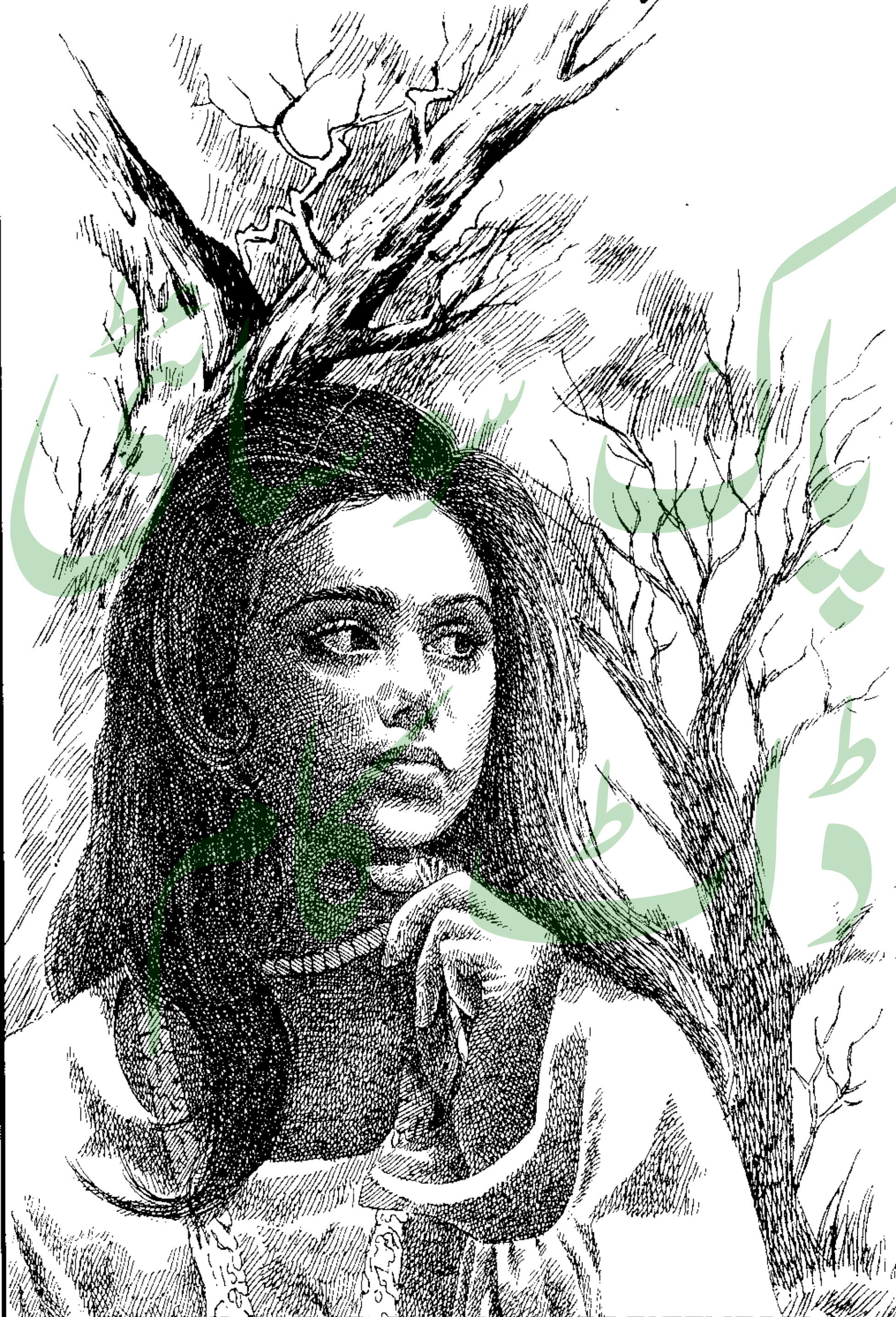

(زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے!)

''غضب خدا کا، ان لڑکیوں کی نیند......'' امو جان خلافِ توقع سویرے، سویرے غصے سے ہمارے کمرے میں آ ئیں، اتنی سویر بھی نہ تھی، میں اور تمنا اپنا کمرا صاف کر کے فارغ ہو چکی تھیں، تمنا شاور لے رہی تھی اور میں اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔

''ہم جاگ چکی ہیں امو جان، کمرا بھی صاف کرلیا ہے، آپ دیکھ لیں، تمنا نہا رہی ہے۔'' میں نے فوراً اپنی اور تمنا کی صفائی پیش کی۔

''تم لوگوں کو تو جانتی ہوں جان......'' انہوں نے رسان سے کہا۔ ''میں تو فاطمہ کی بات کر رہی ہوں، باہر کئی عورتیں آئی بیٹھی ہیں اور وہ ہے کہ ابھی تک کمرے سے باہر ہی نہیں نکلی۔''

''ان عورتوں کو اتنا سویرے، سویرے آنے کی کیا ضرورت ہے امو جان؟''

''ساتھ والے گاؤں کی کچھ عورتیں ہیں۔ اپنی ہی برادری کی ہیں، شادی پر نہ آ سکی تھیں کہ ان کے اپنے گھر میں شادی تھی تو آج مبارک باد دینے چلی آئیں۔''

''تو آپ اُن کے پاس بیٹھیں امو، چائے پانی پلائیں......''

''وہ لوگ دلہن کو دیکھنے اور اسے سلامی دینے آئے ہیں بیٹا!'' انہوں نے وضاحت کی۔

''کبیر بھائی کہاں ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ تو صبح سویرے ناشتا کر کے حسبِ معمول جا چکا ہے۔'' ان کے انداز میں اپنے بیٹے کی بات کرتے وقت فخر تھا۔

''ان کی شادی کو ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا امو جان......'' میں نے کہا۔ ''شہر میں لوگ اپنی شادیوں پر اپنے دفاتر سے مہینہ بھر کی چھٹیاں لیتے ہیں۔ اپنی نئی نویلی دلہنوں کے ساتھ وقت گزارتے ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے ایک دوسرے سے ہر وقت چپکے رہنا ضروری نہیں ہوتا......'' مجھے ان کے انداز سے ساس کی سی مخصوص بُو آئی۔ ''اب تم جاؤ اور اسے جگاؤ، برا لگتا ہے اس طرح۔ گاؤں کی عورتیں باہر نکل کر سو طرح کی باتیں کرتی ہیں کہ فلاں کی بہو دن چڑھے تک سو رہی تھی...... بہویں اگر یوں سونے لگیں تو چوکی چولہا کس طرح چلے گا؟''

''آپ سے تو مجھے اس طرح کی توقع نہیں تھی امو جان......'' میں نے تاسف سے کہا۔ ''آپ جائیں ان عورتوں کے پاس بیٹھیں، میں جگاتی ہوں اسے!'' وہ اٹھ کر گئیں، میں نے تمنا کا فون اٹھایا اور اس سے فاطمہ کا نمبر ڈائل کیا......

''جاگ رہی ہو پیاری؟'' میں نے اس کے سلام کے جواب میں کہا۔ ''میں تمنا نہیں، امرت بول رہی ہوں۔''

''ہاں جاگ تو اسی وقت گئی تھی جب کبیر جا رہے تھے...... مگر انہوں نے ہی کہا کہ میں ریسٹ کروں، تھکاوٹ بہت ہو گئی ہے اور وہ کہہ رہے تھے کہ وہ واپس آ کر میرے ساتھ ہی ناشتا کریں گے!'' یقیناً وہ کہہ کر تو گئے ہوں گے مگر امو جان نے انہیں ناشتا کروا کر ہی بھیجا ہوگا اور پھر کام میں مصروف ہو کر انہیں بھول گیا ہوگا کہ وہ فاطمہ سے کیا کہہ کر گئے تھے...... ''سب خیریت ہے ناں؟''

''ہاں ہاں، سب ٹھیک ہے، میں نے سوچا کہ چیک کرلوں اگر تم نے ناشتا نہیں کرلیا تو میں، تم اور تمنا اکٹھے ناشتا کرتے۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

''اور کبیر......؟'' اس نے سوال کیا۔

''چیک کرتی ہوں، عموماً تو وہ ناشتا کر کے جاتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ آج بھی ناشتا کر کے گئے ہوں......'' میں نے گول مول بات کی۔ ''تم کتنی دیر میں فریش ہوجاؤ گی؟''

''میں تو نہادھو کر کپڑے تبدیل کر کے یونہی ذرا سستا رہی ہوں......'' اس نے بتایا۔

''اچھا...... یہ تو بہت اچھی بات ہے، میں آتی ہوں تمہارے کمرے میں۔ لگتا ہے کہ باہر کچھ عورتیں دلہن کو ......یعنی تمہیں دیکھنے کے لیے آئی ہوئی ہیں، اموجان سے پوچھ لیتی ہوں پھر تم ان سے مل لینا......''

''اتنی صبح؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''یوں صبح صبح کون کسی کے گھر جاتا ہے۔''

''بے بی...... گاؤں کے لوگوں کے لحاظ سے تو اب آدھا دن گزر چکا ہے۔'' میں نے بشاشت سے کہا۔

''اچھا فون بند کرتی ہوں اور میں آرہی ہوں، تم تیار رہو!''

''اتنی سردی میں یہ عورتیں اپنے گھروں میں گرم گرم رضائیوں میں آرام نہیں کرسکتیں؟'' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔

''چند دن کی بات ہے بنو، نئی دلہن کا شوق ہے لوگوں کو...... پھر کوئی تمہیں اپنی گرم، گرم رضائیوں سے نکل کر دیکھنے نہیں آئے گا۔'' جتنی دیر میں، میں نے اس کے بستر کا کمبل تہ کر کے بستر کی سلوٹیں نکالیں اتنی دیر میں وہ تازہ لپ اسٹک لگا کر دوپٹا ٹھیک سے اوڑھ کر، سینڈلز پہن کر تیار کھڑی تھی۔ وہ مجھے منع کرتی رہی کہ اپنا بستر وغیرہ وہ خود درست کر لے گی مگر اس طرح اور بھی وقت ضائع ہوتا اور اموجان کا پارہ مزید ہائی ہوجاتا۔ میں اسے جلدی، جلدی کمرے سے نکال کر لائی اور ہم مہمانوں کے سامنے پہنچے تو انہوں نے اٹھ کر دلہن کی بلائیں لیں، اسے سلامیاں دیں۔

''چلتے ہیں عائشہ بھابی!'' ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''ارے بیٹھو ناں بھئی، ابھی اتنی جلدی چل دیں۔'' اموجان نے حسب عادت انہیں روکا۔ ''اب کھانا کھا کر جانا......''

''چلتے ہیں بھابی، دکان پر مردوں کا کھانا بھی بھیجنا ہے...... کافی دیر ہوچکی پہلے بھی اور یوں بھی آپ کے ہاں تو ابھی ناشتا ہوگا، دلہن رانی ابھی تو جاگ کر آئی ہیں۔'' وہ طنز سے باز نہ آئی تھیں۔ فاطمہ کا چہرہ دیکھنے کی سکت نہ تھی مجھ میں۔

''تو آپ ہمارے ساتھ ناشتا ہی کرلیں ناں پھپو...... ابھی تو میں نے اور تمنا نے بھی ناشتا کرنا ہے۔'' میں نے دانستہ کہا تا کہ فاطمہ کو خجالت نہ ہو۔

''نہیں بیٹا...... تم لوگ کرو ''ناشتا!'' انہوں نے دانستہ لفظ ناشتے پر زور دیا تھا۔'' میکے میں بیٹیوں اور سسرال میں بہوؤں کے انداز مختلف ہوتے ہیں، میکا تو بیٹیوں کے لیے سرائے ہوتا ہے، جہاں ان کے لاڈ اٹھائے جاتے ہیں، سسرال اصل آزمائش گاہ ہے۔'' دور پار کے رشتے سے ابوجان کی وہ کزن نامعقولیت کے سارے ریکارڈ توڑنے پر تلی تھیں۔

''بڑی منافقت کی بات ہے پھپو...... ایسے دوغلے معیار ان بیٹیوں کے لیے کیوں جنہوں نے آپ کی پوری اگلی نسل چلانی ہوتی ہے......'' جو بات اموجان کو کہنی چاہیے تھی، ان کی خاموشی کے باعث مجھے کہنا پڑی تو انہوں نے مجھے گھوری ماری۔

''مجھے ابھی اندازہ ہوگیا ہے بٹیا...... تمہاری سسرال والوں کی قسمت میں کیا اندھیرے ہیں۔'' انہوں نے زیادتی کی انتہا کردی مگر میں اموجان کی گھوری کے باعث خاموش ہوگئی۔ جانتی تھی کہ اصل کلاس تو ان مہمانوں کے جانے کے بعد ہوگی۔

''بچے، بڑوں کی باتوں میں نہیں بولتے امرت!'' ان کے سامنے تو انہوں نے صرف اتنی سی سرزنش کی تھی.... بعدازاں انہوں نے باقاعدہ میری کلاس لی تھی۔ تمنا بھی شاور لے کر نکل آئی تو ہم تینوں باورچی خانے میں گئیں کہ اپنے' اپنے ناشتے کا ملازمہ کو بتائیں...... ناشتا کرنے کے دوران ہی کبیر بھائی بھی ''حسبِ وعدہ'' آ گئے تھے۔

☆☆☆

''فارغ ہیں آپ مس؟'' مین آفس سے آیا جی پیغام لے کر آئی تھی۔

''جی فارغ تو نہیں مگر کہیے؟'' میں نے شائستگی سے اس سے کہا۔

''میڈم جی آپ کو بلا رہی ہیں۔'' آیا نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا، انہیں یہی حکم تھا کہ انگریزی بولنا لازمی ہے۔

''انہیں کہیے کہ جب بچوں کی آرٹ ٹیچر آتی ہیں تو میں آ جاؤں گی۔'' میں نے اس سے کہا، بچوں کو یوں تنہا چھوڑ کر نہیں جایا جا سکتا تھا، پرنسپل کو بھی علم تھا اسی لیے انہوں نے آیا کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ کوئی... ایمرجنسی نہ تھی، ورنہ ایسی صورت میں وہ ہمیشہ خود کلاس میں آتی تھیں۔

''وہ جی میڈم کہہ رہی ہیں، کوئی ایمرجنسی نہیں، بے شک چھٹی کے بعد جب سب بچے چلے جائیں تو اس وقت آ کر آپ ان کی بات سن لیں۔'' آیا دوبارہ بتانے آئی تھی، میں اسی بات کی توقع کر رہی تھی۔

''ٹھیک ہے...... شکریہ!'' میں نے اسے کہا تو وہ چلی گئی۔

چھٹی کے بعد سب بچوں کی روانگی کے بعد فارغ ہو کر میں مین آفس میں گئی، دفتر میں کچھ ملاقاتی بیٹھے تھے اس لیے میں باہر ہی انتظار میں بیٹھ گئی اور باہر بڑے، بڑے میدانوں میں کھیل کے پیریڈ میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھنے لگی، کیسی بے فکری کی عمر ہوتی ہے، نہ کوئی پریشانی نہ غم، خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے ہوئے بچپن کتنی جلدی بیت جاتا ہے، میں سوچ رہی تھی۔ پھر عمر بڑھتی ہے، ہم عملی زندگیوں میں قدم رکھتے ہیں، قدم قدم پر پریشانیاں اور غم ہمیں چاٹنے کو لپک رہے ہوتے ہیں۔ شادی کے رشتے میں بندھ کر تو زندگی کا رنگ ہی بدل جاتا ہے، مجھے وہ وقت یاد آتا تھا جب فاطمہ کے ساتھ اموجان کا رویہ عجیب سا ہوتا تو میں اور تمنا اس کا ساتھ دیتے...... وہ ہماری پیاری دوست ہی نہیں، بڑی بھابی بھی تھی، پہلے دن ہی جب ہم نے اسے معتبر کرنے کو بھابی کہنا چاہا تو اس نے ایسا کہلوانے سے صاف انکار کر دیا......

''بھابی بناؤ گی تو دوستی ختم ہو جائے گی نندو!'' اس نے ہنس کر کہا تھا اور ہمیں کب عادت تھی بھلا اس کو بھابی کہنے کی، اس سے جو قربت دوستی میں محسوس ہوتی تھی وہ کسی اور رشتے میں کس طرح ہو سکتی تھی۔ ''اور تم بھی کل کلاں کو مجھ سے توقع نہ کرنا تمنا کہ میں تمہیں بھابی کہوں گی۔''

تمنا کا تو فاطمہ کی طرف داری کرنا بنتا تھا کہ وہ اس کا خیال کرتی تو کل کو اس کی بھی اس کی سسرال میں توقیر ہوتی...... حالانکہ ایسا نہیں تھا کہ مہرپھپو، اموجان کے فاطمہ کے ساتھ روا رکھے جانے والے رویے کا جواب تمنا کو دیتیں...... مگر قدرتی امر ہے کہ وہ بھی ایسا کر تو سکتی تھیں۔ پڑھ لکھ کر اور شہروں میں عمر بتا کر انسانوں کے رویوں میں فرق تو آ جاتا ہے، دیہات کے عام لوگوں کی نسبت ان کی عادات اور سوچیں مثبت ہوتی ہیں۔ اسی لیے ہم دونوں دبے لفظوں میں اموجان کو فاطمہ پر ''ہاتھ ہلکا'' رکھنے کا کہنے کے ساتھ، ساتھ اپنے رویے سے اسے اہم بناتے، اس سے گپ شپ لگاتے اور اموجان کی سخت باتوں کو اپنی ہنسی مذاق کی باتوں کی گولیوں میں لپیٹ کر ان کا تاثر زائل کرنے کی کوشش کرتے۔

اموجان کی سوچ جاہلانہ تھی نہ ان کے اندر کوئی ناراضی...... بس وہ اس ڈر سے ایسا سلوک روا رکھتی تھیں کہ دیکھنے والے کیا کہیں گے، لوگ سنیں گے تو کیا سوچیں گے...... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تو فاطمہ کو اس ماحول میں ڈھلنا ہی تھا مگر اموجان سے وہ وقت نہیں گزارہ جا رہا تھا۔ فاطمہ یک مختلف ماحول میں پلی ہوئی لڑکی تھی۔ اس کے سینے میں بھی ہر

امرت

جوان لڑکی کی طرح امنگوں بھرا دل تھا، شادی اور شریکِ حیات کے حوالے سے کچھ خواب تھے مگر ان خوابوں کی تعبیر اسے کافی مختلف ملی۔ کبیر بھائی بہت لیے دیے رہنے والے خاموش طبع، سیر و تفریح سے زیادہ کام کے دلدادہ۔ وہ جو سوچے ہوئے ہوگی کہ وہ یہاں آ کر سب کچھ تبدیل کر لے گی، اپنی محبت سے کبیر بھائی کو بدل لے گی۔ شادی کے بعد یہ کرے گی، وہ کرے گی، سب کچھ خواب ہوا، جو کچھ بھی بدلنا تھا، اسی کو اور اپنے اندر ہی بدلنا تھا، یہاں تو جو کچھ تھا اسے 'جہاں ہے اور جیسے ہے' کے مقولے سے نہ ہٹنا تھا۔

بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے کبیر بھائی کی پرداخت جس طرح ہوئی تھی اسے بدلنے کے بجائے، ان کے ساتھ رہنے اور چلنے والوں کو بدلنا تھا۔ فاطمہ کے لیے یہ مرحلہ کافی دشوار تھا، اس راستے کی کٹھنائی میں صرف میں اور تمنا اس کے سہولت کار تھے، امو جان تو اس پر جلد از جلد ذمے داریوں کا بوجھ ڈالنا چاہتی تھیں اور پھر ہر آیا گیا یہ پوچھتا کہ ابھی تک انہیں دادی بننے کی کوئی نوید نہ ملی تھی۔ انسان وقت کے ساتھ، ساتھ کس طرح بدل جاتا ہے، رویّے، سلوک، سوچیں اور عمل...... میں جو سمجھتی تھی کہ امو جان جیسا پیار کرنے والا اور بے لوث انسان شاید ہی دنیا میں کوئی ہو، خود ہی اپنی سوچ تبدیل کرنے پر مجبور ہوگئی۔ ایک مہربان ماں، پیار کرنے والی خدمت گار اور وفا شعار بیوی، ارمان پورے کرنے والی بھابی، بھائیوں کا نام لے، لے کر جینے والی بہن...... سب کچھ اچھا تھا، وہ ایک انتہائی شفیق خاتون دور نزدیک والوں کے غم میں شریک ہونے والی، اب اپنے ساس کے رول سے انصاف کرتی نظر نہ آتی تھیں، جانے انہیں کیا اندیشہ تھا۔ ہاں اس روز وہ کتنی خوش نظر آ رہی تھیں جس روز فاطمہ نے انہیں بتایا کہ وہ دادی بننے والی تھیں۔

''میڈم اندر بلا رہی ہیں آپ کو!'' آیا کی آواز سے میں چونکی تھی، خیالات کی رو نے جانے کہاں، کہاں کی سیر کروا دی تھی۔

☆☆☆

''آپ اسی کلاس میں اپنی ملازمت جاری رکھنا چاہتی ہیں یا پھر......؟'' پرنسپل نے مجھ سے سوال کیا تھا، میں سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ کر رہ گئی، وہ پھر گویا ہوئیں۔ ''کے جی کلاس کی ٹیچر کو ہنگامی وجوہات کی بِنا پر ملازمت چھوڑنا پڑ رہی ہے، ان کے شوہر نے کسی ملک کی امیگریشن کے لیے اپلائی کر رکھا تھا اور انہیں امیگریشن مل گئی ہے...... اسی لیے وہ فوری طور پر ملازمت چھوڑنا چاہتی ہیں...... اسکول کی پالیسی کے مطابق اس نے ایک ماہ کا نوٹس ہمیں دے دیا ہے!''

''کے جی!'' میں سوچ میں بڑبڑائی۔

''تم نے اپنے انٹرویو کے وقت کہا تھا ناں کہ اگر کسی بڑی کلاس میں ویکینسی ہوئی تو تم ترجیح دو گی......'' انہوں نے مجھے یاد دلایا۔

''وہ تو ہے......'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''مگر مونٹیسوری اور کے جی میں اتنا فرق نہیں ہوتا، میرا مطلب پرائمری یا مڈل سیکشن سے تھا۔''

''مڈل سیکشن میں تو ہم انہی ٹیچرز کو رکھتے ہیں جن کی تعلیم اسی مضمون کے متعلق ہوتی ہے......'' انہوں نے کہا۔

''چلو اگر تم اسے ٹھیک محسوس نہیں کرتی ہو تو میں اصرار نہیں کروں گی، سوچ لو تم کل تک...... اگر کل بھی تمہارا یہی جواب ہوا تو پھر میں کسی اور سے بات کر لیتی ہوں یا پھر کے جی کے لیے کوئی نئی ٹیچر بھرتی کرنا ہوگی۔ اصل میں سال کا آخر ہے اور اس وقت بچوں کی ٹیچر کی تبدیلی پر والدین شدید احتجاج کریں گے، اندر خانے کوئی تبدیلی ہو جائے تو وہ پھر بھی گوارا کر لیتے ہیں...... اس صورت میں ہم نئی ٹیچر کو گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد بھرتی کرتے۔'' انہوں نے کہا، یقیناً وہ اس وقت ایک نئی ٹیچر بھرتی کرنا نہیں چاہتی تھیں تاکہ دو ایک ماہ کی ایک ٹیچر کی تنخواہ بچ جاتی۔

''میں کل آپ کو بتا دوں گی......'' میں نے کہا حالانکہ میرا اس پر سوچنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

''اس تبدیلی کی صورت میں، میں تمہاری تنخواہ میں تین ہزار روپے ماہانہ کا اضافہ بھی کر دوں گی!'' چارا پھینکا گیا، جانتی تھیں کہ گھروں سے یوں ملازمت کے لیے نکلنے والی لڑکیوں کے لیے ترغیب کیا ہو سکتی ہے۔

''اس تبدیلی کی صورت میں میری موجودہ کلاس کا کیا ہوگا؟'' نصف تعلیمی سال سے زیادہ ان بچوں کے ساتھ رہ رہ کر انسیت سی ہو گئی تھی اور جانتی تھی کہ اتنے چھوٹے بچے اس تبدیلی کو اتنی آسانی سے قبول نہیں کر سکیں گے۔

''وہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے پیاری!'' انہوں نے مجھے کہا۔ ''ہمارے پاس ایسی بہت سی درخواستیں ان لڑکیوں کی رکھی ہوتی ہیں جنہیں اپنی تعلیم کے دوران یا اختتام پر دو ایک ماہ کی انٹرشپ یا ٹریننگ کرنا ہوتی ہے، انہی میں سے کسی کو رکھ لیں گے۔'' تو گویا اس وقت اپنے مفادات اہم تھے، ان ٹریننگ کے لیے آنے والی لڑکیوں کو تو شاید وہ پانچ ہزار روپے ماہانہ دے دیتیں یا کچھ بھی نہ دیتیں تو بھی وہ بخوشی اس ''نامی گرامی'' سکول میں کام کرنے کو تیار ہو جاتیں۔

''میں آپ کو کل بتاؤں گی!'' کہہ کر میں ان کے دفتر سے نکل آئی اور کل نہیں، اسی روز پرنسپل کے اٹھنے سے پہلے ہی میں ان کے دفتر کے باہر کھڑی تھی، انہیں یہ بتانے کے لیے کہ مجھے ان کی تجویز پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ ایسا نہیں کہ مجھے تین ہزار اضافی روپوں کے لالچ نے مائل کر لیا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ یہ میری باس کی خواہش تھی اور باس تو ہمیشہ صحیح بات کہتے ہیں، اگر میں انکار بھی کرتی تو مسز کمیلا شاید مما تک اس معاملے کو پہنچا دیتیں اور پھر میرے پاس کوئی چارہ نہ ہوتا، بہتر ہے کہ میں خود ہی اس پر مہر ثبت کر دوں، اپنی رضا سے۔

گھر پہنچ کر میں نے مما کو اپنی ''ترقی'' کی خبر دی اور ان کی طرف سے کسی ردِعمل کی منتظر تھی۔

''ہاں بتایا تھا کمیلا نے مجھے فون کر کے، ان کی ایک ٹیچر اچانک ملازمت چھوڑ کر جا رہی ہے...... یہ نہ سمجھنا کہ تمہیں کسی قابلیت کی بنا پر ترقی ملی ہے، یہ نظریۂ ضرورت اور مطلب کا سودا ہے اور یوں بھی یہ ملازمت، ہی سفارش کی بنیاد پر دی گئی ہے تمہیں، میری سفارش کی بنیاد پر۔''

☆☆☆

''کیوں اس طرح کا برتاؤ کرتی ہیں آپ فاطمہ کے ساتھ امو جان؟'' میں نے امو جان کو ایک دن ان کے کمرے میں پکڑا، اس وقت جب وہ تھوڑی دیر پہلے ہی فاطمہ پر کسی چھوٹی سی بات پر برہم ہو گئی تھیں۔

''بیٹا، ساس بن کر ایسا ہی کرنا پڑتا ہے......'' انہوں نے جواز پیش کیا۔ ''ورنہ بہویں گھروں کے قاعدے قانون ہی نہیں سمجھ سکتیں۔''

''پلیز امو آپ کی تو ایسی عادت ہی نہیں، کیوں اس کے ساتھ ذرا سی بات پر بپھر جاتی ہیں؟''

''ہاں عادت نہیں ہے میری مگر بعض جگہوں پر تربیت نرمی کے بجائے سختی سے کرنا پڑتی ہے!''

''میں نے تو دادی جان جیسا نرم مزاج اور حلیم کسی کو نہیں دیکھا، انہوں نے تو کبھی آپ پر سختی نہیں کی۔ تو پھر آپ کیوں اپنی بہو کے ساتھ......؟''

''ہم گاؤں کی پلی بڑھی لڑکیاں تھیں، میکے اور سسرال کے ماحول میں کوئی فرق نہ تھا...... اس لیے ہم نے سسرال میں آ کر ان کے طور طریقے اپنانے میں ایک پل نہیں لگایا لیکن آج کل کی شہروں کی بچیاں...... دیکھتی نہیں ہو تم اسے، مجھ سے براہ راست بات تک نہیں کرتی، سامنے آ کر صرف سلام کرتی ہے اور اس کے بعد منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھ جاتی ہے......''

''ڈرتی ہے وہ آپ سے امو جان، کیا بات کرے وہ آپ کے ساتھ، اگلے دن اس نے سلام کے بعد آپ کی خیریت پوچھی تو آپ نے جواب میں کہا۔ 'مجھے کیا ہونا ہے بیٹا؟' اب وہ کیا پوچھے کہ جس کا جواب آپ اسے سیدھا دیں؟''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

''تو اور کیا کہتی میں اس سے؟'' انہوں نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

''آپ کہہ سکتی تھیں، 'میں ٹھیک ہوں بیٹا...... تم سناؤ؟' جس طریقے سے آپ نے جواب دیا، وہ مجھے اچھا نہیں لگا تو فاطمہ کو تو اور بھی برا لگا ہوگا۔'' میں نے رسان سے کہا۔

''بس آج کل کے والدین کا المیہ یہی ہے کہ اپنے بچوں کو وہ سب سے خراب اور غلط لگتے ہیں۔''

''ایسی بات نہیں ہے امو جان!'' میں نے ان کا ہاتھ تھاما اور ان کے کندھے سے لگ گئی۔ ''آپ قطعی غلط نہیں ہیں، بس آپ کا رویّہ..... صرف فاطمہ کے ساتھ تھوڑا ٹھیک نہیں ہے۔''

''شروع میں اپنے طور اطوار میں ڈھالنے کے لیے بہوؤں کے ساتھ ذرا سی سختی لازم ہے.....'' انہوں نے اپنی منطق پیش کی۔ ''ورنہ ایسا نہیں کہ مجھے وہ بری لگتی ہے یا میں اسے جان بوجھ کر تنگ کرتی ہوں۔''

''امو..... اگر آپ اس سے پیار سے بات کریں گی، نرمی سے اپنی بات منوائیں گی تو وہ سب سے بہتر ہوگا۔ کل کو اس گھر میں تمنا کو بہو بن کر جانا ہے، اس کی اماں اگر تمنا سے اس طرح کا سلوک روا رکھیں گی تو آپ کو اچھا نہیں لگے گا ناں.....'' میں نے انہیں سمجھانا چاہا۔

''کیا بہت برا سلوک کرتی ہوں میں اس کے ساتھ؟'' انہوں نے منہ لٹکا کر پوچھا۔

''حقیقت میں..... خاصا!'' میں نے پوری سچائی سے کہا۔

''کیا واقعی؟'' ان کا چہرہ لٹک گیا۔

''چلیں امو، اپ سیٹ نہ ہوں، اب بھی کچھ نہیں بگڑا..... آپ اپنا رویّہ اب بھی بدل سکتی ہیں۔''

''تم مجھے ایسا برا سمجھتی ہو؟'' انہوں نے منہ بسور کر پوچھا۔

''ارے نہیں امو..... آپ تو اتنی اچھی، اتنی پیاری ہیں۔''

''جانتی ہو کہ میں ایسا کیوں کرتی ہوں؟''

''آپ یقیناً اس کی بہتری کے لیے کرتی ہیں، چاہتی ہیں کہ لوگ اسے بھی اتنا ہی اچھا جانیں اور کہیں جتنی آپ ہیں.....'' میں نے کہا۔

''ہرگز نہیں.....'' انہوں نے میری بات کاٹی۔

''تو پھر..... پھر کیوں ایسا سلوک کرتی ہیں آپ اس کے ساتھ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے مہر بانو نے کہا تھا ایسا.....''

''کیا؟'' میں نے حیرت سے تقریباً چیخ کر پوچھا۔ ''مہر پھپو ایسا کیوں کہیں گی امو جان..... فاطمہ کیا اُن کی سگی بیٹی نہیں ہے؟''

''یہ کیا احمقانہ سوال ہے؟'' وہ خفگی سے بولیں۔

''پھر انہوں نے ایسا کیوں کہا امو جان؟''

''اس کے خیال میں فاطمہ اس کی اکلوتی بیٹی ہونے کے باعث اور اس کے لاڈ پیار میں گھرداری نہیں سیکھ سکی تو اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس پر شروع سے ہی سختی کروں تاکہ.....''

''انہوں نے کہا اور آپ نے عین سچ مان لیا امو..... ان کا مطلب یہی ہوگا کہ آپ اس پر اسی طرح سختی کریں جیسی کہ آپ نے اپنی بیٹیوں پر کی ہے.....''

''میں نے تم لوگوں پر کب اور کس معاملے میں سختی کی ہے؟'' وہ فوراً بولیں۔

''جب آپ نے ہم پر اور پھپو نے فاطمہ پر سختی نہیں کی تو آپ اب اس پر کیوں سختی کریں، ماؤں نے جب اپنی

بیٹیوں کو اتنے پیار سے پالا ہوتا ہے، ان پر ساسیں سختی کرنا شروع کر دیں اور پھر یہ توقع بھی کریں کہ وہ ان کی عزت کریں؟'' میں نے کہا۔

اس کے کئی سال بعد میں سوچتی تھی کہ جو بات مائیں کسی نہ کسی طریقے سے بیٹیوں سے کہہ دیں، وہ پھر برداشت کر لیتی ہیں مگر ساسوں کی کوئی بات کیوں برداشت نہیں ہوتی! شاید ساسیں بھی بہوؤں کی برداشت کو ان کے نقطۂ انجام تک آزماتی ہیں۔

☆☆☆

ہم سب کی توقع کے عین خلاف...... شامیر نے فوج میں جانے کے ابتدائی مراحل میں کامیابی حاصل کر لی تھی اور انتظار کر رہا تھا آئی ایس ایس بی کی کال کا، جس کے بعد اسے کوہاٹ جانا پڑتا۔ ان دنوں وہ دن رات انہی تیاریوں میں رہتا تھا۔ کبیر بھائی کا وہی لگا بندھا معمول، صبح کے گئے شام کو لوٹتے۔ کبھی کبھار دن کو گھر آتے بھی تو کھانا کھا کر پھر لوٹ جاتے۔ فاطمہ کی حالت زیادہ آرام اور توجہ کی متقاضی تھی، اموجان کا رویہ اس کے ساتھ بہتر ہو گیا تھا، وہ اس کا خیال رکھتیں، اس کے کھانے پینے اور آرام کے اوقات کا بھی دھیان کرتیں۔ مہر پھپھو چاہ رہی تھیں کہ اسے کچھ عرصے کے لیے لاہور لے جائیں مگر کبیر بھائی اس پر متفق نہ ہوئے، امو نے بتایا کہ کبیر بھائی نے ان سے کہہ دیا تھا کہ پھپھو کو منع کر دیں۔

''کبیر بھائی......'' میں نے رات کے کھانے کے بعد باہر چارپائی پر بیٹھے ہوئے انہیں متوجہ کیا، وہ چائے پیتے ہوئے رکے، میری طرف مڑ کر سوالیہ نظر سے دیکھا۔

''کیا بات ہے گڑیا؟'' انہوں نے شفقت سے سوال کیا۔

''مہر پھپھو، فاطمہ کو کچھ دنوں کے لے جانا چاہتی ہیں...... آپ نے انہیں منع کیوں کر دیا؟''

''فاطمہ نے شکایت کی ہے تم سے کہ وہ جانا چاہتی ہے؟'' انہوں نے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

''نہیں نہیں...... ہرگز نہیں، فاطمہ مجھ سے کیوں شکایت کرے گی، اموجان نے مجھے بتایا تھا تو میں نے اس لیے پوچھا۔''

''اگر فاطمہ جانا چاہتی ہے تو چلی جائے۔'' بے نیازی سے انہوں نے کہا۔

''مگر آپ نے منع جو کر دیا ہے......'' میں نے ہچکچا کر کہا۔ ''جب وہ جانتی ہے کہ آپ نے منع کر دیا ہے تو وہ کیسے جا سکتی ہے؟''

''میں نے کسی وجہ سے ہی منع کیا ہے بیٹا!''

''کیا میں وہ وجہ پوچھ سکتی ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''بہتر ہوگا کہ تم وہ وجہ فاطمہ سے پوچھ لو......'' انہوں نے حتمی انداز میں کہا تو میں خاموش ہو گئی۔ وہ کھانا کھا کر ابو جان کے ساتھ کچھ وقت گزارتے اور زمینوں اور دیگر معاملات کی بابت ان سے مشورے لیتے تھے۔ اس روز جب وہ ابو جان کے ساتھ لاؤنج میں میٹنگ میں تھے تو میں فاطمہ کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ صوفے پر نیم دراز کچھ پڑھ رہی تھی، مجھے دیکھ کر اس نے ٹانگیں سمیٹیں اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''آؤ آؤ...... امرت، آؤ بیٹھو!'' اس نے مجھے اپنے ساتھ صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گئی، اس کا چہرہ پیلا سا ہو رہا تھا مگر اس پیلاہٹ میں چمک تھی، اندرونی خوشی کی چمک۔

''کیسی ہو پیاری؟'' میں نے اس کے گال کا بوسہ لیا۔ ''کھانا کھانے نہیں آئیں تم آج؟''

''بھوک بھی نہیں تھی، مامی جی نے شام کو دودھ میں جانے کیا، کیا میوے ڈال کر شیک بنایا تھا تو اس سے طبیعت میں گرانی سی ہو گئی۔''

''کچھ ہلکا سا کھا لیتیں...... چاول وغیرہ!'' میں نے اصرار کیا۔

''ابھی تو بالکل بھی بھوک نہیں...... بعد میں بھوک لگے گی تو کھا لوں گی۔'' اس نے فوراً کہا۔ ''تم سناؤ سب ٹھیک تو ہے ناں؟''

''ہاں سب ٹھیک ہے......'' میں نے کہا۔ ''فاطمہ تم خوش تو ہو نا یہاں؟''

''ہاں...... خوش ہوں۔'' اس نے فوراً کہا۔ ''کیوں؟ کیوں پوچھا تم نے؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''میں نے تو کبھی کبیر بھائی کو تم سے ہنس کر بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا، نہ ہی وہ تمہیں کہیں ہنی مون پر لے کر گئے ہیں......''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' اس نے عام سے لہجے میں کہا۔ 'ہنی مون کا ارادہ تو تھا مگر قدرت کو منظور نہ تھا، ابھی ہماری پلاننگ میں ایسا کچھ نہ تھا مگر جو اللہ کی رضا...... وہ ہم سب سے بڑھ کر بہتر منصوبہ ساز ہے...... زندگی رہی تو ہنی مون ہوتا رہے گا!''

''اچھا...... تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا ان باتوں سے؟ تم تو گھومنے پھرنے کی اتنی شوقین تھیں، کبیر بھائی پیار تو کرتے ہیں ناں تم سے؟'' میرے انداز میں تشویش تھی۔

''ہاہاہاہا......'' وہ ہنسی۔ ''تمہیں ایک لطیفہ سناؤں، ایک عورت ایک وکیل کے پاس گئی اور کہنے لگی کہ اسے اپنے شوہر سے طلاق لینا تھی، وکیل نے وجہ پوچھی تو کہنے لگی کہ اس کا شوہر اس سے پیار نہیں کرتا تمہارا کوئی بچہ؟ 'جی وکیل صاحب الحمدللہ میرے آٹھ بچے ہیں' ...... وکیل نے کہا 'شکر کرو بی بی کہ تمہارا شوہر تم سے ابھی پیار نہیں کرتا۔'' وہ لطیفہ سنا کر ہنسی، میری بھی ہنسی نکل گئی۔

''بچوں کے ہونے کا پیار سے کیا تعلق ہے فاطمہ...... بچے تو ان عورتوں کے بھی ہو جاتے ہیں جن کے شوہر ان کو رات سونے تک زبانی اور جسمانی ایذا پہنچاتے رہتے ہیں، صبح ٹھڈا مار کر جگاتے ہیں۔ پھر بھی توقع کرتے ہیں کہ انہیں ناشتا بھی ملے، واپسی پر بیوی کھانا پکا کر انتظار میں بھی بیٹھی ہو اور سوتے وقت اس کی ٹہل سیوا بھی کرے......''

''کوئی زیادہ ہی ناولوں کہانیوں جیسی باتیں نہیں کر رہی ہو تم؟'' اس نے ہنس کر کہا۔

''مہر پھپو تمہیں اپنے ساتھ لاہور لے کر جانا چاہتی ہیں کچھ وقت کے لیے، کیا تم جانا چاہتی ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہوں...... مشکل سوال ہے، جانا چاہتی بھی ہوں اور نہیں بھی......''

''نہیں بھی کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس کی دو وجوہات ہیں پیاری......'' وہ مسکرائی، ایک انوکھی سی چمک اس کے چہرے پر تھی۔

''کیا دو وجوہات؟'' میری حیرت کو زباں ملی۔

''ایک تو یہ کہ تمہارے کبیر لالہ......'' اس نے بات شروع کی۔

''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ انہوں نے ہی تم پر پابندی لگا رکھی ہوگی......'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''سن تو لو میری بات!'' اس نے مجھے ٹوکا۔ ''وہ کہتے ہیں کہ انہیں میرے بغیر رہنے کی عادت نہیں رہی۔''

''کیا؟'' میں حیرت سے چیخی، اس کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے کہ شاید وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ ''وہ ایسی بات کر ہی نہیں سکتے۔'' میں نے دعوے سے کہا۔

''تم کیا خاک جانتی ہو اپنے لالہ کو......'' اس نے میری ہنسی اڑائی۔

''وہ اتنے رومینٹک ہو ہی نہیں سکتے...... وہ تو اتنے بھولے اور سادہ سے ہیں۔'' میں نے اس کی بات کی...... بھرپور نفی کی۔

”دنیا کی ساری ماؤں کو اپنے بیٹے اور بہنوں کو اپنے بھائی ایسے ہی بھولے لگتے ہیں۔“ وہ ہنسی۔ ایک بھرپور ہنسی، خوشیوں کا عکس اس کے چہرے پر تھا۔ ”کبیر مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں امرت، وہ بہت اچھے بیٹے اور بھائی ہونے کے ساتھ، ساتھ اچھے شوہر بھی ہیں۔“ اس کی بات پر یقین کرنا ہی پڑا۔

”اور دوسری وجہ؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”مجھے اس حالت میں میثاق اور بابا کے سامنے کچھ عجیب سا لگے گا......“

”یہاں بھی تو ابو جان ہیں...... شامیر ہے!“

”شامیر تو کم ہی گھر پر ہوتا ہے، ابو جان بھی ہر وقت گھر پر نہیں ہوتے اور پھر میں نے چادر اوڑھ رکھی ہوتی ہے تو مجھے ٹھیک لگتا ہے۔“

”تو وہاں بھی چادر اوڑھ لینا...... چند دن کے لیے چلی جاؤ۔“ میں نے تجویز دی۔

”تمہیں بابا کا علم نہیں...... کہیں گے اتنی گرمی میں پاگلوں کی طرح چادر لپیٹ رکھی ہے، اتارو اسے اور کوئی دوپٹا وغیرہ لے لو۔“ اس نے خود ہی فرض کیا تھا، اب کے میں ہنسی۔

”تمہیں سب علم ہے کہ کون کب اور کیا کہے گا۔“

”ویسے ایک اور بات بھی ہے، تیسری بات۔“ وہ ہنسی۔

”وہ کیا؟“ میں نے اٹھتے، اٹھتے واپس بیٹھ کر پوچھا۔

”مجھے بھی کبیر کے بغیر نیند نہیں آتی......“ اس کے کہنے پر میری ہنسی نکل گئی۔

”ہاں تم نے عمرِ عزیز کے چوبیس برس جاگ کر ہی تو گزارے ہیں ناں!“ میں نے اسے گھوری ماری۔

”ہاں تقریباً!“ ہم دونوں بھرپور ہنسی تھیں۔

”ویسے ایک بات ہے فاطمہ......“ میں نے ہولے سے کہا۔ ”ایک بات کا مجھے یقین نہیں آ رہا کہ کبیر بھائی اتنے رومینٹک ہو سکتے ہیں۔“

”کیوں بھلا؟“

”ذرا مختلف سے ہیں ناں، کم بولتے ہیں، ریزرو سے رہتے ہیں۔“ میں نے وضاحت کی۔

”مجھے اسی طرح کے مرد اچھے لگتے ہیں...... مختلف سے۔“

”پنجابی فلموں کے ہیرو جیسے؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں جن کے گرد ہیروئن ناچ، ناچ کر ہانپ جاتی ہے مگر ان کے چہرے کی رعونت نہیں جاتی......“ ہم دونوں کا قہقہہ بلند ہوا، اسی سمے کبیر بھائی کمرے میں آئے تھے، ہم دونوں کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔

”کیا بات ہے...... لطیفہ بہت اچھا تھا کیا؟“ انہوں نے سوال کیا تو ہم دونوں کی ہنسی نکل گئی۔

”ہم آپ کے خلاف باتیں کر رہے تھے......“ فاطمہ نے کہا۔

”وہ تو مجھے گل کو یہاں دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا......“ ان کے لہجے میں بھی شرارت تھی۔ ”کیوں گل بیٹا! ہو گئی تسلی تمہاری؟“ ان کے براہِ راست سوال پر میں شرمندہ ہو کر باہر کو لپکی۔

☆☆☆

میں دل ہی دل میں دعائیں کر رہی تھی کہ مما کسی کیمسٹ سے کیفیت بتا کر دوا لے آئیں۔ تیار ہو کر ان کے ساتھ کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کا موڈ تھا نہ ہی ہمت کہ مما کے سامنے ڈاکٹر کوئی انکشاف کرے، میں ان کے غصے اور ردِعمل کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

''مما آپ جا کر کیمسٹ سے دوا لا دیں......'' میں نے مشکل سے بستر چھوڑ کر منہ ہاتھ دھویا تھا اور نیچے آ کر ان سے کہا۔

''میں کس چیز کی اور کیا دوا لا کر دوں تمہیں؟'' ان کے لہجے میں ایسی سختی تھی کہ مجھے ان کی تھوڑی دیر پہلے کی ہمدردی خواب محسوس ہو رہی تھی۔

''قے روکنے کی دوا مما......'' میں نے بہ مشکل کہا۔

''تمہیں خود ساتھ چلنا ہوگا، یہاں اس طرح کون دوا دیتا ہے، کوئی گاؤں کا حکیم تو نہیں جو کیفیت سن کر دوا دے دے گا۔'' ہمیشہ کی طرح طنز، وہ کبھی گاؤں میں نہیں رہی تھیں مگر گاؤں کے بارے میں ہر منفی بات کا انہیں علم تھا، اپنی کلاس کے زعم میں مبتلا، اپنے شہری ہونے پر نازاں......

''میں تیار ہو کر آتی ہوں پھر......'' ہولے سے کہہ کر میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''کچھ ناشتا وغیرہ تو کر لیتیں تم!'' عقب سے ان کی آواز آئی، پل میں تولہ پل میں ماشہ۔

''میں دودھ لے لیتی ہوں، بھوک نہیں ہے مجھے اور یوں بھی جو کچھ کھاتی ہوں فوراً قے آ جاتی ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے جناب!'' ان کے کہنے پر میں مرے، مرے قدموں سے باورچی خانے میں گئی، خانساماں کچھ بھون رہا تھا، اس کی خوشبو میرے دماغ میں چڑھ رہی تھی۔

''کیا چاہیے بیٹا؟'' انہوں نے شفقت سے پوچھا۔ ''میں بنا دیتا ہوں۔''

''کچھ نہیں مقبول بابا......بس میں دودھ لوں گی۔'' فریج سے میں نے دودھ کا ڈبا نکالا اور گلاس میں انڈیلنے لگی۔

''انڈا بنا دوں ساتھ؟'' انہوں نے پھر پوچھا۔ ''ٹھنڈا دودھ لوگی بیٹا، تھوڑا سا گرم کر لو، پہلے ہی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''ٹھنڈا ٹھیک ہے بابا......'' میں جلد از جلد کچن سے نکلنا چاہتی تھی کہ میرا جی متلا رہا تھا، دودھ کا گلاس لے کر ... بہ مشکل اوپر پہنچی ہی تھی کہ گلاس تپائی پر رکھ کر سیدھا غسل خانے کو بھاگنا پڑا، باہر نکلی تو میں نڈھال ہو چکی تھی۔ یقیناً مما نیچے میرا انتظار کر رہی ہوں گی اور میرے جلدی نہ جانے پر ناراض بھی ہوں گی، دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

''کون ہے؟'' میں نے نقاہت سے پوچھا۔

''جی میں ہوں ساجدہ......'' باہر سے آواز آئی۔

''اندر آ جاؤ ساجدہ!'' میں نے کہا تو وہ دروازہ کھول کر اندر آئی، میں بیڈ کے کنارے پر ہی پڑی تھی۔

''آپ کی طبیعت تو بہت خراب لگ رہی ہے بی بی...... بڑی بی بی نے مجھے آپ کو بلانے کو بھیجا ہے مگر آپ تو ابھی تک انہی کپڑوں میں ہیں۔''

''ہاں کمزوری کی وجہ سے مجھ سے ہلا بھی نہیں جا رہا ساجدہ!'' میں نے کہا، میرے دل کی دھڑکن بھی مدھم سی چل رہی تھی۔

''آپ کا تو جسم بالکل ٹھنڈا ہو رہا ہے......'' اس نے مجھے چھو کر دیکھا اور گھبراہٹ سے کہا، اس کے بعد مجھے غنودگی سی ہونے لگی، میں نے غنودگی میں ہی اسے چیختا اور باہر کو بھاگتا ہوا محسوس کیا، اس کے بعد سیڑھیوں سے کسی کے اوپر آنے کی آوازیں اور پھر طویل خاموشی کا وقفہ......شاید میں بے ہوش ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''ہوش آ رہا ہے......'' ایک آواز آئی تھی، میری آنکھیں بند تھیں مگر شاید میری بند آنکھوں کی پتلیوں کی جنبش سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا۔

''اسے ہوا کیا ہے ڈاکٹر جواد؟'' مما کی آواز میں پریشانی تھی۔

''بلڈ پریشر بہت لو ہو گیا تھا......'' ڈاکٹر جواد نے کہا۔ ''مجھے جو شک ہے اس کی تصدیق کے لیے آپ انہیں کسی گائنا کالوجسٹ کو دکھالیں، فی الحال تو میں نے انجکشن لگا دیا ہے...... آپ جب میرے اندازے کی تصدیق کروالیں تو ہی کوئی دوا تجویز کی جاسکتی ہے ورنہ اس حالت میں کوئی بھی دوا دینا خطرناک ہو سکتا ہے۔'' اپنے کمرے میں موتیے کے پھولوں کی مخصوص خوشبو کو میں پہچانتی تھی جو میں شوق سے اپنی سائڈ ٹیبل پر رکھتی تھی، اس کا مطلب ہے کہ ڈاکٹر جواد کو مما نے ایمرجنسی میں گھر بلوایا تھا۔ میں ہوش میں آنے کے باوجود آنکھیں بند رکھے ہوئے تھی۔

''آپ ہوش میں ہو بیٹا؟'' ان کی شفیق آواز آئی۔

''ہوں......'' میں نے ہولے سے کہا۔

''میں چلتا ہوں پھر میڈم!'' مما سے اجازت لے کر وہ روانہ ہوئے۔ مما نے ساجدہ سے کہا کہ وہ ڈاکٹر جواد کو باہر تک چھوڑ دے۔

''تم ٹھیک ہو بیٹا؟'' ایسا مہربان اور شفیق لہجہ مما کا کب ہو سکتا تھا، میں آنکھیں موند کر یوں ہی پڑے رہنا چاہتی تھی۔

''جی......'' بس اتنا ہی کہہ سکی تھی میں۔

''میں تمہارے لیے سوپ بنواتی ہوں، جلد ہی تم بہتر محسوس کرو گی۔'' کہہ کر وہ میرے کمرے سے نکلیں تو میں نے آنکھیں کھولیں۔ جانے کیا وقت ہوا تھا، کمرے کے نیم تاریک ماحول میں تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا۔ جاتے ہوئے مما کمرے کی بتی بجھا گئی تھیں، ہلکی سی روشنی والا زیرو کا بلب آن تھا، دیوار گیر گھڑی میری عقبی دیوار پر تھی اس طرف مڑ کر دیکھنے کی ہمت ہی نہ تھی، میرا فون بھی جانے کہاں تھا۔

دروازے پر دستک کی آواز آئی۔ پھر ہلکی سی آواز سے دروازہ کھلا۔ ''جاگ رہی ہیں بی بی؟''

''ہاں ساجدہ......'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''کیا وقت ہوا ہے؟''

''دو بج رہے ہیں بی بی!'' اس نے بتایا۔ ''سوپ لائی ہوں آپ کے لیے، بڑی بی بی نے کہا ہے کہ خود آپ کو پلا کر آؤں۔''

''کھڑکی کے پردے ہٹا دو ساجدہ!''

''تیز دھوپ ہے، گرمی ہو جائے گی کمرے میں...... اے سی چلا دوں پھر؟'' اس نے سوال کیا۔

''تم پردے ہٹا دو، مجھے سردی لگ رہی ہے......'' میرے کہنے پر اس نے پردے ہٹائے تو کمرا روشنی سے بھر گیا، مجھے لگا میری آنکھیں اس روشنی سے چندھیا رہی ہوں۔

''آپ کے کندھے دبا دوں بی بی؟'' سوپ پلانے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا، میں خاموش رہی تو وہ ہولے، ہولے میرے کندھے اور کمر دبانے لگی۔ مجھے سکون آنے لگا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ کوئی خوشی کی خبر ہے بی بی!'' اس کا کہنا تھا کہ میرے وجود میں ایک سرد سی لہر اتری۔ ''میری بھی الٹیاں کر کر کے کمزوری سے ایسی ہی حالت ہو جاتی تھی!''

''تھینک یو ساجدہ...... بس کرو، اب میں بہتر محسوس کر رہی ہوں: پردے برابر کر دو، ایک لائٹ جلا دو، میں ذرا آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے بی بی......''

''سائڈ ٹیبل سے میرا فون تو پکڑا دینا۔'' میں نے اس سے کہا، مجھے فون دے کر، پردے برابر کر کے وہ چلی گئی۔ میں نے فون دیکھا، اس پر جانے کتنی ہی مسڈ کالیں اور پیغامات تھے...... میں نے ان کو پڑھنے کا ارادہ ملتوی کر کے

آنکھیں موند لیں، آنسو میری آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر میرے کانوں کی طرف سفر کر رہے تھے۔

☆☆☆

''کیسے ہو سکتا ہے یہ؟'' اس کا سوال تھا یا کوڑا جو میرے وجود پر لگا تو درد کی ایک لہر دوڑ گئی۔

''تم نہیں جانتے کہ کیسے ہوتا ہے یہ؟'' نہ خیریت دریافت کی، نہ ہمدردی کا کوئی لفظ۔

''جانتا ہوں...... اچھی طرح جانتا ہوں مگر پوچھ رہا ہوں کہ بے احتیاطی کہاں ہوئی؟''

''اللہ کے کاموں کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ علم نہیں ہے نہ ہی میں اس کی قدرت پر کوئی شک رکھتی ہوں کہ جو کچھ ہوتا ہے اس کی رضا سے ہوتا ہے...... ہماری کیا اوقات اور کیا سکت؟''

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری کتابِ زندگی میں اس نام کا کوئی باب نہیں ہے......'' اس کے لہجے میں سرد مہری تھی۔

''کتابِ زندگی کے ابواب ہم خود نہیں لکھتے...... کاتبِ تقدیر لکھتا ہے اور تقدیر پر ہمارا اختیار اتنا ہی ہے جتنا کسی بھی ذی روح کا ہوتا ہے۔'' میں نے رسان سے کہا۔

''بے مقصد بحث بالکل پسند نہیں مجھے اور تمہیں علم ہے کہ مما کس قدر اپ سیٹ ہیں اس بات کی وجہ سے۔''

''ابھی تک تو صرف شک ہی ہے، اس بات کی تصدیق تو ہوئی ہی نہیں، مفروضوں پر ہی تم نے میری کلاس لینا شروع کر دی۔'' میں تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی اور اس سے بحث کا موڈ بھی نہ تھا۔

''اگر یہ شک محض شک نہ رہا تو؟'' اس نے اپنے اندیشے کو زبان دی۔

''تو؟'' سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

نسوانی حسن میں اضافہ (بلوسم یونانی کریم) کل نہیں آج خوبصورت اور جاذب نظر آئیں

بلوسم بریسٹ ڈولپنگ اینڈ
ٹائیٹنگ کریم (ہربل)

چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے
بریسٹ کی نرمی کو دور کر کے سختی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔

گزشتہ 30 سال سے آزمودہ

گلیسی یونانی کریم

چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔

قیمتی جڑی بوٹیوں کے اجزا اور عرقیات سے تیار کردہ۔ بدنما داغ دھبوں، مہاسوں کو بھی صاف کر کے رنگ گورا کرتی ہے۔

☐ خواجہ اسٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
☐ صدر میڈیکل اسٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
☐ مسلم جنرل اسٹور لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
☐ ابراہیم سنز لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
☐ وقاص میڈیکل اسٹور والا آصف اسکوائر سیکٹر 22 کراچی
☐ قمری اسٹار جنرل اسٹور مدینہ چوک ریشم بازار حیدر آباد
☐ نیو دل دواخانہ وکٹوریہ روڈ سکھر
☐ خالد دواخانہ صرافہ بازار ایبٹ آباد
☐ قدیمی چنیوٹی دواخانہ کچہری بازار سرگودھا
☐ سلیم پنساری گوجرانوالہ روڈ حافظ آباد
☐ القیوم جنرل اسٹور ہسپتال روڈ [illegible]
☐ یوپی پنساری اسٹور ریلوے اسٹیشن روڈ [illegible]
☐ ناصر دواخانہ 20 صدر لائن پشاور صدر
☐ کلاسک ہومیو [illegible] روڈ کوئٹہ
☐ مصطفیٰ دواخانہ رسالہ روڈ حیدر آباد
☐ پنجاب ہومیو اسٹور چنیوٹ بازار فیصل آباد
☐ عوامی دواخانہ مین بازار مظفر آباد
☐ شہزاد دواخانہ شاہی بازار بہاول پور
☐ اتفاق ہومیو ملک پلازہ ٹرکنگ اڈا پارہ چنار
☐ ملت دواخانہ [illegible] پشاور
☐ ٹی ہومیو اسٹور کچہری روڈ ملتان

اپنی PIC روانہ کریں
watsap: 0311-5800057
Email: bdhdeva@yahoo.com
skype: devapak
کراچی ہوم ڈیلوری 0322-2916250
پنڈی ڈیلوری 0300-2500026

ڈسٹری بیوٹر بادشاہ دی ہٹی بوہڑ بازار راولپنڈی 051-5502903-5533528 ☐ اپنا ایڈریس SMS کر کے لٹریچر مفت منگوائیں

☐ النجیب یونانی اسٹور شاپ نمبر 4، زینت میڈیسن مارکیٹ، ڈینسو ہال کراچی 021-32720328, ریاض محمد 69 نیو عالمگیر مارکیٹ شاہ عالم لاہور۔ فون 042-7666264

پورے پاکستان میں گھر پر منگوانے کے لیے اور بریسٹ میں کمی یا اضافہ کے بارے میں مفت طبی مشورے کے لیے حکیم صاحب سے تمام امراض کے مشورے کی سہولت بریسٹ ڈویلپر آئل کے بارے میں معلومات اس نمبر پر حاصل کریں۔ Cell: 0333-5203553, Website: www.devaherbal.com

’’تم جانتی ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں اور مما نے تمہیں اس بارے میں پہلے دن ہی بتا دیا تھا۔‘‘ اس نے کہہ کر مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹنے کی کوشش کی۔ ’’ہمیں پہلے اپنی زندگی میں خود سیٹ ہونے کی ضرورت ہے...... ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنا ہے، بچہ ہم ابھی افورڈ نہیں کر سکتے، اس لیے اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو تمہیں خود علم ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔‘‘

’’مجھے نیند آ رہی ہے!‘‘ میں نے کسمسا کر اپنے وجود کو اس سے بچایا، میرے اندر گہرائی میں جوار بھاٹے اٹھ رہے تھے جیسے وہ بدقسمت وجود کسی سونامی کی زد میں آ گیا تھا، جسے ابھی کچھ مہینوں کے بعد اس دنیا میں آنا تھا...... شاید نہیں بھی آنا تھا۔

☆☆☆

امو جان...... شامیر کے جانے سے بہت اداس تھیں، ان کا چہرہ اتر گیا تھا، انہوں نے کبھی اس کے لیے بددعا تو نہ کی ہوگی مگر ان کے لاشعور میں کہیں دبی دبی یہ خواہش ضرور اٹھتی ہوگی کہ وہ فوج میں نہ جائے۔ فاطمہ، میں اور تمنا انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتیں، ابو جان اور کبیر بھائی تو اپنی زندگیوں میں مگن اور مصروف تھے اس لیے امو جان خود اپنے خول میں سمٹ گئیں، ان کی نمازیں اور ان کے سجدے طویل ہو گئے تھے۔ مصلے پر ہی کتنی دیر بیٹھے، بیٹھے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے، کبھی وہ ہولے، ہولے سسکنے لگتیں۔ وہ شاید ڈپریشن کی طرف جا رہی تھیں، شامیر ان کا چھوٹا اور بے حد لاڈلا بیٹا تھا، کبیر بھائی جتنے سنجیدہ تھے وہ اتنا ہی شوخ اور شرارتی۔

جہاں وہ موجود ہوتا وہاں قہقہے اور ہنسی ہوتی، ہر عمر کے لوگوں کو کمپنی دیتا اور بھرپور طریقے سے، کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یوں اس کے سر میں فوج میں جانے کا سودا سما جائے گا...... سو دا وہ جو سمایا تو اس نے جان جوکھوں سے اپنی منزل پا بھی لی۔ اس کی لگن سچی تھی، اس نے اپنی محنت اور زورِ بازو سے، سارے مراحل بخوبی طے کر کے فوج میں کمیشن حاصل کیا تھا۔ ابو جان اور کبیر بھائی اسے چھوڑنے کے لیے ایبٹ آباد گئے تھے، واپس لوٹے تو انہوں نے وہاں کے قصے یوں سنائے کہ لگتا تھا وہ کوئی دیو مالائی دنیا ہے...... جہاں ایک شامیر نہیں بلکہ اس جیسے سیکڑوں سپوت تھے جو تن، من، دھن سے مادرِ وطن کے رکھوالے بننے کو تیار تھے۔

’’امو جان کو کسی نہ کسی طرح مصروف کرنا ہوگا تمنا......‘‘ میں نے تمنا سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ اسے کسی کی پریشانی کم ہی نظر آتی تھی مگر میرا دل بہت حساس تھا اور میں دوسروں کی تکلیف کو بہت جلدی محسوس کر لیتی تھی۔

’’وہ کتابیں وغیرہ تو پہلے پڑھتی تھیں بڑے شوق سے مگر اب......‘‘ تمنا نے بے فکری سے کہا۔ ’’اب زیادہ تر وقت وہ مصلے پر ہی نظر آتی ہیں۔‘‘

’’عبادت کرنا کوئی غلط بات نہیں ہے مگر زندگی کی باقی سب مصروفیات سے منہ موڑ کر خود کو مصلے تک محدود کر لینا...... یہ رجحان ٹھیک نہیں تمنا...... وہ ڈپریشن کا شکار ہو رہی ہیں اور ہمیں ان کو اس سے نکالنا ہے۔‘‘

’’ہم کوئی ڈاکٹر ہیں امرت؟‘‘ اس نے ہنس کر کہا۔

’’تم میری بات کو مذاق میں اڑا رہی ہو......‘‘ میں ناراضی سے بولی۔ ’’تم نے سنا نہیں کہ بندہ ہی بندے کا دارو ہے۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ ابو جان کو اب گھر پر زیادہ وقت دینا چاہیے۔‘‘ تمنا کا مشورہ بھی برا نہ تھا۔

’’امو کو کسی کام میں مصروف کرنے کی ضرورت ہے پیاری۔‘‘

’’مثلاً...... کس کام میں؟‘‘ اس نے سوال کیا۔

’’کچھ سوچنا پڑے گا۔‘‘ میں نے دماغ دوڑانا شروع کیا۔

☆☆☆

’’آپ کو سویٹر بُننا تو آتے ہیں امو جان؟‘‘ میں نے ان سے پوچھا، وہ میرے بالوں میں تیل لگا رہی تھیں۔

’’ہاں بہت، پہلے میں بہت شوق سے بنائی کیا کرتی تھی، نیا نیا کروشیہ بنانا اور سویٹر کی بنائی سیکھی تھی، تم لوگ چھوٹے، چھوٹے تھے...... خاندان میں جو بھی بچہ پیدا ہوتا تھا میں اس کے لیے چھوٹے، چھوٹے سویٹر، موزے اور ٹوپیاں ... بُن، بُن کر دیا کرتی تھی!‘‘ وہ ماضی کے دریچوں میں جھانکنے لگیں۔ ’’تم لوگوں کو بھی میں نے اپنے ہاتھوں سے بُن، بُن کر سویٹر پہنائے ہیں، اس وقت کیمرے اتنے عام تھے نہ آج کل کی طرح تصویریں کھینچنے کا جنون، ورنہ میں ان سویٹروں کی تصویریں کھینچ کر رکھ لیتی......‘‘

’’میرا بہت دل چاہتا ہے امو کہ میں سویٹر بُننا سیکھوں، آپ سکھائیں گی مجھے؟‘‘

’’ہاں، ہاں کیوں نہیں۔‘‘ انہوں نے جوش سے کہا۔

’’آپ کو یاد ہے اب تک سب؟‘‘

’’سلائیاں ہاتھ میں پکڑوں گی تو سب یاد آ جائے گا۔‘‘ انہوں نے کہا۔

’’اچھا، کل میں فاطمہ کے ساتھ لاہور جا رہی ہوں تو واپسی پر سلائیاں اور اون لے کر آؤں گی، آپ مجھے لکھ کر دے دیں کہ کیا کیا چیزیں درکار ہیں، میں اسی حساب سے لے آؤں گی۔‘‘

’’سلائیاں تو میرے پاس ابھی تک ہوں گی، کروشیہ بھی، تم بس اون لے آنا۔‘‘ انہوں نے کہا۔ ’’عموماً دکانداروں کو علم ہوتا ہے کہ کس عمر کے لیے کتنی اون چاہیے ہوتی ہے۔ ویسے تم اور فاطمہ لاہور جا کیوں رہی ہو؟‘‘

’’امو جان، اس کا ماہانہ چیک اپ ہے اس لیے......‘‘ میں نے انہیں یاد دلایا۔ ’’تمنا کو آپ کی طرف سے اجازت نہیں ہے ورنہ جی تو اس کا بھی بہت چاہ رہا ہے۔‘‘

’’مناسب نہیں ہے یہ بیٹا، اسے سمجھاؤ، تم لوگوں کو رات رکنا ہے کیونکہ جانے اور آنے کے سفر میں فاطمہ تھک جائے گی اور یوں بھی ڈاکٹر کوئی نہ کوئی ٹسٹ لکھ دیتی ہیں تو زیادہ امکان ہے کہ رکنا ہی پڑے گا۔‘‘

’’کبیر بھائی کو خود ساتھ جانا چاہیے تھا امو جان!‘‘

’’ہر دفعہ جاتا ہے بیٹا، اس وقت فصل کو پانی لگوانا اہم ہے...... دوراتوں سے بہت فرق پڑ جاتا ہے، تم سمجھدار ہو، وہاں سے مہر بانو ساتھ جائے گی، پریشانی کی کیا بات ہے۔‘‘

’’کوئی اور مسئلہ نہیں ہے امو جان، نہ مجھے کوئی اکیلے جانے سے ڈر ہے، صرف یہ کہ ایسے معاملات میں شوہر کو بیوی کے ساتھ ہونا چاہیے......‘‘ میں نے اپنے موقف کی وضاحت کی۔

’’تم اتنی ہی بڑی بات کیا کرو، جتنی بڑی تم ہو...... ساری دنیا کی عورتیں بچے پیدا کرتی ہیں اور کسی کا شوہر اس کی پٹی سے لگ کر نو مہینے نہیں گزار سکتا......‘‘ ان کے لہجے میں غصہ در کر آیا۔ ’’جب بچے کی پیدائش کا وقت نزدیک آئے گا تو وہ چند دنوں کے لیے اس کے ساتھ ہی چلا جائے گا لاہور۔‘‘

’’اچھا مجھے بتائیں کہ کس، کس رنگ کی اون لے کر آنا ہے؟‘‘

’’سویٹر تم نے بنانا کس کے لیے ہے؟‘‘ ان کا موڈ تبدیل ہو گیا۔

’’پہلے تو سیکھوں گی اور سیکھنے، سیکھنے میں ہی چھوٹی، چھوٹی ٹوپیاں اور موزے بناؤں گی، کبیر لالہ کے آنے والے بچے کے لیے۔‘‘ میں نے تصور میں اس گل تھوتھنے سے وجود کی بلائیں لیں۔

’’اچھا...... چونکہ یہ علم نہیں کہ بیٹا ہے یا بیٹی تو ایسے رنگ لے آؤ جو دونوں میں چل جاتے ہیں، سفید، ہلکا سبز، ہلکا پیلا......‘‘

’’کتنا جانتی ہیں آپ رنگوں کے انتخاب کے بارے میں......‘‘ میں ہنسی۔ ’’اگر کوئی لڑکا گلابی پہن لے یا کوئی لڑکی نیلا رنگ تو اس سے کیا ان کی عزت میں فرق آ جاتا ہے؟‘‘

”ایسا تو نہیں ہے...... اب تو ناولوں اور کہانیوں میں ہیروز زیادہ تر گلابی شرٹیں ہی پہنتے ہیں۔“ ان کا کہنا تھا کہ میرے تصور میں اس کا سراپا چھن سے اتر آیا۔ کبیر بھائی کے ولیمے والے دن، سیاہ تھری پیس سوٹ کے ساتھ اس نے گلابی شرٹ اور کالی ٹائی لگا رکھی تھی، اس پر نظر ہی نہ ٹھہر رہی تھی پھر بھی میری نظریں اس کی بلائیں لے رہی تھیں۔

☆☆☆

سنا تو یہی تھا کہ گل پھپھو وغیرہ ملک میں نہیں تھے مگر لاہور جا کر علم ہوا کہ ایک دن پہلے ہی وہ واپس لوٹے تھے، شام کو فاطمہ کی ڈاکٹر کے ساتھ اپائنٹمنٹ تھی، وہاں سے لوٹے تو مہر پھپھو نے بتایا کہ گل پھپھو نے رات کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ دل اچھل پچھل کرنے لگا۔

”آپ منع کر دیتیں پھپھو ان کو!“ میں نے تکلفاً کہا، حالانکہ دل چاہ رہا تھا کہ وہ چند گھنٹے اڑ کر گزر جائیں۔ ”اس کی کیا ضرورت تھی بھلا، ہم کون سا مہمان ہیں۔“

”مما میں اس حالت میں کیسے اتنے لوگوں کے سامنے جاؤں گی، یوں کریں کہ مجھے رہنے دیں، آپ سب لوگ چلے جائیں!“

”تم دونوں کی وجہ سے ہی تو اس نے کھانے کا کہا ہے ورنہ میں تو یہیں رہتی ہوں۔“

پھوپا بھی بزنس ٹرپ پر ملک سے باہر تھے اور میثاق کا کوئی سیمینار تھا، یوں آخر میں ہم تینوں ہی رات کے کھانے پر گل پھپھو کی طرف جانے کے لیے رہ گئیں۔ گاڑی سے اترتے ہی باربی کیو کی خوشبو نے استقبال کیا، لان میں ہی سارا انتظام کیا گیا تھا، ہم بھی لان میں بچھی کرسیوں پر جا بیٹھے...... کامل اور تحریم ہی انگیٹھیوں میں کوئلے جلانے کے بعد سیخوں میں بوٹیاں پرو رہے تھے۔ کامل کے ساتھ میں نظر بھی نہ ملا رہی تھی، ہاشم پھوپا اندر لاؤنج میں کرکٹ میچ سے محظوظ ہو رہے تھے، ہمیں ملنے کو باہر آئے تھے اور پھر واپس چلے گئے۔

”ینگ مین، جب گوشت بھن جائے تو مجھے بلا لینا۔“ انہوں نے جاتے، جاتے کہا تھا۔

”شیور پاپا!“ کامل نے ہنس کر کہا تھا، لان میں اوائل اکتوبر کی خنکی تھی۔ قسم، قسم کے پھولوں کی خوشبو نے مل کر ماحول پر ایک سحر طاری کر دیا تھا، آگ کی سرخی سے دمکتا ہوا کامل کا چہرہ...... ماحول سحر زدہ تھا یا میں کسی سحر میں مبتلا تھی۔

”امرت اٹھو...... تم بھی ان کے ساتھ مل کر کام کرو...... گپ شپ لگاؤ۔“ گل پھپھو نے سحر توڑا تھا، میں مسمرائزڈ انداز میں اٹھی اور تحریم کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

”کبھی بنایا تم نے باربی کیو اس سے پہلے؟“ تحریم نے پوچھا تھا۔

”نہیں......“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”کل واپس چلی جاؤ گی؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”ہاں......“ نظر کامل کا طواف کر رہی تھی اور کان تحریم کی آواز پر لگے تھے۔

”تم پکڑو یہ سیخ اور اس پر بوٹیاں لگاؤ، میں اندر سے مسالا لگا ہوا باقی کا گوشت لے کر آتی ہوں......“ تحریم نے مجھے سیخ پکڑائی۔

”کسی ملازم سے کہہ دو......“ میں نے کہا۔

”باربی کیو والی شام مما ملازموں کو کسی کام کا نہیں کہتیں، تمام کام ہمارے ذمے ہوتا ہے، پاپا زیادہ کام کرتے ہیں مگر آج پاپا کا کرکٹ میچ ہے اور وہ ٹی وی کے سامنے سے ہٹنے والے نہیں چاہے جو بھی ہو جائے۔“ تحریم اندر چلی گئی۔

میں کامل کے ساتھ جیسے پوری دنیا میں تنہا رہ گئی تھی، دونوں پھپھو اور فاطمہ ذرا فاصلے پر تھیں۔

''کوئلوں کے اندر کیا گرا ہے تمہارا امرت؟'' میں جو جلتے کوئلوں کو گھور رہی تھی اب نظر اٹھا کر کامل کی طرف دیکھا، جذبوں کی لو دیتی آنکھیں، جو اس وقت آگ کی تپش سے لال ہو رہی تھیں مگر ان آنکھوں میں جھانکتے ہی میرے اندر کچھ پگھلنے لگا...... ''سوچ ہی رہا تھا کہ کس طرح تم سے ملاقات ہوگی اب؟'' میں اسے دیکھ کر رہ گئی۔ ''تم نہ آتیں تو!''

''تم آ جاتے کیا گاؤں؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''طنز کر رہی ہو؟'' اس نے مجھے گھورا۔ ''آزمانے کی کوشش نہ کرنا، تم مجھے جانتی نہیں ہو۔''

''تم آ بھی جاؤ گے تو کیا ہو جائے گا، کیا کر لو گے تم؟''

''تمہیں دیکھ کر اپنی نظروں کی پیاس تو بجھا لوں گا۔'' میں حیا سے لال ہوگئی، حالانکہ وہی کام میں بھی کر رہی تھی اور اسی سے سکون محسوس کر رہی تھی۔ ''سنبھل کے ذرا!'' بے دھیانی میں میرا دوپٹا اڑ کر آگ کی طرف گیا تھا، کامل نے اسے پکڑا تو وہ میرے گلے سے ذرا سا کھنچ گیا، میں نے چونک کر اسے پکڑا۔ ''بچت ہوگئی ناں!''

''ہوں ٹھیک ہے......'' میں نے ہولے سے کہا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ مما نے بات کی تھی ماموں سے، کبیر بھائی کی شادی سے واپس آتے ہوئے۔''

''اچھا؟'' میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ماموں نے تم سے رائے نہیں مانگی اس کے متعلق؟'' اس نے سوال کیا۔

''ممکن ہے کہ وہ خود ہی کوئی فیصلہ کر کے مجھے اطلاع کر دیں، ہمارے ہاں زیادہ تر رشتے اسی طرح طے ہوتے ہیں۔''

''میری مما کی شادی تو اس طرح نہیں ہوئی تھی۔'' اس نے دوبدو کہا۔ اس کا مطلب ہے کہ پھپو نے اپنے بچوں کو اپنے ماضی کی اس کہانی سے آگاہ کر رکھا تھا، میں نے چہرے کے تاثر سے ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں اس بارے میں جانتی تھی۔

''اچھا...... پھپو کی شادی کس طرح ہوئی تھی؟'' میں نے معصومیت سے سوال کیا۔

''ان کی مرضی سے......'' اس نے مختصراً کہا۔

''تحریم جانے کہاں رہ گئی ہے۔'' میں نے برآمدے کی طرف دیکھا۔

''بات کو بدلنے کی کوشش کر رہی ہو؟'' اس نے مجھے گھرکا۔

''کامل......'' میں نے بے بسی سے کہا۔ دھیان اس طرف بھی تھا کہ جہاں سے کوئی بھی اٹھ کر میرے عقب میں نہ آن کھڑا ہوتا۔

''جانِ کامل!'' میں بلش کر گئی۔ ''ساتھ دو گی ناں میرا، چاہے اپنے رواجوں سے بغاوت کرنا پڑے؟'' میرا دل کانپا، بغاوت! یہاں بات رواجوں سے نہیں بلکہ ماں باپ سے بغاوت کی ہوتی، اگر ان کی مرضی کہیں اور ہوتی اور میری رضا کامل...... تو ٹکراؤ لازم تھا اور اس کا نتیجہ کیا نکلتا، کون جانے! مجھے ایک کمزور سا شک تھا کہ شاید ابو جان کے دل میں کامل کا ہی رشتہ تھا۔ دادا جان، ابو سے اگر کسی بہن بھائی سے رشتے داری کرنے کو کہہ سکتے تھے تو وہ گل پھپو ہی ہو سکتی تھیں جو عمر بھر اپنے ماں باپ سے کھل کر مل بھی نہ سکی تھیں کہ انہوں نے رواجوں سے ٹکر لی تھی، اپنے بچپن کے منگیتر سے شادی کرنے سے انکار کر کے اپنی مرضی کی شادی کر لی تھی۔

''یہ تحریم کہاں رہ گئی؟'' میں نے پھر برآمدے کی طرف دیکھا۔

''ڈر رہی ہو مجھ سے؟''

''یار آج بار بی کیو کھانے کو ملے گا بھی یا پھر تم دونوں باتوں کے بگھار سے ہی فارغ نہ ہو گے؟'' فاطمہ نے چلّا کر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

جنت کے پتے
نمرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM
مصحف
نمرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM
نمل
نمرہ احمد
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
آبِ حیات
عُمیرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM
ہم سفر
فرحت اشتیاق
داستان ایمان فروشوں کی
جلد اول
التمش
بن روئے آنسو
فرحت اشتیاق
www.paksociety.com
عبداللہ
ہاشم ندیم
پیرِ کامل
عمیرہ احمد
متاعِ جاں ہے تو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM
من و سلویٰ
Man-o-Salwa
عمیرہ احمد
www.paksociety.com
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM
خدا اور محبت
ہاشم ندیم
یارم
سمیرا حمید
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
ٹوٹا ہوا تارہ
سمیرا شریف طور
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
قراقرم کا تاج محل
نمرہ احمد

پوچھا تھا۔

''کچھ تیار ہوا بچوں کہ نہیں؟'' پھوپا بھی میچ سے فارغ ہو کر باہر آ گئے تھے۔

''تشریف رکھیں پاپا...... something is cooking!'' کامل نے معنی خیز فقرہ کہا۔

''امید ہے تمہاری دال گل گئی ہو گی؟'' پھوپا نے بھی اسی انداز کا فقرہ کہا۔

''دال نہیں پاپا گوشت...... بوٹیاں!'' ٹرے میں تیار شدہ گوشت رکھ کر اس نے مجھے تھمایا۔ ''لے جاؤ امرت اور سب کو دو!'' اس نے بلند آواز سے کہا، میں نے ٹرے پکڑی۔ ''کھانے کے بعد میرے ساتھ آئس کریم کھانے چلو گی؟'' اس نے ہولے سے پوچھا۔

''نہیں......'' میں نے ٹرے لے کر اس طرف جاتے ہوئے ہولے سے اسے کہا، اس کا منہ لٹک گیا۔

''ظالم!'' وہ بڑبڑایا، میں زیرلب مسکرا دی، سب کو باربی کیو سرو کر کے میں بھی وہیں بیٹھ گئی، اب باقی کام کامل اور تحریم کر رہے تھے۔

''چائے کون، کون پیے گا؟'' تحریم نے پوچھا، سبھی امیدوار تھے۔ ''اگلا سوال ہے کہ چائے بنائے گا کون؟ میں تو بہت تھک گئی ہوں۔''

''میں بنا لیتی ہوں بیٹا!'' گل پھپو نے کہا تو مجھے شرمندگی محسوس ہوئی۔

''میں بناتی ہوں پھپو......'' میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو تم بناؤ...... میں آ کر کپ وغیرہ نکالتی ہوں پیاری!'' تحریم نے ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ میں باورچی خانے کی طرف چلی، تھوڑا بہت اندازہ تھا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے اس لیے مجھے چائے بنانے میں دشواری نہ ہوئی، چائے تقریباً تیار تھی اور تحریم ابھی تک نہیں آئی تھی۔

''کپ نکال دیے ہیں میڈم!'' اس کے انداز میں غصہ تھا۔ ''چائے ڈالنے کی زحمت کر لیں تو میں باہر لے جاؤں۔'' اسے غالباً تحریم نے بھیجا تھا کہ اس کا اپنا دل نہ تھا۔

''ناراض کیوں ہوتے ہو کامل؟'' میں نے اس کا خراب موڈ دیکھ کر پوچھا۔

''اور کیا کروں...... اتنا چٹا انکار، تمہیں احساس ہے کہ تم کتنا تڑپاتی ہو مجھے...... جانے کتنے مراحل باقی ہیں میری منزل کے راستے میں۔''

''لگن سچی ہو اور منزل نصیب میں تو سارے مراحل آسان ہو جاتے ہیں کامل!''

''میرے ساتھ جو وقت قسمت کی خوبی سے مل جاتا ہے اسے تو خوشی، خوشی گزارا کرو، جانِ کامل!'' وہ میرے اس قدر قریب تھا کہ میں خود کو کسی لطیف قید میں محسوس کر رہی تھی۔

''پلیز!'' اس کے ہاتھوں کے اپنے کندھوں پر ہلکے سے دباؤ پر میں نے احتجاج کیا۔

''اتنی سی گستاخی کی اجازت بھی نہیں دیتی ہو تم۔'' اس کے انداز میں شکوہ تھا۔ ''تم سے محبت کا اظہار بھی نہیں کر سکتا؟''

''کر سکتے ہو۔'' میں نے جی کڑا کر کہا۔ ''مگر صرف زبانی اور ویسے اس کی ضرورت نہیں ہے کامل......''

''کیوں...... کیوں ضرورت نہیں ہے؟'' اس نے موڈ آف کیا۔

''کیونکہ میں جانتی ہوں، چاہے تم کہو یا نہ کہو، میں تمہاری طلب کو بھی جانتی ہوں اور تمہارے جذبوں کی شدت کو بھی!'' میں نے اس کو یقین دہانی کرائی کہ میں اس کے دل کی کیفیت جانتی تھی۔

''ایسی کیفیت میری کیوں نہیں ہے امرت...... مجھے کیوں لگتا ہے کہ تمہارے جذبوں میں وہ شدت نہیں، تمہیں

میری ایسی طلب ہے نہ لگن، تمہیں مجھ سے ملنے کی ایسی تڑپ بھی نہیں ہے!‘‘ اس کا لہجہ خمار آلود تھا۔

’’تم کیا جانتے ہو کامل...... ‘‘ میرے منہ سے پھسل گیا۔ ’’میں اپنے جذبوں کا یقین تمہیں کیسے دلاؤں، کیسے بتاؤں کہ میں بھی تمہیں دیکھ کر جی اٹھتی ہوں، بند اور کھلی آنکھوں سے تمہارے سپنے دیکھتی ہوں۔‘‘ میں صرف سوچ کر رہ گئی تھی۔

’’تم بتا دو جو کچھ میں نہیں جانتا!‘‘ اس کے ہاتھ ابھی تک میرے کندھوں پر تھے...... میں نے اپنے ہاتھ کو اس کے ہاتھ پر رکھ کر ہلکے سے دباؤ سے اسے اپنی محبت کا یقین دلایا۔ ’’میں اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جس دن میں پورے استحقاق کے ساتھ تمہیں تھاموں گا تو تم خود کو میرے سپرد کر دو گی۔‘‘

’’باہر لوگ چائے کا انتظار کر رہے ہیں۔‘‘ میں نے مسکرا کر کہا اور وہ اپنے جس خواب سے بیدار ہوا تھا اس پر اس کا غصہ لازم تھا۔

☆☆☆

’’کیسا رہا تمہارا لاہور کا دورہ؟‘‘ تمنا نے پہلی فرصت میں سوال کیا۔ ’’سنا ہے بڑی بار بی کیو پارٹی ہوئی؟‘‘ اس نے آنکھ میچ کر پوچھا۔

’’تم تو یوں بار بی کیو پارٹی کا پوچھ رہی ہو جیسے کوئی کاک ٹیل پارٹی تھی۔‘‘

’’کاک ٹیل ہی ہوئی ناں......‘‘ اس نے ہنس کر کہا۔

’’اچھا کاک ٹیل کیسے ہوئی؟‘‘ میں نے حیرت سے پوچھا۔

’’بھئی دید کی پیاس بھی بجھے پیٹ کی بھوک کے ساتھ تو نشہ دو آتشہ ہو ہی جاتا ہے ناں!‘‘

’’تمہیں تو کچھ زیادہ ہی پیاس لگ رہی ہے دیدار کی، میرا خیال ہے۔‘‘ میں نے ہنس کر کہا۔ ’’اور وہ بجھی نہیں!‘‘

’’ہائے ظالم سماج...... امو جان!‘‘ اس نے اداکاری کی۔ ’’حالانکہ ابو جان نے کہا بھی کہ ہم دونوں بہنیں جائیں مگر امو...... ابو جان تو چاہتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ رہوں، پاسبانِ عقل کی طرح!‘‘

’’اچھا! بڑی عقلمند ہو ناں تم!‘‘

’’میثاق نے پوچھا نہیں میرے بارے میں؟‘‘ اس نے تجسس سے پوچھا۔

’’وہ مجھ سے کیوں تمہارے بارے میں پوچھے گا؟‘‘ میں نے ہنس کر کہا۔ ’’اسے تمہارے بارے میں کس بات کا علم نہیں ہے، دن بھر تو تم دونوں ٹیلی فون پر رابطے میں رہتے ہو۔‘‘

’’تمہیں بڑا پتا ہے......‘‘

’’جی، ابھی اگلے دن میں نے کسی ضرورت سے تمہارا فون اٹھایا تو اس پر غلطی سے میری نظر تمہارے پیغام پر پڑ گئی۔ ’نہا کر کون سا سوٹ پہنوں؟‘ ہر وقت تو تم ایک دوسرے سے رابطے میں ہو! ابھی سے یہ حال ہے تو شادی کے بعد تو سانس بھی پوچھ، پوچھ کر لیا کرو گی۔‘‘

’’توبہ!‘‘ اس نے تکیہ اٹھا کر مجھے مارا۔ ’’کتنی بڑی جاسوسہ ہو تم......‘‘ اس نے ایک اور وار کیا، میں ہنس دی۔

’’بڑی جاسوسہ تو تم ہو، مجھ سے زیادہ اندر کی خبریں رکھتی ہو۔‘‘

’’ارے ہاں یاد آیا...... کچھ سنا تم نے؟‘‘ اس نے پُراسرار انداز میں کہا۔

’’کیا سنا؟ کس سے سنا؟‘‘ میں نے اس سے مخصوص انداز میں سوال کیا، جب وہ اس طرح بات کرتی تھی تو اس کے پاس بہت خاص خبریں ہوتی تھیں اور وہ مجھے فوری سنانے کو بے چین ہوتی تھی۔

(جاری ہے)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

تخلیق کار

فوزیہ احسان رانا

بے شک لفظ عطا ہوتے ہیں، اللہ کی طرف سے ودیعت کیے جاتے ہیں یہ وہ تحفۂ خاص ہے جس سے اللہ ہر کسی کو نہیں نوازتا۔ یہ نوازش اس پر کی گئی تھی۔ آج وہ اپنی تمام ذمّے داریوں سے سبکدوش ہو کر بیٹھی تھی اب اس کے پاس بہت سارا وقت تھا، فراغت تھی، اس نے اپنے فرائض خوش اسلوبی سے نبھائے تھے۔

”ممی آپ ساری زندگی اس طرح سے لکھ نہیں سکیں جس طرح آپ کو لکھنا چاہیے تھا۔ اب آپ لکھیں اور جی بھر کر لکھیں۔ میں نے گھر کے کام کاج کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ کا انتظام کر دیا ہے۔ پیسے میں ہر ماہ بھیجوا تا رہوں گا۔“ وہ اپنی کہہ کر چلا گیا تھا، مٹھی بھر پیسوں اور ایک حدت بھرے بوسے سے ماں کا برسوں کا حق ادا

کر کے وہ شاید بری الذمہ ہوگیا۔

سونیا رحمان چاند کو تکتی سوچوں میں گم تھی...... اتنا بڑا گھر سائیں، سائیں کر رہا تھا۔ تنہائی کا آسیب اسے ڈرا رہا تھا، وہ جو پہروں چاند کو تکا کرتی تھی، خواب دیکھتی آنکھیں مانند جگنو جگمگایا کرتی تھیں۔ وہ جو ہر چیز میں فینٹسی ڈھونڈتی تھی آج کتنی اکیلی تھی۔ وہ اٹھی اور اسٹور روم سے اپنی فائل نکال لائی۔ فائل گرد سے اٹی پڑی تھی اس نے فائل کو جھاڑ، قلم اٹھایا۔

”ابا دیکھیں تو میں نے کہانی لکھی ہے۔ پڑھ کے بتائیں کیسی ہے۔“ برسوں پرانی پرتازگی سے بھرپور اپنی ہی آواز کی بازگشت اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ ”ابا کھل کے تنقید کیجیے گا۔ مجھے آپ کی مفصل رائے چاہیے۔“ سونیا لاڈ سے چہکی۔

انہوں نے اس کے ہاتھ سے مسودہ لے لیا۔ وہ باپ بن کر اس کی تحریر نہیں پڑھ رہے تھے بلکہ ایک نقاد بن کر وہ اس تحریر کو باریک بینی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ جھوٹی تعریف کر کے سونیا کے ساتھ ناانصافی نہیں کر سکتے تھے۔

”ابا بہت کمیاں ہیں ناں۔ پہلی کہانی ہے جھول بھی بہت ہوں گے ناں۔“ سونیا نے ڈرتے، ڈرتے پوچھا تھا۔

”ویلڈن بیٹا...... تم نے جو لکھا اس میں جو چیز میری نظر میں اہم ہے وہ احساس ہے تم نے کسی اور کے درد کو اپنی ذات پر طاری کر کے تخلیق کا کرب سہا ہے۔ کہانی کار ہونے کے لیے سب سے پہلی کڑی ہی محسوسات ہیں۔ یہ ایسا روزن ہے، ایسا دریچہ ہے جو ہر من میں نہیں کھلتا جو وارد ہو جائے تو احساس جگاتا ہے۔ احساس کا ہونا ہی زندہ ہونے کی علامت ہے آئم پراؤڈ آف یو۔ باقی کہانی میں اگرچہ بہت جھول ہیں۔ بے ربطی بھی ہے مگر تمہاری سوچ منفرد ہے۔ سیکھ جاؤ گی وقت کے ساتھ، ساتھ۔ قلم سے رشتہ استوار رکھنا۔ ساری خامیاں دور ہو جاتی ہیں لگن سچی ہو تو...“ رحمان صاحب نے سونیا کا سر اپنے سینے سے لگا کر کہا۔

☆☆☆

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ جولائی 2017ء
کی جھلکیاں

دانشمند دیوانہ
ایک بڑے مسلم سائنسداں کا زندگی نامہ

عشق کامل
اس صحابی کا ذکر جس نے کبھی
رسول ﷺ کا دیدار نہیں کیا

ہوائے حجاز
اسلامی تاریخ پر اردو تحریروں
کے خالق کا احوالِ زیست

قوالی
فنِ سماع پر ایک مختصر سی
مگر نہایت اہم تحریر

[illegible]
بہت سی ایمان افروز سبق آموز تحریریں

ایک ایسا شمارہ جسے آپ جلد بندی کرا کر محفوظ
رکھنا چاہیں گے۔ اس لیے آج ہی نزدیکی
بک اسٹال پر ”سرگزشت“ مختص کرا لیں

اور بھی بہت کچھ جسے آپ کو پڑھنا چاہیے۔
آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔

سونیا یونی ورسٹی سے نکلی تو وہ حسب معمول آنکھیں موندے سست سا بیٹھا تھا سونیا کو گھر جانے کی جلدی تھی، ممی نے کہا تھا گھر میں مہمان آرہے ہیں۔ اس نے ایک نظر اس پر ڈالی اور وہ تیزی سے اس کے پاس سے گزر کر گاڑی میں بیٹھنے لگی تو اپنی جگہ تھم سی گئی۔ اسے گمان گزرا کہ اسے پکارا گیا ہے... سونیا گاڑی سے اتری اور کسی معمول کی طرح چلتی اس کے پاس جا رکی۔ اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ سونیا دھیرے سے زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

”مجھے بھول گئی ہو۔ تم ہی تو تھیں جو میرا درد سمجھتی تھی۔“ اس کی بند آنکھوں سے پانی چھلکنے لگا سونیا کا دل لرزا۔

”سوری بابا، میں کچھ مصروف تھی۔ مجھے معاف کر دیں آئندہ ایسی بے پروائی نہیں کروں گی۔“ سونیا نے ایک نظر اس بابا جی کے سامنے رکھے پاپڑ اور مرنڈے کے ٹکڑوں پر ڈالی اور اپنے پرس سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر سامنے بچھے کپڑے کے نیچے رکھ دیا اور پاپڑ اٹھا لیے۔ یہ ان دونوں کے بیچ وہ پردہ تھا جو صرف وہی جانتے تھے‘ وہ ضرورت مند تھا مگر اس کی خودداری اسے ہاتھ پھیلانے نہیں دیتی تھی، وہ آنکھیں بند کر کے اندھا بن کے بیٹھ جاتا تھا اور آنکھ والے اسے پہچان جاتے تھے کہ وہ صدا نہیں لگاتا اور پاپڑ و مرنڈے میں اپنی عزتِ نفس بچا کے بیٹھا تھا۔ سونیا ملال میں گھری سارا راستہ روتی آئی تھی۔ اس کا دل ندامتوں میں گھرا ہوا تھا کہ وہ اتنے دن اس شخص کی خبر گیری کیوں نہیں کر پائی۔ اسے اللہ سے ڈر لگا اس کے دل کی سطح نم ہونے لگی، لفظ وارد ہونے لگے‘ کردار واضح تھا اور ان بند آنکھوں کے پیچھے چھپے آنسو سونیا کو مضطرب کر رہے تھے۔ احساس میں ڈوبے بہت سے جملے قرطاس پر کہانی کی صورت بکھرنے لگے۔

”یہ کیا کر رہی ہو؟“ فاروق لالا کمرے میں کب آئے وہ نہیں جانتی تھی۔

”کہانی لکھ رہی ہوں لالا۔“ سونیا خوشی سے بتانے لگی۔ فاروق کے چہرے کے تاثرات بگڑے اور اگلے ہی پل اس نے سونیا کا مسودہ ہاتھ میں لے کر دبوچا اور اس کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ وہ شاکڈ سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

”ابا نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ مگر اب وہ نہیں رہے۔ منوں مٹی تلے جا سوئے ہیں۔ آج کے بعد میں تمہیں ایسی جھوٹی کہانیاں گھڑتے نہ دیکھوں ورنہ تمہارا یونیورسٹی جانا بھی بند......“ وہ اسے کڑے تیوروں سے گھورتا کمرے سے نکل گیا۔

”فاروق لالا میرا احساس سچا ہے تو کہانی جھوٹی کیسے ہو سکتی ہے۔ اور کہانی تو بُنی جاتی ہے گھڑی نہیں جاتی۔“ وہ روتے ہوئے زور سے بولی۔

”میں تمہیں اجازت نہیں دوں گا اس گھر میں ایسی خرافات کی۔ اپنے شوہر کے گھر جا کر اپنا یہ بیکار کا شوق پورا کر لینا۔“ وہ بھی باہر سے بہ آواز بلند بولا تھا۔ سونیا اپنی تحریر کے ٹکڑے اکھٹے کرتے ہوئے تا دیر روتی رہی۔

☆☆☆

سونیا کی شادی ہو گئی‘ اس کا شوہر اس سے بہت پیار کرتا تھا مگر وہ بھی اس پر اجارہ داری اتنی رکھتا کہ لکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ بچے چھوٹے ہیں بڑے ہو جائیں پھر لکھنا۔ سونیا کے اندر درد کروٹیں لینے لگتا، کہانی سسکنے لگتی، کردار شکایت کرتے۔ الفاظ قطار باندھ کر کھڑے ہو جاتے کہ آؤ سونیا رحمان‘ ہمیں لکھو اور قلم کا حق ادا کر دو۔ وہ برتن دھوتی جملے اس کے ذہن کی سطح سے ٹکرا ٹکرا کر اسے بے دم کر دیتے۔ وہ بے بس تھی، مجبور تھی اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے مگر اس کا ذہن تو آزاد تھا کیسے اچھوتے اور نئے خیالات اس کے دل کو بے چین کرتے۔ بے شمار واقعات ایسے بھی ارد گرد میں ظہور پزیر ہوتے جو کہانی لکھنے کے محرکات بن سکتے تھے مگر اسے اپنی ذات کا کتھارسس کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ ہر گزرتے دن اپنی کھوکھلی ہوتی ازدواجی زندگی سے بیزار ہو رہی تھی اس کی خواب دیکھتی آنکھیں کب بنجر ہونے لگیں اسے کچھ خبر نہیں ہوئی۔ سہانے سپنے ٹوٹ گئے، زندگی بوجھ سی بن کر رہ گئی۔ شوہر کی محبت بھی پھیکی سی لگنے

لگی وہ اپنی پسند سے محبت کرتا تھا اپنی شرائط پر۔ سونیا رحمان کا دل سکڑنے سمٹنے لگتا اُسے چاند سے باتیں کرنے کی عادت تھی وہ فسوں خیر لمحوں کی اسیر تھی اور اس کی زندگی میں یہ سب نہیں تھا۔ اس کی زندگی میں تو شاید کچھ بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

بچے اسکول جانے لگے تھے۔ اسے بہت گھٹن ہوتی یوں لگتا اس کے اندر کوئی بیٹھا زور شور سے رو رہا ہے۔ سونیا کے دل کی ویرانی اور بڑھ جاتی۔ پھر ایک دن شوہر کا خوشگوار موڈ دیکھتے ہوئے اس نے اس سے پھر اجازت مانگی تھی اور اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا جب اس کے شوہر نے کوئی بات کوئی اعتراض کیے بنا اسے لکھنے کی اجازت دے دی۔ وہ سر جھکا کر۔ مشکور ہوتی چلی گئی۔

آج بہت سالوں کے بعد وہ کچھ لکھ رہی تھی الفاظ سونیا کے دل سے لپٹ کر انوکھے معنی پہن رہے تھے۔ احساس سے مربوط ہو کر کاغذ کی زینت بن رہے تھے۔ اسے کہانی لکھنے کے لیے کبھی بھی سوچنا نہیں پڑتا تھا۔ کہانی لکھنے کے لیے کہانی بُننا پڑتی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ کہانی میں کتنا ربط ہے وہ اپنی ذات کی تسکین کے لیے لکھتی تھی جو محسوس کرتی تھی وہی لکھتی تھی۔ احساس گہرا تھا جذبے سچے تھے تبھی کہانی پر کہانی بنتی چلی جاتی۔

آج تو صبح، صبح ہی وہ لکھنے بیٹھ گئی تھی بچے اسکول جا چکے تھے اس نے شوہر کو ناشتا دیا اور پاس بیٹھ کر لکھنے لگی اسے ناشتا پسند نہیں آیا اس نے برتن پٹخ دیے اور ایک کٹیلی سی نظر سونیا پر ڈالی ایک وحشت زدہ کرتی سرد سی لہر سونیا کی ریڑھ کی ہڈی میں اترنے لگی۔ وہ قہر آلود نظروں اسے تا دیر دیکھتا رہا وہ سہم سی گئی۔ اس حاکمیت پسند مرد کی نگاہ سونیا سے ہوتی ہوئی اس کی فائل پر چلی گئی وہ غصیلا ہوا اور بھڑک کر اٹھا۔ سونیا روتی رہی ہاتھ جوڑتی رہی مگر اس نے اس کا لکھا ایک، ایک لفظ مٹا دیا جلا دیا اور تن فن کرتا چیزوں کو ٹھوکریں مارتا گھر سے نکل گیا۔

”آج تو مجھے کوئی محنت بھی نہیں کرنی پڑی تھی، آج تو کہانی نے خود میرا ہاتھ پکڑا تھا خود کو مجھ سے کتنے پیار سے لکھوایا تھا...... میں بہتی چلی گئی، لفظ قلم کی نوک تلے آتے چلے گئے۔ سب ختم ہو گیا میرے لاکھوں۔ بے مہنگے قیمتی الفاظ جل گئے۔“ وہ ایک کونے میں بے جان سی بیٹھی پاگلوں کے مانند خود سے ہی باتیں کر رہی تھی جیس بڑھتا جا رہا تھا، نارسائی کا کرب کیا ہوتا ہے اور کسی دوسرے کی ذات پر جبر کر کے اجارہ داری قائم کرنا کسے کہتے ہیں اس سے کوئی ٹوٹی بکھرتی سونیا سے پوچھتا۔

”ممی کھانا دے دیں۔“ قریب سے ہی آواز آئی تو وہ تڑپ کر اٹھی اور اپنے بیٹے کے گلے لگ کر رو دی۔

اس دن سے پھر وہ پابندی کی زد پر آ گئی تھی۔ وہ ماں اور بیوی کے فرائض نبھاتے، نبھاتے تھک جاتی سب کچھ ٹھیک تھا بس وہ کہیں کھو گئی تھی اپنی نا تمام خواہشوں کے حصار میں دفن ہو گئی تھی۔ ذات کی اس بے توقیری نے اسے جیتے جی مار ڈالا تھا۔

☆☆☆

بچے پڑھ لکھ گئے دونوں بیٹوں کی شادیاں ہو گئیں وہ اپنی بیویوں کو لے کر اپنے تئیں بہتر مستقبل کی خاطر چلے گئے۔ سب کام ختم ہو گئے۔ عرصے بعد شوہر کو بھی بیوی کی اہمیت پتا چل ہی گئی۔ اب اس کی محبت کا عالم یہ تھا کہ وہ سونیا کی سانس کے ساتھ سانس لیتا تھا وہ ہر وقت محبت نچھاور کرتا رہتا تھا۔ ملازمہ کھانا بنا دیتی سب کام کر جاتی فراغت ہی فراغت تھی کوئی پابندی نہیں تھی اب شوہر نے فائل اور قلم خود اسے لا کر دیے تھے وہ اسے بار، بار کہتا تھا لکھو۔

سونیا کے دل میں ہول اٹھتے تھے۔ ایک دن انہی سناٹوں سے گھبرا کر اس نے قلم سنبھالا۔ وہ قلم کاغذ پر پھیر رہی تھی، آڑی ترچھی لکیریں بنتی جا رہی تھیں۔ لفظ ہاتھ کی رسائی میں نہیں آ رہے تھے اس کی آنکھوں میں دھند سی اتر رہی تھی، رعشہ زدہ ہاتھ قلم تھامنے سے قاصر تھے۔ اور ذہن خالی ہو چکا تھا۔ سونیا کی سکت جواب دے گئی وہ اپنی طاقت کھو چکی تھی، بے بسی کے دبیز احساس تلے دبی وہ رو دی اس کا سر ٹیبل سے آن لگا اور آنسو بے رکے بہتے جا رہے تھے...... بہتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

ناولٹ

چاند کی کھڑکی

منشا محسن علی

”میرے تو پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی تھی جب پہلی بار سنا کہ یوسف کو زلیخا سے محبت ہوگئی ہے مگر اب معلوم ہوا کہ یوسف کو تم سے محبت نہیں ہوئی اور تم زلیخا جیسی ہو بھی نہیں ...... میں تمہیں دن میں بیسویں بار گالیوں، کوسنوں سے نواز چکی ہوں۔ کیا تم مجھے معاف کروگی؟“

وہ میرا گھونگٹ اٹھائے کھڑی مجھ سے راز و نیاز کررہی تھی...... میں حیران تھی کیونکہ باقی جتنی بھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

گاؤں کی عورتیں آئی تھیں وہ ایک پل کو گھونگٹ اٹھاتیں کچھ نوٹ میرے پسینے سے بھیگے ہاتھوں میں دبا کر چل دیتیں...... مگر جب ''وہ'' آئی تو اس نے بالکل ایسا نہیں کیا...... اٹھے ہوئے گھونگٹ کے گرنے کا میں انتظار کرتی رہ گئی تھی...... اور جو میرے مقابل کھڑی تھی ایسے لگتی تھی جیسے چھپی ہوئی سوئیوں والی گڑیا ہو...... بعد میں مجھے پتا چلا تھا کہ اس کا نام فرزانہ تھا...... بلا کی خوب صورت لڑکی تھی وہ۔ لمبے، گھنے بال، دل فریب مسکراہٹ، موٹی، موٹی آنکھیں اور گالوں پر پڑتے گڑھے...... میری آنکھوں کا کاجل پھیل گیا تھا۔ فرزانہ نے مڑ کر میری نند گل کو مخاطب کیا تھا۔

''گل...... مجھے یقین تھا کہ یوسف، زلیخا جیسی ضرور لائے گا...... مگر یہ تو......؟'' وہ قہقہہ لگا رہی تھی۔

''فرزانہ یہ وہ نہیں ہیں۔'' گل نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔

فرزانہ کا قہقہہ وہیں مر گیا...... وہ گھونگٹ میں اپنا سر لے آئی تھی۔ ''تم تو نام کی زلیخا ہو...... میں تو تمہارے مرنے تک کی دعا کر چکی تھی۔ محبتوں میں ایسا تو ہوتا رہتا ہے...... مجھے دیکھو کیا حال ہو گیا ہے۔''

''نی فرزانہ...... کون سے راز و نیاز میں لگی ہے۔'' کسی عورت نے ہانک لگائی۔

''آئے ہائے ماسی...... میری گوری سہیلی ہے۔''

''ہیں سچی......!''

''ہاں تو جھوٹ تھوڑی ناں بول رہی ہوں...... دلہن سے پوچھ لیں۔''

پھر مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔ ''تم پھر بھی خوش قسمت ہو...... زلیخا کو یوسف کا نام مل گیا...... مجھے تو وہ بھی نہ مل سکا۔'' جانے مجھ کیوں وہ لہجہ ساون بھادوں جیسا لگا تھا...... وہ جا رہی تھی۔ اماں (میری ساس) نے روک لیا تھا اسے۔

''فرزانہ سوکھے منہ کے ساتھ جا رہی ہے جھلی۔''

''آج کچھ کھانے کو دل نہیں کرے گا چاچی......'' نین کٹورے اب چھلکے کہ تب مگر خیریت رہی تھی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی تھی اور اس سے ٹکراتے، ٹکراتے بچی تھی۔ روشن پیشانی پر بکھرے بال، گھنی مونچھیں، ستواں ناک وہ یوسف تھا......

''دیکھ کر چلا کرو......'' وہ غصہ ہوا تھا پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

''یوسف کو دیکھ کر تو کوئی بھی ہوش کھو سکتا ہے۔'' وہ کانچ کی چوڑیاں گھما رہی تھی۔

''اپنے حواسوں میں رہا کرو......''

''دل نہیں دے سکتے تھے تو اپنا نام ہی دے دیتے۔'' وہ لاوجود ہوئی کھڑی تھی۔

''تم اس لائق بھی نہیں ہو......'' اس کو پرے دھکیلتا وہ اندر آ گیا تھا...... گل نے میرا گھونگٹ ہٹا کر پن لگا دی تھی۔ دروازہ کھلا تھا اور سامنے ہی گلی تھی...... گلی میں لڑکھڑاتے ہوئے دیواریں تھامے گزرتی فرزانہ مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا...... دھوپ ڈھل رہی تھی...... موسم میں ہلکی سی خنکی تھی۔

''فرزانہ کیا کہہ رہی تھی؟'' گل نے مجھ سے پوچھا تھا۔

''کچھ خاص نہیں...... ویسے یہ کون ہے؟''

''اکبر چچا کی بیٹی ہے' بھائی سے عشق کرتی ہے مگر بھائی کو پسند نہیں......'' گل کوئی کام کرنے لگی تھی...... صحن میں بچھی چارپائیوں پر اب تین خواتین بیٹھی تھیں باقی گھروں کو جا چکی تھیں...... میرا تھکن سے برا حال تھا۔

''ارے یہ سکینہ کی شہری بہو ہے مگر خوب صورت تو نہیں ہے اتنی...... سنا ہے سولہ جماعتیں پاس ہے۔''

''اے لو...... تو کیا سولہ جماعتوں نے سکینہ کو خرید لیا؟''

''ارے نہیں...... اصغر کے دوست کی دھی ہے، بیچارہ کینسر کا مریض تھا مر گیا...... اصغر نے حقِ دوستی نبھایا اور اس کی دھی کو بہو بنا لیا...... سنا ہے سکینہ اس سے خوش نہیں ہے......'' میں ساکت بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

دو چھوٹے، چھوٹے کمرے، غسل خانہ اور چھوٹا

ساصحن تھا...... میرا دم گھٹتا تھا، یوں لگتا تھا کہ اب مری کہ تب مری مگر میں زندہ رہی تھی...... گرمیوں میں تندور سا سماں ہوتا تھا اور سردیوں میں گھٹن ہوتی تھی...... کمرے کی واحد کھڑکی تھی جو کئی جھٹکوں کے بعد عجیب وغریب آوازیں نکال کر کھلتی تھی، میرا تو جی ہی دہل جاتا تھا...... دن کو محلے کے آوارہ لونڈے سگریٹ کے کش لگاتے گلی کے نکڑ پر کھڑے رہتے۔ دن سے کھڑکی کھولتے لاج آتی تھی اور رات سے خوف آتا تھا...... عجیب وغریب آوازوں کا لگاتار آنا میں برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ پھر میں نے بھی گھٹن سے سمجھوتا کرلیا تھا۔

ابا سبزی منڈی میں مال ڈھوتے تھے...... میں نے کالج سے پولیٹکل سائنس میں ایم اے کررکھا تھا۔ شکل صورت خاص نہیں تھی اور نہ ہی شخصیت میں کوئی چار چاند لگے تھے جو محفلوں میں بیان کرکے تعریفیں بٹورتی...... گھر میں ہم دو ہی فرد تھے اور تیسری آوارہ گھومتی تنہائی تھی...... ابا بیمار ہونے لگے تھے۔ کانکھتے رہتے۔ بلغم خون سے بھرا رہتا...... چار ہفتے تین دن خسوری حکیم سے پڑیاں لے، لے کر پھانکتے رہے اور مزید بیمار ہونے لگے تھے۔ مجھے بیماری سے نفرت تھی اور بیماری کو ہم سے بڑی محبت تھی بن بلائے مہمان کی طرح آن دھمکتی تھی۔ ایک دن ابا آئے تو میں چولھے پر ساگ چڑھائے بیٹھی تھی۔ ڈربے نما گھر میں کڑوا کسیلا دھواں گھمن گھیریاں کھا رہا تھا۔

''زلیخا! جمیلہ کو کہنا اپنی ماں کو میرے پاس بھیجے ضروری بات کرنی ہے......'' گرم چمٹا میرے ہاتھ پر جا پڑا...... جھلس گیا...... میں نے ابا کا پیغام من وعن اپنی اکلوتی سہیلی جمیلہ تک پہنچایا...... جمیلہ کی اماں کبریٰ خالہ خالی ہاتھ آئیں اور پھلوں سے لدی پھندی گھر کو روانہ ہوئیں...... ابا منڈی سے آم، آڑو اور دوسرے پھل لے کر آتے تھے۔ اس گھر میں بے شک آوارہ تنہائی تھی۔ عجیب وغریب تنہائی تھی، آوازیں تھیں مگر پھلوں کا آنا جانا بھی تھا جو کہ فرحت بخش تھا۔

میں خوبانی کی گٹھلیاں ہتھوڑے سے توڑ رہی تھی جب اچانک دروازہ کھلا اور ہانپتی کانپتی جمیلہ اندر آئی تھی۔ ہتھوڑا سیدھا ہاتھ پر جا لگا...... میں چھوٹے سے صحن میں ناچتی پھر رہی تھی اور وہ چارپائی پر ڈھیر ہوئی پڑی تھی۔ جب میرا رقص تھما تو اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''تمہیں کیا ہوا؟'' وہ اٹھ بیٹھی تھی۔

''زمانے بھر کا آوارہ شکورہ نائی خط پکڑا کر بھاگ گیا۔''

''ہائے، ربا...... لو لیٹر؟'' (واؤ کتنا رومینٹک تھا ناں یہ)

''ہاں...... رومانی چٹھی...... میں تو جھٹ سے بھاگی ورنہ اماں نے گت سے پکڑ کر ناک رگڑوانی تھی۔''

''اچھا...... کہاں ہے چٹھی...... ذرا پڑھ کر دیکھوں۔''

''ہاں، ہاں تبھی تو بھاگی، بھاگی تمہاری طرف آئی ہوں۔'' جمیلہ نے پانچ روپے والی کاغذی کاپی کا مڑا تڑا ہوا محبت نامہ میری طرف بڑھایا تھا...... شکورے کی لکھائی تو رج کے خوفناک تھی مگر میں نے جوڑ توڑ کرکے، ہجے جوڑ، جوڑ پیغام محبت جمیلہ تک پہنچا دیا تھا۔

''میری پیاری راج دلاری جیمی...... (ایں...... جیمی؟...... جیم کہہ دیتا...... ہونہہ)

تمہیں پہلی بار بالم کی شادی پر دیکھا اور میرا دل دھک، دھک کرنے لگا...... (دھک، دھک کرنے لگا...... دھک، دھک تو کافی زنانہ لفظ نہیں ہے)

مجھے لگا میرا اور تمہارا جنم جنم کا ساتھ ہے......

(جنم، جنم کا ساتھ...... ہونہہ...... ہندو کہیں کا)

تمہارے ناگن بالوں نے مجھے جکڑ لیا...... پکڑ لیا...... (واؤ...... رومینٹک)

میں گوڈے گٹے سمیت تمہارے عشق میں ڈوب گیا ہوں۔ (چلو بھر پانی میں ڈوب مرو...... بدتمیز) اس لو لیٹر کا جواب دینا ورنہ تمہارے سامنے تڑپ، تڑپ کر جان دے دوں گا (دے دو کمینے) تمہاری اماں سے بڑا ڈرتا ہوں...... (خیر...... اماں تو میری گت کا جو حشر کریں گی سو کریں گی مگر تمہارا بھی ٹنڈ

کردیں گی...... آہو جی)

چڑیا بولے، کوّا بولے
اس خط کو پہلے جیمی ہی کھولے......"

جیمی ہنس، ہنس کر مرنے والی ہوگئی تھی...... میں نے ایسا محبت نامہ پہلی بار پڑھا تھا اور بہت متاثر ہوئی تھی...... جیمی کا جواب مجھے پسند نہیں آیا تھا...... بیچارے کو پوری گلی میں تھپڑ جڑ دیا...... پھر تو شکورے کی دکان سے ایسے دکھی، دکھی گیت برآمد ہوئے کہ غیر ارادی طور پر آنکھوں سے جھڑیاں لگ جاتی تھیں...... نصیبو لال، احمد نواز چھینہ، کمار سانو سن، سن کر ساری پکی ہو گئے تھے۔ مگر شکورے کا مرض غم بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی مصداق لافانی ہونے کو تھا۔

عشقا والے تیرا ککھ نہ رہوے
چٹھی دے جواب اچ آئے پتھر......

میری جھیل سی زندگی میں پہلا کنکر میری یارِ غار جیمی نے گرایا اور سمجھو تھرتھلی مچ گئی۔

"تمہارے ابا تمہارا رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"مجھے تو نہیں بتایا۔" میں حیران ہوئی تھی۔

"اے لو...... لاج آگئی ہوگی، اماں سے کہا ہے رشتہ ڈھونڈنے کو......"

"تمہاری اماں کوئی رنڈوا نہ میرے سر منڈھ دیں۔" مجھے فکر ہوئی تھی وہ اب مزے سے تربوز کا شربت پی رہی تھی۔

"اے لو...... سہیلی ہوا پنی...... سفارش ہوگی میری۔"

اور پھر تین رشتے آئے...... پھل، فروٹ معدے میں اتارے، تکیاں، کباب اڑائے گئے، تندوری نان مزے لے، لے کر کھائے گئے اور دروازہ پار کرتے وقت چند الفاظ سے ابا کو زخمی بلکہ لہولہان کر گئے۔

"بھائی صاحب...... کھایا پیا معاف کردیجیے گا...... بے شک آپ کی لڑکی سولہ پاس ہے۔ مگر شکل صورت کی خاص نہیں...... مریل مرنج سی ہے...... اور جہیز کا بھی تو کوئی آسرا نہیں...... ہماری طرف سے معذرت قبول کیجیے۔"

ابا چارپائی پر دھم سے گرے اور میں ننگے پاؤں چھوٹے سے صحن میں ٹہلتی پھرتی رہی تھی...... یارِ غار کو تاخیر سے اطلاع ملی تھی، تسلیوں، دلاسوں کے ٹوکروں کے ساتھ آن وارد ہوئی...... سارے گھر میں شام اتری ہوئی تھی...... بجلی شارٹ سرکٹ سے غائب تھی۔ پڑ دادی کے زمانے کی لالٹین دیوار کے ساتھ کیل پر ٹانگ رکھی تھی...... ملگجی کثیف سی روشنی تھی۔

زلیخا کے لیے یوسف ہی آئے گا۔"

"خواب دکھا رہی ہو؟"

"حقیقت ہے سو فیصد۔"

"تمہاری حقیقتیں اثر نہیں رکھتیں......"

"تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔" اسے شاک لگا تھا۔

"کسی پر بھی نہیں......" میں پُرسکون سی تھی۔

"دفع ہو جاؤ...... تم دوستی کے لائق ہی نہیں ہو۔"

"ہاں نہیں ہوں۔"

"ایسی باتیں مت کرو زلیخا......" وہ واحد کھڑکی کھول رہی تھی اور آج میں نے اسے منع بھی نہیں کیا تھا...... آج مجھے کھڑکی کی آوازوں سے خوف نہیں آرہا تھا صرف ان چند الفاظ سے آرہا تھا جو ہم دونوں باپ، بیٹی کو لہولہان کر گئے تھے۔

"جمیلہ...... کوئی اپنا تخلیق کار خود نہیں ہے، وہ تو صرف ایک ہے جو سب کو تخلیق کرتا ہے...... میرا قصور نہیں...... میں خوش شکل نہیں ہوں تو مجھے رد کر دیا جائے گا؟" میں رو دینے کو تھی اور وہ رو رہی تھی۔

"زلیخی...... تجھی...... تیرے لیے کوئی یوسف ہی آئے گا۔"

رات تھی...... کثیف روشنی تھی...... ہمارا یقین لالٹین کی تھرتھراتی لو جیسا تھا...... گھٹتا تھا...... بڑھتا تھا مگر کم نہیں ہوتا تھا۔ ختم بھی نہیں ہوتا تھا...... اور پھر زلیخا کے لیے "یوسف......" آیا مگر وہ زلیخا کا نہیں تھا۔

☆☆☆

ابا کو کینسر تھا، خون تھوکنے لگے تھے اور میں تو ایسا ستارہ ہوگئی جو مدار سے ہٹے اور فنا ہو جائے۔ باپ، بیٹیوں کے لیے مدار ہی ہوتے ہیں جن کے گرد وہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

گھومتی ہیں...... اور پھر ابا کے یارِ غار کہیں سے نمودار ہوئے اور ابا نے میرا نکاح ان کے بیٹے سے کر دیا۔ نکاح نامے پر نام دیکھا تو ٹھٹک گئی...... ”یوسف“ گردان تھا تو اس پہر تھا...... کوئی مورت تھی تو وہ ”میں“ تھی...... میرے سسر بہت اچھے تھے مگر میری ساس اکھڑی، اکھڑی سی لگی تھیں...... ”یوسف“ کو میں نے دیکھا نہیں تھا۔ میری نند گل اچھی لڑکی لگی تھی۔

”اس چھوٹے سے گھر میں آپ کا دم نہیں گھٹتا؟“

”گھٹتا ہے بہت......“ میں نے توے پر روٹی پلٹی تھی۔

”ہمارا گھر بہت بڑا ہے آپ کا دم نہیں گھٹے گا۔“ وہ اشتیاق سے بتا رہی تھی۔ میں مسکرا دی تھی۔

”اچھا...... اتنا بڑا گھر ہے تمہارا؟“ میں نے پوچھا تھا۔

”ہاں، بہت بڑا...... آپ کو اچھا لگے گا......“ وہ چھوٹی، چھوٹی باتیں بتا رہی تھی اور میں سن رہی تھی۔ باقی لوگ ابا کے ساتھ چھوٹی سی بیٹھک میں تھے۔ میں نے کھانا لگایا اور انہوں نے کھایا اور چلے گئے...... جاتے، جاتے گل میری مٹھی میں یوسف کی تصویر دبا گئی تھی۔

”تکیے کے نیچے رکھ لیجیے گا...... پھر راتوں کو چوری، چوری اٹھ کر دیکھیے گا...... میرے بھائی کو نظر مت لگا دیجیے گا۔“

میں نے لالٹین کی روشنی میں وہ تصویر دیکھی اور دل کو غائب ہوتے پایا...... وہ بہت خوب صورت تھا، میں پلکیں جھپکنا بھول گئی تھی۔ مجھے نظر لگنے کا خطرہ لاحق ہوا تو مرچیں چٹکی میں لے کر چولھے میں پھینک آئی...... مرچیں سلگ، سلگ گئیں...... جمیلہ نے دیکھا تو ہاتھ سیدھا کلیجے پر جا پڑا تھا۔

”ہائے اتنا سوہنا، میں نے کہا تھا ناں یوسف آئے گا۔“

☆☆☆

بارش برسی اور جل تھل ہو گیا۔ گلیاں، کوچے، چھتیں پانی سے بھر گئیں۔ شڑاپ، شڑاپ کی آوازیں تھیں چھوٹے سے صحن میں، میں اور جمیلہ بھیگتی رہیں اور گل، گل ہنستی رہیں...... ابا کانکھتے ہوئے اندر پُرسکون سے پڑے تھے۔

”ہاں جیمی...... وہ آگیا...... یوسف آگیا......“

”ہونہہ...... تم تو جیمی مت کہا کرو......“

”اچھا، اچھا...... نہیں کہوں گی۔“

”تم بہت خوش قسمت ہو زلیخی......“ میں ہنس دی تھی۔

”لڑکیوں...... اندر آ جاؤ، بخار چڑھ جائے گا۔“ ابا کمرے سے بولے تھے۔

”چاچا بے فکر رہیں...... تاپ کو تاپ نہیں چڑھتا......“ ابا کف سیرپ چڑھا کر سو گئے تھے...... ہم پھوار میں بھیگتی باتیں کرتی رہیں۔

”آنکھیں وحید مراد سی ہیں۔“

”ارے پورا وحید مراد ہے۔“

”ہاں، مراد سے یاد آیا...... کل مراد بابا کے دربار پر چراغ جلانے جائیں گے۔“

اگلی شام ہم مزار پر چراغ جلا آئے اور اس سے اگلی شام وہ ابا کی خیریت پوچھنے آیا تھا...... میں دیکھتی رہی، ٹکٹکی باندھ کر اور وہ بے نیاز بنا بیٹھا رہا...... ابا چائے اندر لے گئے تھے...... پھر وہ چلا گیا اور میرا دل بھی اس کے ساتھ روانہ ہو گیا تھا...... گل آئی تو میں اس کی باتیں ہی کرتی رہی۔

”بھائی کلور کوٹ کالج میں اردو کے پروفیسر ہیں...... وہیں ہاسٹل میں ہوتے ہیں، ہفتے کے ہفتے گھر آتے ہیں۔“ جمیلہ ہنس، ہنس کر گاتی رہی تھی۔

”او گھر آجا پردیسی
نی تیری میری اک جندڑی

”زلیخا، تم خوش تو ہو ناں......؟“ ناشتے کے وقت ابا قریب آ بیٹھے تھے۔ چہرے پر جھریوں کا لیپ تھا۔

”جی ابا......“

”اللہ تجھے خوش رکھے...... اصغر میرا بچپن کا دوست ہے، اکھٹے پڑھا ہے...... اب مجھے سکون سے موت آئے گی۔“

"ابا موت کی باتیں مت کریں۔" میں لرز گئی تھی...... سنا تھا موت کی باتیں موت سن رہی ہوتی ہے۔ اس دن ابا کی باتیں بھی سن لی گئیں...... رات دیواروں پر لرزتی رہی...... لالٹین کی لو مرگئی...... موت آئی اور ابا کو لے گئی...... اصغر چچا آئے اور مجھے سینے لگائے میرے ساتھ روتے رہے۔

"اللہ کے کام ہیں بیٹا...... صبر کرو...... اللہ بہتر کرے گا۔ تم تنہا نہیں ہو، ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔"

میں پھوٹ، پھوٹ کر روتی رہی......

"اللہ تمہیں صبر اور حوصلہ دے۔" سکینہ چچی نے فقط اتنا کہا تھا۔

جمیلہ اور گل تسلیاں دیتی رہیں۔ تجہیز و تکفین کے انتظامات اصغر چچا اور یوسف نے سنبھال لیے تھے۔ پھر دو ماہ بعد میری رخصتی ہوئی تھی اور آج میں اس گاؤں میں موجود تھی۔ بڑا وسیع و عریض رقبے پر پھیلا ہوا گھر تھا...... فرش سرخ اینٹوں کا تھا...... طویل برآمدہ تھا، پانچ کمرے اور باورچی خانہ تھا...... دیوار میں چھوٹے سے دروازے کے پار مویشیوں کے باڑے تھے...... گھر کے عقب میں سبزیاں لگی تھیں...... انگور کی بیل، آم، آڑو، امرود، انار کے لاتعداد درخت تھے...... صاف ستھرا گاؤں تھا، شہری سہولتیں بھی موجود تھیں۔ مجھے اپنا ڈربے نما گھر یاد آرہا تھا...... مجھے اپنی یارِ غار جیمی یاد آرہی تھی......

☆☆☆

گل مجھے شرارتی نظروں سے دیکھتی اس لال گلابوں سے سجے کمرے میں چھوڑ گئی تھی...... کمرا لال گلابوں سے مہک رہا تھا...... کمرا ہوا دار اور روشن تھا۔ شیشے کی تین کھڑکیاں اور سائیڈ پر دیوار گیر الماری تھی جو مختلف کتابوں سے بھری ہوئی تھی...... وقت دبے پاؤں گزرتا رہا وہ بہت دیر سے آیا تھا...... کاٹن کے کرتے اور کھیڑی میں مجھے وہ کسی امیر ملک کا اکھڑ، اکھڑ شہزادہ لگا تھا اور میں نمانی تو اس جیسی نہیں تھی...... وہ قریب آن کھڑا ہوا تھا۔

"تم کپڑے تبدیل کر کے صوفے پر سو جاؤ...... بیڈ پر مجھے سونا ہے۔" ساری دنیا جیسے اندھیر ہوئی تھی، وہ کیا کہہ رہا تھا؟ میں کیا سن رہی تھی؟ میں نے اپنے آپ کو بے وقعت اور مردہ ہوتا محسوس کیا تھا۔

میں کپڑے تبدیل کر کے صوفے پر بیٹھی رہی...... زیرو کے بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی جب میں نے بیڈ پر لیٹے اس خوب صورت شخص کی آواز سنی تھی۔

"میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ مجھ سے کوئی بھی امید مت رکھنا...... یہ شادی میری ذاتی رضا کی بنا پر نہیں بلکہ ابا کی ضد پر ہوئی ہے۔ میرے دل میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں...... اور یہ بات اسی کمرے میں دفن ہو جانی چاہیے۔" اس بات کے ساتھ، ساتھ زلیخا بھی اس رات دفن ہوگئی تھی...... فجر ہوئی...... سورج طلوع ہوا تو روشنی شیشے کی کھڑکیوں سے ٹکرا گئی۔ میں سلیپر پہنے باہر آگئی تھی۔

"ارے بیٹا...... لوگ کیا کہیں گے؟"

"آپ کو ہمیشہ لوگوں کی پروا کیوں رہتی ہے۔"

"شادی کو ایک دن ہوا ہے اور تم جا رہے ہو۔" اماں حیران تھیں۔

"میرے اسٹوڈنٹس کے پروموشنز ہو رہے ہیں، جانا ہوگا...... ہفتے کو آجاؤں گا......" خوب صورت پیشانی پر تیوری چڑھائے پشت پر بیگ لٹکائے وہ میرے سامنے سے گزر گیا...... سامنے پتھر بھی پڑا ہو تو نظر اٹھ جاتی ہے، زلیخا پتھر جوگی بھی نہیں تھی......؟ گل باہر آئی مجھے دیکھا اور ٹھٹک گئی۔

"ارے بھابی آپ...... آئیں ناں......" میں اندر چلی آئی اور اماں کو سلام کیا تھا، وہ جواب دے کر گل سے مخاطب ہوئی تھیں۔

"ناشتا چائے لا دے بھرجائی کو...... میں باڑے میں جا رہی ہوں پیچھے بالٹیاں لے کر پہنچ جانا......" وہ چلی گئی تھیں...... گل ناشتا لے کر آئی تھی، میں نے صرف چائے کا کپ اٹھا لیا تھا اور سپ لینے لگی۔

"آپ کو بھائی کیسے لگے؟"

"اچھے لگے......"

''صرف اچھے......؟'' وہ حیران ہوئی تھی۔

''نہیں، بہت اچھے۔'' میں نے جواب دیا تھا۔

''اچھا...... میں اماں کو بالٹیاں دے آؤں۔'' وہ برتن اٹھاتی جانے لگی تھی۔

''سنو گل...... میں دے آتی ہوں۔''

''آپ جائیں گی؟''

''ہاں...... کیوں، نہیں جاسکتی؟'' میں مسکرائی تھی...... وہ نفی میں سر ہلا گئی...... میں دیوار کے دروازے سے باڑے چلی آئی تھی...... باندر پر مویشی بندھے تھے...... ان کے گلے کی گھنٹیاں ہل، ہل کر آوازیں دیتی تھیں...... ابا چارا ڈال رہے تھے۔ اماں کھل بھگو رہی تھیں مجھے دیکھا تو ٹھٹک گئیں۔

''گل کہاں ہے......؟''

''وہ برتن دھو رہی تھی تو میں دینے چلی آئی۔'' وہ سر ہلا گئیں...... ابا چارے سے فارغ ہو کر میرے پاس آئے سر پر ہاتھ رکھا۔

''ارے میری دھی آئی ہے، آجا چارپائی پر بیٹھ۔'' ہم دونوں چارپائی پر بیٹھ گئے۔

''جس کی طرف اشارہ کردے گی تیری ہی ہوگی۔'' ابا نے کھونٹے سے بندھی گائے بھینسوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

میں نے اماں کی طرف دیکھا وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھیں۔

''نہیں، نہیں چاہیے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''ارے جھلی کیوں نہیں چاہیے۔'' وہ حیران ہوئے تھے۔

''مجھے وہ پسند ہے۔'' میں بکائن تلے بندھی بکریوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

وہ ہنس دیے تھے اور ہنستے ہوئے مجھے ابا جیسے لگے تھے۔

''ٹھیک ہے...... ساتھ، ساتھ بھوری مج بھی تیری ہوئی۔'' اماں چاپ چاپ وہاں سے اٹھ گئیں...... مجھے دکھ ہوا تھا۔ ابا نے مجھے دیکھا اور سمجھ گئے۔

''دل ہلکا نہ کر، یہ جو میری عورت ہے ناں بڑی پتھر دل بنی پھرتی ہے بس ایک اتھرو کی مار ہے...... تو وی دو آنسو بہا کے دیکھ اس کے سامنے۔''

☆☆☆

سارا دن لوگوں کا تانتا بندھا رہا تھا۔ کوئی آرہا تھا کوئی جا رہا تھا...... سب شہری دلہن کی چاہ میں آرہے تھے اور مجھے ان کے چہرے کی مایوسی صاف نظر آرہی تھی...... کیا لوگ.... لوگوں کو شکل صورت سے ہی اچھے یا برے ہونے کی تصدیق دیتے ہیں؟ میں نے تو کبھی ایسا نہیں کیا تھا تو میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا تھا...... مجھے سب برداشت کرنا تھا اور ان کے درمیان ہی جگہ بنانی تھی۔ جمیلہ کا فون آیا تو ساتھ، ساتھ وہ ہنستی روتی رہی تھی۔

''زیبی بدتمیز...... تیرے بغیر سارا محلہ کاٹ کھانے کو دوڑے ہے، بڑی اکیلی پڑ گئی ہوں میں...... تیری قدر تو اب محسوس ہو رہی ہے۔ بارش ہوئی سب جل تھل ہو گیا۔ گلیاں، کوچے، چھتیں پانی ٹپکاتی رہیں میں اکیلی بھیگتی رہی اور بیمار پڑ گئی...... تو تو سب سونا کر گئی...... میرا جی نہیں لگتا......'' وہ سسک رہی تھی۔

☆☆☆

رات کو میں اور گل چھت پر بیٹھی تھیں جب فرزانہ چلی آئی۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ آئی تھی جو اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس رات کا چاند فرزانہ تھی، وہ میرا ہاتھ تھامے بیٹھی۔

''میں تمہیں، تم ہی کہا کروں گی، تکلفات مجھے پسند نہیں، امید ہے برا نہیں مانو گی۔'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ ''تمہیں یہاں کے لوگ رہن سہن سب کیسا لگا؟'' وہ پوچھ رہی تھی...... گل ریڈیو ٹھیک کرنے میں لگی تھی جو چل کے نہیں دے رہا تھا...... میں اور فرزانہ باتوں میں لگی تھیں۔

''سب اچھے ہیں...... مگر شاید میں یہاں کے لوگوں کو اچھی نہیں لگی۔'' میں ہمیشہ سے صاف گو رہی تھی...... فرزانہ ہنسی تھی۔

''ارے دفع کرو لوگوں کو...... جس کی ماس بوٹی

اچھی ہو اس کے دیوانے ہو جاتے ہیں...... خاک ایسی صورت پر جو محبوب قدموں میں نہ لا کر رکھ دے...... زندہ مثال تمہارے سامنے بیٹھی ہوں۔'' وہ بہت عام سے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ شاید وہ کر سکتی تھی۔

''تم تو اتنی پیاری اور دلکش ہو......'' میں نے رشک سے اس چاندنی لٹاتی لڑکی کو دیکھا تھا۔

''خوب صورتی آپ کو محبت نہیں دیتی ورنہ یوسف کو مجھ سے محبت نہیں عشق ہوتا۔'' وہ میرے سامنے میرے شوہر کا ذکر کر رہی تھی۔ ''برا مت ماننا...... زلیخا یہ میری عادت ہے۔''

''نہیں، ایسی بات نہیں۔''

''مجھے تو یہ تک یاد نہیں کہ مجھے یوسف سے محبت کیسے اور کیونکر ہوئی۔ ہم اکٹھے قاعدہ پڑھنے جایا کرتے تھے...... مجھے کبھی جلدی سبق یاد نہیں ہوا...... وہ مجھے سبق یاد کرواتا تھا، سبق تو یاد پھر بھی نہ ہوا مگر میں نے یوسف یاد کر لیا...... پھر میں نے یوسف کو ہی پڑھا......'' وہ ننگے پاؤں چلتی منڈیر پر جا کھڑی ہوئی تھی...... میں بھی وہیں آ گئی اس کے لمبے بال ہوا سے اڑ رہے تھے......

''ہم کچی عمر کی لڑکیاں جب پکی محبت کے پہاڑے پڑھتی ہیں ناں تو رُل جاتی ہیں پھر میرے جیسا حال ہوتا ہے۔'' گل ریڈیو کے انٹینا کی تار ٹھیک کر رہی تھی اور ہماری طرف متوجہ نہ تھی...... میں نے غور سے اس چاندنی کو دیکھا تھا۔

''یوسف کو جانے تم سے کیوں محبت نہ ہوئی؟ یوسف کو زلیخا سے ہی محبت ہو سکتی ہے۔'' وہ مڑی اور شرارت سے ہنسی تھی......

''پر ہر بار ایسا نہیں ہوتا۔'' وہ رات کے اندھیرے میں کچھ کھوج رہی تھی اور میں اسے کھوج رہی تھی۔

''پتا ہے زلیخا...... یوسف نے مجھے کیا کہا......؟''

''کیا کہا......؟''

''اس نے مجھے اجڈ، جاہل، گنوار اور وہ کیا ہوتا ہے...... ہاں...... ال مینرڈ بھی کہا۔'' وہ بھیگے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''کہتا ہے مجھے بات کرنے کی تمیز نہیں، میں ان پڑھ ہوں اور اس کے معیار تک پوری نہیں اترتی...... میں واقعی یہ سب ہوں زلیخا......؟ میں خود کو پور، پور بدل دیتی زلیخا...... سچ کہہ رہی ہوں...... اگر مجھے ایک فیصد بھی امید ہوتی...... میں اس کے دل پر سو دستکیں دے چکی مگر ہر بار دل کے پار خاموشی ہی رہی...... پھر میں نے سوچا وہ کسی زلیخا سے ہی محبت کرے گا...... تب میں نے زلیخا کے مرنے تک کی بددعائیں کرتی رہی۔ تب مجھے علم نہیں تھا کہ وہ بددعائیں زلیخا کے لیے نہیں کسی اور کے لیے ہونی چاہیے تھیں۔'' وہ خاموش ہوئی تھی اور خاموشی جیسے میرے لیے چابک ہوئی تھی...... مجھے نیلو نیل کر گئی...... میں نے مضبوطی سے چوبارے کی منڈیر کو تھاما تھا...... گل پچ کس ڈھونڈنے نیچے جا چکی تھی۔

''کس کے لیے؟'' میرا لہجہ کپکپایا تھا، میں جانتی تھی۔ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولی تھی۔

''وہ کوئی زلیخا نہیں ازنی گیلانی تھی۔'' مجھے لگا میں کسی تابوت میں دفن ہو گئی ہوں...... گھٹن بڑھنے لگی تھی...... فرزانہ نے دوبارہ میرے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

''میں تمہارے لیے دعا کروں گی۔''

''کیا دعا کرو گی؟''

''یہی کہ جو دروازہ میرے لیے نہیں کھل سکا وہ تمہارے لیے کھل جائے۔'' وہ اگر امید تھی تو کھوکھلی تھی وہ دلاسا تھا تو خام تھا۔

''ایسا کیونکر ہوگا؟'' میری سرگوشی رات جیسی سیاہ تھی...... وہ مسکرائی تھی وہ میرے لیے مسکرائی تھی۔

''کیونکہ تم زلیخا ہو۔'' اس کی سرگوشی چاند جیسی روشن تھی...... آنگن میں لگے موتیا کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی...... گل میٹھی لسی لے آئی تھی۔

''تین ہفتوں کے بعد میری شادی ہے۔'' فرزانہ نے بتایا تو گل اچھل پڑی۔

''ہیں واقعی...... تم نے ہاں کر دی......'' وہ

اطمینان سے لسی پی رہی تھی۔

''ہاں......'' وہ عام سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''مجھے یقین نہیں آرہا......'' گل کو یقین نہیں آرہا تھا۔

''چٹکی کاٹوں؟'' وہ ہنسی تھی۔

''اب ایسا بھی نہیں......'' وہ برا مان گئی تھی۔

''تم میری شادی میں ضرور آنا خاص طور پر دعوت دے رہی ہوں۔'' فرزانہ مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔

''ضرور آؤں گی۔'' میں نے کہا تھا، ہم نیچے اتر آئی تھیں...... جاتے وقت وہ گل سے مخاطب ہوئی تھی۔

''کہہ دینا یوسف سے اب اتنا قیمتی بھی نہیں وہ کہ اپنی حیاتی رول دوں اس کے پیچھے۔'' میں اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ چکی تھی...... اور وہ یوسف اصغر کے لیے آخری آنسو بہائے گئے تھے۔

محبت کی تکون پھٹ گئی...... تیسرا سرا بہت ہولے سے، دھیرے سے رات کی خاموشی میں گم ہوگیا تھا...... تکون کے اب دو کونے بچے تھے۔ زلیخا صدیق اور رازنی گیلانی......

☆☆☆

میں اب گھر والوں سے کافی گھل مل گئی تھی۔ اماں کا رویہ کچھ بہتر ہوگیا تھا...... شاید انہوں نے سمجھوتا کرلیا تھا...... میری باتوں کے مختصر جواب دے دیتی تھیں...... ابا حجام کی دکان پر گئے ہوئے تھے...... اماں اور گل دور کے رشتے داروں کی شادی میں گئی تھیں، گل نے کہا کہ وہ کھانا بنا کے رکھ جاتی ہے مگر مجھے مناسب نہیں لگا، آخر کبھی تو مجھے یہ سب کرنا ہی تھا سو اسی وجہ سے منع کردیا...... میں باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی۔ آلو گوشت بن گیا تھا...... سادہ چاول بھی دم پر تھے اور پودینے کی چٹنی بھی بنالی تھی۔ بس سلاد بنانا باقی تھا جو میں اب بنا رہی تھی۔

''گل کھانا بن گیا ہے تو لے آؤ...... بہت بھوک لگی ہے۔'' جانے وہ کب آیا، میں اپنے کام میں مگن تھی...... وہ مجھے نہیں دیکھ سکا تھا تبھی گل سمجھ بیٹھا تھا...... میں نے کپڑوں پر نظر ڈالی تھی لان کا پرنٹڈ جوڑا تھا...... کانچ کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں ہلکا پھلکا میک اپ بھی کیا ہوا تھا...... میں ٹرے میں سب سلیقے سے سجا کرلے آئی تھی۔ دروازے پر دستک دے کر قدم اندر رکھا اور سلام کیا۔ وہ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا چونک گیا۔ مجھے بے خیالی میں دیکھا۔

''اماں اور گل کہاں ہیں؟''

''جی وہ تو شادی پر گئی ہیں۔'' وہ اٹھ کر ہاتھ منہ دھونے چلا گیا تھا...... میں نے میز پر سب لگا دیا...... اور پانی لینے کچن میں آگئی تھی۔ وہ سفید کاٹن میں ملبوس تھا...... بال سیٹ کیے ہوئے تھے...... کسرتی جسم پر کاٹن کا جوڑا جچ رہا تھا۔ یقیناً کم مسکراتا ہوگا اور جان نکال لیتا ہوگا...... میں پانی لے کر آئی تو وہ رغبت سے کھانا کھا رہا تھا...... میں چوری، چوری دیکھتی رہی پھر الماری سے استری شدہ اس کا جوڑا نکال دیا...... وہ بے نیاز سا کھانا کھانے میں مصروف رہا...... جب کھالیا تو مخاطب ہوا۔

''چائے بنانی آتی ہے......؟'' میں حیران ہوئی تھی۔

''جی ہاں......'' میں برتن لے آئی تھی اور چائے کا پانی چڑھا دیا۔ ابا آئے تو انہیں کھانا دیا۔

''ارے واہ...... کیا ذائقہ ہے، اتنا اچھا آلو گوشت تو تمہاری ساس بھی نہیں بناتی......'' وہ مزے لے، لے کر کھاتے رہے اور میں مسکراتی رہی......

میں چائے لے کر گئی تو وہ خوبرو شخص نیند میں تھا...... میں نے افسوس سے چائے کو دیکھا۔ اس کے ماتھے پر گیلے بال بکھرے ہوئے تھے، پرفیوم کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی...... اس کے سینے پر ادھ کھلی کتاب دھری تھی...... جو میں نے ہولے سے اٹھا کر سائڈ پر رکھ دی...... اور دروازہ بند کرتی باہر آگئی۔

جانے کیوں مجھے لگتا تھا وہ یوسف میرا نہیں تھا...... عجیب سا خالی پن رگ وپے میں سرایت کر گیا۔

شام سے ذرا پہلے کا وقت تھا۔ نارنجی دھوپ پھیلی

ہوئی تھی...... ابا کو آلو گوشت بہت پسند آیا تھا۔ رات میں سالن کے ساتھ سبزی کی فرمائش کردی۔ اماں اور گل نے تو کل آنا تھا...... میں اور ابا شام کے کھانے کے لیے سبزیاں توڑنے گھر کے عقبی حصے میں چلے آئے تھے...... کدو، توریاں، کریلے کی بیلیں تھیں...... سبز مرچوں کے پودے لدے ہوئے تھے...... اپنے ہاتھوں سے سبزیاں توڑنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے...... میں اور ابا اکٹھے سبزی توڑتے رہے......

''یوسف تمہارے ساتھ اچھا تو ہے ناں؟''

''جی ابا...... اچھے ہیں۔'' میں نے بھی انہیں مطمئن کرنے کو کہہ دیا تھا۔

''جو بھی بات ہو، مسئلہ ہو سیدھا مجھے بتانا ہے۔ باپ ہوں تمہارا...... جھجک مت جانا دھی......'' میری آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ مجھے وہ چھوٹا سا صحن یاد آیا تھا...... مجھے اپنے ابا یاد آئے تھے۔

شام ہونے کو تھی...... پرندے قطاروں میں گھروں کو روانہ ہو رہے تھے...... ہم بیٹیاں بھی تو پرندوں سی ہوتی ہیں ناں...... شام کو میں سبزی بنا رہی تھی اور ابا برآمدے میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے...... گل نے بتایا تھا کہ بھائی کے دوستوں کا بہت آنا جانا رہتا ہے...... اس شام بھی چار پانچ آگئے تھے...... وہ کچن میں آیا تھا......

''چائے بنادو اچھی سی ساتھ بسکٹ بھی۔''

''جی اچھا...... ساتھ کباب بھی بنادوں......'' میں نے مطلع کیا تھا۔

''بنانے آتے ہیں؟'' جانے وہ کیوں یہ بات پوچھتا تھا...... اور مجھے ہر بار حیرت ہوتی تھی۔

''جی ہاں...... بنانے آتے ہیں۔''

''چلو تیار کرو پھر ابا کے ہاتھ بھجوا دینا۔''

میں جلدی، جلدی تیاری میں لگ گئی۔ کباب تلے ساتھ تازہ چٹنی بھی بنائی۔ جب سب بن گیا تو باہر ابا کو بلانے آئی...... برآمدہ خالی تھا شاید وہ مغرب کی نماز کو مسجد چلے گئے تھے آخر کچھ سوچ کر اچھے سے دوپٹا اوڑھا اور ٹرے اٹھا کر بیٹھک کے اندرونی دروازے پر دستک دی۔ وہ باہر آیا تھا مجھے دیکھا تھا تو ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''ابا کو بھیجنے کا کہا تھا۔'' وہ غصہ ہوا تھا۔ میری آنکھیں نم ہوگئیں۔

''وہ ابا......'' ٹرے ہاتھوں سے لے لی۔

''جاؤ اب......'' میں چپ چاپ پلٹ آئی تھی۔

☆☆☆

جانے کب آوارہ بادل اکٹھے ہوئے اور پہلے ریت اور دھول اڑی اور پھر بارش...... میں تو صوفے پر لیٹی تھی کہ کھلی کھڑکی سے گردوغبار اندر آیا...... چھت پر اماں کی مرچیں اور آم کی ڈلیاں سوکھنے کے لیے رکھی تھیں سب خراب ہوجانا تھا، میں اکیلی اتنی تاریک رات میں کیسے چھت پر جاتی...... ابا باڑے میں رکھوالی کے لیے سوتے تھے۔ یوسف بیڈ پر سویا ہوا تھا...... سوچتی رہی کہ جگاؤں یا نہیں......؟ آخری ڈرتی جھجکتی قریب آئی اور شانے سے ہلایا۔

''جی...... سنیں......'' کالی آنکھوں میں نیند کروٹ لے رہی تھی۔ یوسف نے غائب دماغی کے عالم میں مجھے دیکھا۔

''کیا بات ہے؟'' انداز میں ناگواری سی تھی۔

''وہ باہر آندھی اور بارش......''

''تو میں کیا کروں......؟'' وہ اٹھ بیٹھا تھا۔

صرف بنیان میں اس کا کسرتی جسم صاف نظر آرہا تھا، مجھے لاج سی آئی۔

''وہ اماں نے آم اور مرچیں سوکھنے کو رکھی تھیں چھت پر وہ نیچے لے کر آنی ہے، بارش کے پانی سے خراب ہوجائیں گی۔'' وہ نیند ٹوٹنے پر جھنجلا رہا تھا، مجھ پر ہی بگڑ گیا۔

''بچی نہیں ہو ایم اے پاس ہو ڈرتی ہو؟'' میں بیچاری وہیں کھڑے، کھڑے ایم اے اور ڈر کے تعلق پر غور کرتی رہی...... وہ کمبل لپیٹ کر سو گیا۔ ''خود جا کرلے آؤ......''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آخر کار لرزتی، کانپتی برآمدے کا بلب جلا کر چھت پر چلی آئی تھی۔ جھینگر، گیدڑ بول رہے تھے۔ میں سیڑھیاں چڑھتی اوپر آئی اور سب احتیاط سے سمیٹ کر کپڑے میں ڈالا اور گراہ لگادی۔ بارش بتدریج تیز ہورہی تھی۔ جیسے ہی مڑی کسی سے ٹکرا گئی۔ دل اچھل کر حلق میں آگیا...... وہ یوسف تھا جانے کب اوپر آیا تھا اس نے ٹارچ تھامی ہوئی تھی۔ کبوتروں کے ڈربے پر چادر چڑھانے لگا تھا۔ میرا دل تھا کہ قابو میں نہیں تھا...... جس کے لمس نے مجھے پتھر کیا تھا۔ وہ میرا شرعی وارث تھا۔ مگر وہ آرام سے چارپائیاں کھڑی کرنے میں مگن تھا۔ میں بارش میں بھیگتی کڑکتی بجلی میں اسے دیکھے گئی...... بے خود سی، بے دھیانی میں...... زلیخا ”یوسف“ ہوگئی...... ”میں“ کا درجہ ”تم“ میں جا گرا...... وہ بارش میں بھیگا قدم، قدم چلتا میری طرف آیا تھا۔ مجھے یوں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

”سکتہ ہوگیا ہے۔ کیوں ٹکٹکی باندھے پاگلوں کی طرح دیکھے جارہی ہو...... پہلے کبھی انسان نہیں دیکھے؟“ وہ ٹارچ دائروں میں گھماتا سیڑھیاں اتر گیا اور میں وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ کمرے میں آئی اور کھڑکیاں کھولے، باہر برستی بارش دیکھتی رہی اور میری کلس آنکھیں بھی برسات ہوگئیں...... وہ خوبرو شخص دوبارہ کمبل میں غڑاپ ہوچکا تھا...... دل چاہا زور، زور سے برستی بارش میں چلاؤں۔ ”ہاں...... زلیخا نے کبھی ”یوسف“ نہیں دیکھا۔“

وہ کٹھور تھا شاید دل رکھتا یا پتھر...... کھڑکیوں سے پھوار اندر آئی اور کمبل میں سے غصیلی آواز مجھ تک پہنچی تھی۔

”اگر اتنا ہی شوق ہے برسات دیکھنے کا تو برآمدے میں تخت رکھا ہے کھڑکیاں بند کردو......“ اس رات محبت کے ساتھ، ساتھ میرے وجود میں عزتِ نفس اور انا کے پودے نے بھی آبیاری پکڑی تھی...... میں کیوں قدر گھٹاؤں اپنی،...... کاش میں فرزانہ جتنی بہادر تو ہوتی کہ...کالی رات میں دوکھارے آنسو بہا کر کہتی۔ ”جاؤ یوسف...... تم اتنے خاص بھی نہیں کہ تمہارے لیے حیاتی رول دوں......“ مگر میں تو ”زلیخا“ تھی...... عشق گزیدہ......

ماہی ماہی کوکدی...... میں آپے رانجھن ہوئی
رانجھن رانجھن مینوں سب کوئی آکھو، ہیر نہ آکھو کوئی......

اگلے دن اماں آئیں تو اپنا شٹل کاک تخت پر پھینکتی سیڑھیاں چڑھ گئیں۔ ”ہائے کہیں سب برباد نہ ہوگیا ہو۔“ اگلے لمحے واپس آئیں تو سکون سے تھیں...... ”شکر ہے تمہارے باپ کو بھی میری محنت کا خیال آیا۔“ گل سے کہنے لگیں۔

”خیر خیال تو انہیں ہمیشہ آپ کا رہتا ہے۔“ وہ شرارتی انداز میں بولی تھیں۔ میں شکنجبین بنا کر لے آئی تھی۔ گل شکنجبین پیتی ہوئی تفصیلات سے آگاہ بھی کررہی تھی...... میں مسکراتی ہوئی سنے گئی...... شام کو ابا نے اماں کو مطلع کیا تھا کہ مرچیں اور آم انہوں نے سنبھالے تھے۔

”ہیں تو یوسف نے...... وہ ایسے کام کرتا تو نہیں......“ وہ حیران تھیں۔

”جی میں نے چھت سے اتار کر رکھی تھیں۔“ میں نے ہولے سے انہیں مطلع کیا تو وہ خاموشی سے سر ہلا گئی تھیں...... اگلے دن یوسف بھی شہر چلا گیا تھا ہر سو اداسی سی پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

ازنی گیلانی کون تھی؟ کیا تھی؟ کیسی تھی؟ یہ سب باتیں مجھے بعد میں گل نے بتائی تھیں...... ان باتوں کی روشنی میں، میں یہ اندازہ لگا پائی تھی کہ وہ ایک طرحدار، نخریلی اور اونچی ٹک، ٹک کرتی ہیل پہننے والی لڑکی تھی جو کہ ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور یوسف کے ساتھ کالج میں پڑھاتی تھی۔ ایک بار گاؤں آئی تو الٹیاں کرتی ہوئی گئی، اسے آزادانہ مٹرگشت کرتی گائے بھینسوں سے خوف آیا تھا...... گوبر سے گھن آئی اور سارا کھایا پیا اگل دیا تھا۔ اور دنیا بھر کی نزاکت اس پر ختم تھی...... دو بل صحن میں اونچی ہیل سے لڑکھڑا کر گری

اور دونوں بار یوسف نے تھام لیا۔ اماں اور ابا کی آنکھیں چار ہوئیں۔ تیسری بار یوسف نے اسی چینی گڑیا کو گرنے نہیں دیا...... یوسف کا پروپوزل قبول ہونا صرف ایک شرط پر تھا۔

’’یوسفی...... او مائی گاڈ...... آئی کانٹ لیو دیئر...... کالی بھینسیں، گوبر، گندے میلے لوگ...... میں وہاں نہیں رہ سکتی...... اگر تم واقعی مجھے چاہتے ہو تو شہر شفٹ ہو جاؤ چاہو تو اپنی فیملی کو بھی لے آؤ......‘‘ یوسف نے سکون سے سن کر یہی بات ابا کے آگے رکھ دی۔ ابا نے نیا حقہ دیوار پر دے مارا۔

’’پرکھوں کی زمین ہے۔ راکھی ہے۔ سب چھوڑ چھاڑ شہر چل دوں، تیرے دو آنے کے عشق کے لیے...... اتنا بے غیرت نہیں ہے اصغر چوہدری...... تو جاتا ہے تو جا...... پھر اپنا مرن جی ہم سے ختم سمجھنا۔‘‘ اماں نے تو پالک کاٹنے والی چھری نس پر رکھ دی۔

’’یوسفے...... دودھ نہیں بخشوں گی، اتنے سے پڑھایا لکھایا اور تو ہمارے آگے یہ دن لے آیا...... عقل نال سوچ وے......‘‘ کہانی کا اختتامیہ کافی ٹریجک رہا ازنی گیلانی کالج تو چھوڑ گئی مگر یوسف کا دل لے کر رفو چکر...... ہو گئی...... یوسف کے مزاج میں سختی آ گئی۔ میں نے اطمینان سے ساری کہانی سنی تھی...... تکون کا دوسرا کونا ازنی گیلانی تھی جو روپوش تھی اب ایک کونا بچا تھا اور وہ میں تھی میں یعنی ’’زلیخا صدیق......‘‘ رانجھا، رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی۔

☆☆☆

ابا نے کہا تھا اماں چار آنسوؤں کے آگے موم کا گھر ہو جائیں گی، پگھل جائیں گی مگر اماں تو چند جملوں میں ریت ہو گئیں...... ہم دونوں اکٹھے بھٹی رکھے پرالی جلائے روٹیاں پکا رہی تھیں جب میں بھٹی تلے متوازن مقدار سے پرالی جلاتی اماں کو دیکھے گئی...... ان کی چوڑیاں آواز دیتی تھیں۔

’’کیا دیکھ رہی ہے زلیخا......؟‘‘ وہ روٹی کا رخ پلٹ رہی تھیں۔

’’کچھ نہیں......‘‘ میں نے پانچویں روز بھی یہی جواب دیا تھا...... چھٹے روز جب میں انہیں نثار ہوتی نظروں سے دیکھے گئی تو انہوں نے معمول کی طرح پوچھا تھا۔

’’میری سگی اماں بھی ایسے ہی روٹیاں پکاتی تھیں۔‘‘ میں نے ڈبڈبائی آواز سے کہا تھا۔ اسی شام انہوں نے مجھے لاڈ سے پاس بٹھا کر کہا تھا۔

’’زلیخا میں بھی تمہاری ماں جیسی ہوں۔ میں سمجھی تو بھی اس شہری کڑی جیسی ہوگی، مجھے بڑا ہول آتا ہے ان شہری کڑیوں سے...... مگر تو، تو سیدھی سادی ہے میری گلی جیسی...... جو جانے انجانے میں مجھ سے ہوا ماں سمجھ کر معاف کر دینا۔‘‘ ہم ساتھ لگی پھوٹ، پھوٹ کر روتی رہیں اور گل چوزوں کو ڈربے میں بند کرتی قل، قل ہنستی رہی تھی۔

’’پہلی بار کسی ساس، بہو میں اتفاق دیکھا ہے۔‘‘

’’نظر لگائے گی۔‘‘

’’میری نظر نہیں لگتی۔‘‘

’’میں تو جیسے جانتی ہی نہیں۔‘‘

فرزانہ کی شادی ہوئی تو میں اور گل تیار شیار ہو کر گھر سے نکل رہی تھیں...... یوسف چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ مجھے دیکھا تو ٹھٹک گیا...... میں نے بھی نظر انداز کر دیا۔ گل نے تو مجھے تیار دیکھ کر بلائیں لی تھیں ’’ہائے بھرجائی...... بہت پیاری لگ رہی ہو......‘‘ میں جھینپ گئی اور اندر جا کر تیسری بار خود کو آئینے میں دیکھ آئی تھی...... میں نے واقعی خود کو بدلتا دیکھا تھا...... ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ شاید اس لیے کہ پہلے میں صرف ’’زلیخا صدیق‘‘ تھی مگر اب میں ’’زلیخا یوسف‘‘ تھی۔ پہلے واحد تھی اب جمع ہو گئی تھی۔

اماں نے مرچیں سر سے وار کر آگ میں جھونکیں۔

’’ارے اللہ میری بہو کو نظرِ بد سے بچائے۔‘‘ ابا نے تو سورۂ... ناس پڑھ کر ہم دونوں پر پھونکی تھی...... یوسف بھی لک چھپ کے دیکھ رہا تھا۔ پہلے مجھے الجھن ہوئی پھر میں نے بے نیازی سے اسے نظر انداز کر دیا۔ فرزانہ لال شرارہ پہنے دہک رہی تھی، ہمیں

دیکھا تو اٹھ کر ملی اور ساتھ ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

''کیسی ہو زلیخا؟''

''میں ٹھیک ہوں، تم آج بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' میں نے کھلے دل سے تعریف کی تھی۔

''واقعی......؟'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاید ساری دلہنوں کو یقین نہیں آتا مگر اس خاص دن سب پیاری لگتی ہیں۔

''سچ میں، میں نے آج سے پہلے اتنی خوب صورتی دلہن نہیں دیکھی۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔

''زلیخا......تمہارا یوسف کیسا ہے؟'' دلہن کا لہجہ لرزا تھا...... میں نے کنگن گھمایا۔

''صرف نام ساتھ جڑنے سے کوئی کسی کا نہیں ہو جاتا۔'' لاج کی ڈلی بنی دلہن مجھے دیکھے گئی۔

''زلیخا نام تو ہے ناں......امید تو ہے۔''

''تم خوش نہیں ہو؟'' میں نے اس کی آنکھ سے اک آنسو لڑھک کر رخسار سے ہوتا اس کی حنا سے رنگی ہتھیلی پر گرتے دیکھا۔

''کیا میں تمہیں خوش نظر نہیں آ رہی؟'' وہ الٹا مجھ سے سوال کر رہی تھی...... میں نے بغور اسے دیکھا۔ اس کا سارا وجود جیسے آنسو تھا درد تھا......کرب......

''تم مسکرا نہیں رہیں فرزانہ......'' وہ پھر مسکرا دی...... میرے لیے مسکرائی تھی...... پہلے بھی ایک بار وہ میرے لیے مسکرائی تھی۔ ''سب خوش ہیں زلیخا سب......''

''اصل بات تو تمہاری خوشی کی ہے۔''

''یتیم لڑکیاں اپنی خوشی نہیں دیکھتیں۔'' اس کی کٹورا آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔

''تم اپنے بھائی، بھابی کے دباؤ میں آ کر تو......؟'' میری بات ادھوری رہ گئی تھی......دولھا والوں کے آنے کا شور مچ گیا۔ دولھا بانکا سجیلا سا تھا۔ شکر ہے چاند سورج کی جوڑی تھی۔ رخصتی کا وقت آن پہنچا تو وہ سب سے گلے مل کر روئی تھی اور ٹکر، ٹکر درودیوار کو دیوانوں کی طرح دیکھ رہی تھی......لڑکیاں بالیاں رخصتی کے گیت گا رہی تھیں ہر آنکھ اشک بار تھی۔

لال گلاب سی چہکتی دلہن میرے گلے آن لگی تھی اور سرگوشی کی تھی۔

''اللہ کے واسطے زلیخا مجھے معاف کر دینا...... یوسف صرف تمہارا ہے......آج میری شادی کو میری یوسف کی موت سمجھ لو...... دل کو سمجھا بجھا لوں گی...... دل بہل جائے گا زلیخا......بہل جائے گا......'' روتی کرلاتی الوداعی ہاتھ ہلاتی وہ رخصت ہو گئی تھی......

مجھے اپنی شادی کا دن یاد آیا تھا جب اس نے میرا گھونگٹ اٹھا کر کہا تھا۔ ''میں تمہیں دن میں بیسویں بار گالیوں، کوسنوں سے نوازتی ہوں، کیا تم مجھے معاف کرو گی۔'' رخصتی کے وقت یوسف نے دلہن بنی فرزانہ کے سر پر ہاتھ رکھا تو ہنس کر بولی تھی۔

''شکر ہے تم مجھ سے شادی پر راضی نہ ہوئے ورنہ میں ساری زندگی پچھتاتی رہتی۔'' وہ ہنسی کیسی تھی......آوارہ درد جیسی تھی......کربِ مسلسل......

☆☆☆

گاؤں کے سارے شریر بچے میرے پاس پڑھنے آنے لگے تھے، گاؤں میں نت نئی شرارتیں ایجاد ہوتی ہیں۔

''میں تو سو بار پھینٹی لگا چکی ہوں۔ مگر مجال ہے جو کانوں پر جوں تک رینگ جائے۔'' گل کانوں کو ہاتھ لگاتی۔ ''بھرجائی آپ کا حوصلہ ہے جو ان بلاؤں کو قابو کر رکھا ہے۔'' اماں مدھانی سے مکھن نکالتی ہنستی تھیں۔

''نی گل......وڈی کاکی نہ بن...... بچپن میں سارے ایسے ہی ہوتے ہیں کوئی شودھا نہیں ہوتا۔''

''کم از کم میں ایسی آفت پرکالہ نہیں تھی۔''

''اے لو......کچی دیواروں کی مٹی تمک تو تم اور یوسف چاٹ کھاتے تھے۔'' ہائے بچپن میں مٹی چاٹتا رہا تھا تبھی میری شیریں محبت کی قدر نہیں ہونہہ......

ماہ رمضان المبارک ..شروع ہو چکا تھا۔ اگلے ہفتے گھر آیا تو عجب نظارہ دیکھا صحن میں ٹاٹ بچھا تھا

اور انواع اقسام کے بچے ہل، ہل کر پہاڑے یاد کررہے تھے۔ دھوپ والی دیوار کے ساتھ تختیاں قطاروں میں لگی ہوئی تھیں...... وہ ہمیشہ شور سے خائف رہتا تھا...... بھنا ہی تو گیا۔

”یہ مدرسہ کس نے کھولا ہے؟“

”وہ اماں......“ میری بات آدھی رہ گئی تھی۔

”ایں...... اماں نے؟“ وہ حیران ہوا تھا۔

”اماں سے گاؤں والی عورتیں کہنے آئیں کہ ان کے بچوں کو پڑھا دیا کروں...... تبھی اماں کے اصرار پر......“ تیکھے چتونوں سے گھورتا رہا۔

”ہاں، ہاں اسی گاؤں سے محمد علی جوہر، سرسید احمد خاں پیدا ہوں گے ناں۔“ وہ غصے میں چارپائی پر ڈھیر ہوگیا تو سہ پہر سے ہی آنکھ کھلی۔ ٹھنڈی دھوپ پھیلی ہوئی تھی...... میں اور گل سبزی بنارہی تھیں...... محلے کی حمیداں آئی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ اس کا بیٹا بھی تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھیں۔

”استانی جی...... بس اسے پڑھا دیا کریں...... بڑا شرارتی ہے...... اس دن دادی کی چٹیا مقراض (قینچی) سے کاٹ ڈالی۔“

”چٹیا کاٹ ڈالی؟“ میں اور گل ہکا بکا رہ گئیں سبزی ہمیں بھول بھال گئی۔

”ہاں بد بخت ایسی، ایسی شرارتیں کرتا ہے کہ شرمندہ کروادیتا ہے...... انڈے کا شوقین ہے...... سالن چولھے پر چڑھا ہو تو دڑبے سے انڈے نکال کر دیگچی کا ڈھکن اٹھا کر اس میں توڑ دیتا ہے۔ اب توری، کریلا اور گوشت بھی انڈے جیسا ذائقہ دیتے ہیں...... پیو بھی کچھ نہیں کہتا کہ اکلوتا پتر ہے ہمارا...... مگر ہے پورا شیطان دی ٹا کی۔“

اس آفت کے پرکالے کو جس طرح میں نے اور گل نے سدھارا ہم جانتے ہیں یا اوپر والا...... کپڑے کے بستے میں چوزے ڈال کر پڑھنے آتا تھا...... زندگی تغیر ہے، بدلتی ہے...... میں نے یوسف کو بدلتے دیکھا...... وہ مجھ پر توجہ دینے لگا...... بہانے، بہانے سے بات کرنے کی کوشش کرتا...... اگر یوسف اصغر دل کے سو دروازے رکھتا تھا تو دستکیں دے، دے کر نڈھال تو میں بھی ہوئی تھی مگر ایک بھی دروازہ نہ کھلا۔ گھر کے کام میں اور گل مل کر کرتی تھیں...... اور آج کل روزوں کی وجہ سے قدرے مصروفیت کم تھی...... سو میں فارغ وقت میں یوسف کی لائبریری سے استفادہ کررہی تھی، بے تحاشا کتابیں کرشن چندر، منٹو، امتیاز علی تاج، ممتاز مفتی کی اور اس کے علاوہ بھی دوسرے ادیبوں کی...... شہاب نامہ کی ایک لائن نے مجھے سکات کردیا...... ”مجھے چندراوتی کے مرنے کے بعد اس سے محبت ہوئی۔“ میں چندراوتی کی موت میں اپنے آپ کو مرتا دیکھ رہی تھی۔ گل سیب کاڑھ رہی تھی...... ساتھ، ساتھ باتیں بھی کررہی تھی۔

”مجھ سے تو یہ موٹی، موٹی کتابیں نہیں پڑھی جاتیں۔“

”ہاں، ہر کسی سے نہیں پڑھی جاتیں۔“

”ان میں سب جھوٹ ہوتا ہے کیا؟“

”نہیں، آدھا سچ ہوتا ہے۔“ میں کتاب لیے اندر چلی آئی اور ورق موڑ کر میز پر رکھ دی...... بڑھی ہوئی شیو...... بکھرے بالوں کے ساتھ یوسف پیپر چیک کررہا تھا۔

”سنو......“ میں جو باہر جانے لگی تھی ٹھہر گئی...... پلٹ کر دیکھا تھا۔

”چائے بنانی آتی ہے؟“ ہر رات کے بارہ بجے اسے چائے یاد آتی تھی۔ میں بھنائی ہوئی دروازہ زور سے بند کرتی کچن میں آگئی...... چائے بنا کر گل کے ہاتھ بھجوادی...... کچھ دیر بعد وہ میرے سر پر کھڑا تھا۔

”میں نے تمہیں چائے لانے کو کہا تھا......“ میں سنک میں پڑے ایک دو برتن دھوتی رہی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا تھا...... گرفت مضبوط تھی...... میں لرز گئی تھی...... وہ لمس تھا یا انگارہ۔

”ہاتھ چھوڑیں......“

”کیوں چھوڑوں...... بیوی ہو میری......“ اسے تین ماہ بعد یاد آیا تھا کہ میں بیوی تھی اس کی، مجھے حیران ہونا چاہیے تھا۔

"ہاتھ چھوڑیں...... میں برتن دھو رہی ہوں۔"

"برتن ضروری نہیں ہیں۔"

"ضروری ہیں۔"

"شوہر کی کوئی اہمیت نہیں تمہارے لیے......" وہ میرے اتنے قریب تھا کہ میں نے دیوار تھام لی تھی۔ اسے کیا خبر کہ اہمیت تھی تو کتنی تھی؟

"اہمیت......" میں نے طنز سے اسے دیکھا تھا...... اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

"میں تم پر سارے حق رکھتا ہوں۔"

میری آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں...... ہر بار کی طرح میں نے دھند پھیلتے دیکھی تھی۔ میں نے ہولے سے ہاتھ چھڑا لیے تھے۔

"جمیلہ کہتی تھی میرے لیے یوسف آئے گا...... اور میرے لیے یوسف آیا مگر وہ میرا نہیں تھا...... وہ فرزانہ شبیر کا بھی نہیں تھا۔ میں جیتی جاگتی عورت ہوں جذبات، احساسات سب رکھتی ہوں، پتھر نہیں ہوں...... دل رکھتی ہوں...... چوٹ لگتی ہے تو مجھے بھی درد ہوتا ہے۔ ٹیسیں اٹھتی ہیں...... عورت کھلونا نہیں ہوتی یوسف اصغر...... میں اپنا آپ مٹی میں رول دوں تب بھی آپ کا دل نہیں پاسکتی...... تین ماہ مجھے نظر انداز کیا گیا...... میرا قصور کیا تھا؟ صرف اتنا کہ یوسف اصغر کو زلیخا صدیق سے محبت نہیں...... محبت گلی کوچوں میں بکا کرتی تو پاؤ بھر خرید لیتی...... آج آپ کو حقوق و فرائض یاد آرہے ہیں...... ترازو میں رکھ کر حساب کیجیے مجھے بھاری پائیں گے...... میں جانتی ہوں آپ کے دل میں کبھی جگہ نہیں بنا پاؤں گی۔ پہلی محبت پہلے زخم جیسی ہوتی ہے جس کا نشان تاعمر رہتا ہے...... میں ازنیٰ گیلانی کی کبھی جگہ نہیں لے سکوں گی۔ کبھی نہیں......"

میں روتے ہوئے ہتھیلی کی پشت سے آنسو پونچھتی باہر آگئی تھی۔ یوسف اصغر وہیں پتھر بنا کھڑا رہا تھا۔

☆☆☆

روزے بخیر وخوبی گزر گئے تھے اور اب چاند رات کو چوبارے پر کھڑی میں چاند ڈھونڈ رہی تھی جانے کہاں تھا نظر ہی نہیں آتا تھا۔ موتیے کی بھینی، بھینی خوشبو سے سحر طاری کرتی ہوئی وہ ایک سحر انگیز شام تھی۔ فضا میں ہلکی سی خنکی تھی...... میں منڈیر سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی تھی...... تبھی مدھم کولون کی مہک آس پاس بکھر گئی تھی...... شاید وہ ابھی آیا تھا اور سیدھا مجھے ڈھونڈتا...... ہوا چھت پر آگیا تھا۔

"چاند ڈھونڈ رہی ہو؟" وہ بالکل میرے قریب میری طرح ہی منڈیر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا تھا۔" میں نے خاموش رہنا ٹھیک سمجھا تھا۔

"ناراض ہو؟" میں چپ رہی تھی...... دل عجیب ہمک رہا تھا ہم عورت ذات بھی عجیب ہوتی ہیں۔

"میں مانتا ہوں ساری غلطی میری ہے، سارے قصور میرے ہیں...... تم اپنی جگہ ٹھیک ہو...... جس طرح تم نے بچپن سے لوگوں سے یوسف کا ذکر سنا ہوگا اسی طرح میں نے بھی زلیخا کا نام سنا...... جانے کیسے میری زندگی میں ازنیٰ آگئی اور کیونکر مجھے اس سے محبت ہوئی میں اس بات سے لاعلم ہوں...... شاید محبت لاعلمی کا دوسرا نام ہے...... مجھے دقیانوسیت سے ہمیشہ چڑ رہی ہے اسی لیے میں ماڈرن ازم کا دلدادہ رہا ہوں اور شاید ازنیٰ کی طرف متوجہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو، تمہیں سچ بتاؤں یہ یک طرفہ معاملہ تھا۔ مجھے اس سے محبت تھی مگر اسے مجھ سے محبت نہیں تھی شاید پسندیدگی تھی اور ہم بے شک اچھے دوست بھی رہے ہیں...... کبھی، کبھی ماڈرن ازم ہمارے لیے وبال ہوجاتا ہے اس کا اندازہ مجھے تب ہوا جب ابا نے حقہ توڑا اور مجھے...... بے دخل ہونے کو کہا اور اماں نے نس کاٹنے کی ٹھانی...... تب میرے اور ازنیٰ کے راستے الگ ہوگئے...... مگر میرا دل اب بھی اس کے پاس تھا...... رہی بات فرزانہ کی تو وہ میرے لیے گل جیسی ہی تھی...... تب میں نے اپنے آپ کو اپنی ذات کے دائرے میں قید کرلیا...... میری ذات کے دروازے کی چٹخنی تب ہولے، ہولے ٹوٹی جب تم میری زندگی میں آئیں...... پہلی بار میں نے تمہیں چوری کھڑکی سے تمہارے گھر میں دیکھا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

جب تم اس چھوٹے سے گھر میں اتنا دھواں پھیلائے میرے لیے چائے بنا رہی تھیں...... اور سچ کہوں وہ دنیا کی سب سے بری چائے تھی، عجیب دھوئیں جیسا ذائقہ تھا شاید دو تین تمہارے آنسو بھی ٹپک گئے ہوں گے...... یہی وجہ ہے کہ میں تین ماہ سے ایک سوال دُہرا رہا ہوں کہ تمہیں چائے بنانی آتی ہے؟''

وہ آدھی رات کے روشن چاند سا شخص میرے کندھے سے کندھا ملائے داستانِ الف لیلیٰ سنا کر مجھے مسحور کر رہا تھا...... چاند ابھی نہ ابھرا تھا۔ شام رکی، رکی سی تھی...... میں نے چور نظروں سے اسے دیکھا تھا...... وہ زلیخا کا ''یوسف'' تھا۔

''میں نے دوسری بار تمہیں تمہارے ابو کی وفات پر روتے دیکھا تھا اور مجھے تم پر بے تحاشا ترس آیا تھا...... اور پھر میں نے تیسری بار تمہیں اپنے گھر دلہن بنے دیکھا تھا...... اسی دن میں نے ازقی کی واپسی کی خبر سنی...... باقی مجھے سب بھول گیا۔ مجھے تم بھی بھول گئیں۔ تب مجھے یاد رہا تو صرف اپنا دل جو اس کے پاس تھا۔ میں اگلے دن ہی شہر چلا آیا تھا...... اس نے شادی کر لی تھی اور وہ خوش بھی تھی...... میں نے بھی تو شادی کر لی فرق اتنا تھا کہ وہ خوش تھی اور میں جوگ میں تھا...... میں دو ماہ تک کچھ سمجھ ہی نہیں پایا پھر آہستہ، آہستہ میں گھر میں تمہارے وجود کا عادی ہوتا گیا...... تم جب، جب مجھے چوری دیکھتی تھیں...... مجھے خبر ہوتی تھی...... تمہاری نظروں کا ارتکاز محسوس ہوتا تھا...... اور جب میں تمہاری طرف متوجہ ہوا تم نے مجھے اگنور کرنا شروع کر دیا...... میں ایک واقعی برا شوہر ہوں۔'' تکون کا مرکز میرے سامنے تھا...... میں تھی اور یوسف تھا۔

میں چاند کھوج رہی تھی اور وہ مجھے دیکھ رہا تھا......

''میں نے تمہیں یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میں تمہیں پسند کب کرنے لگا؟'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا......

''اس وقت جب چندراوتی کی موت کا درد زلیخا کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا اس بار میں چھڑا نہیں پائی تھی۔ ''کیا تم مجھے معاف کر سکو گی زلیخا...... میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا کیونکہ تم اب اچھی چائے بنانے لگی ہو......'' کبوتروں کے جوڑے آسمان کی طرف پرواز کر گئے تھے...... میں دیکھتی رہ گئی...... وہ میرے سامنے آن کھڑا ہوا...... میں نظریں جھکانا بھول گئی...... شام سے وہ مجھے دنیا کا خوب صورت ترین مرد لگا تھا۔

''کیا تم مجھے اتنا وقت دے سکتی ہو کہ مجھے تم سے محبت ہو جائے؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ میں نے اس کی پشت پر پھیلے سرمئی آسمان پر چاند ابھرتا دیکھا تھا۔

''اگر نہ ہوئی تو......؟'' میرا خدشہ لبوں پر آیا...... اس نے میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا تھا۔

''شش...... محبت کو زلیخا کے لیے یوسف کے دل میں آنا ہوگا......'' وہ جواب تھا تو خوب صورت ترین تھا۔

یوسف نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے...... عید کا چاند ہمارے سامنے تھا...... گل ہڑ بڑا کر اوپر آئی ہمیں دیکھا تو شرما کے آنکھوں پر ہاتھ رکھتی بھاگ گئی۔

''تم نے مجھے معاف کر دیا؟''

''فی الحال سوچ رہی ہوں۔''

''ابھی سوچو گی؟'' وہ حیران ہوا تھا۔ میں ہاتھ چھڑا کر جانے لگی تھی۔ ''ارے سنو...... رکو تو سہی......''

''مہندی لگوانے جا رہی ہوں۔'' میں منہ چڑاتی بھاگ آئی تھی۔

آس پاس کی چھتوں سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ''چاند رات مبارک......'' آج میں عید کے دن سوچتی ہوں شاید محبت ہر کسی کو نہیں ملتی...... مجھے بھی مل گئی بس تھوڑا انتظار کرنا پڑا......

''یوسف کے لیے زلیخا صدیوں انتظار کر سکتی ہے۔'' اب میں اسے چائے بنا کر دینے جا رہی ہوں اگر آج میری بنائی گئی چائے پر سوال اٹھا تو یا تو یوسف کا سر ٹوٹے گا یا چائے کا کپ...... جی ہاں...... عید مبارک......

☆☆☆

سجنا سنگ میری آئی عید

ریما نور رضوان

''انشراح......!'' مزنہ جیلانی نے اسے دھیمے سے پکارا تھا۔

''مزنہ...... یار...... میں کیا کرسکتی ہوں......'' انشراح آفندی نے بیچارگی سے کہا تھا۔

''پپا کے انتقال کو دن ہی کتنے گزرے ہیں۔ اس صدمے سے سنبھل نہیں پائی ہوں کہ اک نئی آفت نازل ہو جائے گی اگلے مہینے۔'' مزنہ جیلانی شدید پریشانی کے عالم میں تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حنا ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://paksociety.com

''تیرے چچا بھی ناں۔ دنیا بھر کے نمبر ون لالچی، فراڈیے، دوغلے شخص ہیں۔ جائداد کا بٹوارا کر کے تمام رشتے ناتے توڑ کر وہ چھ سال قبل پاکستان چھوڑ گئے تھے۔ اب یوں اچانک انکل کے انتقال پر صدمے، غم، افسوس کا اظہار...... چہ معنی...... کچھ پلے نہیں پڑ رہا......'' وہ پُرسوچ انداز میں بولی تھی۔

''میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ کچھ غلط ہونے والا ہے۔ پپا بھی مجھے بھری دنیا میں تنہا چھوڑ گئے۔ میں کس طرح ان مشکلات کا سامنا کروں گی......'' مزنہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

''مزنہ! پلیز رو ؤ نہیں۔ موت تو برحق ہے۔ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ موت و زندگی رب العزت کے اختیار میں ہے۔ اپنوں سے جدا ہونے کا غم روح کو ہر وقت زخمی کرتا ہے۔ دل اپنوں کی یاد میں تڑپے یا بلک، بلک کر روئے اپنے کبھی پلٹ کر نہیں آتے' مزنہ حوصلہ کرو۔ میں اور شعیب کچھ سوچتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو سب بہتر ہوگا' بے شک .... ہمارا رب ہمیں ہم سے زیادہ چاہتا تھا......'' انشراح نے ہمت بڑھائی تھی۔

''انشو! تو پلیز شعیب بھائی سے ڈسکس کرنا ناں......''

''مزنہ! تو آفس میں ڈسکس کر لے ناں......'' انشراح نے آئیڈیا پیش کیا تھا۔

''جی نہیں، میں مسٹر شعیب مرزا احمد سے کوئی بات نہیں کرنے والی۔'' مزنہ جیلانی نے صاف انکار کیا تھا۔ ''شعیب بھائی سے تو نے ہی بات کرنی ہے......'' مزنہ نے اس کی بات مسترد کر کے تحکم آمیز لہجے میں کہا تھا۔

''او کے باس! آپ کا حکم سر آنکھوں پر......'' انشراح نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔

☆☆☆

''شعیب! آج مزنہ آئی تھی......''

''تو...... وہ تو...... روز ہی آتی ہے......'' شعیب نے ٹی وی پر میچ دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔

''شعیب! مزنہ بہت پریشان ہے...... اس کے چچا صداقت علی پاکستان آ رہے ہیں۔ وہ خوفزدہ ہے کہ وہ زبردستی اپنے بیٹے ابراہیم علی سے مزنہ کی شادی نہ کر لیں۔ انکل سے انہوں نے کئی مرتبہ مزنہ کا ہاتھ مانگا تھا۔ انکل کو وہ لفنگا ٹائپ لڑکا ذرا برابر پسند نہ تھا۔ مزنہ بھی یہی کہہ رہی ہے۔ وہ اپنی من مانی کریں گے۔ اس کے چچا ایک لالچی انسان ہیں۔ اور لالچی لوگ صرف اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔ دوسروں کے نفع و نقصان کے بارے میں کچھ نہیں سوچتے۔ مزنہ کہہ رہی ہے میں مر جاؤں گی لیکن یہ رشتہ نہیں ہونے دوں گی......''

''ہیں...... وہ تو اپنا حصہ لے کر قطع تعلق کر کے چلے گئے تھے ناں ہمیشہ کے لیے...... اب دوبارہ پاکستان کیوں آ رہے ہیں؟''

شعیب حیرانی سے بولا تھا۔

''اسی لیے تو وہ پریشان ہے۔'' انشراح اور شعیب باتوں میں مشغول تھے۔

مزنہ جیلانی کی قریبی اور خاص الخاص دوست انشراح آفندی ہی تھی۔ مزنہ کی مما کا انتقال اس کی پیدائش پر ہی ہوگیا تھا۔ بیٹیاں تو آنکھوں کی ٹھنڈک و راحتِ قلب ہوتی ہیں۔ مزنہ بھی اپنے پپا کی آنکھوں کی ٹھنڈک و راحتِ قلب و جاں تھی۔ انہوں نے مزنہ کو بڑے نازو نعم سے پالا تھا۔ اب جب وہ ان کی خدمت کرنے کے قابل ہوئی تو انہوں نے قلیل علالت کے بعد رختِ سفر باندھ لیا اور اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ اتنے چاہنے والے پپا کی دائمی جدائی سوہانِ روح تھی۔ وہ ٹوٹ کر بکھری ہوئی تھی۔ ایسے میں اس کی بہن جیسی دوست نے حقِ دوستی ادا کرتے ہوئے ہر لمحہ اس کا ہر طرح سے خیال رکھا تھا۔ وہ باپ کی موت کے صدمے سے نکلی نہ تھی کہ اس کے چچا نے اپنے پاکستان آنے کی خبر دے کر اس کا چین و سکون ختم کر دیا تھا۔ وہ مضطرب سی فوراً ہی اپنی جان سے عزیز سہیلی کے پاس آئی تھی۔ اس دنیا میں کوئی اس کا کوئی اپنا نہ تھا

سوائے انشراح کے وہ سخت پریشان تھی۔

☆☆☆

''میکائیل! یار مان جاؤ ناں۔ لڑکی بہت اچھی ہے۔ میں اسے کافی عرصے سے جانتا ہوں.....'' شعیب مرزا اپنے قریبی دوست میکائیل یوسف خان کو مزنہ سے نکاح کے لیے راضی کرر ہا تھا۔

''یار! تو پاگل ہو گیا ہے کیا۔ ہمارے خاندان میں آج تک ایسا نہیں ہوا ہے۔ اتنی ایمرجنسی میں شادی اور پھر مجھے مزنہ کے گھر میں رہنا ہو گا۔ امپاسبل۔'' میکائیل ذرا برابر راضی نہ تھا۔

''دیکھو مجبوری ہے۔ آنٹی اور انکل سے میں خود بات کرتا ہوں۔ مزنہ کے سر پر میں نے بڑا بھائی بن کر ہاتھ رکھا ہے اور دنیا کا کوئی بھی بھائی مشکل میں اپنی بہن کو اکیلا نہیں چھوڑتا ہے۔'' شعیب مرزا سیریس تھا۔

''ابے اوئے! ایسا لگ رہا ہے۔ لو میرج ہے۔ تو گھر آ کر ساری صورتِ حال بتائے گا ناں سب یہی سوچیں گے کہ میں نے سیٹنگ کی ہوئی ہے، تجھ سے سب کو راضی کروا رہا ہوں۔''

بات تو وہ صحیح کرر ہا تھا۔

''یار! کیا کروں۔ مزنہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کے ساتھ کچھ غلط ہو۔ اس کے چچا اور چچا زاد کی نظر اس کی بے تحاشا دولت پر ہے۔ اور اس کا آوارہ چچا زاد اس سے شادی کرنے کی ضد پر ہے۔ اور مزنہ بیچاری بہت پریشان ہے۔ اکیلی لڑکی معاشرے میں بالکل محفوظ نہیں ہے۔ وہ اپنی پریشانی لے کر میرے پاس آئی تھی۔ میں نے اپنے دماغ کے سارے گھوڑے دوڑائے۔ پھر ذہن میں آیا، مزنہ کی شادی کر دی جائے۔ ریڈی میڈ ہزبینڈ ملنا پاسبل نہیں۔ قریبی دوستوں پر نظر ڈالی۔ انشراح کہنے لگی میکائیل بھائی! بہت اچھے ہیں۔ وہ ضرور ہماری مدد کریں گے۔''

شعیب مرزا کہہ رہا تھا اور میکائیل بغور سن رہا تھا۔ وہ یک دم ہی بولا تھا۔

''بہت خوب، انشراح بھابی کو میں اس سے پہلے اچھا نہیں لگا۔ اپنی دوست کی زندگی میں پریشانیاں دیکھیں، ان پریشانیوں سے نجات دلانے کے لیے مجھے اچھا بنا لیا' واہ بھئی!''

''یار میکائیل! یہ وقت مذاق کا نہیں ہے۔ میں اِک مسئلہ حل کروانے آیا ہوں تیرے پاس۔ واقعی میں بہت پریشان ہوں۔'' شعیب نے اس کی مزاحیہ باتوں کو نظر انداز کیا تھا۔

''شعیب! میرے یار، میری زندگی تیرے نام تیری دوستی پر قربان۔ تو نے مشکل وقت میں میری مدد طلب کی ہے۔ وہ دوست ہی کیا...... جو وقت پڑنے پر دوست کے کام نہ آ سکے۔ دیکھ لے بن دیکھے بن سوچے بن سمجھے تیری منہ بولی بہن سے شادی کے لیے ہامی بھر رہا ہوں۔ ہمیشہ دوست ہی رہئیو منہ بولا سالا مت بن جائیو۔ اور لڑکی بھی یعنی تیری منہ بولی بہن بھی نیک، شریف ہو، تجھے تو پتا ہے کہ مجھے ماڈرن لڑکیوں سے چڑ ہے۔'' میکائیل یوسف مسکرا کر رضا مندی والے انداز میں بولا تھا۔

شعیب مرزا نے پُرجوش ہو کر اسے گلے لگا لیا تھا۔

''واہ میرے یار! دل خوش کر دیا۔'' شعیب چہک کر بولا تھا۔

''اوہ! گھر آ کر امی، ابو سے بات کر لینا۔ میں نے آج تک اس لڑکی کو دیکھا نہیں ہے۔ اور اب مجھ پر پورا خاندان پسند کی شادی کا ٹیگ لگانے والا ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنی عزت کی انتہا سے زیادہ فکر کی ہے لیکن تیری وجہ سے ہائے اللہ میری عزت و ناموس سرِ عام بدنام ہو گی۔'' میکائیل اپنی شوخ طبیعت کے باعث شوخی سے بولا تھا۔

''میکائیل ہمیں لوگوں کی جلن و حسد بھری گفتگو پر صبر کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ صبر کرنے والا اللہ کو پسند ہے۔ اللہ پاک سے کوئی حقیقت پوشیدہ نہیں۔ سچ کیا ہے، جھوٹ کیا ہے وہ بہتر جاننے والا ہے۔ بے شک

رب کے یہاں مشکلات میں ساتھ دینے والوں کے لیے بڑا اجروثواب ہے۔'' شعیب مرزا سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا۔

''بے شک میرے یار........'' میکائیل یوسف نے زیرِلب کہا تھا۔

☆☆☆

ان دونوں کے نکاح کا فنکشن تھا۔ شعیب اور انشراح نے مزنہ کا ہر قدم پر ساتھ دیا تھا۔ مزنہ نے بھی ان دونوں پر بھروسا کرتے ہوئے اِک اجنبی سے زندگی بھر کا ناتا جوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ شعیب نے اس شادی کے لیے میکائیل کے ماں باپ کو بہ مشکل راضی کیا تھا۔

مزنہ کی گوری میدے جیسی رنگت پر سرخ رنگ بہت ہی کھل رہا تھا۔ کامدار لہنگے اور سوفٹ میک اپ میں وہ نہایت جاذب نظر اور دلکش لگ رہی تھی۔ میکائیل بلیک شیروانی میں ہینڈسم لگ رہا تھا۔ نکاح کے بعد میکائیل کی مما نے اسے میکائیل کے پہلو میں لا کھڑا کیا تھا۔ فوٹو سیشن جاری تھا۔ مزنہ سادگی میں ہی حسین لگتی تھی۔ اب تو وہ مکمل مشرقی انداز میں دلہن بنی ہوئی تھی۔ شرم و حیا سے اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ رخسار حیا کی سرخی سے مزید گلابی ہو رہے تھے۔

''ماشاء اللہ چاند سورج کی جوڑی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے پہلو میں جچ رہے ہیں۔'' انشراح نے کہا تھا جبھی کسی اور طرف سے ان کی تعریف کے بجائے ان کی کردار کشی کی جا رہی تھی۔

''نہ جانے کب سے چکر چل رہا ہوگا جو یوں اچانک شادی ہو رہی ہے......''

''لڑکی کے ماں، باپ، بہن، بھائی کوئی نہیں دکھ رہا......''

''جن ماں، باپ کی بیٹیاں پسند کی شادی کرتی ہیں تو ان کے والدین کے سر معاشرے میں شرم و ندامت سے جھک جاتے ہیں......''

''ہاں بھئی، بیٹیاں مان اور فخر ہوں تو تب ہی اچھی لگتی ہیں......''

''پسند کی شادی کرنا بری بات نہیں لیکن پسند کی شادی کے نتائج اچھے نہیں ہوتے...... بھئی برے کام کا برا انجام......''

اسٹیج کے اطراف بیٹھے لوگوں کے کڑوے کسیلے جملے مزنہ کے کان میں مسلسل پگھلے ہوئے سیسے کے مانند گھسے جا رہے تھے۔ اس کی خوب صورت براؤن آنکھوں سے اشک ٹپک رہے تھے۔

میکائیل بھی سن رہا تھا بلکہ وہاں موجود سبھی لوگ سن رہے تھے۔

''مزنہ! میں ہوں تمہارے ساتھ...... گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں......'' میکائیل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔ مزنہ کا دل بڑی زور سے دھڑکا تھا۔ اس نے نکاح کے دو بول پڑھتے ہی اپنی حفاظت کا اسے یقین دلا دیا تھا۔ اب اس کے چہرے پر مدھم سی مسکان رقصاں تھی۔

''بھائی! بس اب رخصتی کروائیں، بہت ہو گیا فوٹو سیشن۔ بس اب گھر جانا ہے۔'' میکائیل کو مزنہ کی فکر ہو رہی تھی۔ جبھی اس نے بڑے بھائی کو بلا کر کہا۔

مزنہ، شعیب اور انشراح کی دعاؤں کے سائے تلے رخصت ہو کر میکائیل کے ہمراہ آ گئی تھی۔

☆☆☆

مزنہ کو حجلۂ عروسی میں لایا گیا۔ میکائیل کی کزنز اسے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ مدھم سُروں میں موسیقی بج رہی تھی۔

اِک اجنبی نے یہ کیا کر دیا
احساس دل میں یہ
کیا بھر دیا
ڈور کوئی کھینچے مجھے
تیری اور
دھڑکن دل کی
مچانے لگی ہے شور
جادو یہ کیا کر دیا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

جادو یہ کیا ہو گیا

اسے گانے کے بول بہت اچھے لگ رہے تھے۔ آنکھوں کو موندے دونوں گھٹنوں کو سمیٹے اس پر ہاتھ باندھے، ہاتھوں پر سر ٹکائے وہ بیٹھی تھی۔ پورا کمرا سرخ گلابوں سے سجا اور مہکا ہوا تھا۔ سرخ گلاب کی خوشبو بھی اعصاب پر خوشگوار اثر ڈال رہی تھی۔ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے انہیں تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ دل کی دہلیز پر میٹھی، میٹھی سی خوب صورت سی سوچوں نے دستک دی تھی۔

”السلام علیکم مزنہ جی۔“ میکائیل نے پیار بھرا سلام کیا۔ مزنہ نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔

”مزنہ میں سوچتا تھا کہ جس سے میری شادی ہو گی میں، اس سے فون پر خوب چیٹنگ کروں گا، خوب کالز کروں گا، پارکوں میں ملاقات کروں گا، پتا نہیں تھا یوں اچانک شادی ہو جائے گی۔ اللہ پاک جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ اللہ پاک نے مجھے اس بے راہ روی سے روک لیا، شکر ہے مالک کا۔“ میکائیل یونہی کہے جا رہا تھا۔ تبھی درمیان میں وہ بول پڑی تھی۔

”میری وجہ سے آپ کی خواہشات کی تکمیل ممکن نہ ہو پائی۔“

اس کا لہجہ بھیگا، بھیگا تھا۔

”مزنہ! میرا مقصد تمہاری دل آزاری نہیں تھا۔ پیاری بیوی معاف کر دو...... اور جہاں تک میری خواہشات پوری ہونے کی بات ہو رہی ہے وہ تو میں ضرور پوری کروں گا۔ بیوی تو تم بن گئی ہو۔ تمہیں اب محبوبہ بن کر دکھانا ہے۔ میری پسند میں ڈھل کر، میری چاہتوں میں جی کر...... وعدہ کرو ہم ہزبینڈ وائف بعد میں ہیں' پہلے ہم دوست ہیں۔ تم بنا جھجکے اپنی پرابلمز میرے ساتھ بانٹو گی۔ آج سے ہم ایک دوسرے کے سکھ دکھ کے ساتھی ہیں۔“

مزنہ نے نمناک نگاہوں سے مسکرا کر میکائیل کا پھیلا ہاتھ تھام لیا تھا۔

☆☆☆

ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ

جولائی کے
گرم موسم کا
تروتازہ شمارہ

بنیادی خرابی
دہشت و سیاست کے پیچ و خم سے
گزرتے دہشت انگیز کھیل کا سنسنی خیز
احوال...... ایچ اقبال کے قلم کا کمال

انگارے
دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن
کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا
طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد
چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت
سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت......
عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ
اسماء قادری اور روبینہ رشید کی
سنسنی خیز وولولہ انگیز کاوشیں......

ان کے علاوہ
منظر امام، تنویر ریاض، سلیم انور،
کبیر عباسی، جمال دستی، تمکین رضا
اور عکسیں فاطمہ کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

چینی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے ... محبتیں...
شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں ... کتھائیں

شادی کے اولین دن رات ایک دوسرے کی چاہتوں اور محبتوں میں ڈھلے گزرتے چلے گئے تھے۔ پتا ہی نہ چلا اور مزنہ کو رب العزت کی اِک اور نعمت ملنے کی نوید ملی تو پورا گھر خوشی سے جھوم گیا۔ میکائیل نے اس کا بہت زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا تھا۔ مزنہ اپنے رب کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی۔

سنڈے کو سبھی لان میں بیٹھے چائے اور اسنیکس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ آج مزنہ نے خاص طور پر چائے کے لوازمات کا اہتمام کیا تھا۔ موسم بھی سہانہ تھا، دھوپ میں تپش نہ تھی۔ ہوا میں ہلکی، ہلکی ٹھنڈک تھی۔

مزنہ نے میکائیل کے کہنے پر نیوی بلیو اور وائٹ کنٹراسٹ کا سوٹ زیب تن کیا تھا۔ لائٹ میک اپ میں بالوں کا خوب صورت فاؤنٹین بنائے ہوئے بہت حسین لگ رہی تھی۔

جبھی گیٹ کھلا اور چوکیدار کے پوچھتے، پوچھتے وہ اندر بھی آگئے تھے۔

”مزنہ تم نے یہ کیا حرکت کی ہے؟ پتا تھا ہم آنے والے ہیں۔ تم انتظار نہیں کر سکتی تھیں۔ ہم تمہارے سگے چچا، چچی تمہارے سر پر ماں، باپ کی طرح شفقت بھرا ہاتھ رکھتے۔ کیا تم نے یتیم لاوارثوں کی طرح اکیلے ہی شادی کر لی۔“ صداقت علی، شبانہ اور ابراہیم پاکستان آچکے تھے۔

وہ لوگ مزنہ ولا گئے تھے مگر گھر بند تھا۔ چوکیدار نے بتایا کہ مزنہ میڈم نے شادی کر لی اور وہ گھر بند کر کے چلی گئی ہیں۔ کبھی کبھی یہاں آتی ہیں۔ صداقت علی اسی چوکیدار سے پتا لے کر اب میکائیل کے گھر آگئے تھے۔ گھر میں قدم رکھتے ہی مزنہ کو میکائیل کے پہلو میں بیٹھا دیکھا تھا۔ میکائیل اسے زبردستی کٹلس کھلا رہا تھا۔ مزنہ کو دیکھتے ہی وہ چلانے لگے تھے۔

وہ ان کی گرجدار آواز پر ڈر گئی۔ اس نے فوراً میکائیل کے بازو کو مضبوطی سے پکڑا تھا۔ میکائیل نے اسے تسلی دی تھی۔

”ارے بھائی! یہ شادی ہم سب کی موجودگی میں ہوئی ہے۔ مزنہ تو کہہ رہی تھی کہ جب آپ آئیں گے جب ہی وہ شادی کرے گی۔ لیکن ہمیں جلدی تھی تو ہم نے کر لی شادی۔ سب رشتے دار، دوست، احباب کی موجودگی میں یہ شادی ہوئی ہے۔ مووی، فوٹو سیشن بڑی ہی دھوم دھام سے کی ہے ہم نے اپنے میکائیل کی شادی۔“ اس کے پاپا سب بول رہے تھے۔ ”مزنہ مجھے ایک سپر اسٹور پر دکھی تھی۔ پہلی نظر میں ہی مجھے اپنے میکائیل کے لیے پسند آگئی۔ بہت بار میکائیل کی بہنوں، بھابیوں اور ماں کو مزنہ کے گھر لے کر گیا۔ تب کہیں جا کر اس نیک بچی نے شادی کے لیے ہامی بھری تھی۔“

یوسف رضا خان (میکائیل کے پاپا نے) بڑے خوب صورت انداز میں کہانی سنائی تھی۔ صداقت علی خاموش تھے۔

”مزنہ بیٹا! ہم یہاں پاکستان تمہارے پاس آئے ہیں۔ اب ہم کہاں رہیں گے۔ تم ہمیں گھر کی چابیاں دے دو......“ شبانہ بیگم (مزنہ کی چچی) بناوٹی محبت میں بولی تھیں۔

مزنہ، میکائیل کو دیکھ رہی تھی۔

”مزنہ! چلو ہم بھی چلتے ہیں وہیں دو، چار دن جب تک چچا، چچی ہیں۔ ہم بھی گھر رہ کر آجاتے ہیں...... کچھ کام بھی کرانے ہیں کیوں۔ ٹھیک ہے ناں امی، ابو ہم بھی رہ آتے ہیں ان کے ساتھ۔ جب چچا، چچی چلی جائیں گے ہم واپس آجائیں گے۔“

”ارے وہاں رہ کر کیا کرنا ہے۔ آپ یہاں ہمارے گھر رک جائیں ناں...... جب تک آپ کا دل چاہے اپنا گھر سمجھ کر رہیں۔ ہمیں ذرہ برابر اعتراض نہیں......“ یوسف رضا بولے تھے۔

”نہیں بھائی، دراصل ہمارے یہاں بیٹیوں کے گھر رہنے کا رواج نہیں۔“ صداقت علی خان نے

مکاری سے بات بنائی تھی۔ وہ لوگ باتوں میں مشغول ہوگئے تو مزنہ اٹھ کر کمرے میں آ گئی تھی۔

''انشو! چچا، چچی، ابراہیم یہاں آگئے ہیں میرے گھر......'' مزنہ نے بیڈروم میں آ کر انشراح کو فوراً کال کی تھی۔ وہ خوفزدہ تھی۔

''میکائیل بھائی ہیں تیرے ساتھ۔ تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مزنہ شریکِ حیات مخلص، چاہنے والا، قدر دان، خیال رکھنے والا ہو تو زندگی خوشگوار اور حسین ہو جاتی ہے۔'' انشراح مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

''اللہ پاک شعیب بھائی اور تجھے ہمیشہ خوش رکھے۔ تم نے بہت اچھا ہم سفر تلاش کیا میرے لیے۔ میکائیل بہت اچھے ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ سب گھر والے بھی بہت اچھے ہیں۔ سب نے خوشدلی سے مجھے اپنایا ہے۔ ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ سنو چچا گھر کی چابیاں مانگ رہے تھے۔ میکائیل نے کہا جب تک آپ یہاں ہیں ہم بھی چل کر وہیں رہ لیتے ہیں۔ چچا چچی کے تو چہرے کا رنگ ہی پھیکا پڑ گیا تھا۔ ابراہیم تو مجھے یوں گھور، گھور کر دیکھ رہا تھا جیسے کھا جائے گا......''

''مزنہ! اب تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تیرا ہم سفر تیرے سنگ ہے۔ میکائیل بھائی اپنی عزت کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کریں گے۔ تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' انشراح سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

''انشو! ایک گڈ نیوز ہے......'' مزنہ نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

''ماشاء اللہ مبارکاں، مبارکاں......'' انشراح خوشی سے چہک کر بولی تھی۔

میکائیل نے روم میں آ کر مزنہ کو دیکھا۔ وہ ٹیرس پہ کھڑی کسی سے فون پر بات کرتی نظر آ رہی تھی۔ گلاس ڈور کھولتا میکائیل بھی وہیں آ گیا تھا۔

''مائی لائف! کیا ہو رہا ہے۔'' میکائیل نے محبت سے مخمور لہجے میں کہا۔

''انشراح سے بات کر رہی تھی۔ چچا، چچی کے آنے کا بتا دیا ہے اسے۔'' مزنہ نے دھیرے سے کہا۔

وہ دونوں باتوں میں مشغول تھے کہ میکائیل کی امی بھی وہیں آ گئی تھیں۔

''ارے امی آپ......'' مزنہ، میکائیل کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہی تھی۔ ساس کو دیکھ کر جھینپ سی گئی۔

''میکائیل! بیٹا تم بھی ناں...... تم وہاں نہیں رہو گے مزنہ کو لے کر۔ چابیاں دو ان کو اور چلتا کرو۔ ہمیں مزنہ بہت عزیز ہے۔ اس حال میں اسے ہماری زیادہ ضرورت ہے۔ میں اس کو اس کنڈیشن میں کوئی ٹینشن نہیں دینا چاہتی۔''

ضوباریہ بیگم فکرمندی سے بول رہی تھیں۔

''امی جی! آپ بے فکر رہیں میں مزنہ کا بہت، بہت زیادہ خیال رکھوں گا...... مزنہ کا گھر، کاروبار سب مزنہ کے والد صاحب کی محنتوں کا ثمر ہے، جس پر مزنہ کے چچا اور چچا زاد کا کوئی حق نہیں ہے۔'' میکائیل سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''سب باتیں اپنی جگہ لیکن اگر مزنہ کو ذرا سی بھی ٹینشن ملی تو میں اسی دن اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے آؤں گی۔''

اتنی محبت پر مزنہ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں، ضوباریہ بیگم نے بڑھ کر اس کا ماتھا چوما تھا۔

☆☆☆

تین ماہ ہو چکے تھے۔ ان لوگوں کو رہتے ہوئے بالآخر دونوں نے چچا، چچی کو کافی حد تک نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا یہاں تک کہ کوئی بات بھی نہ کرتا تھا۔ آہستہ، آہستہ شبانہ بیگم کا دل اکتانے لگا تھا۔

''چلو بھئی اپنے گھر...... یہاں کچھ بھی نہیں ملنے والا، تمہاری بھتیجی خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ چالاک بھی ہے۔ شادی کر کے بیٹھ گئی اور اپنی تمام تر جائداد وہ یتیم خانے میں دے چکی ہے...... یہاں رہنے کا کوئی فائدہ

نہیں اب۔'' شبانہ بیگم غصے سے چلا رہی تھیں میکائیل اورمزنہ ہال روم میں بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

وہ اپنی جائداد گھر آفس کا فیصلہ کر چکے تھے اور اب اس گھر کو بھی ٹرسٹ کے حوالے کرنا تھا۔ قانونی کارروائی بھی مکمل ہوچکی تھی، گھر دو دن میں خالی کرنا تھا۔ صداقت علی خان نے زندگی بھر جھوٹ اور دھوکا دہی سے اپنے بڑے بھائی کے پیسے بٹورے تھے لیکن اب میکائیل نے ایسا نہیں ہونے دیا تھا۔

بیزار اور پریشان ہوکر صداقت علی خان اپنی فیملی کے ہمراہ واپس چلے گئے تھے۔ جاتے وقت ان کی آنکھوں میں احساس پشیمانی تھا۔ اور اک بار ہی معافی مانگنے پر مزنہ نے دل سے انہیں معاف کر دیا تھا۔

''زندگی مختصر ہے کیا دلوں میں نفرتیں کدورتیں رکھنا۔'' مزنہ نے یہی سوچا تھا۔

☆☆☆

رمضان المبارک کے بابرکت ماہ کا آغاز ہو چکا تھا۔ صبح شام رب کی رحمت برس رہی تھی۔ مزنہ کے حمل کے آخری ایام چل رہے تھے۔ وہ اب وزن بڑھنے کی وجہ سے اٹھنے بیٹھنے میں میکائیل کا ہاتھ تھاما کرتی تھی۔ زندگی پُرسکون خوشیوں بھری گزر رہی تھی۔ بعض اوقات اسے یہ سب خواب لگتا تھا

''مزنہ! تم اتنی سست عورت ہو۔ پورے رمضان المبارک کا اختتام کرلیا، روز کہتا ہوں شاپنگ پر چلو مگر تم ہر روز ٹالتی رہتی ہوں۔'' میکائیل افطار کے بعد خفت سے بول رہا تھا۔

''مزنہ! بیٹا تمہاری شادی کے بعد پہلی عید ہے، جاؤ خوب اچھی سی تیاری کرو۔ عید سال میں ایک بار آتی ہے۔ خوشیوں کی سوغات اور دلکش لمحات سے بنتی ہے عید، عید کو بھرپور انداز میں مناؤ۔ آج چاند رات ہے جاؤ کچھ تو خریداری کر کے آؤ۔'' ضوباریہ بیگم نے برتن دھوتی مزنہ کے ہاتھ سے صابن لگی پلیٹ لے لی تھی۔

مزنہ ان کی بات پر رونے لگی تھی۔

''امی! اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ہے کہ مجھے آپ جیسے چاہنے والوں کا ساتھ نصیب ہوا۔ میکائیل اور آپ سب گھر والے بہت' بہت اچھے ہیں۔ میرے ماں باپ کی کوئی نیکی میرے آگے آئی ہے جو مجھے اتنے اچھے ہم سفر کے ساتھ اتنی اچھی فیملی بھی ملی ہے۔'' وہ تشکر آمیز لہجے میں بولی۔

''میکائیل! بیٹا میری لاڈلی کو شاپنگ پر لے جاؤ۔ مہندی ہاتھ پاؤں پر ضرور لگوانا چوڑیاں دونوں ہاتھوں میں بھر، بھر کر اپنے ہاتھوں سے پہنا کر لانا۔ عید خوب صورت ہی تب لگتی ہے جب مہندی' چوڑی' سجنا سنگ عید مناؤ۔''

''مما جی! بے فکر رہیں میں خود آپ کی لاڈلی کو سجاؤں گا اپنی محبتوں و چاہتوں کے رنگوں سے۔'' وہ اسے اس کے شانوں سے تھام کر روم میں لے آیا تھا۔ مزنہ نے اس کے دونوں ہاتھوں کو چوما تھا۔ میکائیل نے اسے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔

''میکائیل! یہ چاند رات، یہ عید، یہ پل، یہ ساعت میرے لیے بہت خاص ہیں۔ یہ عید میرے لیے میرے ہم سفر کا ساتھ لائی ہے، من بہت خوش ہے مسرور ہے کہ عید اپنے سجنا کے سنگ منا رہی ہوں۔ عید کی خوشیوں بھری ساعتیں، سجنا کے سنگ مزید حسین اور دلکش ہوگئی ہیں، دو محبت کرنے والے ایک دوجے کا ہاتھ تھام کر جب چاند تکتے ہیں تو چاند گگن پر مسکراتا ہے، عید نام ہے خوشیوں، چاہتوں، محبتوں کا...... میری خوشی، میری چاہت، میری محبت تم ہو شکر ہے میرے پروردگار کا کہ اس نے مجھے اپنی مخلوق میں سے مخلص شخص کا ساتھ دیا ہے...... یہ ساتھ، یہ بندھن اتنا حسین ہے کہ زندگی حسین ہے۔'' مزنہ، میکائیل کے شانے سے ٹکی محبت و چاہت بھرے انداز میں کہہ رہی تھی۔

دور افق پر چاند رات کا چاند مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

ناولٹ

زندگی تو حسین ہے

فوزیہ اشرف

عشرت بیگم نماز فجر سے فارغ ہو کر اپنے.... زور مرہ کے ذکر و اذکار میں مصروف تھیں۔ گاہے بہ گاہے اپنی بیٹی شمعو کو بھی آواز دے دیتیں۔

”شمعو اے شمعو، اب اٹھ بھی جاؤ، نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے۔“

مگر وہ شمعو ہی کیا جو ایک آواز پر اٹھ جائے...... جب لگاتار آوازیں کان میں پڑیں تو آنکھ کھل ہی گئی۔ مگر اٹھنا اور وہ بھی اتنی جلدی ممکن ہی نہیں تھا۔ سو

DOWNLQADED FROM PAKSOCIETY.COM

دوسری جانب کروٹ بدل کر اماں کی آواز کو دبانے کی کوشش کی۔ مطلب تکیہ اٹھا کر کان پر دھرا کہ شاید آواز کان تک نہ پہنچے...... یہ روزانہ کا معمول تھا، یہ اماں ہی کا کام تھا کہ اسے اٹھا کر نماز پڑھوا دیتیں۔ مگر جب بار‘ بار آواز دینے سے ان کے وظائف میں خلل پڑتا‘ وہ یکسوئی نہ رہتی تو وہ بھی عاجز آ کر دو ہنٹر لگا ہی دیا کرتیں۔ آج بات ابھی آوازوں تک ہی تھی کہ شمعو کے کان میں چھن، چھن چھناک کی ایک اور آواز گونجی...... اس سُریلی آواز پر اس کی آنکھیں ایک دم پٹ سے کھل گئیں۔

’’اوہو آج تو صبح ہی صبح خوب صورت موقع ہاتھ لگا۔‘‘ فوراً اٹھ کر جلدی، جلدی دوپٹا نماز کے اسٹائل میں لے کر آنکھوں کو ہاتھوں سے مسل کر نیند کا خمار دور کرتے ہوئے باہر کی جانب دوڑی اور آواز کا تعین کرتے ہوئے سیدھے کچن میں جا کر دم لیا۔

اقصیٰ بھابی صاف ستھرے استری شدہ لباس میں کچن میں موجود تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ اتنی سویرے اشعر کا فیڈر بنانے آئی تھیں کہ اچانک گلاس ہاتھ سے پھسل گیا۔

’’کیا ہوا بھابی؟ میں تو ابھی نماز پڑھ کر دعا ہی مانگ رہی تھی کہ اچانک آواز پر بھاگی کہ پتا نہیں بلی نے تو کچھ نہیں گرا دیا۔‘‘

اقصیٰ بھابی ہکا بکا اس کے ظاہری حلیے اور بیان کے تضاد کو دیکھتی رہ گئی۔ کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وضو وغیرہ کر کے نماز پڑھ کر آ رہی ہے، صرف دوپٹا سر پر لپیٹنے کی کوشش کی گئی تھی وہ بھی بے ڈھنگی...... اقصیٰ تو حیران پریشان کوئی جواب بھی نہ دے پائی۔

’’یا اللہ، یہ منحوس کہاں سے نازل ہو گئی۔‘‘ وہ صرف سوچ ہی پائی۔

’’ارے بھابی یہ والا گلاس توڑ دیا...... اُف اللہ، پتا ہے کتنا مہنگا سیٹ ہے؟ آپ نے لے کے ستیاناس مار دیا۔ یہ واٹر سیٹ تو امی جان نے دبئی سے منگوایا تھا۔ اپنی کسی جاننے والی کے ہاتھ...... اور کل مہمانوں کی آمد پر پہلی دفعہ نکالا گیا تھا۔‘‘

حالانکہ صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ وہ والے گلاس نہیں تھے مگر وہ شمعو ہی کیا جو بات کو اپنی مرضی کا رنگ نہ دے۔

اقصیٰ نے لاکھ کہا کہ بھئی یہ روز مرہ کے عام استعمال کا گلاس تھا جو غلطی سے ٹوٹ گیا۔ مگر شمعو کے ہاتھ کوئی موقع آ جائے اور وہ اس چانس کو مس کر دے یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔

’’اب جلدی سے قرآن پڑھ لوں تاکہ اماں مجھ سے خوش ہوں تو ہی میرے کہنے پر بھابی کی ڈسٹنگ ہو گی ناں......‘‘ یہی سوچ کر شمعو غسل خانے کی طرف چل دی تاکہ وضو کر کے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنائے...... نماز کا وقت تو اس نے ویسے ہی قضا کر دیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کے قرآن پڑھنے کی آواز پچھلے برآمدے میں موجود عشرت بیگم تک پہنچ رہی تھی۔

☆☆☆

’’شمعو جا اٹھ کر اپنی بھابی کا ہاتھ ہی بٹا دے، ناشتا تیار کروا دے، اب آج کل چھٹیوں میں بھی تو کام کو ہاتھ نہیں لگاتی۔‘‘ عشرت بیگم نے بیٹی کو کہا۔

’’اور ذرا اپنی دادی کے کمرے میں بھی جھانک لے... پوچھ لے۔ ابھی ناشتا کریں گی یا صرف چائے لیں گی۔‘‘ شمعو نے برا سا منہ بنایا، ابھی وہ ماں کے پاس آ کر بیٹھی ہی تھی۔ ابھی تو بھابی کے ڈسٹنگ والے منصوبے پر کام ہونا تھا کہ اماں نے کام بتا دیا۔

’’میں تو نہیں جا رہی کچن میں...... برتن توڑے آپ کی بہو اور اب چاہے نام میرا لگ جائے۔‘‘

عشرت بیگم نے سوالیہ نظروں سے شمعو کی طرف دیکھا...... وہ فطرتاً اچھی خاتون تھیں مگر کیا، کیا جائے جہاں شمعو جیسی چلتر نند موجود ہو...... وہاں ان کی اچھائی کیا کر سکتی تھی۔

’’جی اماں سچ کہہ رہی ہوں ابھی بڑ بڑ کر رہی تھیں کچن میں، ساتھ ہی گلاس اٹھا کر دیوار پر دے مارا...... اب بھلا اپنے بچے کا فیڈر تو خود ہی بنانا تھا ناں...... اب آج اسد بھائی تو نائٹ ڈیوٹی پر تھے تو

مہارانی صاحبہ کو خود فیڈر جو بنانا پڑا۔“ حالانکہ یہ مبالغہ تھا۔ صرف ایک یا دو بار اقصیٰ کی بیماری میں اسد نے فیڈر بنا کر اشعر کو دیا تھا اور اس شمعو نے نمک مرچ لگا کر سارے عالم میں نشر کر دیا تھا۔

”سچ کہہ رہی ہوں اماں......“ شمعو نے عشرت بیگم کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھ کر کہا۔ ”چاہے آپ ابھی جا کر ڈسٹ بن میں گلاس کے ٹکڑے دیکھ لیں، جو میں سیٹ کر آ رہی ہوں۔“ شمعو نے مبالغے کی حد کراس کرتے ہوئے کہا۔

عشرت بیگم نے ہاتھ سے اسے چپ ہونے کا اشارہ کیا اور تسبیح ختم کر کے گھر کے چاروں کونوں اور اطراف کا تصور کر کے پھونک ماری۔

”بیٹا بری بات...... بلاوجہ بات کو بڑھانا اچھی عادت نہیں۔“

”سچ کہہ رہی ہوں، امی جان۔“ شمعو فوراً جلدی، جلدی آنکھیں جھپک کر بولی۔ جیسے آنکھوں کی نمی کنٹرول کر رہی ہو۔

”چلو خیر چھوڑو...... میں دیکھ لیتی ہوں، تم ذرا اپنی دادی کے کمرے میں جھانک لو...... انہیں کسی چیز کی ضرورت نہ ہو۔“ عشرت بیگم دوٹوک انداز میں کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”ہونہہ، لوگوں کی امائیں تو ہر وقت اپنے بچوں پر واری صدقے جاتی ہیں مگر یہ ایک اپنی اماں جان، اُف توبہ...! ذرا جو اپنی سگی اولاد کو لفٹ کروا دیں یا ان کا کہا سچ مانیں۔“ وہ منہ بناتی ہوئی اٹھ کر دادی کے کمرے کی طرف بڑھی۔

”السلام علیکم! دادی جان......“

”وعلیکم السلام...... جیتی رہو میری بچی......“

جہاں آرا خاتون نے شفقت سے جواب دیا۔ انہیں اپنی یہ پوتی تمام تر خامیوں کے باوجود بہت پیاری تھی۔ یہ اور بات کہ اکثر باتوں، باتوں میں وہ کوشش کرتی تھیں کہ شمعو اپنی عادت واطوار درست کر لے۔

”ماں کیا کر رہی ہے تمہاری؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ابھی، ابھی کچن میں گئی ہیں۔“ شمعو نے جواب دیا۔

”بری بات بیٹا، اب تو چھٹیاں ہیں، تم خود کچن دیکھ لیا کرو ناں تاکہ ماں کو بھی کچھ سکون ہو۔“

”جی اچھا، آئیں دادی جان باہر برآمدے میں چلتے ہیں بڑی اچھی ہوا آ رہی ہے۔“

”پہلے میری کنگھی تو کرو...... لگتا ہے تم نے تو اپنے بال بھی نہیں سنوارے۔ بیٹا صبح، صبح ہر لحاظ سے انسان کو فریش ہونا چاہیے۔ صرف منہ دھونے یا دانت صاف کرنے کی بات نہیں۔ بندہ کنگھی چوٹی کرے، ہو سکے تو لباس بھی بدل لے۔ اور اگر گھر کے کام اس کے ذمے ہیں تو لباس فارغ ہو کر بدل لے...... مگر کنگھی تو لازمی ہے ناں...... یہ کیا کہ سر جھاڑ منہ پھاڑ ناشتا کرنے بیٹھ گئے۔ اس طرح نہ خود کو اچھا لگتا ہے نہ دوسرے لوگوں کو...... اپنی بھابی ہی سے کچھ اچھی باتیں سیکھ لو۔“ دادی کا اشارہ اقصیٰ کی طرف تھا۔

شمعو نے بہ مشکل اپنی جمائی کو روکا...... کیونکہ اگر دادی صبح صبح جمائیاں لیتا دیکھ لیتیں تو ایک اور لیکچر شروع ہو جانا تھا۔ اب اس نے کنگھا اٹھا ہی لیا تھا کہ اس کے بغیر اب کوئی چارہ نہیں تھا۔

”اوئی اللہ بال نوچو... گی کیا...... کتنی بار کہا ہے کہ دوسرے کا کام محبت، پیار کے ساتھ کیا کرو...... نرم ہاتھ لگایا کرو......“ دادی نے قدرے ناگواری سے کہا...... شمعو کے چہرے کے زاویے بگڑنے لگے۔

”سب میرے ہی پیچھے پڑے رہتے ہیں، پتا نہیں کیا مصیبت ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔

☆☆☆

یہ تھا چوہدری شہریار کا کنبہ...... جن کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑے بیٹے وقار کی شادی انہوں نے بیگم کی بھانجی کے ساتھ کی تھی۔ جو شادی کے بعد کافی عرصہ ان کے ساتھ رہنے کے بعد میاں کا ٹرانسفر ملتان ہونے کی وجہ سے وہاں ہی شفٹ ہو گئی تھی۔

دوسرے نمبر پر ان کی بیٹی ردا تھی جو شادی ہو کر کوئٹہ جا بسی تھی۔ اب کبھی کبھار ہی لاہور کا چکر لگاتی

تھی۔ تیسرے نمبر پر اسد تھا۔ جس کی شادی انہوں نے ردا کے ساتھ، ساتھ ہی کی تھی۔ ایک بیٹی رخصت کی اور اپنے دوست کی بیٹی اقصیٰ کو بیٹی بنا کر گھر لے آئے، اسد مقامی بینک میں جاب کرتا تھا۔ گزر بسر اچھے سے ہو جاتی تھی۔

خود شہر یار خاں اپنا پلاسٹک کے برتنوں کا بزنس خوش اسلوبی سے چلا رہے تھے۔ ان کی آخری اولاد شمعو تھی جو پڑھائی میں دلچسپی نہ ہونے کے باعث... بہ مشکل مر، مر کر ایف اے کرنے کے بعد ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھا رہی تھی اور ساتھ ہی سب کی جان عذاب میں ڈالنے کا کام بھی خوش اسلوبی کے ساتھ نبھائے ہوئے تھی۔

☆☆☆

اقصیٰ سبزی کی ٹوکری لے کر ساس کے پاس ہی آ بیٹھی۔ مگر یہ کیا کہ آج انہوں نے سبزی کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ بلکہ بہانے سے وہاں سے ہی اٹھ گئیں۔ حالانکہ روزانہ سبزی کاٹنے کا کام تو زیادہ تر عشرت بیگم خود ہی کر دیا کرتی تھیں۔ مگر آج اگرچہ عشرت بیگم نے منہ سے تو کچھ نہ کہا تھا مگر اطوار کچھ بدلے، بدلے سے تھے۔

”ہونہہ، اچھا ہوا میں نے خود صبح ڈسٹ بن میں گلاس کے ٹکڑے دیکھ لیے، ورنہ میں تو سمجھ رہی تھی کہ شمعو جھوٹ بول رہی ہے، منہ کی کتنی میٹھی بنتی ہے مگر ڈھٹائی تو دیکھو، جان بوجھ کر نقصان کر دیا اور نواب زادی کی نظر میں کوئی بات ہی نہیں...... بنائے اب خود ہی سبزی کرے گھر کا سارا کام، کون سا اس کی ماں نے نوکرانی ساتھ بھجوائی ہے۔“

تھوڑی دیر اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد عشرت بیگم، ساس کے پاس جا بیٹھیں، وقت ان کا بھی نہیں کٹ رہا تھا۔ کام کی عادت جو تھی پھر آخر کار اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئیں، الماری کھول کر کپڑے درست کر کے رکھنے شروع کر دیے۔ آخر وقت تو گزارنا تھا۔

”دیکھوں تو سہی اقصیٰ کیا کر رہی ہے۔“ دراصل جن کو کام کی عادت ہو وہ بیٹھ نہیں سکتے۔ عشرت بیگم کو تو بے وقت سونے کا مرض بھی نہیں تھا۔

”بس کچن سے پانی پی کر واپس آ جاؤں گی، میں کون سا بہو رانی کی مدد کروانے لگی ہوں۔“ خود کو سمجھاتے، سمجھاتے وہ کچن تک پہنچ گئیں...... وہاں اشعر کو پرام میں لیٹے دیکھ کر یک دم دل کو کچھ ہوا۔ جلدی سے آگے بڑھ کر گود میں بھر لیا۔

”اسے یہاں کیوں لے کر آئیں تم اتنی گرمی میں......؟“ انہوں نے بہو سے آنکھ چراتے ہوئے کہا۔

”تو اور کیا کرتی ابھی تھوڑی دیر میں ابو اور اسد کھانے کے لیے آ جائیں گے، یہ چپ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ دادو کے کمرے میں بھی لے کر گئی تھی میں...... مگر شمعو نے باہر سے ہی کہہ دیا کہ وہ آرام کر رہی ہیں اور اس کے اپنے سر میں درد ہے۔ اس لیے فی الحال اشعر کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔“ اقصیٰ نے تفصیل سے جواب دیا۔

”اور یہ پٹی کیوں باندھ لی تم نے؟“ عشرت بیگم کی نظر اقصیٰ کی انگلی پر پڑی۔

”کچھ نہیں امی جان، صبح اچانک گلاس ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا تو بکھرے ہوئے شیشے اٹھاتے، اٹھاتے کانچ انگلی میں چبھ گیا۔“

عشرت بیگم کو شمعو پر ایک دم تاؤ آیا۔ ”میں بھی ناں شمعو کی باتوں میں آ جاتی ہوں...... پتا بھی ہے کہ اس کی عادت کا...... اب بیچاری اقصیٰ کب سے بچے کے ساتھ ہلکان ہو رہی ہے۔“ ورنہ پہلے تو جب تک عشرت بیگم سبزی بناتیں، اتنی دیر میں اقصیٰ اشعر کو نہلا دھلا کر گھر کا پھیلاوا بھی سمیٹ کر برتن دھو دیتی۔ باقی گھر کی صفائی کے لیے کام والی آتی تھی۔ اس کے آنے میں اکثر دیر سویر ہو جاتی تھی۔

”میں لے جاتی ہوں اشعر کو...... تم کھانا تیار کر لو...... برتن سارے اکٹھے کر دینا، آج شمعو سے دھلواتی ہوں۔“

”بس سالن تو تقریباً تیار ہے، سلاد بھی بنا کر فریج میں رکھ دیا ہے، بس اب رائتہ اور روٹیاں بنا کر کچھ کباب فرائی کر لیتی ہوں، ابو جان کل کہہ رہے تھے

کہ کیا آج کل کبابوں کی ہڑتال ہے؟'' اقصیٰ نے سلیب سے فالتو سامان سمیٹتے ہوئے کہا۔

عشرت بیگم اشعر کو اٹھائے، اٹھائے کچن سے نکل آئیں۔

☆☆☆

''کیا مصیبت ہے، آج تو کھانا بھی مجھے ہی پکانا پڑے گا۔ یہ اقصیٰ بھابی کو بھی آج ہی بخار چڑھنا تھا، جب امی گھر پر نہیں..... چلو چکن کڑھائی ہی بنالیتی ہوں، آسانی سے بن جائے گی، سبزی وغیرہ تو بنانے میں ہی اتنا ٹائم لگ جاتا ہے۔'' انہی سوچوں میں گم شمعو کو دھیان ہی نہ رہا کہ چائے بھی چولھے پر دھری ہے۔ سوں، سوں کی آواز پر چونک کر ساس پین اٹھایا مگراب گندے چولھے کو دیکھ کر منہ بن گیا۔ جو کہ چائے سے بھرا ہوا تھا۔

''چلو جی اب اس کو بھی پہلے صاف کرنا پڑے گا۔ ورنہ چائے جل کر ساتھ چمٹ جائے گی تو مزید مصیبت گلے پڑ جائے گی۔''

مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق منہ بنا، بنا کر چولھا صاف کیا۔ اتنے میں چائے ٹھنڈی ہوگئی مگر شمعو نے اپنی دُھن میں اسی طرح کپ بھرے اور لے گئی۔

''اوئی اللہ..... ! یہ چائے کیا آج ٹھنڈے چولھے پر پکائی ہے؟ اس سے تو شربت بھی تھوڑا گرم ہی ہوتا ہے۔'' جہاں آرا بیگم نے گھونٹ بھرتے ہی کہا۔

''کوئی ذائقہ نہ سواد.....'' انہوں نے ایک گھونٹ بھر کر ہی کپ واپس ٹرے میں رکھ دیا۔

''اب میں بار، بار تو بنا کر دینے سے رہی ان بڑی بی کو۔'' شمعو منہ میں بڑ، بڑ کرتی اپنی چائے ایک سانس میں چڑھا کر ٹرے اٹھا کر کچن کی طرف روانہ ہوئی۔ مگر یہ کیا کہ راستے میں پاؤں رپٹ جانے سے خود تو جو گری سو گری ٹرے میں رکھے برتن بھی سارے برآمدے میں بکھر گئے۔ کپ ٹوٹنے کے ساتھ، ساتھ دادی کی بچی ہوئی چائے بھی برآمدے میں نقش و نگار بنانے لگی۔

اقصیٰ گھبرا کر کمرے سے نکل آئی۔

''کیا ہوا شمعو.....؟'' شمعو نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔

''کچھ نہیں ہوا..... آپ کو کیا آپ تو صبح سے کمرے میں بند ہیں۔'' شمعو نے بدتمیزی سے کہا۔

''اوئی لڑکی کچھ شرم کر..... وہ صبح سے بخار میں پڑی ہے۔'' دادو نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''وہ تو پھر بھی بیماری آزاری میں گھر بھی دیکھ ہی لیتی ہے۔ یہ تم جو ٹھنڈی چائے بنا کر اچھل کود کرتی پھر رہی ہو، اپنی بات کرو۔''

''اُف..... یہ دادی بھی ناں.....'' شمعو کا دل چاہا کہ دیوار سے سر ٹکرانا شروع کر دے۔ ''ان لوگوں نے مل کر بھابی کو سر چڑھایا ہوا ہے۔''

''بھابی میرے تو اب پاؤں میں موچ آگئی ہے، کھانا وانا میں تو نہیں پکاؤں گی، بھائی کو فون کریں کہ آتے ہوئے بازار سے کچھ لے آئیں۔'' شمعو نے مصنوعی لنگڑاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ اور ہائے وائے کرتی ہوئی کمرے میں جا گھسی۔

اب برتن اٹھا کر برآمدہ تو اقصیٰ کو ہی صاف کرنا تھا۔ چاہے طبیعت جیسی بھی ہو۔

☆☆☆

''امی، میں ان چھٹیوں میں ردا آپی کے پاس کوئٹہ چلی جاؤں؟ تھوڑی سیر ہی ہو جائے گی۔'' شمعو نے بڑے لاڈ بھرے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں کوئی ضرورت نہیں۔'' عشرت بیگم نے فٹ سے انکار کر دیا۔ انہیں ردا کی سسرال کی فکر تھی اور وہ شمعو کے انداز و اطوار سے بھی خوف واقف تھیں۔

''پتا نہیں یہ جو اتنی بدتمیز ہے کب سدھرے گی۔'' وہ دل ہی دل میں سوچنے لگیں۔

منع تو انہوں نے کر دیا کوئٹہ جانے سے..... مگر وہ شمعو ہی کیا جو ایک بار کا کہا مان جائے۔ اگلے دو روز تک تو ماں سے ہی دبی زبان سے کہتی رہی۔ پھر مطالبہ باپ تک پہنچا دیا۔

''چلو جانے دو کوئی بات نہیں تھوڑا گھوم پھر آئے

گی، اس میں کوئی حرج نہیں......ویسے بھی وہ کون سا کہیں جاتی ہے۔'' شہریار صاحب نے بیگم کو رام کرنے کی کوشش کی۔

''آپ کو کیا معلوم سسرال میں رہنے کی باریکیاں......میں تو اسے ہرگز نہیں جانے دوں گی کوئٹہ......'' عشرت بیگم نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔

''چلو پھر وقار کے پاس ملتان ہی جانے دو۔'' تم شہریار صاحب نے درمیانی راہ نکالی۔ تھوڑی سی ردوکد کے بعد عشرت بیگم بھی ملتان کے لیے رضامند ہو ہی گئیں۔

''ہونہہ سوچا تھا کہ گرمیاں مزے سے گزاروں گی کوئٹہ میں......مگر یہ اماں بھی ناں، ملتان کی گرمی میں سڑائیں گی مجھے......مگر چلو کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔'' وہ خوشی، خوشی ملتان جانے کی تیاریوں میں لگ گئی۔

☆☆☆

''یہ تم نے کیا چکر چلایا کہ مصیبت لاہور سے نکال کر ملتان کی طرف روانہ کردی۔'' ناز نے اقصیٰ کو فون کھڑکایا۔

''میری اتنی جرأت کہاں کہ کوئی چکر چلا سکوں بس آپ ہی آپ چکر چل گیا۔ چلیں اب آپ بھی ذرا اپنی نند کو بھگت لیں۔'' اقصیٰ کا لہجہ خوشگوار تھا۔

''وہ تو خیر اب دیکھنا ہی ہے جب مصیبت سر پہ آپڑی ہے تو......'' ناز کا میاں بھی ذرا سخت مزاج کا تھا۔ اپنے گھر والوں کے مقابلے میں بیوی کو اہمیت نہیں دینے والا۔ اس لیے وہ جائز ہی فکرمند تھیں۔ آج صبح ہی وقار نے ناشتا کرتے ہوئے انہیں بتایا تھا کہ وہ آج شام چار بجے کے قریب شمعو کو پک کرتے ہوئے آئیں گے، ساتھ ہی انہوں نے سخت لہجے میں باور کروادیا کہ ''جب تک میری بہن یہاں ہے مجھے گھر میں کوئی ڈراما چلتا نظر نہ آئے جیسا کہ تم لوگوں کی عادت ہوتی ہے، ذرا ذرا سی بات پہ دنگا فساد شروع کرنا۔ یاد رکھنا وہ چند دن کے لیے آرہی ہے، گھر میں کسی بھی قسم کی کوئی بدمزگی نہیں ہونی چاہیے۔'' اب ناز بھابی کیا کرسکتی تھیں۔ ویسے بھی وہ خوش مزاج خاتون تھیں۔ بے انتہا نفیس طبیعت کی مالک......بلاوجہ کا جھگڑا تو انہیں خود بھی پسند نہیں تھا۔ ان کا بیٹا خرم سکستھ کلاس میں تھا۔ اس کے بعد دو جڑواں بیٹیاں عدن اور انمول تیسری میں تھیں۔

☆☆☆

''السلام علیکم بھابی!''

''وعلیکم السلام!'' انہوں نے پیار سے سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے گلے لگایا۔ خرم، نے ادب سے پھپو کو سلام کیا۔ انمول اور عدن بھاگ کر شمعو سے لپٹ گئیں۔

ناز نے کولڈ ڈرنک سے سب کی تواضع کی، تھوڑی دیر بعد چائے کے ساتھ خاصے لوازمات بھی لا رکھے اور اصرار کرکے ہر چیز شمعو کو پیش کرتی رہیں۔

''اس کے دماغ میں کچھ برا نہیں چل پڑے۔ آتے کے ساتھ ہی خوش ہوگئی۔ تو شاید باقی ماندہ دن بھی اچھے گزر جائیں گے۔'' مگر یہ ناز بھابی کی سوچ تھی۔ جس کے ساتھ شمعو کا متفق ہونا ضروری نہیں تھا۔

رات کے کھانے کے بعد شمعو نے ناز کے حوالے وہ تحائف کیے جو عشرت بیگم نے بھجوائے تھے۔ بچوں کے اچھے مہنگے والے کپڑے تھے، وقار کے لیے اس کا فیورٹ پرفیوم تھا۔ ناز کے لیے انہوں نے بہت خوب صورت ڈیزائنر سوٹ خریدا تھا۔ (جو کہ شمعو نے اپنی الماری میں چھپا کر دوسرا سوٹ پیک کرلیا تھا جو اس نے خود پچھلے سال جاتی گرمیوں میں لیا تھا اگر پتا بھی چل گیا امی کو کہوں گی کہ غلطی سے ایسا ہوگیا۔ ویسے بھی ناز بھابی، امی سے کون سا سوٹ کی پڑتال کروائیں گی)

''شکریہ شمعو! ویسے یہ تو تم نے بلاوجہ ہی اتنا تکلف کیا۔ اس سب کی کیا ضرورت تھی، تم آگئیں یہ ہی کافی ہے۔'' (ہاں بہت کافی ہے میرے لیے)

''کوئی بات نہیں بھابی۔'' (ہونہہ، امی نے لے دیے ورنہ میں کہاں چاہتی تھی اتنا پیسہ ضائع کرنا)

☆☆☆

دو چار دن تو راوی نے چین ہی چین لکھا مگر پھر شمعو کو گھر کا سکون کھٹکنے لگا۔

''یہ ناز بھابی تو سارا دن فارغ ہی رہتی ہیں، گھر کی صفائی ستھرائی اور کپڑوں کی دھلائی تو ماسی کر جاتی ہے، کھانا پکانا کون سا مشکل کام ہے۔ سارا دن ویلی نکمی میرے بھائی کی کمائی پر عیش کرنے کے سوا کوئی کام نہیں...... ملتان سیٹ ہوگئیں یہ نہیں کہ گھر رہ کر ساس، سسر کی خدمت کرتیں۔ اس سے اچھی تو اقصیٰ بھابی ہیں کم از کم گھر والوں کے لیے کام کاج تو کرتی ہیں۔'' یہاں شمعو کو ناز بھابی کی شادی کے وہ ابتدائی آٹھ سال بھول گئے جو انہوں نے ساس، سسر کی خدمت کرتے ہوئے گھن چکر بن کر گزارے تھے۔ ان دنوں ابھی ایسی خوشحالی بھی نہیں تھی کہ کام کاج کے لیے ملازمہ رکھی جاتی تو ناز بھابی اور ردا آپی سارا دن خود ہی کام کاج میں مصروف رہا کرتی تھیں۔

''خیر دیکھ لوں گی' میرا نام بھی شمعو ہے۔''

☆☆☆

''یار ذرا جلدی سے ملک شیک بنا دو، باقر صاحب آئے ہیں۔'' وقار نے ڈرائنگ روم میں جاتے، جاتے کہا۔

'' جلدی سے بنا دوں' یہ نہ ہو لائٹ چلی جائے۔'' ناز فوراً ہی اٹھ گئیں۔ جلدی، جلدی آم کاٹ کر بلینڈر جگ میں ڈالے چینی، دودھ ڈال کر ابھی فارغ بھی نہ ہوئی تھیں کہ وقار دوبارہ کچن کے دروازے میں نمودار ہوئے۔

''ذرا جلدی سے وہ فائل دو جو کل تمہیں رکھنے کو دی تھی۔ جلدی کرو۔''

''شمعو ذرا گرائنڈ کا بٹن دبا کر شیک تیار کر دو، لائٹ جانے والی ہے، میں فائل دے کر آئی، سب کچھ اندر ڈال دیا ہے، صرف بٹن دبانا ہے۔'' ناز کمرے میں جاتے ہوئے بولیں۔

شمعو نے بھاگ کر کچن کا فاصلہ طے کیا مگر گرائنڈر کا بٹن دبانے سے پہلے چینی کا اضافہ کرنا نہ بھولی۔

غزل

ساون رت کی رات ہو دشت میں دیپ جلے
تجھ سے میری بات ہو دشت میں دیپ جلے
صحراؤں کی پیاس بجھے ان آنکھوں سے
آنکھوں سے برسات ہو دشت میں دیپ جلے
ساری دنیا دیکھ کے ہم کو جل جائے
ہاتھ میں تیرا ہاتھ ہو دشت میں دیپ جلے
سوچوں کے اوراق پہ مہکیں تحریریں
ہاتھوں میں ہو ہاتھ تو ہو دشت میں دیپ جلے
مر جاؤں تو تمثیلہ یہ خواہش ہے اپنی
لب پہ تیری ذات ہو دشت میں دیپ جلے

کاوش: تمثیلہ لطیف، لاہور

''یہ ملک شیک تھا یا چینی شیک......؟'' وقار نے ناز کو کڑی نظروں سے گھورا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' ناز نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

''خود چیک کر لو......'' وقار نے ٹرے لاؤنج میں پڑی میز پر پٹخی اور کمرے کی طرف مڑ گئے۔

ناز نے جلدی سے جگ میں سے ملک شیک چکھا۔ ''اُف اتنی چینی؟ میں نے تو تھوڑی سی ڈالی تھی۔'' ناز بھابی پریشان ہو کر بولیں۔

''کیا مطلب ہے آپ کا تھوڑی سی ڈالی تھی۔ میں نے تو صرف بٹن دبا کر شیک تیار کیا ہے، ناز بھابی۔'' شمعو نے ٹی وی کا چینل بدلتے ہوئے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔ ناز نے یک دم لب بھینچ لیے۔ ساری بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اب کچھ کہنے کا مطلب شمعو کا والیوم بلند کرنا تھا اور اس کا والیوم بلند کرنے کا مطلب تھا، وقار کا والیوم بند کرنا...... تپ چڑھ کر کنٹرول کرنا کتنا مشکل کام ہے، یہ ناز کو اب پتا چلا...... مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کتنی بار......

☆☆☆

''اُف آج تو خوب سوئی میں۔'' ناز کے سر میں درد تھا۔ ساتھ ہلکا ٹمپریچر بھی تھا۔ دوائی کھا کر سوئی تو کچھ ہوش

ہی نہیں رہا...... شاید دوائی میں بھی کچھ نیند کا اثر تھا۔

"شمعو ایک کپ چائے بنا کر ساتھ دو رسک دے دو پلیز......" ناز نے لاؤنج کے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "چائے پی کر تھوڑا فریش ہو لوں تو کھانا پکانے کا سوچتی ہوں۔"

"چائے؟ مگر بھابی دودھ کہاں سے لوں......؟" شمعو نے معصومیت کے ساتھ ریکارڈ توڑتے ہوئے کہا۔

"ارے ابھی صبح ہی تو تین کلو دودھ بوائل کر کے رکھا تھا۔ کچن میں چولھے پر ہی رکھا ہوگا، لیٹنے سے پہلے تو گرم کیا تھا، تم کچن میں جاؤ گی تو نظر آ جائے گا۔"

"جب آپ کچن میں جائیں گی تو آپ کو بھی نظر آ جائے گا جو ہوا ہے۔"

"کیوں، کیا ہوا ہے؟" ناز نے ایک دم اٹھ کر شمعو کو مشکوک نظروں سے گھورا۔

"آپ نے دودھ کے نیچے چولھا تو بند کیا ہی نہیں تھا۔ سارا دودھ ضائع ہو گیا، کچھ ابل گیا کچھ جل گیا۔ پتیلی بھی ساری جل کر کالی ہو گئی...... ساتھ ہی چولھے کا بھی بیڑا غرق ہو گیا۔ وہ تو میں پانی پینے کمرے سے نکلی تو پتا چلا......"

"مگر میں تو چولھا بند کر کے دودھ پر چھلنی رکھ کر...... پھر جا کر لیٹی تھی۔"

"تو میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟" شمعو نے بگڑ کر کہا۔ ناز نے کچن میں جا کر چولھے اور پتیلی کا حشر دیکھا تو چکرا کر گرتے، گرتے بچی......

"یا اللہ اسے کون صاف کرے گا...... کام والی کو ہی دینی پڑے گی یہ پتیلی...... ورنہ تو یہ صاف ہونے سے رہی۔" کالی بھجنگ پتیلی ناز کو اپنا منہ چڑاتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"مگر میں نے خود چولھا بند کیا تھا۔ یہ ہو نہ ہو شمعو کا کام ہے، اب دودھ کہاں سے لاؤں...... وقار آ کر چائے پئیں گے۔ وہ تو پیکٹ کے دودھ کی چائے پیتے ہی نہیں...... یا اللہ کیا کروں......" ناز اپنی تکلیف بھول کر پریشانی میں پڑ گئی۔

☆☆☆

"بھابی چائے کا ذائقہ تو بالکل اپنے گھر کے دودھ کی طرح کا ہی ہے۔ لگتا ہے ہمارا دودھ والا ہی مسز فاروقی کے ہاں بھی دودھ سپلائی کرتا ہے۔" شمعو نے مسکراتے ہوئے بھائی کی طرف دیکھ کر کہا۔

ناز کا دل چاہا کہ گرم چائے کا کپ شمعو کے منہ پر دے مارے۔

"کیوں کیا ہوا؟" وقار نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"اوہو...... اچھا آپ کو تو پتا ہی نہیں کہ آج کیا ہوا...... آج تو بھابی نے فون کر کے مسز فاروقی کے ہاں سے دودھ منگوایا چائے کے لیے...... اور بچوں کو شوار ما بنا کر دیا تاکہ وہ دودھ کو بھول جائیں، آپ بھی میرا خیال ہے آج رات شیک نہ ہی مانگیں۔ ورنہ ڈبے کے دودھ کا ہی ملے گا۔" شمعو نے بڑے ٹھنڈے انداز میں گرم، گرم خبر سنائی۔

"کیوں، آج دودھ والا دودھ نہیں دے کر گیا؟" وقار نے پوچھا۔

"وہ تو دے کر گیا تھا مگر بھابی ہی سو گئیں چولھے پر رکھ کر......" شمعو نے مسکرا کر کہا۔

ناز کا دل چاہا جوتے مار، مار کر شمعو کا چہرہ ہی بگاڑ دے۔

"میں...... وہ نہیں مگر...... میں نے تو چولھا بند کیا تھا اور پھر میڈیسن لے کر سوئی تھی۔" ناز نے پریشانی سے میاں کو دیکھا۔

"تو پھر دوبارہ چولھا کون جلا گیا؟ کیا اب اس گھر میں جنات آ گئے۔" وقار نے تلخی سے کہا۔

شمعو نے اچانک بھاں، بھاں کر کے رونا شروع کر دیا تھا۔ "بھابی کا اشارہ میری طرف ہی ہوگا۔ کیا میں اتنی پاگل ہوں کہ چولھا جلا کر دودھ ضائع کروں گی۔ ساتھ پتیلی بھی...... جو اب بھابی نے کام والی کو دے بھی دی ہے، بجائے مانجھنے کے۔"

اس نے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک دی۔

وقار نے غصے سے بیوی کو گھورا اور کپ ٹرے میں پٹخ کر

بائیک کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔

اب روتی ہوئی شمعو کو چپ کروانا اور رات گئے گھر واپسی پر میاں کا موڈ بحال کرنا بیچاری ناز ہی کی ذمے داری تھی۔

☆☆☆

اگلے ہی دن ناز نے اپنی ماں کو فون پر روتے ہوئے ساری بات بتائی۔

''اچھا سوچتے ہیں کوئی حل اس کا......'' ان کی اماں نے تسلی دلاسا دے کر فون بند کر دیا۔

''آج دفتر میں خالہ جان کا فون آیا تھا۔'' وقار نے پانی کا گلاس تھام کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کہہ رہی تھیں کہ طبیعت کچھ پریشان سی ہے تو تمہیں اور بچوں کو بھجوا دوں۔ دراصل باتھ روم میں سلپ ہو جانے کی وجہ سے ان کے پاؤں میں درد ہے تو خود ان کا آنا مشکل ہے اور وہ گھبرا رہی ہیں؟''

''زیادہ تکلیف تو نہیں؟'' ناز نے پریشانی ظاہر کی۔

''نہیں، اب ٹھیک ہیں کافی...... ویسے بچوں کی تو چھٹیاں ہی ہیں میرا خیال ہے تم چند دن کے لیے ہو آؤ...... شمعو کو بھی تم ساتھ ہی لے جاؤ...... یہ یہاں اکیلی کیا کرے گی۔'' وقار نے ناز کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

''امی جان سے تو پوچھ لیں۔ وہ شمعو کو بھلا کہاں کہیں جانے دیتی ہیں۔ یہاں بھی پتا نہیں کیسے بھیجا۔'' ناز نے امید کا دامن تھامتے ہوئے کہا۔

''پوچھ لوں گا میں خود ہی...... تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وقار نے بیوی کو تیز نظروں سے گھورا۔

اب نہ جانے ناز کی دعاؤں میں اثر تھا یا شمعو کا مقدر کہ عشرت بیگم نے شمعو کو رحیم یار خاں بھجوانے کی حامی ہی نہ بھری اور ناچار شمعو کو گھر واپسی کے لیے تیار ہونا پڑا۔

☆☆☆

''اے بیٹا وقار اور بہو تو ٹھیک تھے ناں...... بچوں کا کیا حال تھا؟'' جہاں آرا بیگم تو تقریباً روزانہ ہی پوچھ، پوچھ کر بے حال ہوئی جاتیں۔ ایک ہی سوال کو دس بار پوچھ کر بھی ان کا جی نہیں بھرتا تھا۔

''بہو نے تو کافی دیر ہوگئی یہاں کا چکر ہی نہیں لگایا...... تقریباً چھ ماہ تو ہو ہی گئے۔''

''جی ان کا میکا یہاں ہوتا تو پھر دیکھتیں آپ...... کیسے یہاں کے چکر پہ چکر لگتے...... اب آج کل میں رحیم یار خاں کا مقدر جگانے جائیں گی آپ کی پوت بہو صاحبہ...... ایک آپ ہیں کہ ان ہی کے گُن گاتی رہتی ہیں، وہ تو سم والوں نے نئے، نئے پیکج فراہم کر دیے ہیں تو ناز بھابی آپ لوگوں کو مسکا لگاتی رہتی ہیں فون پر...... ورنہ آپ اس سے بھی جاتیں۔''

''تم تو ہر وقت کریلے ہی چباتی رہتی ہو...... جب بھی بولنا الٹا ہی بولنا...... کبھی کوئی مثبت بات بھی سوچ لیا کرو...... پتا نہیں تمہارے اندر اتنا بغض و کینہ کیسے بھر گیا ہے جو صاف ہونے پر ہی نہیں آتا۔'' عشرت بیگم نے بیٹی کو لتاڑا تھا۔

☆☆☆

''شمعو کے کل کے لیے کوئٹہ کے ٹکٹ کروا رہا ہوں میں۔'' شہریار صاحب نے گھر آتے ہی بتایا۔

''کیوں......؟'' عشرت بیگم نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

''نہیں ایسی پریشانی کی تو کوئی بات نہیں...... بس ذرا ردا اور حماد کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، بائیک پر بازار جاتے ہوئے۔ بس اب تم پریشان مت ہو جانا۔ میری آج خود حماد اور ردا...... بات ہوئی ہے، وہ لوگ معمولی مرہم پٹی کروا کر گھر واپس آ گئے تھے۔ بس ردا کی کمر میں کچھ تکلیف ہے، وہ بھی انشاء اللہ ایک آدھ دن کی میڈیسن سے ٹھیک ہو جائے گی۔''

''پھر اسے کیوں بھجوا رہے ہو تم؟'' جہاں آرا بیگم نے سوال کیا۔

''وہ اس لیے کہ ردا بہت گھبرا گئی ہے، آج فون پر رو رہی تھی کہ آپ شمعو کو ہی بھیج دیں۔ میرا دل بہت اداس ہو رہا ہے۔'' شہر یار صاحب نے بات ختم کر دی۔ اب کون تھا جو ان سے اختلاف کرتا۔

☆☆☆

''شمعو وہاں جا کر انسانوں کی طرح رہنا۔'' عشرت بیگم بار، بار تاکید کر رہی تھیں۔ ''بہن کا بہت خیال رکھنا، اس کے ساس، سسر سے کوئی بدتمیزی نہ کرنا۔'' عشرت بیگم بار، بار بیٹی کو نصیحت کرتیں۔

''تو پہلے میں کیا جانوروں کی طرح رہتی ہوں، مجھے بھی پتا ہے کیا کرنا ہے۔'' وہ ہاتھ نچا کر بولی۔

''اقصیٰ تم آج جا کر ردا، حماد اور اس کی ساس، سسر کے لیے کچھ چیزیں لا دو...... اب یہ کیا بہن کی سسرال خالی ہاتھ جائے گی۔ اور ہاں اس کی تیاری بھی کروا دینا۔''

''ٹھیک ہے امی جان......'' اقصیٰ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

''امی آج شمعو آ رہی ہے، شام کی فلائٹ سے۔'' ردا نے ناشتے کی ٹیبل پر ساس کو بتایا۔

''چلو اچھا ہے، گھر میں رونق ہو جائے گی۔'' نور بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لینے کے لیے کون جائے گا؟'' نور بانو نے سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے پوچھا۔

''یہی تو فکر ہے امی......! حماد کی تو ضروری میٹنگ ہے۔'' ردا نے فکرمندی سے کہا۔

''اُف تم بھی ناں ردا...... اب تمہاری بہن آ رہی ہے تو کیا ہم اسے کہیں گے کہ خود ٹیکسی کر کے گھر آؤ...... یہ نوفل بھی تو ہے، یہ لینے چلا جائے گا بلکہ ساتھ تم بھی چلی جانا۔ ورنہ یہ اسے پہچانے گا کیسے؟'' نور بانو نے مسئلے کا حل بتایا۔

نوفل دراصل ردا کے گھر والوں سے نہیں مل پایا تھا۔ وہ ہاسٹل میں ہی ہوتا تھا اور امتحانوں کی وجہ سے بھائی کی شادی میں شرکت نہ کر سکا تھا۔ نور بانو کالج میں پرنسپل تھیں۔ ردا کی سسرال خاصی پڑھی لکھی تھی۔ سسر بینک میں منیجر تھے۔ خود حماد بھی ایم بی اے کر کے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ نوفل (دیور) کا انجینئرنگ کا آخری سال تھا۔ ردا کی ایک ہی نند تھی، اس کا گھر قریب ہی تھا اکثر اپنے دونوں بچوں کو لے کر ماں کے گھر آ جایا کرتی تھی۔

☆☆☆

شمعو نوفل کو دیکھ کر کافی متاثر ہوئی تھی...... اور اب ذرا اپنے آپ کو اچھا بنا کر پیش کرنے کے چکر میں تھی۔ جبھی بہن سے بھی لیے دیے رہی......

''ردا آپی کا گھر کتنا خوب صورت ہے۔'' شمعو باہر لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولے بارش سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ڈرائی فروٹس سے شغل بھی ساتھ، ساتھ جاری تھا۔ ''گھر والے بھی بہت اچھے ہیں مگر آپی کی ساس اپنی بیٹی کا کتنا خیال رکھتی ہیں اور بیٹی بھی تو دونوں بچیوں کو لے کر تقریباً روزانہ ہی ان کے گھر گھسی رہتی ہے۔ اگر اس کا آنا کم ہو تو پھر آنٹی کی توجہ صرف ردا آپی کی طرف ہی ہو، نند کا گھر اتنا قریب بھی نہیں ہونا چاہیے اور ہے کتنی مسینی کتنا میٹھا، میٹھا بولتی ہے گلاب جامن کہیں کی۔'' شمعو اپنی انہی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک ردا نے کمرے کا دروازہ کھولا، شمعو جو اپنی دُھن میں مگن تھی اچانک اُچھل پڑی۔

''اُف توبہ ہے آپی...... تم نے تو ڈرا ہی دیا۔''

''تم کیا ہر وقت اندر گھسی رہتی ہو، باہر آؤ......''

''آپی تم بھی اِدھر ہی آ جاؤ...... باہر تو تمہاری ساس بھی بیٹھی ہوں گی۔''

''پھر کیا ہوا؟ ان کے پاس ہی چل کر بیٹھتے ہیں...... وہ اکیلی بیٹھی ہیں، آ جاؤ جلدی سے...... میں ان کے پاس ہی ہوں......'' ردا کمرے سے باہر نکل گئی۔

''اچھا......'' ٹھیک ہے، آنٹی کے ساتھ، ساتھ رہوں گی تو شاید میری بھی اس خوب صورت گھر میں مستقل جگہ بن ہی جائے۔'' شمعو کی نظروں میں نوفل کا مسکراتا چہرہ آ سمایا۔

شمعو سلام کر کے نور بانو کے بالکل قریب ہو کر بیٹھنے کی کوشش میں کرسی زوردار آواز کے ساتھ گھسیٹ کر مزے سے بیٹھ گئی۔

''شمعو تم تو بالکل میرے اور امی جان کے درمیان بیٹھ گئی ہو، ہمیں تو ایک دوسرے کا چہرہ بھی نظر نہیں آرہا۔ پیچھے ہو کر بیٹھو...... پرے کرو اپنی کرسی......'' ردا نے احتجاج کیا۔

''کون کہتا ہے یہ میری بہن ہے...... ہر جگہ مجھے ذلیل کرتی ہے۔'' شمعو کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر یہ وقت غصہ ظاہر کرنے کا نہیں تھا۔

''اور سناؤ بیٹی دل لگ گیا تمہارا، ردا بہن کو کہیں باہر کی بھی سیر کرواؤ ناں......'' وہ اس سے حال چال پوچھتے ہوئے بہو سے مخاطب ہوئیں۔

''جی بالکل امی جان! آج حماد کہہ رہے تھے ذرا جلدی آجاؤں گا تو لے جاؤں گا۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیے گا مزہ رہے گا۔'' ردا نے خوشی خوشی کہا۔

''ارے نہیں بیٹا تم لوگ ہی چلے جانا۔ جویریہ اور بچیوں کے ساتھ پلان بنالو، ہم لوگ پھر کبھی اکٹھے چلیں گے۔ آج تمہارے بابا کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ تو میں تو گھر پر ہی رہوں گی۔''

''کیا ہوا بابا جان کو......؟'' ردا فکرمندی سے بولی۔

''بس وہی نزلہ، زکام، سر درد ہے، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' نور بانو نے بہو کو تسلی دی۔

''لو اب اور سنو خود نہیں جاسکتیں تو ساتھ بیٹی کا پھندنا ٹانک دیا۔'' شمعو نے سخت کبیدہ خاطر ہو کر سوچا۔

''میں ذرا دیکھ لوں بابا جان کو......؟'' ردا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں بیٹا اس وقت سوئے ہوئے ہیں، رات سر درد اور چھینکوں کی وجہ سے کافی بے آرام رہے۔'' نور بانو نے محبت سے بہو کو دیکھا۔

''اچھا پھر میں بابا جان کے اٹھنے تک سوپ تیار کرلیتی ہوں، اٹھ کر گرم گرم پی لیں گے تو سکون محسوس ہوگا۔'' ردا کچن کی طرف بڑھ گئی۔

''خوشامد تو اس کو بھی بہت آگئی ہے، کیسے سسرال والوں کی خدمت کر، کرکے سر چڑھا رہی ہے، میں آگئی اس گھر میں تو ٹھیک کردوں گی سب کو۔'' شمعو کے دماغ میں الگ ہی پلاننگ چل رہی تھی۔

''سلام بیگم صاحبہ......'' اتنے میں ملازمہ لاؤنج میں داخل ہوگئی۔

''وعلیکم السلام......کیسی ہو حسنہ، ہوگئی تمہارے بھانجے کی شادی......'' نور بیگم نے ملازمہ سے پوچھا۔

''جی بیگم صاحبہ......آپ کی دعاؤں سے خیریت کے ساتھ نپٹ گئی۔''

''اس کا مطلب ہے اب کچھ عرصے تک تو تمہاری چھٹی کی درخواست نہیں آنے والی۔'' نوفل نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے حسنہ کی بات سن کر اس کو چھیڑا......حسنہ منہ بنا کر وہاں سے اٹھ گئی۔ حسنہ تقریباً تیس، پینتیس سال کی پھرتیلی عورت تھی۔ گھر کے کام کاج تیزی سے کرلیتی تھی۔ مگر چھٹیاں بھی اکثر بہانے بنا، بنا کر کرلیتی تھی۔ مگر چونکہ کام اچھا کرتی تھی اس لیے نور بانو برداشت کرلیا کرتی تھیں۔

☆☆☆

''شمعو بیٹی......میری ملنے والی آئی ہیں۔ ردا تو سو رہی ہے، اب اس کو کیا جگاؤں......تم ذرا سی اچھی سی چائے تو بنا کر ڈرائنگ روم میں دے جاؤ......'' نور بانو نے لان میں ایزی چیئر پر نیم دراز شمعو کو آواز دی۔

''جی......جی اچھا......'' شمعو بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ یا اللہ ان کے گھر کی چائے اور میں......؟ میں نے تو جب بھی دیکھا ان کے ہاں سیپرٹ چائے ہی دیکھی......ہم تو وہاں اپنے گھر دودھ میں ہی پتی چینی اور الائچی ڈال کر بوائل کر کے کپ بھر لیتے ہیں اور اب ان کے والی چائے......؟''

کیتلی میں پانی بھر کر چولہے پر رکھا......اب اتنا تو پتا تھا کہ پہلے پانی بوائل کرنا ہے، نوفل پانی پینے کچن میں گھسا......

''ہائیں، آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟''

''میں وہ بس چائے......''

''اچھا، اچھا امی جان کی دوست آئی ہیں اس لیے......'' نوفل کو اس کی شکل دیکھ کر ہی اناڑی پن کا

اندازہ ہوگیا۔" یہ اتنا زیادہ پانی کیوں ڈال دیا کیتلی میں۔ چائے تو صرف دو بندوں کی بنی ہے تو قہوہ بھی اسی حساب سے بنے گا۔ آپ ہٹ جائیں میں دیکھ لیتا ہوں، آپ جب تک کراکری نکالیں اور فریزر سے کباب نکال کر دوسرے چولھے پر فرائی کرنا شروع کریں۔"

"آنٹی نے صرف چائے کا کہا ہے۔" شمعو نے اسے اطلاع دی۔

"تو پھر......؟" نوفل نے اسے حیرانی سے دیکھا۔" انہوں نے تو صرف چائے ہی کا کہنا تھا اب باقی لوازمات تو پیش کرنے والے کو ہی دیکھنے پڑیں گے ناں۔" نوفل نے جیسے اس کی عقل پر ماتم کیا۔

"فریج سے کیک بھی نکالو اور کوکیز اور نمکو والے جار اس کیبنٹ میں ہوں گے۔" نوفل نے اشارے سے بتایا.....نوفل نے اب توے پر رکھے کبابوں کو الٹ پلٹ کرنے کی ذمے داری نبھائی۔

نور بانو نے کچن کا چکر لگایا اور نوفل کو شمعو کے ساتھ کام میں لگے دیکھ کر عجب نظروں سے اسے گھورا۔

"امی وہ دراصل شمعو کو کچن میں چیزیں نہیں مل رہی تھیں تو میں نے سوچا میں ہی مدد کروا دوں۔"

"سگھڑ عورت کسی بھی کچن میں چلی جائے وہ اس کا اپنا ہی کچن ہوتا ہے اور یہ کون سا پندرہ مرلے کا کچن ہے، جو بھاگ، بھاگ کر چیزیں ڈھونڈنا پڑیں گی۔" نور بانو کا لہجہ بے حد سرد تھا۔ نوفل جلدی سے اپنے کمرے کی طرف کھسک گیا۔

☆☆☆

"بیگم صاحبہ آپ کے کمرے کے تمام جالے اتار کر پنکھے بھی صاف کردیے ہیں۔" حسنہ، نور بانو کو اطلاع دیتے ہوئے دوسرے کمرے میں گھس گئی۔

"حسنہ ذرا باتھ روم دل لگا کر صاف کیا کرو......" شمعو نے ذرا معتبر بنتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" حسنہ کمرے سے باہر نکل آئی۔

"بی بی میں کسی کے کہے بغیر ہی اچھی طرح صفائی کرتی ہوں، تم نے تو کل نہا کر ٹب میں سے پانی بھی نہ نکالا، یہ بھی نہیں پتا کہ اس طرح ٹب چکنا ہو جاتا ہے، نہانے کے بعد بال تمہارے ٹوٹ، ٹوٹ کر باتھ روم کی جالی پر بکھرے پڑے ہوتے ہیں، ذرا انہیں بھی اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا کرو...... اب سارے کام میں ہی تو نہیں دیکھوں گی ناں......" وہ چمک کر بولی۔

"اور یہ باتھ روم میں دل لگانے والی کیسی بات کی تم نے؟ کیا مجھے دل لگانے کو کوئی اور نہیں ملتا جو تمہارے باتھ روم میں دل لگاؤں گی، میرا تو میاں ہی کافی ہے دل لگانے کے لیے۔" حسنہ نے شمعو کی معتبری کی ایسی کی تیسی کرتے ہوئے کہا۔

نوفل نے اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے بلند و بانگ قہقہہ لگایا۔

"بیٹی یہاں ملازم ملتے ہی نہیں اس وجہ سے یہ حسنہ بی بی بہت سر چڑھی ہے، پتا ہے ناں نکال تو سکتے نہیں، تم بھی ذرا اس کے ساتھ احتیاط سے بات کیا کرو.....کام چھوڑ گئی تو بہت مشکل ہو جائے گی۔" نور بانو نے شمعو کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ شمعو نے خجالت کے مارے وہاں سے اٹھ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

☆☆☆

"آپی تمہاری ساس جوڑا تو تمہارے لیے قیمتی لائی ہیں مگر یہ سمجھ نہیں آیا کہ وہ تمہیں ساتھ لے جا کر شاپنگ کیوں نہیں کرتیں۔" شمعو نے ردا کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بھئی وہ کہتی ہیں کہ سارا سال تم لوگ اپنی مرضی کی شاپنگ کرتی ہو.....مگر عید کا جوڑا میری طرف سے سرپرائز ہوتا ہے، وہ جویریہ آپی کے لیے بھی خود ہی خرید کر لاتی ہیں۔ دیکھا نہیں تم نے؟" ردا نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ہاں دیکھا ہے، جویریہ آپی کا سوٹ زیادہ خوب صورت ہے، اب آپ کی آنکھوں پر تو پٹی بندھی ہوئی ہے مگر میں تو اپنی آنکھیں کھلی رکھتی ہوں، ہوسکتا ہے وہ جاتے، جاتے اپنی بیٹی کو ساتھ بازار لے جاتی

ہوں مگر آپ تو سدا کی بے وقوف' سرپرائز کے چکر میں جو بھی آپ کو مل جائے وہ ہی ٹھیک ہے۔'' شمعو کا لہجہ بے حد کڑوا تھا۔

''دونوں سوٹ ایک ہی پرائس کے ہیں، میرا سوٹ لیتے وقت وہ میری پسند کو مدِنظر رکھتی ہیں، اس لیے اس کا کلر ذرا مدھم ہے تو تمہیں ایسا لگا۔'' ردا نے ساس کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔

''اب جو مرضی کہو تم، میرا تو دل چاہ رہا تھا جویریہ کے خوب صورت جوڑے کو آگ لگا دوں۔'' شمعو کے لہجے میں شعلے بھڑک رہے تھے۔

لان میں بیٹھی نور بانو، ردا کے کمرے کی کھڑکی سے باہر آتی آوازیں سن کر جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئیں۔

''یہ میرے گھر کو تو ضرور آگ لگائے گی، جوڑے کو تو لگائے یا نہ لگائے۔'' وہ بڑی مشکل سے خود کو گھسیٹ، گھسیٹ کر اپنے کمرے تک لائیں اور اندر سے کنڈی لگالی۔ شمعو کے وہ الفاظ ابھی تک کانوں میں گونج رہے تھے جو اس نے کچھ دن پہلے ان کی نواسیوں کے بارے میں کہے تھے۔

''دونوں فتنیاں سارے گھر میں گھستی ہیں، ہر چیز کو چھیڑ، ہر چیز کو خراب کر...... اس دن دیکھا نہیں کیسے آپ کی لپ اسٹک سے آپ کی ڈریسنگ ٹیبل پر لیپا پوتی کر کے گئی تھیں۔ اور جو آپ کی کریم ساری کی ساری انہوں نے اپنے کپڑوں اور منہ اور سر پر لگالی تھی وہ...... اور ان کی ماں بجائے شرمندگی محسوس کرنے کے ان کی طرف دیکھ، دیکھ کر چڑیلوں کی طرح دانت نکال رہی تھی۔'' شمعو کے نفرت انگیز الفاظ اب بھی ان کے سر کو گھما رہے تھے۔

سارا دن کی سوچ بچار کے بعد انہوں نے مشکل کا حل نکال لیا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

''حماد تم کل کی سیٹ بک کروا دو شمعو کی واپسی کے لیے۔'' انہوں نے رات سب کے سامنے حماد سے سرسری لہجے میں بات کی۔

''کیوں، کیا ہوا......؟'' شمعو نے تو بے چین

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں' اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے
امریکا' کینیڈا' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 021-35895313 فیکس 021-35802551

ہونا ہی تھا...... سارے چونک گئے۔

''کچھ نہیں، ہونا کیا ہے، بس ہم لوگ بھی اب عید کا پلان بناتے ہیں، تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہم لوگ رمضان اور عید ہمیشہ گاؤں ہی میں کرتے ہیں، اس بار زیادہ تیاری نہیں کر سکے...تو ذرا جلدی ہی جانا ہوگا۔ اب تمہارے دادا تو اس عمر میں اکیلے سب انتظامات کرنے سے رہے۔'' نور بانو نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''امی اگر شمعو بھی ہمارے ساتھ......'' ابھی حماد نے بات شروع کی ہی تھی کہ نور بانو نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔''

''نہیں بیٹا، پرائی لڑکی کی ذمے داری ہم نہیں اٹھا سکتے۔'' نور بانو نے اتنا کہہ کر اپنے کمرے کی راہ لی۔

شمعو اور ردا اپنی جگہ چور سی بن گئیں۔ صبح سے ساس کا انداز دیکھ کر ردا کو شک تو تھا ہی کہ انہوں نے شمعو کی صبح والی ساری باتیں سن لی ہیں اور اب اس کے اس شک پر یقین کی مہر ثبت ہوگئی تھی۔

حماد کے اٹھ جانے کے بعد جویریہ اٹھ کر ماں کے کمرے میں گئی۔ نور بانو لیٹی ہوئی تھیں۔ بیٹی کے آنے پر آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا۔ ان کی آنکھیں معمول سے بڑھ کر سرخ تھیں۔ جیسے بڑا ضبط کر رہی ہوں، جویریہ ماں کی پائنتی کی طرف ٹک گئی۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟''

''ہوں......'' انہوں نے فقط ایک لفظ بولا۔

''امی میں تو چاہ رہی تھی کہ ردا بھابی اتنی اچھی ہیں تو ہم شمعو کو بھی نوفل کے لیے......''

''بس......'' نور بانو ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھیں......

''اب ایک بھی لفظ اور نہیں شہر یار صاحب کے گھر کا ہیرا میں چن چکی اور اب وہاں سے پتھر اٹھانے کی اجازت میں کسی کو نہیں دوں گی۔'' نور بانو نے انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''بس اب جاؤ تم۔''

اندر سے آنے والا ایک، ایک لفظ شمعو اور ردا نے بھی سنا...... آج رات کسی کی بھی اچھے سے کٹنے والی نہیں تھی۔ ردا کی، نہ شمعو کی اور نہ ہی نور بانو کی۔

صبح جھکی نظروں کے ساتھ شرمندہ سی شمعو سب سے مل کر رخصت ہوئی...... ردا کو اب اپنے گھر، اپنا مقام بحال رکھنے کے لیے بہت محنت و کوشش کرنی تھی، نور بانو سخت گیر ساس نہ تھیں۔ انہوں نے اپنے کسی بچے سے بھی کوئی لگائی بجھائی نہیں کی تھی مگر پھر بھی ساس تو ساس ہی ہوتی ہے، ان کا اپنا دل بھی موم ہونے میں ٹائم لگتا تھا۔ مگر نور بانو کی اچھائی کو دیکھتے ہوئے ردا کو اندازہ تھا کہ وہ جلد ہی یہ ٹارگٹ دوبارہ حاصل کرلے گی۔

☆☆☆

میں...... شمع شہر یار، آج اپنی عمر کی 38 بہاریں دیکھ لینے کے بعد اب تنہا ہوں بالکل تنہا، کوئی ہم سفر نہیں کوئی ہمراز نہیں، دادی جان کی وفات کے بعد جلد ہی اماں ابا بھی روڈ ایکسیڈنٹ میں وفات پاگئے، ان کے چلے جانے کے بعد رشتہ کہیں طے ہی نہیں ہوسکا۔ یا یوں کہیے کہ بھابیوں اور بہن، بھائیوں نے کوشش ہی نہیں کی۔ بہن کو یہ ڈر تھا کہ کہیں رشتے کی بات چلائی تو مجھے اپنے گھر بلانا پڑے گا کیونکہ رشتہ دیکھنے والے اتنی دور کا سفر کرنے پر تیار ہی نہیں ہوتے تھے اور وہ مجھے اپنے گھر بلانے پر ہرگز تیار نہیں ہوتی تھی۔ بھائی اپنے بچوں میں مگن تھے اور رہ گئیں بھابیاں تو ان کو کوئی انٹرسٹ ہی نہیں تھا۔ میری اس بھری دنیا میں کسی کے ساتھ کوئی انڈر اسٹینڈنگ ہے نہ کوئی دوست نہ سہیلی...... فقط تنہائی اور میں، ہاں، میں آج یہ اعتراف کرتی ہوں کہ یہ میرے اندر کا حسد تھا۔ میرے اندر کا بغض و کینہ ہی تھا جو دوسروں کی خوشی میں خوش نہ ہونے دیتا...... میں سب سے چھوٹی تھی۔ گھر کے حالات اس وقت اتنے اچھے نہیں تھے، بھابی کے اچھے کپڑے مجھ سے برداشت نہیں ہوتے، اچھے کپڑے، جوتے اور دوسری چیزوں کا ردا کے جہیز کے لیے پیٹی میں بند ہوجانا بھی میری برداشت سے باہر تھا۔ یوں رفتہ، رفتہ

میرے اندر زہر سرائیت کرتا گیا۔ حالانکہ بعد میں مالی حالات بہتر ہونے پر مجھے بھی کسی چیز کی کوئی کمی نہیں رہی مگر میرے لاشعور میں بچپن کی محرومیاں رچ بس گئیں بعد میں، میں چاہتے ہوئے بھی اپنی عادات کو سنوار نہ سکی اور آج، دوسرے میرے وجود سے ہی الرجک ہیں...... سب کے لیے زندگی رواں دواں ہیں...... حسین ہے اور میں نے اپنے لیے خود کانٹے چن لیے...... اور اب تو ان کے بچوں کے رشتے طے کرنے کا وقت ہے، وہ دونوں آپس میں صلح مشورہ کرتی ہیں، حتیٰ کہ بڑی نند سے بھی فون پر لمبی بات چلتی ہے، بڑی بھابی کے دوبارہ لاہور شفٹ ہو جانے کے بعد دونوں دیورانی، جیٹھانی میں بلا کا سلوک و محبت ہے مگر میں اس گھر میں ہوتے ہوئے بھی کہیں نہیں ہوں بلکہ جب گھر لوگ ان کی بچیوں کے لیے رشتہ دیکھنے آتے ہیں تو بھابیوں کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ مجھے ڈرائنگ روم سے بھی دور رکھیں۔ سچ ہے میں اپنے ہی حسد کی آگ میں جل گئی۔ مجھ سے بھابیوں کا پہننا، اوڑھنا ہی برداشت نہیں ہو پایا۔ ان کی خوشی میرے دل میں سوراخ کر دیتی تھی اور آج...... آہ آج......

''اے خدا مجھے معاف کر...... میری غلطیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میرے گناہوں کو معاف کر دے۔ مجھ پر اپنی رحمت کا دروازہ کھول دے۔ رحم کر دے مجھ پر......'' ساری رات بادل گرجتا رہا آسمان روتا رہا۔ میری آنکھوں کی طرح......

صبح فجر کے وقت یوں لگا خدا نے میری سن لی۔

آٹھ بجے کے قریب ناز بھابی نے میرے کمرے کا دروازہ کھولا۔

''شمع آج خرم کو دیکھنے لوگ آرہے ہیں تو تم اٹھ کر کچن دیکھ لو اور ٹائم سے خود بھی تیار ہو جانا۔ یہ نہ ہو وہ کہیں کہ خرم کی پھپھو کی ڈریسنگ ٹھیک نہیں۔''

''ہاں ماما جی' ایسا نہ ہو پھپھو کی وجہ سے میرا رشتہ ہونے سے رہ جائے۔'' بھابی کے کندھے کے اوپر سے خرم مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

''یا اللہ کہیں آج میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی مگر نہیں اللہ نے میری سن لی ہے اور اس کی ذاتِ... بابرکات مجھے ایک اور موقع دینے کو تیار ہے، اچھی زندگی گزارنے کا گھل مل کر زندگی گزارنے کا ایک اور موقع...... شکر ہے میرے مولا شکر ہے، اب آج سے میں اپنی ایک نئی زندگی کا آغاز کروں گی، جس میں محبت ہی محبت ہوگی۔ خوشیاں ہی خوشیاں...... دوسروں سے محبت، اپنوں سے محبت، بچوں سے محبت، اللہ سے محبت، اللہ کے بندوں سے محبت...... شکر ہے میرے مالک صد ہا بار شکر کروڑوں بار شکر میرے مولا میرے آقا...... مجھے توبہ کی مہلت مل گئی۔''

☆☆☆

''شمعو تو آج بھی خوب صورت ہے، پہن اوڑھ کر اور بھی باوقار دکھتی ہے، برا ہوا جو اس بیچاری کا رشتہ وقت پر طے نہ ہو سکا۔'' وہ ناز بھابی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ دونوں کو آج کل انہی سوچوں نے گھیرا ہوا تھا...... ''مگر اب بھی کیا بگڑا ہے بھابی...... ارسلان میرے چچازاد بھائی جو بیوی کی وفات کے بعد تنہا ہیں...... بچوں کا بھی کوئی جھنجٹ نہیں ہے، اچھی خاصی تنخواہ، زمین جائداد سبھی کچھ تو ہے اپنی شمعو تو عیش کرے گی۔ آپ کا کیا خیال ہے...... ہاں...... ہاں...... کرتی ہوں میں آج ہی اسد سے بات...... آخر ہمیں خدا کو بھی منہ دکھانا ہے کہ ہم نے اپنی ذمے داری کیسے نبھائی۔ امی، ابا ہمارے سپرد کر کے گئے تھے اسے۔''

''ٹھیک ہے۔'' آج دوسری جانب سے ناز نے بھی یقیناً اس کی ہمت بندھائی تھی۔

''آج ہی میں اسد سے بات کر کے جلد ہی ان لوگوں کو بلا لیتی ہوں...... مگر اس سے پہلے شمع سے بات کرنا بھی ضروری ہے۔'' فون آف کر کے اقصیٰ کے قدم شمعو کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

اور شمعو جو ادھ کھلے دروازے کے پیچھے کھڑی تھی دل ہی دل میں اپنے رب کی شکر گزار ہو رہی تھی۔

☆☆☆

منی ناول

دسواں حصہ

ہم کو محبت نے بدنام کیا

سیما رضا ردا

رات کی رانی اور چنبیلی کے پھولوں ایسی لڑکی کو
گھر کے آنگن سے لے جا کر کس آنگن میں چھوڑ دیا
پیڑ سے بچھڑی شاخ بھی کیا ہوتی ہے......

وہ اسپتال کے بیڈ پر بیٹھی خالی ذہن اور خالی نظروں سے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ قسمت نے اس کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کیا تھا یا پھر یہ سب اس کے ساتھ ہونا مقصود تھا۔ اس لیے اس کے ذہن سے سب کچھ مٹا کر کورے کاغذ کی طرح کر دیا تھا۔ وہ خاموشی کی دیوار بن کر رہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایڈ فری لنکس

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.

All Done

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

گئی تھی۔ جس پر اب نئے سرے سے رنگ ہونا تھا۔

یادِ ماضی عذاب ہے اور وہ اس عذاب سے کہیں دور تھی۔ اسے تو اپنا نام اور اپنے ساتھ جڑے رشتے بھی یاد نہیں تھے۔ اس کے لیے شاید زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہی یہ تھا کہ وہ اس حادثے کے بعد بھی زندہ تھی۔ وہ جس کے لیے صرف کتابیں اور زندگی کا مقصد کچھ کر دکھانا تھا۔

وہ آنکھوں میں اجنبیت لیے سفید براق چادر سے سجے بیڈ پر بیٹھی یہ سوچنے سے بھی مفلوج تھی کہ وہ یہاں کیوں ہے؟ اور اسے کون لایا ہے...... یہ جو سفید وردی میں لوگ آتے ہیں یہ کون ہیں؟

رشتے بھی سودے کی طرح ہوتے ہیں۔ محبت انسان کو مار دیتی ہے۔ یہ ایک بیج کی طرح دل میں گرتی ہے اور پھر خون اس کی نشوونما کر کے اسے تناور درخت بناتا ہے اور پھر یہ کر انسان کو کمزور کر دیتی ہے...... وہ محبتوں میں بری طرح لٹی تھی...... تایا جی نے اسے مضبوط سہارا دینا چاہا...... اسے کیا خبر تھی کہ وہ جس نکاح نامے پر اپنے دستخط ثبت کر رہی ہے۔ وہ اسے خون آشام دنیاؤں سے گزار رہا ہے......

''میری بیٹی تشمیرہ کیا سوچ رہی ہے؟'' ایک مہربان شفیق ہستی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا...... تو بس وہ انہیں دیکھے گئی، پہچان کی کوئی لہر نہ ابھری...... ''بیٹا میں تمہارا تایا ہوں...... تم میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو گڑیا......'' وہ گلوگیر لہجے میں بولے...... ''مجھ سے بات کرو......'' مگر وہ خموش، خموش نظروں سے انہیں دیکھے گئی۔

''مجھ سے شکوہ کرو...... مجھ سے لڑائی کرو...... مجھ سے غلطی ہوگئی تھی...... یہ سب میرا کیا دھرا ہے......'' وہ خود کو قصوروار ٹھہرا رہے تھے۔

''وہ تمہارے قابل نہیں تھا جب ہی تو قدرت نے اسے تم سے جدا کر دیا مگر میری آنکھوں پر تو...... پٹی بندھ گئی تھی مجھے معاف کر دو۔ تشمیرہ ایک بار تم ٹھیک ہو جاؤ تو سب ٹھیک ہو جائے گا...... اب جو تم کہو گی بیٹا میں وہی کروں گا...... تم خوب پڑھنا لکھنا......'' وہ اب اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر زار و قطار رو پڑے تھے...... تشمیرہ انہیں روتا ہوئے دیکھتی رہی...... تب ہی ڈاکٹر راحیل نیورو سرجن نے تایا جی کے کاندھے پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

''انکل پلیز حوصلہ کریں...... دیکھیں یہ بہت بڑے ٹراما سے واپس آئی ہیں...... ان کا ہوش میں آنا معجزہ ہے...... انہیں ہم پھر نیند کے فیز میں رکھیں گے اور انشاء اللہ یہ ہنستی کھیلتی واپس اپنی دنیا میں آئیں گی...... آپ بھروسا رکھیں...... اپنا دل نہ دکھائیں۔'' ...... نوجوان ڈاکٹر انہیں بڑی محبت سے سمجھاتے ہوئے امید و یقین دلا رہا تھا...... اور تایا جی اس کے خلوص پہ دکھی دل سے مسکرا دیے......

''جی بیٹا اللہ بہت بڑا ہے...... بس یہ ایک بار ٹھیک ہو جائے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا......'' انہوں نے پلٹ کر تشمیرہ کی طرف دیکھا...... نرس اس کے بیڈ کے قریب کھڑی تھی اور اس کے پیروں پہ کمبل ڈال رہی تھی...... تشمیرہ کا وجود بالکل ساکت دکھائی دے رہا تھا۔

وہ کتنے ہی لمحے چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔ تایا جی کی آنکھوں سے اشک رواں تھے

☆......☆......☆

آسمان سے زمین تک پورے چاند کی روشنی تھی...... ماحول میں گرمی کی شدت کم تھی...... اسلام آباد کی فضا میں ہوا کا پھیلاؤ اچھا لگ رہا تھا...... فوڈ اسٹریٹ لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی...... گرم، گرم کڑاہی اور ملائی چکن کے آرڈر سرو کیے جا رہے تھے...... روشنی کی جھالروں نے ایریا کو خوب صورت بنا دیا تھا۔

وہ دونوں بھی قدرے ایک پُرسکون گوشے میں ایک میز کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

''یار تم بھی حد کرتے ہو، اتنے سال باہر رہنے کے بعد بھی تمہیں عقل چھو کر نہیں گزری، تم عجیب بے وقوفانہ گفتگو کر رہے تھے گھر میں...... ردا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کا موڈ ویسے ہی آف رہتا ہے۔ مزید خراب ہو گیا ہوگا...... بچے کیا سوچ رہے ہوں گے، اعزاز کتنی مشکل سے زندگی کی طرف لوٹا ہے......'' زوار شاہ نے کرسی سنبھالتے ہوئے انتہائی غضبناک لہجے میں ان سے کہا۔

''کم آن یار...... ماحول کو انجوائے کرو......'' وہ کوئی اثر لیے بغیر گویا ہوئے...... ''کیا تم جانتے نہیں ہو میں کیا ہوں؟ اور ایک بات تم بتاؤ......'' وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے...... ''تم خود کو اتنا ان سیکور (غیر محفوظ) کیوں سمجھ رہے ہو؟ تم تو وہ انسان ہو... جو دو منٹ میں سامنے والے کا حشر بگاڑ کے رکھ دیتا تھا......''

''وقت، وقت کی بات ہوتی ہے...... اور میری عمر اب ایسی نہیں ہے...... میں گھر کے ماحول کو... فی الوقت بگاڑنا نہیں چاہتا اور تم...... تم پلیز ایسی کوئی بات نہ کیا کرو جس کا تعلق میرے ماضی سے ہو۔''

زوار شاہ غصے اور بے چینی سے اپنی پیشانی ملنے لگے۔

انہوں نے کچھ دیر خموشی سے زوار شاہ کو دیکھا اور پھر سانس بھر کر کہنے لگے۔

''اوکے...... میں اپنے واپسی کے ٹکٹ کروالیتا ہوں...... بس کل صبح کی فلائٹ سے جا رہا ہوں میں......'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔

''خدا کو مانو یار...... میرا مطلب یہ نہیں تھا......''

وہ یک دم چونک گئے تھے...... وہ واقعی سنجیدہ ہوگئے تھے...... ''میں تو تمہاری باتوں کی وجہ سے کہہ رہا تھا...... جو آگ لگانے والی ہوتی ہیں۔''

اور وہ ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوتے قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''چلو پریشان نہ ہو...... میں اب کوئی ایسی بات نہیں کہوں گا، ہاں کوشش کروں گا تمہیں کم سے کم تنگ کروں......''

''ویسے تم یہ بتاؤ......'' ویٹر ٹیبل پر آرڈر سرو کر رہا تھا...... وہ لمحے بھر کو خاموش ہوگئے۔

''ہاں کہو......'' زوار شاہ اپنی پلیٹ کو سامنے کرتے ہوئے بولے۔

''یہ جو تمہاری پرسنل سیکریٹری ہے کیا نام ہے...... ہاں روزی...... اس کا کوئی تعلق چاندنی سے تو نہیں ہے۔''

''چاندنی سے......؟'' زوار شاہ کا ڈش کی طرف بڑھا ہوا ہاتھ ساکن ہوگیا ماضی کا ایک اور زخم کریدتا ہوا وہ واقعی شیطان تھا۔

''اس کی آنکھیں اور اس کا وجود بتا رہا تھا کہ اس کا چاندنی سے گہرا تعلق ہے......''

''لیکن چاندنی تو مر چکی ہے۔'' زوار شاہ دھیرے سے بولے۔

''مگر چاندنی کی بیٹی تو زندہ ہوسکتی ہے ناں......؟ یا کوئی اور رشتہ۔''

زندگی سے بھرپور اس فضا میں جو رونق تھی...... وہ ایک لمحے میں معدوم ہوگئی تھی...... برقی قمقموں کی روشنی آنکھوں میں چبھنے لگی......

''تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟ تمہاری ایک ہی ملاقات تو ہوئی ہے اور اس ملاقات نے یہ فیصلہ بھی کر دیا......''

''وہ بہت پُراسرار لڑکی ہے...... اسے معمولی نہ سمجھ...... وہ کچھ اور ہے میرے دوست......''

''ہاں معمولی تو نہیں مگر...... وہ ذہین ہے...... ہر کام میں مشاق ہے...... آج تک کسی کام میں اس سے کوتاہی نہیں ہوئی...... یہ تمہارا وہم ہے اور کچھ نہیں......'' زوار شاہ دھیرے سے کہنے لگے۔

''چلو کھانا کھاؤ...... انجوائے کرو یار...... اس پہ غور کرتے ہیں...... تمہارا دوست ابھی زندہ ہے......''

وہ بے پروائی سے کہہ کر اپنی پلیٹ پر جھک گئے۔ ''واہ کیا کڑاہی ہے...... کیا بات ہے......''

زوار کا کھانا پینا خون ہوگیا تھا...... ان کا کہیں دل نہیں لگ رہا تھا......

☆......☆......☆

پتا نہیں کیوں میں چاہتی ہوں
کہ جب کوئی خواب دیکھوں
تو رات میری امانتیں مہربان سورج کو سونپ جائے
پتا نہیں کیوں میں چاہتی ہوں کہ جب دعاؤں
میں ہاتھ اٹھیں
تو کوئی میرے بلند ہاتھوں میں پھول رکھ دے

وہ سر پر پی کیپ پہنے شدید دھوپ سے خود کو بچاتے ہوئے لمبے، لمبے قدم بھرتا ہوا ”Alster“ نامی جگہ پہ پہنچ گیا تھا...... یہ ہیمبرگ کا وہ علاقہ تھا جو وہ آج پہلی بار دیکھ رہا تھا...... جینی نے یہی پتا بتایا تھا۔

”فلگر ریسٹورنٹ کا کس سے پوچھوں......؟“

اجنبی شہر میں ایک اجنبی ریسٹورنٹ کا پوچھنا اسے عجیب لگ رہا تھا...... مگر جینی کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ وہ اس کا دل نہ توڑ پایا اور ”سرپرائز“ کے چکر میں یہاں آگیا...... وہ کیا کہنا چاہتی تھی اسے کچھ سمجھ نہ آیا...... انہی سوچوں میں غلطاں وہ آگے بڑھ رہا تھا کہ کسی سے ٹکرایا...... اس نے اپنا سر ہلایا تو اس اجنبی نے شستہ لہجے میں کہا...... ”سوری......“

”اوہ...... ڈونٹ وری......“ ریبال نے اس کی معذرت قبول کی۔

وہ آدمی آگے بڑھا تو ریبال نے ایکسکیوز کر کے جینی کا دیا گیا ایڈریس اسے دکھایا...... تو اس نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔

ریبال نے اس کے ہاتھ کے اشارے پر نظریں دوڑائیں تو سامنے ایک بہت خوب صورت ہوٹل سمندر کے بیچ میں ایستادہ تھا...... اطراف میں کشتیاں پانیوں میں چل رہی تھیں...... وہ بہت حیران ہو کر سامنے دیکھتا رہا...... جینی کا یہاں بلانے کا مقصد کیا ہے......؟ وہ اسی پر غور کرتا آگے بڑھا تو موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی...... اس نے کان سے لگایا تو جینی جوش میں کہہ رہی تھی۔

”میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے...... تھینک یو ریبال آگے آجاؤ......“

”مگر کہاں......؟“ وہ نروس ہوا۔

”یہ دیکھو سامنے ہوں بس تھوڑا آگے......“ اور وہ موبائل فون کانوں سے لگائے اس کی آواز کی رہنمائی میں آگے بڑھتا رہا......

”مگر تم ہو کہاں؟“ وہ جھنجلایا۔ ”مجھے نظر نہیں آرہی ہو...... میں واپس جا رہا ہوں......“ وہ بیزار ہوا۔

”تمہارے سامنے......“ وہ کھلکھلاتے لہجے میں کہتی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی......

”تم جینی......“ موبائل فون اس کے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچا...... ”اوہ میرے خدا......“

”جی میں......“ وہ سرتا پا پاؤں بالکل بدل گئی تھی...... سیاہ رنگ لمبا ”عبایا“ پہنے اور خوب صورت چمکتا چہرہ حجاب میں تھا...... وہ بالکل اسلامی لبادے میں ڈھلی ہوئی ایک نئی جینی تھی......

”تم یہ سب ...... کیسے......؟“ ریبال اس تبدیلی پہ حیران تھا اور بہت خوش بھی۔

”آؤ...... اوپر چلو میں تمہیں بتاتی ہوں...ایسا کیوں ہوا...؟“

وہ حیران سا ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا...... اور پھر سحر زدہ کیفیت میں گرفتار ہو کر ریسٹورنٹ میں اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھا دیے...... اس کے جادوئی لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جو ریبال کو ہلا گئی تھی۔

☆......☆......☆

رمضان کے آخری عشرے کا آغاز ہو چکا تھا...... اور زوار شاہ کی ذمے داریاں آخری عشرے میں بڑھ جاتی تھیں......

زوار شاہ نے فلاحی اداروں، یتیم خانوں، اسپتال اور ٹرسٹ کے لیے خطیر رقم کے چیک سائن کر دیے تھے...... اور یہ ان کا کئی سال سے طریقہ کار تھا...... رمضان کے آخری عشرے تک وہ یتیم خانوں تک خود جاتے ہر بچے کے لیے لباس، جوتے، پھل اور ان کے علاج معالجے کے لیے ایک بڑی رقم ضرور

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دیتے...... انہوں نے اعزاز اور فیضان دونوں کو اس حوالے سے سخت ہدایات دی تھیں کہ اس معاملے میں کبھی وقفہ نہ آئے...... اور وہ دونوں بھی اس کام میں ان کے ساتھ پیش، پیش رہتے...... ان کے ہر حکم کی بجا آوری کرتے......

اعزاز شاہ اسپتال کے چیک بنفس نفیس خود پہنچا کر آتے...... اس چلچلاتی دھوپ میں جبکہ شہر کی سڑکیں ویران تھیں...... وہ روزے کی حالت میں خود اپنی گاڑی ڈرائیو کر کے مڈسٹی ...... اسپتال میں موجود تھے...... بیرونی ملکوں سے امداد بھی اس اسپتال کو حاصل تھی جدید طبی سہولیات سے آراستہ مشینیں اس اسپتال میں موجود تھیں۔

ڈاکٹر راحیل کا اس اسپتال میں تقرر ہوا تھا...... جو ایک زمانے میں اعزاز کے کالج میں پڑھتا تھا، اب دونوں کی ملاقات گزشتہ دو سالوں سے جاری تھی......

وہ اس کمرے میں بیٹھے اس کے منتظر تھے...... مختلف رسالوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے بہت سارا وقت بیت گیا۔ اعزاز شاہ نے لفافہ رکھ کر گھڑی دیکھی تو ڈاکٹر راحیل کے ساتھ ایک سفید باریش بزرگ نظر آئے جو چہرے سے بہت پریشان اور دکھی نظر آرہے تھے......

''انکل آپ یہاں بیٹھیں گے......'' ڈاکٹر راحیل کی نظر اعزاز شاہ پہ گئی تو وہ اس سے بڑھ کر بغلگیر ہوا......

''کیا حال ہیں اعزاز! مجھے تمہاری کوفت کا اندازہ ہے۔ تم انتظار کی اذیت سے گزر رہے ہو گے مگر ان کی بیٹی کا کیس تھوڑا گمبھیر تھا۔ اس لیے ان کو تمام حالات سے آگاہ کر رہا تھا۔'' وہ تایا جی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وضاحت کرنے لگا۔

'' ہاں بالکل میں بھی تو دیکھو ٹھیک ہو گیا......'' اعزاز نے شگفتہ لہجے میں کہا......''آپ بالکل فکر نہ کریں سر! آپ کی بیٹی بالکل ٹھیک ہو جائے گی......'' اعزاز نے بے حد اپنائیت سے تایا جی سے کہا تو ان کی آنکھیں اس نوجوان کو دیکھ کر بھیگ گئیں...... جو اجنبی تھا مگر انہیں یقین دلا رہا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

''شکریہ بیٹے...... اللہ تمہاری زبان مبارک کرے......'' تایا جی نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا...... پھر ڈاکٹر راحیل سے مخاطب ہوئے......''اچھا میں چلتا ہوں......'' وہ آہستہ، آہستہ قدموں سے نکلتے چلے گئے۔

کچھ لمحے یوں ہی سرک گئے جیسے بات کرنے کو کوئی موضوع نہ رہا ہو......''بیٹھو یار تم تو اب تک کھڑے ہو......'' ڈاکٹر راحیل نے اعزاز شاہ کو دیکھا جو دروازے کو دیکھ رہے تھے جس میں سے ابھی وہ بزرگ نکل کر گئے تھے۔

''مجھے پتا ہے تم بہت حساس ہو، ان کے دکھ کو محسوس کر رہے ہو۔ اصل میں، میں تمہیں تشمیرہ کی کیس ہسٹری بتاتا ہوں تو تمہیں سمجھ میں آجائے گا کہ بزرگوار کس حد تک پریشان ہیں اس بیچاری کے لیے......''

''تشمیرہ......'' ان کے ہونٹوں پہ یہ نام تھرتھرایا۔

''ہاں تشمیرہ......'' اور پھر ڈاکٹر راحیل اسے سارے حقائق بتاتا چلا گیا...... اور وہ دکھی دل کے ساتھ بے جان سے سب کچھ سنتے گئے۔

''اوہ...... اتنا کچھ ہو گیا اس کے ساتھ......''

''جی! صدمے جھیلنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے پھر بھی یہ لڑکی معجزاتی طور پر ہوش میں آگئی ہے...... اور مجھے کیا پورے میڈیکل بورڈ کو امید ہے کہ یہ بہت جلد اصل زندگی کی طرف واپس آئے گی......'' ڈاکٹر راحیل نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ رپورٹ اپنے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

اور واپسی کا سفر اعزاز شاہ کے لیے بہت بوجھل تھا۔

''اف...... کس قدر صدمے جھیلے ہیں اس نے اپنی ذات پر......'' وہ گاڑی آہستہ، آہستہ ڈرائیو

کرتے ہوئے تشمیرہ کے بارے میں سوچ رہے تھے...... ''میں خود کو اس زمانے کا مظلوم ترین آدمی سمجھتا رہا...... شراب اور غلط دوستوں میں خود کو گنوا دیا...... میری اور اس کی محرومی میں کیا فرق ہے پر اس نے خیر کا راستہ چنا۔ میں بابا کو تکلیف دینے کی کوشش میں خود کو اذیت دیتا رہا...... صرف ان کی پسند پہ شادی کی...... باقی سب کچھ اختیار تو میرا تھا ناں مگر میں بھی کیا کروں...... بچپن کے تین سال تو ماں کی محرومی میں گنوا دیے اور ایک مہربان اجنبی کا سہارا ملا تو وہ وقتی تھا...... وہ خواب تھا یا سایہ تھا... وہ خود کلامی کر رہے تھے۔

''میری اپنی ماں مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور اب ان کے لیے میرے دل میں گنجائش بھی نہیں ہے......''

''مگر اعزاز تمہارے بابا تو ہیں ناں......'' ضمیر پکارا۔

☆......☆......☆

ہوٹل کے اندر اطالوی آرکسٹرا دھنیں بجا رہا تھا...... میوزک دھیمے سروں میں بج رہا تھا اجنبی موسیقی بھی، کبھی اچھی لگتی ہے...... اپنائیت کا احساس دلوں میں لیے، سمندر کے درمیان گھرے اس ہوٹل میں وہ سمندر میں اٹھتے جوار بھاٹے کو دیکھ رہا تھا...... بپھرتی لہریں غضبناک ہو کر آگے بڑھتیں اور پھر ساحل پہ...آ کر دم توڑ دیتیں......

کبھی، کبھی اندر اور باہر کا موسم ایک سا ہو جاتا ہے...... نہ اندر کی بات باہر آتی ہے اور نہ الفاظ زندگی پاتے ہیں یہ ہوتا ہے زندگی میں اور ضرور ہوتا ہے...... بس وقت اور حالات کا پتا نہیں ہوتا۔ اس وقت ریبال کی کیفیت بھی عجیب تھی۔

جینی نے کانٹے کو میز پر بجاتے ہوئے اسے چونکا دیا۔

''کیا ہوا مسٹر ریبال...... آپ اس قدر سوچ میں گم صم کیوں ہیں......؟'' وہ مسکراتے ہوئے بڑے سکون کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''نہیں...... کچھ نہیں۔'' وہ اپنی کھوئی، کھوئی کیفیت سے باہر نکلتے ہوئے بولا...... ''یہ سب کیا ہے؟'' پھر اس کے نئے حلیے کی طرف اشارہ کرنے لگا۔

''یہ سب...... آپ کو اچھا نہیں لگا......؟'' وہ حیرت سے بولی...... مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ ویسے ہی جمی تھی...... ''حالانکہ یہ سب آپ کی خاطر ہے......''

''میری خاطر......؟'' وہ شاکڈ ہوا۔

''جی ہاں...... آپ کے لیکچر سن، سن کر...... اس حال کو پہنچی ہوں......''

''اوہ...... یہ تو بہت اچھی بات ہے......'' وہ داد دیتے ہوئے بولا۔

''اور آج میری سالگرہ ہے میں بائیس (22) سال کی ہوگئی ہوں......''

''اوہ...... بہت مبارک ہو......!'' ریبال نے خوشی سے اس کی طرف دیکھا...... تب جینی نے مسکراتے ہوئے گرمجوشی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا...... ایک لمحے کو ریبال نے اس کے بڑھے ہاتھ کو دیکھا اور پھر خوشی سے تمتمائے چہرے کو......

جانے کیا سوچ کر ریبال نے غیر محسوس طریقے سے اس کے خوب صورت ہاتھ کو تھام لیا...... اس کے ہاتھوں کے لمس میں زندگی، محبت اور روشنی تھی اور جب ریبال نے اس کا ہاتھ دھیرے سے چھوڑا تو جینی کتنی ہی دیر اپنے ہاتھوں کو وارفتگی سے دیکھتی رہی پھر بولی تو جیسے ریبال کو اپنی سماعت اور بصارت دونوں پہ شک ہوا۔

وہ کہہ رہی تھی بالکل صاف انگریزی اور اردو کی ملی جلی کیفیت میں......

''میں اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں......''

''ہاں میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں......''

''میں اسلام کے دائرے میں آنا چاہتی ہوں......''

''اور میں آپ کے ہاتھوں پر اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں...... کیا آپ میری مدد کریں گے......؟''

ریبال سے پہلی ملاقات سے آخری ملاقات تک وہ جتنے سوالات کرتی رہی تھی...... اس کا حاصل

یہ جملہ تھا جو جینی ادا کر چکی تھی۔ اقرار کر رہی تھی……

ٹیبل پر جوس اور لزانیہ کی ٹرے ویسے ہی دھری تھی…… کیک کی موم بتیاں چلنے کو بے قرار تھیں اور ریبال رمضان کے اس آخری عشرے میں یہ سعادت حاصل کرنے کے لیے فوراً تیار ہوگیا…… وہ جینی کو اٹھنے کا اشارہ کرکے آگے بڑھ گیا۔ جینی اس کے پیچھے خوشی سے جھومتی آگے بڑھی۔

”میڈم…… آرڈر سرو کردیا ہے…… ٹھنڈا ہو رہا ہے……“ ویٹر نے مؤدب ہوکر اس سے کہا۔

”اس کا روزہ ہے اور میرا روزہ کھل رہا ہے……“ وہ ہنستی ہوئی پل پے کرتی…… اس کے قدموں کی دھول بنی اس سے جا ملی اور بیرا ہکا بکا اس کے عمل پہ غور کرتا ہوا ٹیبل سے اشیا سمیٹنے لگا…… اس کی بارہ سالہ ملازمت میں ایسے کسٹمرز کبھی نہ آئے تھے…… یہ عجیب لوگ تھے، باہر سمندر کا شور بڑھتے، بڑھتے تھم گیا تھا۔

بے قرار موجوں کو سکون آگیا تھا…… لہروں کے آنے جانے میں تیزی نہیں تھی۔

☆……☆……☆

نیند اس کی پلکوں سے الجھتی رہی اور رات گزرتی رہی…… سونے کی خواہش میں نیند اور خفا ہوتی رہی۔ وہ سر کو خود ہی دباتے ہوئے سوچتا رہا…… صبح سے شام تک کا منظر اس کی آنکھوں میں بس گیا تھا۔ جینی کا فون، ریسٹورنٹ میں اس کا بلانا…… حجاب و عبایا کے ساتھ اس کا روپ اور پھر زندگی کا حیرت انگیز لمحہ…… واقعی وہ اسلام قبول کرچکی تھی…… وہ اسے لے کر ہیمبرگ کی اس واحد مسجد میں آیا تھا جو خاصی قدیم تھی اور اس کی تاریخ بہت پرانی تھی۔

امام مسجد مجدد عامر یوسفی کو یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی کہ ایک عیسائی لڑکی مسلمان ہونا چاہتی ہے اور اسلام قبول کرنا چاہتی ہے اور جب جینی سے ان کی ملاقات کروائی گئی تو امام مسجد نے پوچھا۔

”تمہیں کس چیز نے اس طرف راغب کیا کہ تم اللہ کے اس مذہب کو اپناؤ جو سب سے پسندیدہ مذہب ہے……“ تب جینی نے بلا جھجک ریبال کا نام لے دیا۔

”میں مسٹر ریبال کے کردار و عمل سے بے حد متاثر ہوں اور میں نے ہر لمحہ انہیں اس طرح پایا…… جس طرح میں سوچتی تھی۔ ان کی آنکھوں میں شرافت ہے…… دیانت ہے…… انہوں نے کبھی میرے ساتھ اس زبان میں بات نہیں کی جو میں نے چودہ سال کی عمر میں اپنے باپ کے منہ سے سنی…… اس ایڈوانس ملک میں جہاں حرام، حلال یکجا ہوجاتے ہیں…… مسٹر ریبال کا خصوصی وصف میں نے ان کے نفس پہ کنٹرول دیکھا۔ انسان کمزوریوں کا مرقع ہے مگر سر یہ فرشتہ ہیں…… اینجل ہیں، میں انہیں کھونا نہیں چاہتی…… پانا چاہتی ہوں…… اسلام کو اور مزید پڑھنا چاہتی ہوں۔ میں سچی مسلمان بننا چاہتی ہوں……“ وہ صاف گوئی سے سب کچھ کہہ گئی جو اس کے دل میں تھا اور اب زبان پر۔

ریبال کی پیشانی عرق آلود ہوگئی تھی…… اسے اپنا وجود تھرتھراتا ہوا محسوس ہوا۔ امام مجدد عامر یوسفی نے ریبال کو گلے لگالیا…… اور محبت سے اس کا شانہ تھپکتے رہے۔

”بیٹا تم نے کتنا عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ واقعی تم بڑے انسان ہو۔ میں تمہیں سلام پیش کرتا ہوں۔“ نمازِ مغرب کے لیے آنے والے تمام مسلمان جمع ہوگئے تھے۔

امام صاحب نے جینی کو کلمۂ طیبہ پڑھایا…… جو اس نے بڑی عقیدت سے ادا کیا…… امام صاحب نے اس کا اسلامی نام ریبال سے پوچھ کر جہاں نور رکھا…… مسجد کے احاطے میں مبارکباد کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ امام صاحب نے کھجور اور مٹھائی تقسیم کی…… مبارک، سلامت کا شور گونجتا رہا…… امام صاحب کی بیگم ہاجرہ مسعود مسجد کے اندرونی احاطے میں گوشہ نشین تھیں۔ ”جہاں نور“ نے ان کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کی۔ بیگم ہاجرہ مسعود نے جہاں نور کو

خوب صورت نگینوں کا سیٹ اور سوٹ دیا اور بہت محبت و چاہت کے ساتھ رخصت کیا......

''میں تمہیں گھر تک چھوڑ دیتا ہوں......'' وہ وہاں سے نکلنے لگے تو ریبال نے چلتے ہوئے اس سے کہا۔

''سنو ریبال بیٹا......'' اسی لمحے امام صاحب نے اسے آواز دی۔ وہ مڑا اور ان کی طرف آگیا۔

''دیکھو یہ لڑکی بہت نازک اور حساس ہے۔ اس نے تمہاری وجہ سے اسلام قبول کیا ہے۔ اسے کسی بھی موقع پر یہ احساس نہ دلانا کہ تم اس کے ساتھ نہیں ہو...... تمہارا عمل اور تمہارا کردار اس کے لیے روشنی ہے...... ورنہ دل ٹوٹنے پر یہ واپس اندھیرے کو گلے لگا سکتی ہے لہٰذا اپنی اس نیکی کو رائگاں نہ جانے دینا...... بیٹا تم نے بہت بڑا منصب پالیا ہے۔ اتنی کم عمری میں کسی کے لیے مثال بن جانا تمہارے لیے امتحان ہے۔ ہمیشہ اس امتحان میں سرخرو رہنا۔''

امام صاحب کے الفاظ اس کے دل و دماغ میں چلتے رہے اور وہ راہ چلتے پتھروں سے خود کو بچاتا ہوا...... جینی جو اب جہاں نور بن چکی تھی کے ساتھ خاموشی سے قدم بڑھاتا کتنا سفر طے کر گیا، راستے میں کتنی رکاوٹیں تھیں جنہیں وہ عبور کر کے آگے بڑھ گئے تھے۔ آج کل یہاں کا موسم بھی پاکستان کی طرح گرم اور شدت لیے ہوئے تھا۔

''آپ اس قدر خاموش کیوں ہیں......؟ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے......'' اس کی آواز میں بھی نیا پن تھا...... وہ پچھلا لہجہ کہیں کھو چکی تھی...... وہ صرف اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

''کچھ نہیں...... بس میں خاموش رہنا چاہتا ہوں......'' وہ یہ سوچ کر بھی کہہ نہ سکا۔

''آج کا دن تمہارے لیے بہت اہم ہے...... تم سب کچھ کہو......'' وہ مسکرا کر گویا ہوا۔

''ہاں، میں آج بہت خوش ہوں...... میرا ایمان مضبوط ہو گیا ہے......''

''اتنی جلدی اور ایمان......؟'' وہ حیران ہوا......

''میری روح بہت آسودہ ہے......'' وہ چلتے، چلتے مڑی اور رک کر بولی۔

اس کی آنکھوں میں آسودگی دکھائی دے رہی تھی۔ ''آپ کو معلوم ہے ایمان کے تقاضے......؟'' پھر جلدی سے بولی...... ''میں بتاتی ہوں۔ پتا ہے کیا...... اسلام میں ایمان کے درجے بہت اہم ہیں...... جب میں نے تمہارے مذہب اسلام......'' پھر وہ ایک دم رکی اور پھر مسکراتے ہوئے بولی...... ''میرا مذہب اسلام' ایمان کے تقاضے بتاتا ہے؟''

''کیا ہیں ایمان کے تقاضے......؟'' ریبال اس کی معلومات میں دلچسپی لینے لگا...... سفر اچھا لگنے لگا۔

''سورۂ بقرہ میں ہے......'' ایمان والے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے شدید محبت کرتے ہیں......'' اور سورۂ الماعون میں ہے۔ ''وہ فضول باتوں اور فضول کاموں سے بچتے ہیں......'' اور سورۂ فرقان میں ہے۔ ''امانت اور عہد کی حفاظت کرتے ہیں...... اور سورۂ یوسف میں ہے...... ایمان والے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے......'' کچھ وقفہ دے کر وہ مزید بولی۔

''اور سورۂ حجرات میں ہے ''کسی کو حقیر جان کر اس کا مذاق نہیں اڑاتے'' اور سورۂ فرقان کو جب میں نے مزید پڑھا تو معلوم ہوا کہ ایمان والے کسی کو بدنام کرنے کے لیے اس کا برا نام نہیں رکھتے اور بنی اسرائیل کو دیکھیں تو وہ سورۂ کہتی ہے کہ ایمان کے تقاضے یہ بھی ہیں کہ بے جا مال نہیں اڑاتے...... اور سورۂ لقمان میں بھی ارشاد ہوا ہے ''دوسروں سے بے رخی سے پیش نہیں آتے...... ایمان کے تقاضے یہ بھی ہیں کہ وہ گفتگو کرتے وقت آواز میں اعتدال رکھتے ہیں یعنی ایمان والے......'' جہاں نور نے روانی سے ایمان کے تقاضوں پہ روشنی ڈالی...... ریبال حیران، حیران اس کم عمر لڑکی کو دیکھنے لگا...... جس کی زندگی میں کتنا بڑا انقلاب آگیا تھا۔

مکمل لباس سے بے نیاز، حرام چیزوں کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

عادی...... وہ جینی تو کہیں روپوش ہو چکی تھی...... وہ خاموش چلتا رہا......

''یہ آپ میرے اسلام قبول کرنے سے اتنے گم صم کیوں ہو گئے ہیں ریبال صاحب......؟''

وہ اسے جھنجوڑنے لگی......

''نہیں ہرگز نہیں...... میں سوچ رہا تھا کہ تم اتنی اچھی گفتگو کیسے کرنے لگی ہو۔'' وہ متانت سے مسکرایا۔

''قرآن کا مطالعہ کیا ہے اور آپ ہیں میرے محسن...... آپ کے بغیر تو میں کچھ بھی نہیں...... اگر آپ نہ ہوتے میری زندگی میں تو میں بھٹکتی رہتی...... اور یونہی بھٹکتے، بھٹکتے کسی شراب خانے میں یا کلب میں زندہ دفن ہو جاتی...... میں نے اس اللہ سے...... جس کے لیے میں آپ سے جھگڑا کرتی تھی...... بہت منتوں سے بہت کچھ مانگا ہے...... اور اس نے مجھے دے دیا ہے...... اور وہ بہت کچھ دے گا...... کیونکہ آپ کو ابھی میں نے بتایا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے شدید محبت کرنے لگی ہوں اور وہ محبت کرنے والوں کی محبت کو رد نہیں کرتا۔ یہ میرا ایمان ہے۔'' وہ وثوق سے بولی۔

اس کے لہجے میں توازن تھا...... اور چہرہ نور سے روشن ہو رہا تھا۔ آخری چاند کی کرنیں ان کے وجود پہ پڑ رہی تھیں...... جہاں نور کا سراپا اعتماد اور یقین کی دولت سے مالا مال تھا۔

ریبال اسے ہاسٹل پہنچا کر اپنے اپارٹمنٹ میں آ گیا تھا...... مگر آتے آتے جہاں نور کی آنکھوں کی قندیل لے آیا تھا...... جس کی جوت نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ وہ بہت کچھ سمجھ رہا تھا۔ وہ اس امتحان میں کیسے پورا اترے گا...... نیند مہربان نہ ہوئی تو وہ جائے نماز بچھا کر خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔

دعا مانگتے ہوئے اسے تشمیرہ کا خیال آیا...... وہ اس کے لیے دعا مانگنے کے بعد جائے نماز پہ ہی نیم دراز سا ہو گیا۔

''اوہ......'' ایک دم اسے امی کے فون کا خیال آیا...... اس کے ذہن سے کتنا کچھ محو ہو گیا تھا...... وہ جہاں نور کے اس اقدام پر اپنا گزشتہ کل بالکل بھول گیا تھا......

''وہ بتا رہی تھیں کہ تشمیرہ سے ان کا رابطہ بالکل نہیں ہو رہا ہے...... محلے والے کہہ رہے تھے کہ اس کے ساتھ بڑا حادثہ پیش آیا ہے...... اس کے شوہر کو شادی والے دن کسی نے قتل کر دیا...... اس کی شادی کیسے ہو سکتی ہے......؟ اس نے مجھے بھی بتایا نہیں......''

وہ بے حد ڈسٹربڈ تھا...... ''کیا ہم ایک دوسرے کے دل میں نہیں تھے......؟'' اس نے خود سے سوال کیا؟

''خالہ زینب نے جب عروج سے میری شادی کا فیصلہ کیا تو تب بھی میں نے اسے لاعلم نہیں رکھا تھا...... پھر میں ہر، ہر مرحلے پر اسے بتاتا رہا اور کالز بھی کیں...... ایس ایم ایس کا تبادلہ بھی ہوا مگر کہاں ہے وہ......؟ اس کے تایا جی کا بھی پتا نہیں......؟ گھر بھی بند ہے......؟ اللہ خیر...... تشمیرہ تم بالکل خیریت سے ہو......'' اس نے شدت سے تشمیرہ کے لیے دعا کی...... وہ اسے ہمیشہ سے مظلوم لگی تھی...... وہ چاہتا تھا وہ اسے سمیٹ لے...... مگر وقت سے پہلے وہ کسی کو وعدے اور عہد کا پابند نہیں بنانا چاہتا تھا...... جانے وقت کیا فیصلہ کرے۔

''کس سے معلوم کروں تشمیرہ کے بارے میں...... ہاں اعزاز شاہ......!'' اس کے ذہن میں یہ نام چمکا...... وہ تھوڑا مطمئن ہوا تو نیند بھی مہربان ہونے لگی...... سارے دن کا تھکا ہوا تھا...... وہ حال سے غائب ہوتا گیا اور نیند غالب آ گئی...... باہر رات کا پردہ سرکنے لگا......

☆......☆......☆

چھبیسویں روزے کا دن بہت طویل تھا......

مہرالنسا بیگم نے گھر کو صاف ستھرا کر کے چمکا دیا تھا......

محلے کی لڑکیاں ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے آ گئی تھیں...... آج کے دن وہ دعوتِ افطار کا بہت اہتمام کرتی تھیں...... ظہر کی نماز کے بعد قرآن خوانی اور درود شریف کی تسبیحات پڑھی جاتیں اور پھر افطاری

کروائی جاتی...... آج انہیں اپنی اماں بہت یاد آرہی تھیں' زینب اور وہ مل کر امی کے ساتھ کام کرتے' وہ کھلے ہاتھوں سے زکوٰۃ اور کپڑے بھی تقسیم کرتیں۔ کتنی رونق ہوتی تھی۔

انہوں نے آہ بھری...... زینب کیسی بھی سہی مگر تھی تو ان کی بہن، ان کا خون کیسی، کیسی چالیں چلی تھیں ان کے خلاف مگر عجیب بات یہ تھی کہ وہ کامیاب نہ تھی اور ان کے حالات میں تنگی آتی جارہی تھی' اس کی تربیت کا عکس بچوں میں پرورش پا گیا تھا۔ بیٹا چوری چکاری میں کئی بار جیل جا چکا تھا...... اور بیٹی کی جوانی ماں سے بہ آسانی کھیل رہی تھی......

''وہ ایسی کیوں تھی......؟'' انہوں نے سوچا......

''ہمارے گھر میں تو کوئی ایسا نہ تھا نہ ابا نہ اماں...... دور دور تک کوئی ایسا نہ تھا...... اماں نے اسے کتنے ناز سے پالا تھا...... مگر غلط لڑکیوں کی صحبت نے اسے بگاڑ دیا تھا...... وہ تو ایک دفعہ گھر سے بھاگ بھی چکی تھی مگر ابا کے دوست نے اسے ریلوے اسٹیشن پر پکڑ لیا تھا......

اور تب سے وہ اپنی ناآسودہ خواہش کے مکمل نہ ہونے پر باغی ہو چکی تھی...... اپنی من مانی کرنا اس کا شعار تھا...... شادی بھی اس نے اپنی چالاکی سے کی تھی مگر قسمت سے مار کھا گئی اور پھر حسد اور لالچ نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی...... اسے اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا...... کیسی بہن ہے میری...... ماں جائی ہو کر بھی اسے کوئی درد نہیں......'' مہرالنساء نے اپنے آنسو پونچھے اور درود شریف کی تسبیح کے دانے پڑھنے لگیں۔

''میں نے تو اپنے ریبال کا رشتہ بھی منظور کر لیا تھا...... مگر وہ تو گھر سے ہی بے دخل کر رہی تھی...... یا اللہ تیرا شکر تو نے ہمیں بچا لیا...... ورنہ آج کیا ہوتا......'' وہ کانپ کر رہ گئیں...... بیل ڈور اچانک زور سے بجی تو وہ چونک گئیں۔

دروازہ نیم وا تھا...... خواتین کی آمد جاری تھی...... کوئی اجنبی معلوم ہوتا ہے......

''آنٹی باہر کوئی صاحب ہیں...... آپ کو پوچھ رہے ہیں......''

''صاحب...... یہ شاید اعزاز ہو......'' وہ مسکرا دیں...... ''اچھا......!'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ تسبیح ہاتھ میں تھامے وہ دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ ادھ کھلے دروازے پر صاف ستھرے لباس میں ملبوس وہ اعزاز تھے جن کا رخ گھر کی طرف نہیں تھا۔

''ارے آجاؤ اعزاز بیٹا...... باہر کیوں کھڑے ہو......'' اعزاز نے ان کی آواز سن کر رخ ان کی طرف کیا......

''السلام علیکم...... امی!...... بس...... وہ چلوں گا۔ آپ کو یہ سامان دینے آیا تھا......'' وہ ایک شاپر آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔

''ایسے نہیں بیٹا...... اندر آؤ......'' ''اتنی جلدی میں کیوں ہو...... چلو اندر آؤ تھوڑی دیر بیٹھو بیٹا...... مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ میرا بیٹا باہر سے ہی چلا گیا......'' وہ بہت پیار سے کہہ رہی تھیں۔ وہ اعزاز کی بات سنی ان سنی کرتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

''اچھا...... اچھا...... آپ ناراض نہ ہوں بیٹھ جاتا ہوں...... لیکن سنیں میرے ساتھ میرے انکل بھی ہیں۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولے...... ''اور روزے میں اچھا نہیں لگتا......''

''ہاں، ہاں...... بیٹا انہیں بھی بٹھا لو...... تمہارا اپنا گھر ہے......''

''امی رہنے دیں، وہ باہر گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں......''

''ارے تو بیٹا اعزاز انہیں بھی اندر لاؤ...... کیا غیریت والی باتیں کرتے ہو...... چلو آؤ بٹھاؤ...... میں آتی ہوں......'' وہ خفگی اور پیار سے ڈانٹتے ہوئے بولیں۔

اعزاز ان کے احترام میں مزید کچھ نہیں بولے...... انہیں معلوم تھا وہ اسے ایسے نہیں جانے دیں گی۔ وہ انکل کو زبردستی لے کر اندر آگئے تھے......

انہوں نے بہت منع کیا...... مگر اعزاز کی بات رکھ لی اور اندر چلے آئے...... سادہ سا گھر تھا مگر خوب صورت اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم بھی سادگی کا مرقع تھا......

''انکل یہ میرے دوست ریال کا گھر ہے...... وہ آج کل جرمنی میں ہے...... آنٹی سے مجھے بہت لگاؤ ہے...... پتا نہیں کیا بات ہے ان میں...... آپ کو بتاؤں...... مجھے یہ بالکل اپنی ماں جیسی لگتی ہیں......''

محب اللہ دلچسپی سے اعزاز شاہ کو دیکھ رہے تھے...... جوان خاتون کے بارے میں بتا رہا تھا...... جن سے ملنے کا انہیں بھی اشتیاق ہو رہا تھا۔

''اور میں انہیں امی کہتا ہوں......'' ایک کم عمر لڑکا ٹرے میں دو گلاس ٹھنڈے مشروب لیے آیا تو دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا......

''انکل انہیں معلوم ہے میں روزہ نہیں رکھتا اور آپ تو خیر رکھتے ہی نہیں ہیں...... اس لیے بلا تکلف جلدی سے پی لیں ورنہ ان کے سامنے شرمندگی ہوگی......'' انہوں نے مسکراتے ہوئے فوراً گلاس لبوں سے لگالیا...... انہوں نے خالی گلاس واپس ٹیبل پہ رکھا تو قدموں کی آہٹ کے ساتھ ایک باوقار خاتون کمرے میں داخل ہوئیں...... اعزاز شاہ ان کے احترام میں فوراً کھڑے ہوگئے۔

''امی آپ کیسی ہیں...... ریال ٹھیک ہے ناں......؟''

''ہاں بیٹا...... اللہ کا شکر ہے......'' پھر ان کی نظر محب اللہ صاحب کی طرف گئی۔

''آپ......!'' وہ انہیں ہی دیکھ رہے تھے...... یاد کے کئی لمحے سامنے آگئے تھے...... مہرالنسا کو بھی بہت کچھ یاد آنے لگا تھا......

''آپ نے کنڈر گارڈن اسکول میں پڑھایا ہے ناں......؟''

''جی بالکل......!''

''میں محب اللہ ہوں...... آپ کو یاد ہے ناں...... ایک بچے کو لے کر میں آپ کے پاس آیا تھا......''

''جی بالکل یاد ہے...... وہ بہت معصوم اور پیارا بچہ تھا...... اس کی ماں نہیں تھی...... اب کیسا ہے وہ بچہ......؟ اب تو بڑا ہوگیا ہوگا......'' ان کی آنکھوں میں خوب صورت لمحے زندہ ہوگئے تھے...... وہ بچہ ماں کی ممتا سے محروم ان کے پاس آیا تھا......

مگر مہرالنسا نے اسے بہت محبت اور پیار کے لمس سے دوسرے بچوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اس پہ خصوصی توجہ دی تھی...... اسے بالکل اپنے بچے کی طرح پالا تھا...... پرورش کی تھی اور جب محب اللہ اسے لے کر گئے تو...... وہ کئی دن بے کل رہیں، بے قرار رہیں مگر ریال نے جلد ان کی توجہ ہٹادی......

''اس بچے سے ملنے کی خواہش ہے آپ کو......؟'' محب اللہ اپنی عادت سے مجبور ہوکر پھر کسوٹی کھیل رہے تھے...... اعزاز شاہ اپنے موبائل پر کسی سے بات کر رہے تھے مگر کان اسی طرف تھے۔

''ہاں میرا دل چاہتا ہے...... اس سے ملوں......'' وہ بڑی امید سے بولیں...... تو محب اللہ نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے کہا......

''یہ ہے وہ بچہ...... جس نے آپ کی گود میں...... آپ کی ممتا کی چھاؤں میں پرورش پائی...... دیکھیں قدرت نے آپ کو کہاں ملادیا ہے......''

''کیا......؟'' وہ اعزاز کی طرف بڑھا ان کا ہاتھ دیکھ رہی تھیں...... انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مہربان لمحے واپس بھی ہوسکتے ہیں...... اور اعزاز...... وہ تو دم بخود تھا......

''انکل آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں......؟''

''جی بیٹا......! میں بالکل درست کہہ رہا ہوں...... تمہاری ابتدائی پرورش انہی کے ہاتھوں ہوئی ہے یہ واقعی تمہاری امی ہیں...... تم نے صحیح کہا تھا......'' محب اللہ نے اعزاز کو یقین دلایا۔

اعزاز ایک دم اپنی جگہ سے اٹھے اور ان کے

گھٹنوں پہ اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے...... مہر النسا نے اپنا ہاتھ ان کے سر پہ رکھ دیا...... ان سے کچھ کہا نہیں گیا...... بس وہ چپ چاپ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں...... زندگی بھی کیا ہے...... کیسے لوٹ کر آجاتی ہے اچانک...... اس وقت ریبال دو سال کا تھا...... جب اعزاز ان کے پاس آیا تھا......

’’مجھے یونہی تو آپ سے پیار نہیں ہے ناں امی...... میں آپ کا بچھڑا ہوا بیٹا ہوں...... اور اس ملاپ پر میں بہت خوش ہوں......‘‘ وہ واقعی بہت خوش نظر آرہے تھے اور ان سے لاڈ کر رہے تھے...... ان کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگانے لگے...... ان کی آنکھوں سے اشک رواں تھے اور مہر النسا بیگم بھی آبدیدہ ہوگئی تھیں۔

’’بھائی صاحب آپ کا بہت شکریہ! آپ کا احسان ہے مجھ پر واقعی میں بہت شکر گزار ہوں آپ کی، آپ کا آنا اس وقت کسی نعمت سے کم نہیں۔‘‘

’’ارے ایسا نہ کہیں مہرو بھابی......!‘‘ محب اللہ نے اپنی زبان کو روکنا چاہا...... مگر الفاظ نکل چکے تھے......

’’مہرو بھابی......‘‘ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگیں...... یہ انہوں نے مجھے کیوں کہا......

’’میرا خیال ہے...... اب چلنا چاہیے اعزاز...... آج بہت کام ہیں......‘‘

’’جی چلتے ہیں......‘‘

’’امی میں پھر آؤں گا...... میرا آج جانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا مگر اس وقت مجبوری ہے میں ریبال کو فون کر کے بتاؤں گا میرا بھائی کتنا خوش ہوگا اور بابا کو بھی بتاؤں گا......‘‘ وہ جوش میں کہے جا رہے تھے۔

’’اب چلیں بیٹے...... بہت دیر ہو رہی ہے۔‘‘ محب اللہ نے اٹھتے ہوئے مہر النسا بیگم سے اجازت چاہی اور مہر النسا کے دل میں پھر بہت سارے سوال اٹھنے لگے تھے...... جواب محب اللہ کو دینا تھے مگر مصلحتاً وہ خاموش ہو کر واپس ہوگئے کہ اس وقت چپ رہنا ہی مناسب تھا...... اعزاز شاہ کا برسوں کا رکھا روزہ آج ٹوٹ گیا تھا۔

☆......☆......☆

’’سنو...... کچھ تکلیفیں ایسی ہوتی ہیں جن پر معاف تو کیا جاسکتا ہے مگر دوبارہ تعلق نہیں رکھا جاسکتا......‘‘ اس کے اندر پھر اس آواز نے کروٹ لی......

روزی کے دماغ میں اب بھی یہ الفاظ چسپاں تھے...... وہ اس معاملے میں بالکل مختلف تھی، وہ سراپا انتقام تھی...... وہ تکلیف کا جواب تکلیف سے دیتی تھی...... معافی، درگزر جیسے الفاظ کی اس کی لغت میں کوئی گنجائش نہیں تھی...... محب اللہ وہ شطرنج کا مہرہ تھا جو اس کے کام آسکتا تھا...... بہت ساری گرہیں کھل سکتی تھیں۔ وہ پورے کمرے میں چکراتی پھر رہی تھی...... اور ساتویں چکر میں اس نے یہ راز پالیا تھا کہ محب اللہ کے ساتھ تیکھا رویہ نہیں رکھنا...... اس سے کام لینا ہے۔ وہ سارے مسائل حل کرسکتا ہے...... وہ بہت سے رازوں سے پردہ اٹھا سکتا ہے۔

’’ہاں یہ ٹھیک ہے......‘‘ اس کے موبائل فون کی اسکرین فیضان شاہ کے نمبر سے چمک رہی تھی...... وہ مسکرادی...... ’’تم بچ نہیں سکتے...... تم بھی تو میری گڈ لک میں ہو......‘‘ کچھ سوچتے ہوئے اس نے فون ریسیو کیا۔

’’ہیلو فیضان شاہ...... کیا حال ہیں......؟ ہم تو آپ کے فیضانِ نظر کے لیے بے قرار ہیں......‘‘

’’یقین نہیں آرہا کہ آپ ایسی اچھی گفتگو بھی کرسکتی ہیں......‘‘ فیضان کی آواز میں بھی اشتیاق تھا۔

’’کیوں؟ کیا میں مشین ہوں......؟‘‘ وہ دلکش انداز میں پوچھ رہی تھی......

’’آپ مشین کی طرح کام کرتی ہیں۔ انسانی جذبات کو اتنی اہمیت نہیں دیتیں، تین سال سے آپ کو ایسے ہی دیکھ رہا ہوں...... بس ہر کام میں پیش، پیش اور کامیابی کے جھنڈے...... کیا کبھی آپ کا دل نہیں

چاہتا کہ سمندر کی لہروں کو دیکھیں۔ باغ میں پھولوں کو ہنس کر دیکھیں۔ کسی بچے کو آئس کریم کھاتا ہوا دیکھیں۔“

”بس کردیں...... بس کردیں......“ روزی واقعی ہنسنے لگی تھی۔

”ہنسا کریں...... مس روزی، آپ پہ ہنسی سوٹ کرتی ہے......“ فیضان کی آواز میں جذبات بول رہے تھے اور روزی کامیاب ہوچکی تھی۔

”میں نے آپ کے لیے ایک گفٹ لیا ہے اور گفٹ میں سوٹ ہے جو عید پر آپ کو پہننا پڑے گا اور آج ہم ”ریوالونگ“ میں ڈنر کررہے ہیں اوکے......!“ فیضان شاہ نے سارا پروگرام طے کرکے اسے بتادیا اور روزی نے مسکرا کر اوکے کردیا۔

فون بند ہوچکا تھا......

☆☆☆

آج ستائیسویں شب تھی...... عبادتیں، مناجاتیں اور مسجدوں میں آج شبِ گریہ بھی کریں گے...... روٹھے رب کو منائیں گے اور بہت کچھ پالینے کی خواہشیں بھی سر اٹھائیں گی‘ اشکوں کے ساتھ اپنی ضدیں منوائی جائیں گی...... اپنی بات منوانے کے لیے خدا کی خوشامد کی جائے گی مگر روزی کو ان سب باتوں سے کوئی سروکار نہ تھا......

وہ سراپا انتقام تھی‘ اسے ہر چیز اپنی مرضی کے مطابق مل جاتی تھی وہ اپنی جبیں کو سجدے میں جھکانے کی عادی نہیں تھی۔

سوشل میڈیا پہ برق رفتاری سے خبر وائرل ہوئی تھی......

تمام نیوز چینلز بھی اس خبر کو اہمیت دے رہے تھے۔

”پاکستانی نوجوان ریبال سے متاثر ہونے والی ایک جرمن لڑکی، جینی نے اسلام قبول کرلیا ہے...... اور اس کا نام بدل کر اسلامی نام ”جہاں نور“ رکھا گیا ہے......“

بار، بار یہ خبر تمام چھوٹے بڑے چینلز کی بھی زینت بنی ہوئی تھی۔

ریبال کی تصویر نیوز میں بار، بار دکھائی جارہی تھی...... اور جینی کی وہ تصویر جو اسلام قبول کرنے سے پہلے کی تھی اور حالیہ تصویر بھی حاصل کرلی گئی تھی۔

دنیا بھر میں اس اہم واقعے نے دھوم مچادی تھی۔ اسلام کے ماننے والوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ رپورٹر بڑھا چڑھا کر پیش کررہے تھے...... پھر ریبال کے کردار کو اجاگر کیا گیا تھا...... ریبال کے ساتھ پڑھنے والے تمام دوستوں سے تاثرات لیے جارہے تھے۔

ایک ایسی لڑکی جو کرسچن اور ہندو مذہب کے پس منظر سے تھی...... کا مسلمان ہونا حیرت انگیز بات تھی...... ٹکر چل رہے تھے کہ جہاں نور کا انٹرویو فوری کیا جائے...... ٹی وی پروڈیوسرز اور اینکرز نے ان دونوں تک پہنچنے کے لیے کوششیں تیز ترکردی تھیں۔

پاکستان میں ریبال کے تمام دوستوں نے کمنٹس اور Like کے ذریعے ٹائم لائن پہ اس کے لیے ڈھیروں مبارکباد اور دعائیں دی تھیں...... اپنے، اپنے بلاگز پہ سب نے اسلام کے زریں اصولوں کو واضح کیا...... اور مسلمان ہونا کتنا بڑا اعزاز ہے...... اس موضوع پہ اسٹیٹس ڈال دیے گئے تھے۔

وہ راستے میں تھا...... جب اس نے دیکھا...... پھر اعزاز نے غور سے تصویر میں ریبال کو دیکھا اور اسلام قبول کرنے والی لڑکی کو...... اسے یاد آگیا کہ جب وہ ریبال کے ساتھ اسکائپ پہ تھا تو یہی لڑکی اس کے عقب میں دکھائی دی تھی...... اس سے بات کرتے ہوئے......

”اوہ...... تو میرے دوست نے کمال دکھایا...... جیو میرے یار! یہ ہے ایک مسلمان کی شان...... واقعی تو میرا بھائی ہے......“ اسے ریبال پہ رشک آیا...... اسے امی کے ساتھ اپنے نئے رشتے اور تعلق پر فخر ہو رہا تھا

......تو وہیں ریبال کے اقدام نے اسے اور سرخرو کردیا...... گاڑی پورچ میں رکتے ہی وہ گاڑی سے باہر آیا...... تو فیضان شاہ بہت تیاری کے ساتھ باہر نکل رہا تھا......

"خیریت کہاں.........؟" اعزاز اسے دیکھ کر چونکے۔

"وہ بھائی ایک دوست کے ساتھ ڈنر ہے...... اس لیے فوراً ہی جارہا ہوں...... او کے ملتے ہیں واپسی پر......" کہتا ہوا وہ گاڑی لے کر تیزی سے نکلتا چلا گیا...... وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اندر داخل ہوئے تو ردا بیگم اعزاز شاہ کا انتظار کررہی تھیں۔

"میں تمہارا ہی انتظار کررہی تھی کہ تم آؤ... تو کھانا لگواؤں......" اعزاز شاہ نے ایک نظر انہیں دیکھا۔

"یہ میری سگی ماں ہیں...... اور میں کتنے عرصے ان کے بغیر اکیلے رہا...... انہیں احساس تک نہ ہوا...... صرف پیدا کرنا ماں کہلانا ہوتا ہے...... اور تربیت نہیں......؟" وہ صرف سوچ کر رہ گئے۔

"جی آتا ہوں...... آپ کھانا لگوائیں......" سعادت مندی سے کہا۔

وہ سیڑھیاں طے کرنے لگے جب ہی محب اللہ اور زوار سیڑھیوں سے اتر رہے تھے۔

"آج کہاں رہے تم سارا دن...... تمہاری شکل ہی نہیں دکھائی دی......" زوار شاہ نے انہیں دیکھتے ہی کہا...... محب اللہ ان کے جواب دینے سے پہلے ہی کہہ اٹھے۔

"بھئی میں بتاتا ہوں...... ۱۱ بجے صبح سے شام ۶ بجے تک ہم ساتھ تھے اور پھر اس کے بعد یہ موصوف کہاں گئے مجھے نہیں معلوم......" محب اللہ نے خوش دلی سے کہا......

"آج اس نے اپنے بچپن کی خوشیاں دریافت کی ہیں...... یقیناً انہیں سیلی بریٹ کررہا ہوگا...... کیوں اعزاز......؟" انہوں نے اعزاز سے پوچھا...... وہ سیڑھیوں پہ ٹھہر گئے۔

جاگتی آنکھوں کے خواب

جاگتی آنکھوں کے خواب
اور میری نظروں کے گلاب
اِک، اِک کرکے سبھی مرجھا گئے
میرے پاکیزہ گلوں کی
خوشبوؤں کے پاؤں میں
خوف کی نادیدہ سی زنجیر پہنادی گئی
خون میرے دل کے سب
معصوم جذبوں کا ہوا
اور آنکھ سے آنسو بہے
جاگتی آنکھوں کے سارے خواب
جن کو سوچ کر
مجھ میں میری زندگی لوٹ آئی تھی
وہ ادھورے ہی رہے
اور دے گئے دل کو عذاب
جاگتی آنکھوں کے خواب

شاعرہ، شگفتہ شفیق
مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

"تو کیا ان خوشیوں کو ہم سے شیئر نہیں کرو گے......؟" زوار شاہ نے بڑے مان سے کہا۔

"ان خوشیوں کا گہرا تعلق تم سے بھی ہے زوار......" ان کی سماعتوں میں محب اللہ کی آواز ٹکرائی...... وہ ان کی طرف رخ موڑ گئے...... اعزاز بھی حیران ہوئے۔

"کیسے......؟"

"مجھ سے کیسے تعلق ہے محب اللہ...... بتاؤ پلیز......"

"بالکل بتاؤں گا......" وہ ان کی بے چینی بھانپ کر انہیں دلاسا دیتے ہوئے بولے...... "ہم اطمینان سے بات کریں گے...... پہلے کھانا تو کھالیں...... وہ دیکھیں بھابی ہمارا انتظار کررہی ہیں......" انہوں نے ردا بیگم کی طرف اشارہ کیا جو ڈائننگ ٹیبل کے قریب کھڑی تھیں...... "آرہے ہیں بھابی بے فکر رہیں......" وہ تیزی سے سیڑھیاں

اترتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر سجی اشیا کو دیکھنے لگے...... زوار شاہ ایک اور اذیت ناک مرحلے میں سفر کرنے لگے...... محب اللہ انہیں کس بات کی سزا دے رہے تھے... مسلسل کچوکے لگانا اس کا مزاج بن گیا تھا...... حالانکہ وہ شروع سے ہی ایسے تھے۔

مگر عمر کے اس حصے میں زوار شاہ کو ان کی ہر بات ناگوار گزرتی تھی...... مگر وہ ان سب سے بے نیاز ٹھٹول کے ساتھ کھانے میں مصروف تھے...... اعزاز شاہ بھی آکر کھانے میں شامل ہوگئے تھے۔

''میرا خیال ہے فیضان آج ہمارے ساتھ ڈنر نہیں کریں گے......'' محب اللہ نے لزانیہ کا ٹکڑا کانٹے میں پھنساتے ہوئے کہا۔

''جی انکل......! وہ اپنے دوست کے ساتھ ڈنر پہ مدعو ہے...... اسے آنے میں دیر ہوجائے گی۔'' اعزاز سنجیدگی سے بتانے لگے۔

''ذرا ٹی وی تو آن کرو......'' زوار نے کہا تو ردا بیگم نے کھانا کھاتے ہوئے ریموٹ سے LCD کا بٹن آن کردیا...... نیوز چینل پر ریبال اور جینی (جہاں نور) کی رپورٹ دکھائی جارہی تھی......

محب اللہ نے ریبال کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اعزاز یہ تمہارا وہی دوست ہے ناں ریبال...... جس کی امی سے ہم آج ہی ملے تھے......'' انہوں نے تصدیق چاہی۔

''جی انکل......!''

''مہرالنسا صاحبہ کا بیٹا......''

زوار شاہ کے حلق میں نوالہ اٹک گیا تھا۔

☆......☆......☆

جو ہو سکے تو میرے دل اب اِک وہ قصہ بھی
ذرا سنا کہ ہے کچھ ذکر جس میں تیرا بھی

اپنے حریف کا مقابلہ انسان دو طرح سے کرتا ہے...... ایک تو خود کو مقابل سے ہر لحاظ سے بہتر ثابت کرکے یا پھر اسے سب کی نظروں سے گرا کر......

عیدالفطر صرف دو دن کے فاصلے پر تھی...... اور زینب خالہ کا گھر وحشت اور ویرانی کا نظارہ پیش کررہا تھا......

انسان ساری زندگی خوش نہیں رہ سکتا...... زینب خالہ کی خوشیوں کی عمر بھی بہت کم تھی...... جو خوشیاں انہوں نے اپنی مرضی سے حاصل کیں...... جبراً اور زبردستی سے حاصل کیں اس میں صرف ان کی ذاتی پرخاش تھی...... رشتوں کی موت کبھی قدرتی نہیں ہوتی...... انہیں انسان خود مارتا ہے...... کبھی نفرت سے، کبھی نظر اندازی سے...... کبھی غلط فہمی سے...... انہوں نے کبھی قناعت پسندی کو نہیں اپنایا......

بس حسد، لالچ، آسمانوں پہ اڑنے کی خواہش میں کتنے دل برباد کیے...... اور ایک لمحہ بھی مڑ کر نہیں دیکھا کہ کس طرح کسی کے ارمانوں کا خون ہوگیا ہے...... گھر تباہ ہوگیا ہے دلوں میں دراڑیں پڑ گئی ہیں......

''اُف...... انسان کس قدر کمزور ہے......؟''

کسی لمحۂ فکر نے انہیں نہیں روکا...... ہمیشہ سے بھرپور نیند لی...... دوسرے کے مال پر ہمیشہ نظرِ بد رکھی...... ماں باپ، بہن سب کے ساتھ غداری کی مگر جذبۂ انتقام بڑھتا رہا...... جانے کس بات کا انتقام...... کبھی کبھی انسان اپنی خواہشات کا غلام بن کر خود اپنے آپ سے ہی انتقام لے رہا ہوتا ہے اور اسے پتا بھی نہیں چلتا یہی سب زیب النسا کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

شوہر کی آنکھوں پر ہمیشہ پٹی بندھی رہی...... مگر...... یہ پٹی اولاد نے کھول دی...... وہ ساری چالیں جو زندگی بھر وہ چلتی رہیں...... اب ان کی اولاد نے ان پر آزمادی تھیں......

بیٹا چوری ڈکیتی کے کیس میں جیل میں بند تھا...... بیٹی محبت کی جھوٹی زنجیر میں پاؤں زخمی کر بیٹھی تھی...... یہ کیسی عید تھی...... کیسی خوشیاں تھیں...... ان کے آنگن میں۔

(باقی آئندہ)

ہاں کہو کہ عید ہے

فریدہ سیفی

''میں تمہیں کیسا لگتا ہوں......؟'' حمدان نے آنکھوں میں اشتیاق بھر کے سوال کیا تھا۔

''بکواس۔'' پلوشہ نے فوراً جواب دیا تو وہ احتجاجاً رخ موڑ گیا۔ پلوشہ نے اسے دیکھا۔ وہ دراز قد تھا...... سرخ و سفید رنگت...... گھنی مونچھوں تلے مسکراتے عنابی لب اور شرارتی نگاہیں...... گھرے بھورے بال کشادہ پیشانی پر یوں آتے تھے کہ.... بے اختیار انہیں سنوارنے کو جی چاہے۔ خوب صورت،

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

وجیہہ، ہینڈسم، ایک مرد کی مردانہ وجاہت کو بیان کرنے کے لیے جس قدر الفاظ ڈکشنری میں موجود ہیں وہ ان سب کے مطابق تھا۔

''کیا برائی ہے مجھ میں...... کیا خرابی ہے میرے اندر......'' اب وہ پلٹ کر اس سے پوچھ رہا تھا۔ یہ بھی اس کی خوبی تھی کہ وہ پلٹ، پلٹ کر اس کی طرف ہی آتا تھا۔

''کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔'' پلوشہ نے اپنے شہد رنگ بالوں کی ڈھیلی ہوتی پونی کو دوبارہ کس کر باندھا۔

حمدان نے ایک ماہر وکیل کی طرح خرابیوں کی تفصیل نہیں پوچھی...... بلکہ اپنے حق میں دلائل دینے شروع کر دیے۔

''جو بے شمار پلس پوائنٹس ہیں، تم ان پر غور کیوں نہیں کرتیں...... نمبر ایک، میں تمہارے چچا کا بیٹا ہوں...... یعنی ہمارا خاندان ایک ہے، ذات برادری کا کوئی مسئلہ نہیں...... نمبر دو' میں اکلوتا ہوں...... نمبر تین' میں اسی گھر کے اوپر والے پورشن میں رہتا ہوں، تمہیں شادی کے بعد اپنے ماں، باپ سے دور نہیں جانا پڑے گا۔ نمبر چار......''

''بس......'' پلوشہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روکا۔

''یہی تمہارے نیگٹو پوائنٹس ہیں، نمبر ایک' تم میرے چچا کے بیٹے ہو اور میں کزن میرجز کے خلاف ہوں، خواہ مخواہ کی پرابلمز......'' اس نے ناک چڑھائی پھر مزید کہا۔ ''نمبر دو' تم اکلوتے ہو، میں بھی اکلوتی ہوں۔ ساری عمر میں تنہا رہی ہوں اب میں کسی بڑی فیملی میں شادی کرنا چاہتی ہوں، نمبر تین' شادی کے بعد بھی اگر میری لائف چینج نہیں ہوئی اور مجھے یہیں رہنا ہے تو کیا فائدہ...... ایسی شادی کا اور نمبر چار' سب سے اہم بات میرا اور تمہارا مزاج نہیں ملتا...... پسند ناپسند نہیں ملتی۔''

''اب اس میں میرا کیا قصور ہے کہ تم ہر وقت جلتے توے پر بیٹھی انگارے چباتی رہتی ہو اور میں ایک خوش مزاج انسان ہوں، اصل چیز ہوتی ہے محبت اور وہ میں تم سے کرتا ہوں۔'' حمدان نے کندھے اچکا کر محاوروں کا برمحل استعمال کیا اور اپنے ہی انداز میں اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''میں سڑیل ہوں تو تم کس خوشی میں میرے پیچھے پڑے ہو۔'' پلوشہ کو حسبِ معمول غصہ آ گیا۔ ''نہیں کرتی میں تم سے شادی، بھاڑ میں جاؤ تم۔'' وہ پیر پٹختے ہوئے واک آؤٹ کر گئی تھی۔

''دونوں مل کر جائیں گے...... ہنی مون پر......'' حمدان نے پیچھے سے بلند آواز میں اسے سنایا اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''یہ دل بھی کیا چیز ہے، ذلیل کروا کے رکھ دیتا ہے۔'' اس نے خود کو کوسا۔ ''کیا ہے آخر اس پلوشہ میں جو مجھے یہ اس قدر اچھی لگتی ہے۔ بس بڑی، بڑی آنکھیں جنہیں دیکھتے ہی ان میں ڈوب جانے کو دل چاہتا ہے۔ چھوٹی سی ناک جسے چڑھا کر جب وہ بولتی ہے تو خواہ مخواہ ہی اس پر پیار آ جاتا ہے۔ گالوں میں پڑنے والے ڈمپل جو جان نکالنے کو کافی ہیں۔'' وہ سوچتے، سوچتے پٹری سے اترنے لگا تھا۔

☆☆☆

چچی کی وفات تب ہوئی تھی جب حمدان ایف ایس سی میں تھا۔ کافی عرصے تک تو سعید چچا اور حمدان اس ناگہانی موت سے سنبھلے ہی نہیں تھے اور جب حالات کچھ معمول پر آئے تو سب جاننے والے اور رشتے داروں نے سعید صاحب پر بہت دباؤ ڈالا کہ وہ دوسری شادی کر لیں حتیٰ کہ حمدان کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ ایک عملی سوچ رکھنے والا سمجھدار لڑکا تھا جانتا تھا کہ باپ کو سہارے اور ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ اس لیے فضول کا جذباتی پن دکھانے کے بجائے اس نے ہر حال میں انہیں اپنی حمایت کا یقین دلا دیا تھا لیکن سعید صاحب کا دل ذکرِ الٰہی کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ وہ حلاوت اور مزہ جو انہیں اللہ کے ذکر سے نصیب ہوتا تھا اسے چھوڑ کر وہ دوبارہ دنیا کے جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اب کافی عرصے سے صورت حال یہ تھی کہ آفس کے اوقات کو

نکال کر باقی کا سارا وقت سعید چچا اور حمدان نیچے کے پورشن میں ہی ہوتے تھے اور جب رات ہوتی تو اوپر اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے جاتے۔ ان حالات میں جبکہ راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا اچانک حمدان کو پلوشہ سے محبت ہوگئی۔ اب اگر وہ اپنے طور پر صرف محبت کرتا رہتا پھر تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن وہ اللہ کا بندہ اس محبت کو عملی شکل دینے کے لیے اس سے شادی کی خواہش کا اظہار بھی کر رہا تھا۔

اور گھر میں سب بڑے اس کی اس خواہش پر دل و جان سے راضی تھے ..سوائے پلوشہ کے..... وہ ایک رومانویت پسند لڑکی تھی۔ جسے شادی کے لیے ناولوں والا ہیرو چاہیے تھا۔ وہ ہیرو جو چپکے چپکے ہیروئن کی سالگرہ مناتا ہے، کھانا پکا کر اس کے سامنے رکھتا ہے اور کسی بچے کے مانند ہیروئن کے سب لاڈ اور ناز نخرے اٹھاتا ہے، وہ کسی ایسے ہی ہیرو کی آمد کی منتظر تھی۔ لیکن حمدان نے سب کچھ چوپٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ پہلے بھی اسے کچھ خاص نہیں بھاتا تھا لیکن اب تو اسے دیکھتے ہی پلوشہ کو آگ لگ جاتی ..... وہ تو بھلا ہو حمید صاحب کا جنہوں نے اس رشتے کے لیے بیٹی کی مرضی کی شرط رکھ دی تھی۔ ورنہ رضوانہ بیگم کا تو بس چلتا تو چٹ منگنی پٹ بیاہ کر کے اسے اوپر والے پورشن میں دھکا دے دیتیں۔

''مما چاند نظر آ گیا ہے کل پہلا روزہ ہوگا۔'' پلوشہ نے کچن میں داخل ہو کر ماں کو اطلاع دی تھی۔

''چلو اللہ مبارک کرے.....'' رضوانہ بیگم نے روٹی بیلتے ہوئے بیٹی کو دیکھا۔ ''تم مان جاؤ تو اس عید پر تمہاری اور حمدان کی منگنی کر دیں۔''

''افوہ مما.....'' وہ بری طرح جھنجلائی۔ ''آپ سب تو میرے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں، یہ بتائیں پکایا کیا ہے؟'' اس نے آگے بڑھ کر پتیلی کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا اور چٹخارہ لیا۔ ''واؤ کریلے، گوشت۔'' رضوانہ بیگم نے آخری روٹی توے سے اتار کر دسترخوان میں لپیٹی ..... ''چلو کھانا لگاؤ۔'' انہوں نے پلوشہ سے کہا۔

''تائی..... کریلے پکائے ہیں آج آپ نے؟''

حمدان کی آواز.... پر پلوشہ نے چونک کر دیکھا وہ وہیں کھڑا پانی پی رہا تھا۔ اور کریلوں کا سن کر برے، برے منہ بنا رہا تھا۔

''ارے بھئی.....'' رضوانہ بیگم پیار سے بولیں۔ ''میں نے اپنے بیٹے کے لیے الگ ہنڈیا بنائی ہے۔''

''اوہ..... میری گریٹ تائی..... آئی لو یو۔'' وہ ہنستا مسکراتا ہوا کچن سے نکل گیا تھا۔

''مان جاؤ ناں وشی، دیکھو کتنا پیارا لڑکا ہے۔'' انہوں نے پلوشہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مما، میں ساری زندگی دو، دو سالن نہیں پکا سکتی.....'' اس نے پلیٹیں نکالنا شروع کیں۔

''جب پیار ہوگا تو دو، دو سالن بھی پک جائیں گے اور کریلے گوشت میں سے گوشت الگ کرنا تو بہت آسان ہے بیٹا۔'' رضوانہ بیگم ہنسیں۔

''پیار ہی تو نہیں ہے مما.....'' وہ کچن سے باہر نکل گئی۔

''وہ بھی ہو ہی جائے گا۔'' حمدان جو باہر ہی کھڑا تھا اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم ایک بار ہاں تو کرو۔''

''حمدان تم ہاتھ دھو کر میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔'' وہ جھنجلائی۔

''تم صفائی پسند ہو ناں اس لیے۔'' اس نے دانت نکالے۔

''افوہ.....'' وہ پاؤں پٹختے ہوئے ڈائننگ روم کی طرف بڑھی۔

☆☆☆

رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ اب روزمرہ کے معمولات میں عبادات کے اوقات بڑھ گئے تھے۔ اسٹڈی روم کے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے حمدان نے ٹھٹک کر دیکھا۔ پلوشہ جائے نماز پر بیٹھی دعا مانگ رہی تھی۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا دودھیا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

''تمہاری ساری دعائیں قبول ہو چکی ہیں

پلوشہ......'' وہ دروازے سے ٹیک لگائے وہیں کھڑا ہوگیا تھا۔

''کیا مطلب ......؟'' پلوشہ نے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دیکھا۔

''مطلب یہ کہ ایک بہت اچھا، پیارا اور ہینڈسم انسان تمہاری قسمت میں لکھا جاچکا ہے۔''

''تم کتنے خود پسند ہو حمدان......'' پلوشہ نے طنز کیا۔

''یعنی......!'' وہ ایک لمحے کے لیے رک کر شرارت سے مسکرایا۔

''تم یہ مانتی ہو کہ وہ بہت اچھا، پیارا اور ہینڈسم انسان میں ہی ہوں۔''

''حمدان میری ابھی تراویح رہتی ہیں۔'' وہ تنگ کر بولی۔ ''اور تم بھی کچھ اس رمضان کے مہینے میں عبادت کرلو تو شاید تمہاری قسمت بھی سنور جائے۔''

''مشکل ہے...... میرے نصیب میں تو ایک جھگڑالو، نک چڑھی لڑکی لکھی ہوئی ہے۔ بس اس کے ساتھ رہ کے صبر، شکر کروں گا اور سیدھا جنت میں جاؤں گا۔'' اس نے افسوس سے سر ہلایا تھا۔

''میں مانوں گی تب ناں......'' وہ حسبِ معمول بپھر گئی تھی۔ ''نہیں کرنی ہے مجھے تم سے شادی...... جاؤ یہاں سے۔'' حمدان کا قہقہہ بے ساختہ تھا بڑی مشکل سے ہنسی روک کر بولا۔

''یعنی تم یہ مانتی ہو کہ وہ جھگڑالو اور نک چڑھی لڑکی تم ہی ہو۔'' کہہ کر وہ بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ پلوشہ پیر پٹختی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

گھر میں ماشاء اللہ سب ہی روزہ رکھتے تھے۔ سب مرد تو اپنے، اپنے آفس چلے جاتے، گھر میں رضوانہ بیگم اور پلوشہ ہی رہ جاتیں۔ رضوانہ بیگم کی خصوصی تنبیہ تھی کہ روزے کے اوقات کو فضول کاموں میں ضائع کرنے کے بجائے زیادہ سے زیادہ ذکر تلاوت اور عبادت میں گزارہ جائے چنانچہ دن تو اسی مشغولیت میں گزر جاتا۔ افطاری کے بعد بھی برتن دھونے، کچن سمیٹنے کے علاوہ مغرب اور عشا کی نماز و تراویح کے دوران کسی اور چیز کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ انہی مصروف دنوں میں پلوشہ کو عید کی شاپنگ یاد آگئی تو اس نے ماں کو بھی یاد دلانا ضروری سمجھا اور اس کے لیے مناسب ترین وقت افطاری کے بعد کا تھا۔

''حمدان گھر پر ہی ہے، اس کے ساتھ چلی جاؤ شاپنگ پر......'' مما نے فوراً مسئلہ حل کردیا۔

''آپ نہیں چلیں گی؟'' پلوشہ نے پوچھا۔

''نہیں بھئی، مجھ میں ہمت نہیں ہے، میں تو بس تراویح کے بعد سونے کے لیے لیٹوں گی۔ سحری کے لیے بھی اٹھنا ہوتا ہے۔''

''اچھا۔'' پلوشہ خاموش ہوگئی۔

''اب کس سوچ میں گم ہوگئی ہو......'' رضوانہ بیگم نے ڈپٹا۔ ''ابھی چلی جاؤ عشا واپس آکر پڑھ لینا۔''

''اُفوہ مما...... آپ تو ہتھیلی پہ سرسوں جمانے لگ جاتی ہیں، چلی جاؤں گی پھر کسی دن۔'' وہ سستی سے بولی۔

''پلوشہ جوں، جوں دن گزرتے جائیں گے دکانوں پر رش بڑھتا جائے گا۔ آج تمہارا موڈ نہیں ہے کل حمدان گھر پر نہیں ہوگا۔ بہتر ہے آج ہی کام نپٹا لو......'' انہوں نے سمجھایا۔

''بس آپ کو یاد کیا دلا دیا، آپ بھی مجھے بھیج کے ہی دم لیں گی۔'' وہ منہ بنا کر اٹھ گئی تھی...... اور اب وہ اور حمدان مال میں گھوم رہے تھے۔ اتنی مغز ماری کے بعد جس طرح کے کپڑے وہ پسند کررہی تھی انہیں دیکھ کر حمدان کو تاؤ آرہا تھا۔

''ان میں سے کون سا زیادہ اچھا ہے؟'' پلوشہ نے دو سوٹ اس کے سامنے کیے۔ ایک ہلکا بادامی اور ایک ہلکا گلابی...... حمدان گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''کوئی بھی نہیں......!'' اور مڑ کر سلیقے سے رکھے اسٹینڈ میں سے ایک سوٹ نکالا۔ ''تم یہ کیوں نہیں لیتی ہو۔'' یہ فریش گرین اور گرے امتزاج کا خوب صورت ایمبرائڈرڈ سوٹ تھا۔ پلوشہ نے دیکھا اور منہ بنا کر

کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔

''اسے پیک کر دو۔'' حمدان نے پاس سے گزرتے سیلز بوائے کو سوٹ پکڑایا۔ اور پلوشہ کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے چند اور گہرے اور کھلتے رنگوں کے جوڑے بھی خرید ڈالے۔ وہ بس دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

اے سی آن تھا۔ ٹی وی لاؤنج میں گہری خاموشی تھی۔ پلوشہ مزے سے صوفے پر لیٹی کتاب پڑھ رہی تھی۔ جب حمدان سیٹی پر کوئی شوخ دُھن گنگناتا آدھمکا...... پلوشہ نے ناگواری سے اسے دیکھا...... سارا ماحول غارت کر دیا تھا اس نے...... وہ اب دوسرے صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی آن کر رہا تھا۔

''اب کوئی واہیات سی انگلش مووی لگا کر نہ بیٹھ جانا۔'' پلوشہ نے اسے اپنی موجودگی کی اطلاع دینی ضروری سمجھی تھی۔

''انڈین کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' حمدان مسکرایا۔

''پھر مجھے یہاں سے اٹھنا ہی پڑے گا۔'' پلوشہ نے جل کر کہا۔

''تو آپ یہاں کیا چلّہ کاٹ رہی ہیں جو یہاں آپ کی موجودگی ضروری ہے۔'' حمدان نے بھویں اچکا کر اسے دیکھا ساتھ، ساتھ وہ چینل سرچنگ کر رہا تھا۔

''تم اوپر اپنے پورشن میں جا کر ٹی وی دیکھو ناں...... '' پلوشہ نے بے مروتی کی انتہا کر دی۔

''وہاں مزہ نہیں آتا۔'' حمدان نے برا مانے بغیر صاف انکار کر دیا۔ پھر اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ویسے ایک تو بتاؤ پلوشہ، تم اتنے فضول حلیے میں کیوں رہتی ہو۔''

''کیا مطلب؟'' وہ تپ گئی تھی۔

''نہ تم ہاتھوں میں کچھ پہنتی ہو، نہ کانوں میں مطلب چوڑیاں، بندے وغیرہ، کپڑے بھی تم عجیب بے رنگ سے پہنتی ہو۔ زندگی سے آخر اتنی بیزار کیوں ہو تم؟''

''میں زندگی سے بیزار نہیں ہوں، یہ میرا اسٹائل ہے، مجھے واہیات قسم کے فیشن پسند نہیں۔'' وہ اترا کر بولی۔

''یہ واہیات قسم کے فیشن نہیں ہیں، بے وقوف!'' حمدان نے ڈانٹ کر کہا پھر نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ''تم کبھی گہرے اور شوخ رنگوں کے کپڑے پہن کر تو دیکھو ساتھ چوڑیاں، کانوں میں ائیر رنگز تم بے حد خوب صورت لگو گی۔'' وہ جیسے تصور میں اسے سجا سنورا دیکھنے لگا تھا۔

''میں ایسا کبھی نہیں کروں گی۔'' وہ تنک کر بولی۔

''لیکن مجھے یہ سب پسند ہے۔'' وہ بیچارگی سے بولا تھا۔

''یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔'' پلوشہ نے بے نیازی سے کہا۔

حمدان نے گہری سانس لی اور ٹی وی پر انگلش مووی دیکھنے لگا۔ ٹی وی دیکھتے ہوئے حمدان کی نظر ٹیبل پر پڑی کتاب پر پڑی جو پلوشہ چھوڑ گئی تھی۔ اس نے کتاب اٹھالی۔ ''آخر کیا پڑھ رہی تھیں میڈم۔'' اس نے کتاب کا ٹائٹل دیکھا۔ ''راجہ گدھ...... ہوں'' جہاں وہ نشان رکھ کر گئی تھی وہیں سے اس نے پڑھنا شروع کیا۔ ایک دو پیراگراف پڑھ کر ہی چکر آنے لگے تھے۔ گہری سانس لے کر کتاب واپس رکھ دی اور دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیکن ٹی وی تو محض پلوشہ کو جلانے کے لیے آن کیا تھا۔ ٹی وی بند کر کے وہ بھی اٹھ کر چلا گیا تھا۔

☆☆☆

بارش نے ایک دم ہی ماحول خوب صورت کر دیا تھا۔ پلوشہ لاؤنج میں کھڑکی کے سامنے مبہوت سی اللہ کی رحمت کو برستے دیکھ رہی تھی۔ اس کے شہد رنگ بال ہوا کے جھونکوں سے ہولے، ہولے ہلتے تھے۔

''بارش اچھی لگتی ہے ناں۔'' حمدان اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔

''ہاں۔'' اس نے مڑے بغیر جواب دیا۔

”آؤ بارش میں بھیگیں۔“ حمدان نے فرمائش کی۔

”مجھے بارش کو دور سے دیکھنا پسند ہے۔“ پلوشہ نے واضح کیا۔

”بارش کو دیکھتے ہوئے چائے پینا اور......“

”میں چائے نہیں کافی پیتی ہوں۔“ پلوشہ نے مڑ کر اس کی بات کاٹی تھی۔ ”پتا ہے حمدان میرا دل کیا چاہتا ہے۔“ وہ ایک دم سے بولی۔ حمدان بولے بغیر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں جن میں عجب سا سحر تھا۔

”مرا دل چاہتا ہے میری زندگی میں جو شخص آئے وہ بالکل میرے جیسا ہو...... میں اس کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھوں وہ میرے خوابوں میں رنگ بھرے۔“

”میں ہوں ناں پلوشہ...... میں تمہارے سب خواب پورے کروں گا۔ تم اس کا یقین کیوں نہیں کرتی ہو۔“ حمدان نے کہا۔

”تم میرے خوابوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے تو پورا کیسے کر سکتے ہو حمدان، تم میرے ساتھ کیٹس اور شیلے کی پوئٹری ڈسکس کر سکتے ہو؟ تم میرے ساتھ فیض کی نظم اور غالب کی غزل انجوائے کر سکتے ہو؟ نہیں ناں۔“ پلوشہ کا لہجہ تمسخر آمیز تھا۔

”پلوشہ......“ حمدان نے گہری سانس لی۔ ”تم تصوراتی دنیا میں رہتی ہو۔ تم جانتی ہو اچھی زندگی گزارنے کے لیے زیادہ اہم کیا ہے۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنا...... بھروسا کرنا اور یہ سب میں تمہیں دوں گا، یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔“

”لیکن میں تم سے محبت نہیں کرتی۔“ وہ اس کے بالمقابل کھڑی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ”تم میرا خیال چھوڑ دو حمدان، ہم مشرق اور مغرب کی طرح ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لیے نہیں ہیں۔“ حمدان کچھ نہیں بولا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں ٹوٹتے کانچ دیکھ سکتی تھی۔ پھر وہ خاموشی سے منہ پھیر کر چلا گیا۔ کچھ بھی کہے بغیر...... کوئی شکوہ نہ شکایت...... کوئی دلیل، نہ تبصرہ...... کوئی مذاق نہ کوئی دعویٰ...... کیا وہ سچ مچ مایوس ہو گیا تھا۔ ”چلو وہ اب کبھی اس کے پیچھے نہیں آئے گا۔ کبھی اس کی آرزو نہیں کرے گا۔“ پلوشہ نے گہری سانس لی اور اپنا رخ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ وہی ہوا تھا جو وہ چاہتی لیکن پھر وہ خوش کیوں نہیں تھی۔

آنسو اس کے دل کے گرد گھیرا کیوں ڈال رہے تھے۔ خلش کا کانٹا اس کے دل میں کیوں چبھنے لگا تھا۔ کیوں......؟

☆☆☆

دن ایک دم ہی اداس ہو گئے تھے۔ حمدان نے اس کے آگے پیچھے پھرنا اسے تنگ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کی ایک گہری چھاپ نظر آتی تھی۔ پلوشہ چپکے، چپکے اسے دیکھتی لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نظر نہیں آتا تھا۔ یوں نظر انداز ہونا پلوشہ کو برا لگ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سے اس کی بے پناہ توجہ کی عادی تھی شاید اسی لیے اس نے حمدان کو فار گرانٹڈ لینا شروع کر دیا تھا۔ ایک پیارا سا کزن جو ہمیشہ اس کے اردگرد منڈلاتا رہتا...... اس کی توجہ اور التفات کا منتظر رہتا...... اب اچانک ہی رخ موڑ گیا تو اسے جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ اپنی کیفیت سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ کئی دفعہ خود کو سمجھا چکی تھی کہ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ چاہتی تھی لیکن حقیقتاً سب کچھ ویسا نہیں تھا جیسا وہ چاہتی تھی اور یہ بات وہ جانتی تھی۔

”تائی آپ کو میری شمسہ خالہ یاد ہیں۔“ سحری کرتے ہوئے اچانک حمدان نے رضوانہ بیگم کو مخاطب کیا تھا۔

”وہ جو لاہور میں رہتی تھیں؟“ رضوانہ بیگم نے پوچھا۔

”جی...... ان کی بیٹی نیلم ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتی ہے، آفس کے سلسلے میں یہاں اسلام آباد آ رہی ہے۔“ حمدان نے اطلاع دی تھی۔

”اچھا...... کب......؟“ رضوانہ بیگم نے یونہی برسبیلِ تذکرہ پوچھا تھا۔

”آج...... ہوٹل میں اسٹے کرنے کا ارادہ تھا اس

کا مگر میں نے کہا گھر کس لیے ہے..... جتنے دن ٹھہرنا ہے گھر میں ٹھہرو......''

''ٹھیک کیا بیٹا.....'' حمید صاحب نے کہا۔

''ٹیکسی صاف کردو بیگم.....'' وہ رضوانہ بیگم سے مخاطب ہوئے تھے۔

''ویسے تو صاف ہے، میں پھر بھی کروادوں گی۔'' رضوانہ بیگم نے جواب دیا تھا۔ سحری کے بعد پلوشہ کو سونے کی عادت تھی جب وہ دوپہر میں سو کر اٹھی تو نیلم آچکی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں مما کے ساتھ بیٹھی تھی۔ رضوانہ بیگم نے دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کروادیا تھا۔ پلوشہ نے بغور اس کا جائزہ لیا تھا۔ وہ ایک سنہری رنگت والی خوب صورت لڑکی تھی۔ گرمی کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ لان کے سبز اور سیاہ خوب صورت پرنٹ کے سوٹ میں ہم رنگ چوڑیوں اور سبز جھمکوں کے ساتھ وہ کہیں سے بھی ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی سینئر پوسٹ پر کام کرنے والی لڑکی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کا پہلا تاثر ایک بے فکر، خوب صورت، ہنستی کھلکھلاتی لڑکی کا پڑتا تھا۔ وہ اس سے دعا سلام کرکے اپنے کمرے میں واپس آگئی تھی۔

☆☆☆

''واؤ لکنگ گڈ..... یار۔'' پکوڑوں کا مسالا مکس کرتے ہوئے پلوشہ نے اپنی پشت پر حمدان کی آواز سنی تو چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس کی مخاطب نیلم تھی جو ٹیکسی سے نکل کر آرہی تھی۔ وہ شاید ابھی ابھی نہا کر نکلی تھی۔ گیلے بال ہاف کیچر کیے ہوئے تھے۔ سرخ ایمبرائڈرڈ لباس میں وہ کسی کھلتے گلاب کے مانند تروتازہ محسوس ہو رہی تھی۔ خوش دلی سے حمدان کو تھینک یو کہہ کر وہ سیدھا کچن میں ہی چلی آئی تھی۔

''آنٹی میں کچھ ہیلپ کرواؤں آپ کی۔'' اب وہ اپنی خدمات رضوانہ بیگم کو پیش کررہی تھی۔

''نہیں بیٹا، آپ اندر جا کر بیٹھیں۔ سب تیار ہے، میں بھی آتی ہوں۔'' رضوانہ بیگم نے مسکرا کر جواب دیا تو وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اب وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی تھی، حمدان بھی وہیں تھا۔ دونوں باتیں کررہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کے بلند قہقہوں کی آواز کچن میں بھی آرہی تھی۔

غزل

عید کے روز بھی دامن کو بھگویا ہوگا
دور اس شہر سے جا کر کوئی رویا ہوگا
نیند ظالم تھی کہ روٹھی رہی شب بھر مجھ سے
چاندنی رات میں وہ بھی کہاں سویا ہوگا
گلشنِ شوق سے چن، چن کے امیدوں کے گلاب
اس نے میرے لیے اک بار پرویا ہوگا
میں نے چومی تھیں خیالوں میں جو ساغر آنکھیں
تو نے خوابوں کو میرے ان میں سمویا ہوگا
لازماً وقت پہ پائے گا صلہ بھی اس کا
بیج دہقان نے گر وقت پہ بویا ہوگا
عید پہ بھیجا ہے اس شوخ نے سادہ کاغذ
آنسوؤں نے کہیں تحریر کو دھویا ہوگا
راہِ الفت میں شفق پورا یقیں ہے مجھ کو
کیا بھلا پانا تھا بس کھویا ہی کھویا ہوگا

شاعرہ: نیر رانی شفق

''حمدان اس کے آنے سے بڑا خوش ہے۔'' پلوشہ نے جل کر سوچا۔

''دھیان سے پلوشہ پکوڑے جل رہے ہیں۔'' رضوانہ بیگم نے اسے ڈانٹ کر کہا تو اس نے جلدی سے پکوڑے کڑاہی سے نکالے۔ افطاری بہت خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ حمدان کے ننھیال سے کافی مدت بعد کوئی آیا تھا اس لیے بابا اور چچا بھی نیلم کی خصوصی آؤ بھگت کررہے تھے۔ افطاری کے بعد مغرب کی نماز پڑھ کر سب لوگ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ پلوشہ نے سب کو چائے سرو کی تھی تب ہی نیلم اپنا بیگ لے کر آگئی تھی۔ وہ سب کے لیے تحائف لائی تھی۔ حمدان کے لیے پرفیوم اور گھڑی تھی۔ حمدان نے پرفیوم اسپرے کرکے چیک کیا اور پھر دل کھول کر نیلم کی پسند

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کی داد دی تھی۔

بابا اور چچا کے لیے بھی پرفیومز ہی تھے۔ رضوانہ بیگم کے لیے خوب صورت کڑھائی والی چادر اور پلوشہ کے لیے میرون اور گہرے سبز رنگ کے امتزاج کا سوٹ...... سبھی نے نیلم کا شکریہ ادا کیا تھا۔

مما نے اسے پیار سے ڈانٹا بھی تھا کہ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی وہ جواباً کچھ بھی کہے بغیر ہنستی رہی۔

پلوشہ نے سوچا تھا کہ اس کا سوٹ دیکھ کر شاید حمدان کہے کہ پلوشہ اس طرح کے گہرے رنگ نہیں پہنتی یا کوئی اور طنز والی بات کرے لیکن وہ خاموش رہا تھا۔ پلوشہ کے کسی معاملے میں بھی دلچسپی لینا اب وہ مکمل طور پر چھوڑ چکا تھا۔

☆☆☆

ہم سمجھتے ہیں کہ ہم خود کو جانتے ہیں لیکن درحقیقت ہم خود کو نہیں جانتے، گزرتے وقت کے ساتھ، ساتھ ہماری ذات بھی ہر لمحہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ وقت ہم پر اپنے اچھے اور برے اثرات مرتب کرتا رہتا ہے۔ اور پھر جب ہم کسی دن اچانک خود سے ملتے ہیں تو اپنے آپ کو ہی پہچان نہیں پاتے۔

پلوشہ بدل رہی تھی۔ کیا حمدان بھی بدل رہا تھا؟

رضوانہ بیگم لِونگ روم میں صوفے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں پلوشہ ان کے پاس ہی نیچے کارپٹ پر کشن رکھے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پروین شاکر کی خوشبو تھی۔

''حمدان......'' رضوانہ بیگم نے باہر سے گزرتے حمدان کو پکارا تھا۔

''جی تائی......'' وہ فوراً ہی اندر آ گیا تھا۔

''نیلم اور اس کی فیملی کے لیے گفٹس لینے ہیں، کسی وقت تم پلوشہ کو ساتھ لے جا کر خرید لاؤ۔'' رضوانہ بیگم نے کہا۔

''تائی مجھے اس کی پسند کا پتا ہے۔ میں خود ہی لے آؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔'' حمدان نے جواب دیا۔

''حمدان تمہارے لیپ ٹاپ پر تو پاس ورڈ لگا ہوا ہے۔ اسے تو کھولو۔'' نیلم، حمدان کا لیپ ٹاپ اٹھائے بولتے ہوئے اندر آئی تھی۔

''لاؤ۔'' حمدان نے اس سے لیپ ٹاپ لے لیا تھا۔ اب وہ دونوں کشن رکھ کر نیچے ہی بیٹھ گئے تھے۔

حمدان، نیلم کو اپنے بچپن کی تصاویر دکھا رہا تھا۔

''تم کتنے گولو، مولو سے ہوتے تھے ناں...... اللہ آنٹی، تمہیں اٹھاتی کیسے ہوں گی۔'' نیلم ہنس رہی تھی۔

''یہ کون ہے، کتنی سویٹ بچی ہے۔ اس کے سارے منہ پر چاکلیٹ لگی ہوئی ہے۔'' اب وہ ایک تصویر کی طرف اشارہ کر کے پوچھ رہی تھی۔ پلوشہ جانتی تھی وہ تصویر اسی کے بچپن کی تھی۔

''اسے چھوڑو...... یہ دیکھو کون ہے۔'' حمدان نے نیلم کی توجہ ایک اور تصویر کی طرف کرا دی تھی۔

پلوشہ کے دل کو دھکا سا لگا، وہ اب اس کا ذکر کرنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔

''یہ تو میری تصویر ہے۔ تمہارے پاس کیسے آئی۔'' نیلم حیران ہو کر پوچھ رہی تھی۔

''بس دیکھ لو......'' حمدان نے فرضی کالر اکڑائے۔

''اچھا آئس کریم کھاؤ گی۔''

''نیکی اور پوچھ، پوچھ......'' نیلم فوراً تیار ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی پلوشہ کو بھی پوچھ لیا۔

''پلوشہ آئس کریم کھانے چلو گی۔'' حمدان لیپ ٹاپ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔

''اسے آئس کریم نہیں پسند یار تم چلو۔'' وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔ نیلم اس کے پیچھے تھی۔

''تمہارا اور حمدان کا جھگڑا ہوا ہے؟'' رضوانہ بیگم کڑی نگاہوں سے پلوشہ کو دیکھ رہی تھیں۔

''نہیں تو......'' اس کی آواز مدھم تھی۔

''پلوشہ میری ایک بات کان کھول کر سن لو۔'' رضوانہ بیگم کا لہجہ غصیلہ تھا۔ ''حمدان کی شادی تمہارے علاوہ کسی اور سے ہوئی تو میں ساری زندگی تمہیں معاف نہیں کروں گی۔''

''مما...... اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اگر وہ کسی

اور سے شادی کر لے تو۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

''تمہارا ہی تو قصور ہے۔ تمہارے ہی نخرے آسمان پر پہنچے ہوئے تھے، تمہارے باپ نے تمہاری مرضی کا شوشا نہ چھوڑا ہوتا تو میں اب تک تمہارا نکاح کرا چکی ہوتی تھیں۔'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

پلوشہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے بہت رونا آ رہا تھا۔

☆☆☆

''اُف توبہ...... افطاری کرنے کے بعد تو بہت سستی ہو جاتی ہے۔'' نیلم کسل مندی سے صوفے پر بیٹھی تھی۔

''کم کھانا تھا ناں......!'' حمدان ہنسا۔

''زیادہ کھاتی تو اتنی اسمارٹ نہ ہوتی......'' نیلم نے ہنس کر کہا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' حمدان نے فوراً ہی تسلیم کر لیا۔ ''خالہ سے کہتا ہوں تمہیں ہمیشہ کے لیے اسلام آباد بھیج دیں۔''

''اونہوں۔'' اس نے فوراً ہی انکار کیا۔ ''مجھے اسلام آباد پسند نہیں ہے۔ عجیب بے حس سا شہر ہے، تم کیوں نہیں لاہور شفٹ ہو جاتے۔''

''ہاں خیر...... میرا ٹرانسفر تو ہو سکتا ہے۔'' حمدان سر ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

یہ گفتگو سن کر پلوشہ کو تو آگ ہی لگ گئی۔ تو نوبت یہاں تک آ گئی تھی۔

''حمدان صرف میرا ہے وہ کسی اور کے بارے میں سوچ کے تو دیکھے میں اس کا گلا دبا دوں گی۔'' اپنے کمرے میں اِدھر سے اُدھر چکر لگاتے ہوئے اس کے عزائم جارحانہ بلکہ قاتلانہ ہو رہے تھے۔ نیلم کوئی مجھ سے زیادہ خوب صورت تو نہیں ہے۔'' اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ ہلکا آسمانی جوڑا زیب تن کیے بالوں کی کس کر پونی بنائے ماتھے پر کوئی بل لیے آئینے میں پلوشہ کو اپنے روبرو دیکھ کر اسے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ نظروں کے سامنے نیلم کا بنا سنورا ترو تازہ وجود لہرا گیا۔ اس نے الماری کھول کر وہی شاپنگ بیگ نکالا...... حمدان کے دلائے ہوئے کپڑے ابھی تک یونہی رکھے تھے۔ شیفون کے بازوؤں والا پرپل سوٹ نکال کر وہ واش روم میں گھس گئی۔ شاور لے کر باہر نکلی تو غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ جیولری والا ڈبا کھولا اور سلور نازک سے بندے پہن لیے بالوں کو برش کر کے کھلا چھوڑ دیا۔ اب وہ حمدان کی خبر لینے کے لیے مکمل طور پر تیار تھی۔ باہر آ کر دیکھا تو حمدان اور نیلم دونوں ہی غائب تھے۔ ''گئے ہوں گے پھر آوارہ گردی کرنے۔'' وہ آگ بگولا ہو کر اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔

''چاہے جتنی دیر بھی انتظار کرنا پڑے حمدان کی طبیعت تو آج میں صاف کر کے ہی چھوڑوں گی۔'' اس نے دل ہی دل میں مصمم ارادہ کیا۔ نہ جانے کتنا وقت ہو گیا تھا انتظار کرتے ہوئے جب اس نے کھڑکی کے باہر حمدان کی جھلک دیکھی۔

''حمدان......'' وہ بلند آواز میں چنگھاڑی تھی۔

''کہاں ہے؟'' وہ تیزی سے اندر آیا تھا۔ اور اب اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

''کیا؟'' وہ اسے بیڈ کے نیچے جھانکتے دیکھ کر حیران ہوئی۔

''چھپکلی......!'' وہ معصومیت سے بولا تھا۔

''چھپکلی کہاں سے آ گئی۔'' پلوشہ بری طرح جھنجلائی تھی۔

''تم نے چھپکلی کو دیکھ کر مجھے نہیں بلایا؟'' حمدان نے کہا۔

''نہیں بھئی......'' پلوشہ نے کہا۔

''اچھا......'' حمدان نے سر ہلایا اور کمرے سے جانے لگا۔

''تم، کہاں جا رہے ہو؟'' پلوشہ نے گڑبڑا کر اسے روکا۔ حمدان رک کر حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''میرا مطلب ہے مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''کرو......'' وہ سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

آبِ حیات
عُمیرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

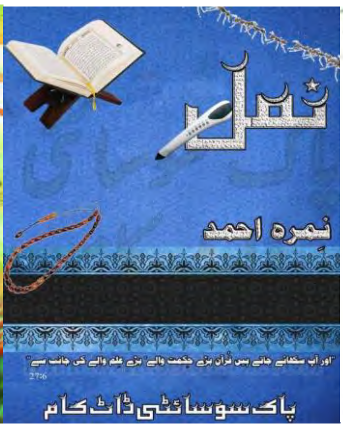
نمل
نمرہ احمد
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

WWW.PAKSOCIETY.COM
مصحف
نمرہ احمد
www.Paksociety.com

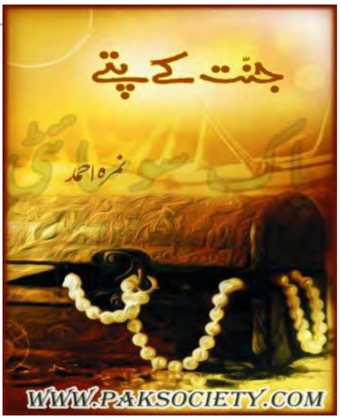
جنّت کے پتے
نمرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

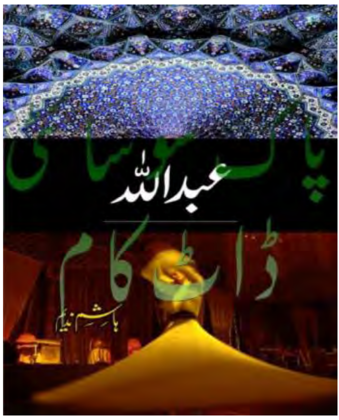
عبداللہ
ہاشم ندیم

بن روئے آنسو
فرحت اشتیاق
www.paksociety.com

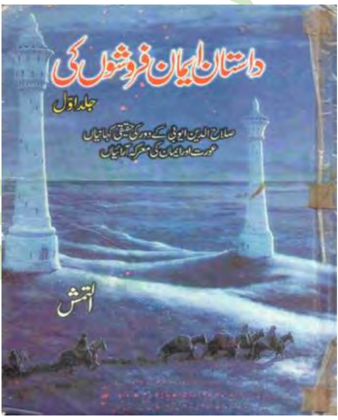
داستان ایمان فروشوں کی
جلد اوّل
التمش

ہم سفر
فرحت اشتیاق
http://www.paksociety.com

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

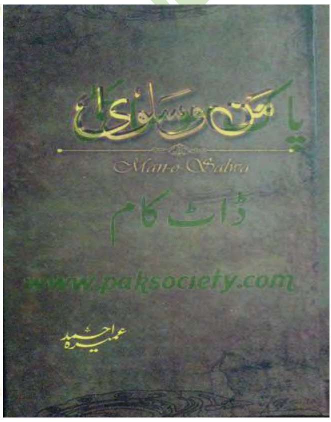
من و سلویٰ
Man-o-Salwa
www.paksociety.com
عمیرہ احمد

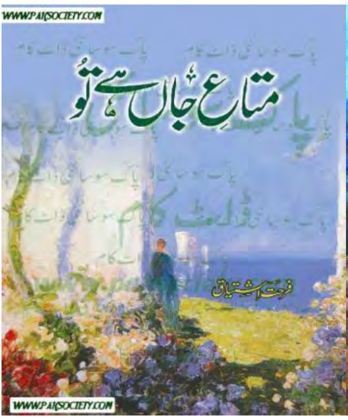
WWW.PAKSOCIETY.COM
متاعِ جاں ہے تو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

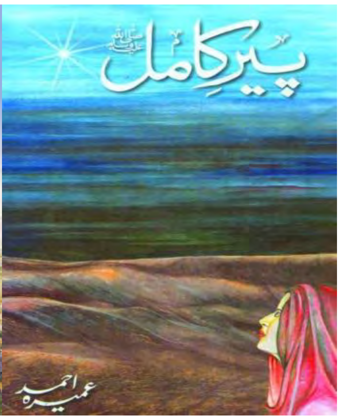
پیرِ کامل
عمیرہ احمد

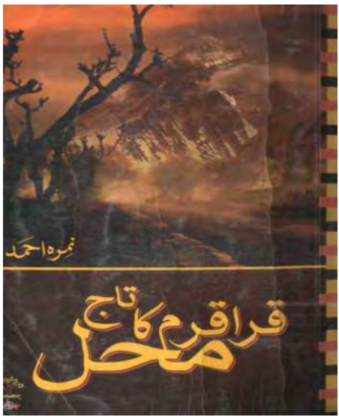
نمرہ احمد
قراقرم کا تاج محل

ٹوٹا ہوا تارہ
سمیرا شریف طور
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

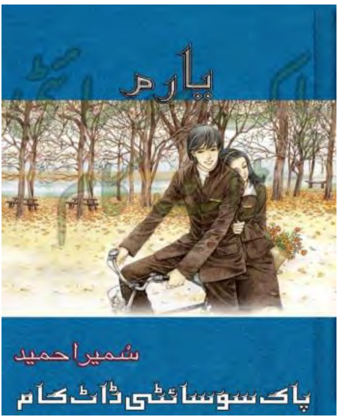
بارش
سمیرا حمید
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

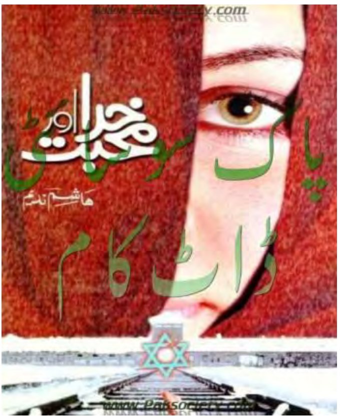
خدا اور محبت
ہاشم ندیم

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

’’مجھے......‘‘ پلوشہ نے تھوک نگلا...... ’’مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ تم اتنے برے نہیں ہو جتنے مجھے لگتے ہو۔‘‘

’’ہیں۔‘‘ حمدان بھونچکا رہ گیا۔ ’’مطلب کیا ہے تمہارا؟‘‘

’’میں تم سے شادی کے لیے تیار ہوں۔‘‘ پلوشہ نے جلدی سے کہہ دیا۔

’’کیوں......؟‘‘ وہ کڑے تیوروں سے پوچھ رہا تھا۔

’’اب تم مجھے برے نہیں لگتے۔‘‘ پلوشہ اپنے ہاتھوں کو آپس میں مل رہی تھی۔

’’تو پھر کیسا لگتا ہوں؟‘‘ حمدان نے اگلا سوال کیا۔

’’جب تم نیلم سے فری ہوتے ہو تو بہت برے لگتے ہو۔‘‘ پلوشہ نے اپنی جلن کا اظہار کر ہی دیا۔ حمدان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

’’تو یہ بات ہے۔‘‘

’’میری بات کا غلط مطلب نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ پلوشہ نے اسے گھورا۔ ’’تمہیں ذرا شرم نہیں آئی۔ میں نے انکار کیا تو تم فوراً اِدھر اُدھر......‘‘ وہ کوئی نامناسب بات کہتے، کہتے رک گئی تھی۔

’’ارے تم کیا سمجھ رہی ہو۔‘‘ حمدان نے انگلی سے اس کا سر بجایا۔ ’’نیلم ایک پیارے سے بیٹے کی ماں ہے۔‘‘

’’کیا......؟‘‘ اب حیران ہونے کی باری پلوشہ کی تھی۔

’’جی ہاں...... خالہ کے پاس چھوڑ کر آئی ہے اپنے تین سالہ بیٹے شاہ زیب کو۔‘‘

’’اوہ...... تم نے بتایا کیوں نہیں تھا۔ میں نے اتنے دن اس بیچاری سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کی۔‘‘ پلوشہ کو حقیقتاً افسوس ہوا۔

’’اب یہ تو تمہاری غلطی ہوئی ناں...... خیر وہ تو تمہاری عادت ہے ناں۔‘‘ حمدان نے بے پروائی سے کہا۔

’’میں ابھی جا کر اس سے سوری کرتی ہوں۔‘‘ پلوشہ نے باہر کا رخ کیا۔

’’اسے تو میں ابھی، ابھی ائر پورٹ چھوڑ کر آ رہا ہوں۔‘‘ حمدان نے اطلاع دی۔ ’’خیر تم کیا کہہ رہی تھیں۔‘‘

’’کیا کہہ رہی تھی۔‘‘ پلوشہ نے غائب دماغی سے کہا۔

’’یہی کہ میں تمہیں اچھا لگتا ہوں۔ تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ اور تم میرے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ وغیرہ، وغیرہ......‘‘ حمدان مسکرایا۔

’’میں نے یہ سب تو نہیں کہا۔‘‘ پلوشہ نے نفی میں سر ہلایا۔

’’تمہارا مطلب تو یہی تھا ناں......!‘‘ حمدان نے پوچھا۔ پلوشہ نے اسے دیکھا اور مسکرا دی۔

’’ہاں......‘‘

’’او بلے، بلے......‘‘ حمدان نے نعرہ لگایا۔

’’کیا بے ہودگی ہے۔‘‘ پلوشہ اس کے انداز پر بگڑی تھی۔

’’تمہیں پتا ہے چاند نظر آ گیا ہے، کل عید ہے۔‘‘ حمدان نے بتایا۔

’’اچھا......‘‘ وہ خوش ہوئی۔ مبارک ہو۔‘‘

’’کس بات کی مبارک...... چاند کی یا منگنی کی......‘‘ وہ جگمگاتے چہرے کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

’’منگنی کی؟‘‘ پلوشہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

’’ہاں، کل ہماری منگنی ہے۔ چلو تمہیں مہندی لگوا کر لاؤں۔‘‘ حمدان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

’’منگنی...... لیکن منگنی کے لیے جوڑا تو خریدا ہی نہیں......‘‘ پلوشہ نے پریشان ہو کر کہا۔

’’میں خرید چکا ہوں میڈم......‘‘ وہ بھی سرخ لہنگا......‘‘ وہ باہر نکلتے ہوئے بولا۔

’’منگنی پہ کون پہنتا ہے سرخ لہنگا......‘‘ پلوشہ اس کے پیچھے، پیچھے چلتے ہوئے بگڑ کر کہہ رہی تھی۔ رضوانہ بیگم نے دونوں کو تکرار کرتے دیکھا تو مسکرا دیں، وہ جانتی تھیں اس دفعہ عید یادگار ہو گی۔ اس لیے کہ وہ بھی اس کا دماغ درست کرنے کے منصوبے میں شریک تھیں۔

جینا اسی کا نام ہے

فصیحہ آصف خان

”عاجز کر رکھا ہے اس موبائل نے مجھے۔“

نورین واقعی زچ ہو کر بولی تو فہمیدہ عرف فہمی نے دوسری جانب سے جاندار قہقہہ لگایا۔۔اور اس کا مذاق اڑاتے ہوئے طنزیہ بولی۔

”تم تو... کبھی نیا موبائل لے ہی نہیں سکتی ہو۔“

نورین کو اس کی بات پر بھرپور طیش آیا..... اپنے حالات کا پتا تھا پھر بھی دوبدو بولی۔

”کیوں نہیں لے سکتی میں۔“ تڑخ لہجے میں نمایاں تھی۔

”پتا ہے اسمارٹ فون کتنے میں آتا ہے؟“ فہمی اسے طیش دلانے پر تلی تھی۔

”بھلا کتنے میں؟“ نورین اس کی حد جانچنا چاہتی تھی۔

”رہنے دو تم تو بس..... اسی پھٹیچر سے گزارہ

کرو...... میرے گھر آنا، میں تمہیں اپنا موبائل دکھاؤں گی، پورے سولہ ہزار میں لیا ہے میں نے۔'' فہمی کی آواز میں غرور اور دکھاوا نمایاں تھا۔

''اچھا......! اچھا میں بھی لے لوں گی۔'' نورین کا لہجہ مایوسی بھرا تھا۔

''ارے مجھے ہانڈی بنانی ہے، خدا حافظ۔'' فہمی نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ فون بند ہوتے ہی نورین نے اپنے موبائل کا جائزہ لیا۔ خاصا پرانا تھا۔ اسکرین پر جا بجا لکیریں، ساؤنڈ سسٹم بھی گرنے کے سبب ٹھیک کام نہیں کرتا تھا اور شکل بھی بگڑی، بگڑی...... پرانا ماڈل...... گویا اس کے لیے باعثِ شرمندگی ہو، بس گزارہ ہو رہا تھا۔

گزارہ تو خیر ہر شے پر ہو رہا تھا۔ وہ کون سا لینڈ لارڈ تھی متوسط گھرانا تھا، جو غربت کو کسی نہ کسی طرح سے ڈھانپے ہوئے تھا، شکر گزاری کے پردے سے۔

نورین کے ابو کی دکان تھی اسٹیشنری کی، تین بیٹیاں اور ایک بیٹا بہ مشکل تمام دو وقت کی روٹی بنتی...... اور عید کے عید جوڑا، عیاشی کا تصور محال تھا، بڑی بہنیں بھی عام گھرانوں میں بیاہی ہوئی تھیں۔ جو کھینچ تان کر گزارہ کر رہی تھیں۔ نورین چھوٹی تھی اور اس سے چھوٹا بھائی...... رضوان جس کا ابھی، ابھی کالج میں ایڈمیشن ہوا تھا۔ اسے کسی سے کوئی توقع نہیں تھی...... سوائے اللہ کی ذات کے۔

☆☆☆

شادی بھی اپنے جیسے متوسط گھرانے میں ہوئی۔ اس کا شوہر عاصم کلرک تھا، حلال روزی کمانے والا...... مگر شکر ہے گزر بسر ہو رہی تھی۔ اس کا بیٹا، احمد اب ڈیڑھ سال کا تھا...... اس کی پیدائش سیزیرین ہوئی تھی، جس کا قرضہ عاصم ابھی تک چکا رہا تھا کہ تنخواہ میں بچت ممکن ہی نہیں تھی۔

ایسے میں کئی خواہشیں وہ دل میں دبائے رکھتی......

''جی بھابی!'' شکیلہ بھابی کے آواز دینے پر وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔ اور وہ کمرے سے باہر نکلی تھی۔

''نورین تھوڑی سی چینی دینا سعد پھیکا دودھ نہیں پی رہا۔'' شکیلہ بیچارگی اور شرمندگی سے بولی تو نورین کٹوری میں تھوڑی سی چینی لے آئی۔

''تمہارا شکریہ نورین......'' شکیلہ چینی لے کر جاتے ہوئے بولی۔

احمد اٹھ گیا تو نورین نے اسے دودھ بنا کر دیا اور خود آلو کا سالن بناتے ہوئے مسلسل موبائل کے بارے میں سوچوں و غلطاں تھی۔

ایک دم اس کے ذہن میں ترکیب آئی کہ ''کمیٹی ڈال لیتی ہوں، کچھ ماہ بعد اتنے پیسے تو یکمشت مل جائیں کہ موبائل لے سکوں۔'' وہ مطمئن سی ہو گئی۔

رات کو کاموں سے فارغ ہو کر وہ کمرے میں آئی تو عاصم، بچے کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس نے عاصم سے کہا کہ وہ اسے ہر ماہ ہزار روپے دیا کرے۔ وہ کمیٹی ڈالے گی...... تاکہ کافی سارے پیسے اکٹھے مل جائیں۔ احمد کو کھلاتے، جھلاتے اس کے ہاتھ نورین کی بات پر رکے۔

''کمیٹی کیوں بھئی، جمع شدہ پیسوں کا کیا کرو گی؟'' عاصم بھی جاننا چاہتا تھا۔

''بس کچھ نہ کچھ تو لیا جا سکے گا ناں......'' وہ حتمی انداز میں بولی۔

''دیکھو فی الحال تنخواہ میں سے ہزار روپے الگ نکالنا ممکن نہیں۔ اخراجات تمہارے سامنے ہیں، قرضہ اتر رہا ہے، بل ہیں کہ کس بل نکال دیتے ہیں۔'' عاصم نے اسے رسان سے سمجھایا۔

مگر وہ تو اڑی رہی...... کہ ''میری اتنی سی بات آپ نہیں مان سکتے پھر پیسے جمع ہو رہے ہوں گے۔ ضائع تھوڑی ہوں گے......'' وہ جیسے رو دی۔

تو عاصم نے اس کا موڈ دیکھ کر جیسے تیسے حامی بھری۔ اور نورین کو ایسے لگا جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ ''اب دیکھے فہمی ذرا میں اس سے بڑھیا موبائل لے کر دکھاؤں گی اسے۔'' وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی۔

☆☆☆

چار سال قبل جب نورین بیاہ کر آئی تو ساس زندہ تھیں.....دو کمرے تھے آمنے سامنے درمیان میں مناسب صحن برآمدے میں چولھا رکھ کر اسے کچن کی شکل دے دی گئی تھی۔ دونوں کے کچن ساس نے خود ہی الگ، الگ رکھوائے تھے کہ جھگڑا نہ ہو......اور شکیلہ تو ویسے بھی خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والی خاتون تھی۔ معمولی پڑھی ہوئی مگر نورین کا بہت خیال رکھا، جب احمد پیدا ہوا اسی طرح سعد کی دفعہ نورین نے اس کا خیال رکھا۔ شکیلہ کی بیٹی ایمن نورین کی شادی سے پہلے ہوئی تھی اور اب اسکول جاتی تھی۔

ساس بتاتی تھیں کہ وہ جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں، غربت گھر میں پنجے گاڑے ہوئے تھی افضل بڑا ہوا تو اسے کام پر ڈال دیا۔ زیور بیچ کر تین مرلے کا گھر لے لیا۔ سستا زمانہ تھا، افضل نے پانچ جماعتیں ہی پڑھیں، البتہ عاصم میٹرک کر گیا۔

اور دو سال بعد ہی کلرک بھرتی ہوگیا۔ ساس اس کے بیٹے احمد کی پیدائش سے ایک ماہ قبل فوت ہوگئیں۔ شکیلہ ان کی دور پار کی یتیم بھتیجی تھی اور نورین بھی جاننے والوں سے تھی۔ افضل ایک فیکٹری میں ملازم تھا، گو تنخواہ بہت کم تھی۔ وہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے والے لوگ تھے سو زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ سلائی کڑھائی میں ماہر شکیلہ شوہر کا ہاتھ بٹاتی؟ اجرتی کام کرتی اور مصروف رہتی، مصروف تو نورین بھی رہتی مگر ٹی وی، موبائل گپ شپ اور رسالوں میں اُسے جب سے معلومات ملی تھیں کہ فون میں فیس بک اور دوسری تفریحات بھی ہیں۔ تب سے اس کا دماغ ایک ہی نہج پر سوچ رہا تھا کہ کوئی جادو کا چراغ مل جائے جسے رگڑ کر وہ اپنی فرمائشیں پوری کر سکے۔

اگلے ہی دن وہ پڑوسن خالہ نسیم کے پاس چلی آئی جو کمیٹی ڈالنے میں ماہر تھی۔

یوں ہزار روپے ماہوار کمیٹی شروع ہوگئی، اب نورین اسی حساب میں غلطاں رہتی کہ کب کمیٹی ملے گی تو وہ اسمارٹ فون لے کر اپنی زندگی کو رنگین بنائے گی۔

☆☆☆

عاصم بھلا بندہ تھا، ہر ماہ تنخواہ ملتے ہی اسے کمیٹی کے ہزار روپے تھما دیتا، جانتا تھا کہ یہ نورین کمیٹی والی پڑوسن کو دیتی ہے، یہ بھی ٹھیک تھا کہ وہ پیسوں کو ضائع نہیں کر رہی تھی۔ اسی اعتماد پر وہ اسے دے دیتا۔

وقت کا پہیا لمحوں اور منٹوں کے چابک کھاتا، دنوں اور مہینوں میں ڈھلنے لگا۔ تینوں بچے گھر میں رونق لگائے رکھتے زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے رہے، دن رات گزرتے رہے، ایک سال ہونے کو آیا تھا کمیٹی ڈالے، دو ماہ بعد نورین کے نمبر کی کمیٹی کھلنا تھا۔

”ارے واہ عید کے قریب، قریب۔“ نورین کی خوشی کی انتہا نہ رہی تھی۔ نہ صرف موبائل بلکہ جی بھر کے وہ عید کی خریداری بھی کر سکتی تھی۔

شکیلہ کا عید سے قبل کام بڑھ جاتا تھا، وہ دن رات سلائی کڑھائی اور موتی ستاروں میں الجھی رہتی کہ کچھ زیادہ رقم ہاتھ آئے گی تو عید بھی اچھی گزر جائے گی۔ اسی دُھن میں وہ مسلسل کام میں مگن رہتی۔ محنت کو شعار بنا کر مصروف رہتی۔ اس کے برعکس نورین خوابوں میں دن گزار رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے، رمضان المبارک کا متبرک و مقدس مہینہ بھی اپنے جلو میں رحمتوں کی برسات لیے آن پہنچا...... ہر انسان اس کی ہر ساعت سے رحمتیں اور نیکیاں کشید کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ بخشش کا سامان ہو جائے، شکیلہ کے معمولات میں بھی فرق آگیا، روزہ رکھ کر وہ سحری کے بعد تلاوت کر کے اپنے کام میں جت جاتی۔ مرد صبح کام پر چلے جاتے۔ اُدھر احمد کو سلا کر نورین لمبی تان کر سو جاتی۔ دوپہر کے بعد اٹھتی، صفائی کرتی، کھانا بناتی، تسبیح و عبادت کا اہتمام کرتی...... افطاری میں کبھی آلو چھولے کی چاٹ، کبھی پکوڑے تو کبھی دو چار فروٹ ڈال کر چاٹ مسالا چھڑک کر چاٹ بنا لیتی...... ساتھ میں شربت، کبھی جوس پھر پیالہ بھر کے شکیلہ بھابی کو بھی دے آتی۔ شکیلہ کے پاس گنجائش نہ تھی، وہ بس کھجور اور لیموں کی شکنجبین بنا لیتی اور ساتھ میں جو کھانا بنا ہوتا بس

کھا کر الگ سے افطار کا اہتمام نہ کرتی۔

☆☆☆

خالہ نسیم نے پندرھویں روزے کو کمیٹی دینے کا مژدۂ جاں فزا سنایا تو نورین کے پاؤں مارے خوشی کے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے، ابھی دس روزے ہوئے تھے، نورین نے خریداری کی فہرست ترتیب دے ڈالی۔ جس میں سرفہرست موبائل تھا، کپڑے، جوتے‘ جیولری عاصم اور احمد کے کپڑے اور جوتے گھر کا کچھ ضروری سامان، اسے اردگرد کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ پورے پچیس ہزار کمیٹی کے ملنے تھے۔ یکمشت، اِک خواب حقیقت کا روپ دھارنے والا تھا۔ اور پھر پندرھویں روزے کو پورے پچیس ہزار اس کی مٹھی میں تھے۔ وہ چھپا کر پیسے لے کر آئی، شکیلہ نے بھی تجسس ہی نہیں کیا تھا کہ وہ کہاں آتی جاتی ہے۔ اتنا تو جانتی تھی کہ وہ خالہ نسیم کے ہاں جاتی ہے مگر کیوں؟ اسے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اس وقت بھی جب نورین آئی تو وہ اپنے کام میں مگن تھی۔

نورین نے اسے سرسری سا دیکھا۔ بے حد کمزور زرد چہرہ‘ آنکھوں کے گرد حلقے، پرانا بوسیدہ سوٹ مگر وہ مستعدی سے اپنا کام کر رہی تھی، ساتھ ہی سعد... کسی ٹوٹی ہوئی کھلونا گاڑی سے کھیل رہا تھا۔

”آؤ، بیٹھو۔“ اسے کھڑا دیکھ کر وہ نرمی سے بولی تھی۔

”جی...... بس وہ احمد جاگ گیا ہوگا، اسے دیکھوں جا کر۔“ نورین اپنی سوچوں کے بھنور سے ابھر کے بولی۔

”اچھا...... اچھا جاؤ......“ وہ ٹانکا توڑتے ہوئے بولی۔ نورین اپنے کمرے میں آ گئی۔ رقم کو احتیاط سے کمرے کی الماری میں چھپا کر تالا لگا دیا...... اور بستر پر لیٹ کر خوابوں کے سہانے سفر پر جا نکلی۔

ابھی اس کی آنکھ لگے آدھا گھنٹا ہی گزرا تھا کہ بیرونی دروازہ دھڑ دھڑ کسی نے پیٹا، نورین حواس باختہ سی اٹھی۔ احمد بھی اٹھ کر رونے لگا تھا۔

تیزی سے وہ باہر آئی، شکیلہ دروازے پر تھی۔

”جی...... کیا ہوا ہے؟“ شکیلہ کی گھبرائی سی آواز پر وہ بھی دروازے تک آ گئی۔

”وہ فیکٹری میں بوائلر پھٹا ہے اور کافی سارے مزدور زخمی ہوئے ہیں افضل بھائی بھی زخمی ہیں اور اسپتال میں ہیں۔“ اب شکیلہ کے رونے کی آواز آئی۔

”کون سے اسپتال میں؟“ وہ روتے، روتے پوچھنے لگی۔

فیکٹری کا کوئی ملازم تفصیل بتا کر چلا گیا۔ شکیلہ بری طرح روئے جا رہی تھی پتا نہیں افضل کی کیسی حالت تھی۔ نورین شکیلہ کو چپ کرانے لگی۔ پھر اندر جا کر عاصم کو فون کر کے بتایا۔ دونوں کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے۔ شکیلہ کو کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔ عاصم بھی پون گھنٹے میں آ گیا اور شکیلہ کو ساتھ لے کر اسپتال چلا گیا۔ نورین گھر میں بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ ایمن بھی اسکول سے آ گئی اسے کھانا کھلا کر، تینوں بچوں کو کھیلنے پر لگا دیا۔

”پتا نہیں کیسی طبیعت ہوگی افضل بھائی کی۔“ سوچیں تھیں کہ امڈی پڑ رہی تھیں۔ کمیٹی ملنے کی ساری خوشی دم توڑ رہی تھی۔ عاصم کا فون آیا تو تشویش بڑھ گئی۔ افضل بھائی کے چہرے کی جلد جھلس گئی تھی۔ بایاں کندھا اور بازو متاثر ہوا تھا۔ شکر تھا کہ آنکھیں بچ گئی تھیں، تین دن اسپتال میں رہنا ہوگا۔

”اُف آ!“ نورین نے شکر ادا کیا۔ جان بچی سو لاکھوں پائے کے مصداق تین دن عاصم کے اسپتال کے چکر لگتے رہے۔ شکیلہ بھی آتی جاتی رہی۔ یوں تین دن کے بعد افضل بھائی گھر آ گئے، چہرہ اور بازو پٹیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ فیکٹری کے لوگ حال پوچھنے آتے رہے۔ شکیلہ افسردہ سی رہتی یا رونے لگتی۔ ہاتھ پہلے ہی تنگ تھا اب ہزاروں کا خرچہ...... سر ڈھکتے تو پاؤں کھل جاتے۔ عاصم کو بھائی سے بہت محبت تھی۔ اور وہ ان کی باپ کی طرح عزت کرتا تھا کہ انہوں نے بہت قربانیاں دیں۔ اب ان کی یہ حالت دیکھ کر وہ رو پڑتا۔ فیکٹری مالکان نے معمولی رقم دے کر جان

چھڑا لی کہ حادثے تو ہوتے رہتے ہیں، ہاں جن کے ہاں حادثے ہوتے ہیں وہی جانتے ہیں جہاں آگ لگتی ہے وہی جگہ جلتی ہے۔

شکیلہ، افضل کی تیمار داری میں لگی رہتی سلائی کڑھائی نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ فکر تھی تو اخراجات کی۔ کبھی افضل کو دیکھتی تو کبھی گھر کو...... ابھی ڈاکٹر کے مہنگے نسخے پر بھی عمل کرنا تھا کہ زخم جلد از جلد بھر جائیں اور خراب نہ ہوں۔ شکیلہ کے پاس صرف دو ہزار ہی رکھے تھے۔ جو اونٹ کے منہ میں زیرہ کے برابر تھے۔ کوئی قرض دیتا، دے بھی دیتا تو وہ ادائیگی کیونکر کر پائے گی؟ پھر اردگرد سارے دیہاڑی دار، مزدور طبقہ تھا، آج تک اسے قرض مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ سوکھی، روکھی کھا کر گزارہ کر لیتی تھی مگر...... اب ادویات نے بیماری کو اور مشکل بنا دیا تھا۔

شکیلہ اسی فکر میں تھکنے لگی۔ خود عاصم کہاں سے قرض کا بوجھ اٹھاتا پہلے بھی کئی بار مقروض ہو چکا تھا، جس کی ادائیگی ابھی تک ہو رہی تھی۔ تنخواہ سے بہ مشکل گھر چل رہا تھا۔ اور اب باپ جیسا بڑا بھائی اس حال میں تھا۔ کیا کروں...... وہ سوچ، سوچ کر پریشان ہوتا رہا۔

☆☆☆

عید آنے میں چند ہی دن باقی تھے۔ مگر ان کے گھر گویا اداسیوں نے پہرے لگا رکھے تھے۔ شکیلہ کی صحت ناکافی خوراک، مسلسل کام اور صدموں سے خراب رہنے لگی تھی۔

اور پیسے نہ ہونے سے مسائل منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ اس دن تو بچوں کے دودھ کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔ نورین آئی تو شکیلہ کو روتے پایا۔ تب اس کے اصرار پر شکیلہ اس کے ساتھ لگ کر روتے ہوئے بتانے لگی۔

نورین تیزی سے اٹھی اور ایک بڑا کپ دودھ کا بھرا ہوا ان کے سامنے رکھ دیا کہ بلکتے سعد کو دودھ پیتے ہی قرار آ گیا۔ افضل بھائی سو رہے تھے۔

"روز، روز کیا کروں گی؟" حقیقت میں شکیلہ دکھی ہو رہی تھی۔

کلام شاز

زندگی کے اک موڑ پر
میری محبت کی دنیا میں
اک عجب سا رنگ ابھرا
جسے میں کچھ نام نہ دے پائی
مگر یہ احساس......
جو ہوا مجھے تو......
دل سرشاری کے عالم میں
جھومنے لگا، رقص کرنے لگا
چہرے پر مسرت کی کرنیں
پھوٹنے لگیں
اور دل پھر اک تمنا کرنے لگا
بس تجھ سے ہو جائے شاز کا
کچھ ایسا رشتہ قائم
جو رہے تا ابد، تا ابد، تا ابد

کاوش: شازیہ ہاشم میواتی عرف تمثال ہاشمی
کھڈیاں خاص قصور

"یہ دیکھو...... ان کا نسخہ، کتنے مہنگے کیپسول، دوائیاں اور کریمیں ہیں، نسخہ استعمال نہیں کیا تو زخم بگڑ جائیں گے۔" شکیلہ نے کپکپاتے ہاتھوں اسے نسخہ دکھایا۔ اور سونی آنکھوں سے افضل کو لیٹا دیکھ کر تڑپ کر بولی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا اور سسکیاں رک نہیں رہی تھیں۔

"اللہ مالک ہے بھابی۔" نورین بس یہی کہہ سکی۔ احمد اور سعد باہر کھیل رہے تھے۔ نورین پریشانی کے عالم میں اپنے کمرے میں آ گئی۔

بے کلی اور بے قراری بڑھتی جا رہی تھی...... وہ اللہ سے دعا کرنے لگی کہ کچھ سبب بن جائے۔ اور افضل بھائی بالکل ٹھیک ہو کر کام پر جانے لگیں۔

"مگر...... کیسے...... کیسے...... کیسے؟" ایک دم اِک خیال دماغ میں بجلی کی طرح کوندا۔

"پچیس ہزار، موبائل، عید، خریداری، خوشیاں'

خواہشیں۔“ وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔ پیسے ان سے بڑھ کر تو نہیں تھے۔

افضل بھائی...... شکیلہ بھابی، بچے، بھوک، سسکیاں، گھر، اخراجات، دوائیاں...... جس قدر سوچتی الجھتی جاتی۔

ظہر کی نماز ادا کر کے وہ ایک فیصلے پر جا پہنچی...... مگر الجھن سوا تھی۔ دال کو بگھار لگایا، چاول پلیٹ میں ڈالے اور شکیلہ بھابی کو دے آئی۔ ان کی ممنون نظریں نورین کے فیصلے کو تقویت دے گئیں۔ افطاری تک وہ بے حد الجھی ہوئی تھی۔ جب تک عاصم بھی آ گیا تھا۔ پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ افطار اور کھانے کے بعد وہ عاصم کے پاس آ بیٹھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ اس کی اتری صورت دیکھ کر وہ پوچھنے لگا۔

”کچھ نہیں...... عید آ رہی ہے ناں......“ وہ عجیب لہجے میں بولی۔ نہ خوشی نہ اداسی بس۔

”ہاں تو پھر؟“ عاصم کا لہجہ دلسوز سا تھا...... نورین تڑپ سی گئی۔

”افضل بھائی کی تکلیف ہماری تکلیف ہے ناں عاصم......“ نورین نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”ہاں، بالکل...... وہ میرے بڑے بھائی ہیں، باپ بن کر پالا ہے انہوں نے مجھے...... بہت خیال رکھا میرا، خود محنت کرتے رہے مجھے تعلیم دلائی، اب وہ مشکل میں ہیں، کاش میرے بس میں ہوتا تو میں ان کے لیے بہت کچھ کرتا، اب بھی میرے بس میں جو ہوا وہ کروں گا۔“ عاصم کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ اس کی باتیں سن کر یک دم نورین اٹھی اور الماری سے پورے پچیس ہزار نکالے اور عاصم کے سامنے لا کر رکھ دیے۔

عاصم حیرت سے کبھی نورین کو تو کبھی پیسوں کو دیکھنے لگا۔

”یہ کہاں سے آئے؟“ وہ واقعی حیرت زدہ تھا۔ کمیٹی کا خیال تک نہیں آیا تھا۔

”کمیٹی نکلی ہے، پورے پچیس ہزار ہیں مگر میں ان میں سے ایک روپیہ بھی نہیں لوں گی۔ آپ یہ سب افضل بھائی پر خرچ کریں، ان کی دوائیاں، گھر کا راشن، بچوں کے لیے دودھ، کھانا، جو بھی ان پیسوں سے آ سکتا ہو، سب لے آئیں تاکہ وہ جلدی ٹھیک ہو جائیں۔“ نورین کی آواز میں خوشی کی جھلک تھی۔ درد کے احساس کے موتی بکھرے ہوئے تھے، اپنائیت کا احساس تھا۔ نورین کے الفاظ عاصم کے دل میں اتر رہے تھے اور اطمینان لہریں اٹھا رہا تھا۔

”کتنا بڑا ظرف ہے نورین کا...... اتنے مہینوں کے انتظار کے بعد جب اس کے ارمان اور خواہش پوری ہونے کا وقت آیا تو وہ خود غرض بننے کے بجائے رحم دل اور سراپا شفقت بن گئی۔ اپنی سوچ اور دل بدل ڈالا۔“ عاصم نے سوچا۔

”تم کتنی عظیم ہو نورین۔“ عاصم نے فرطِ مسرت سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”میں عظیم نہیں، گناہ گار سی عورت ہوں، عظیم تو اللہ کی ذات ہے، جو ہمارے دلوں میں نرمی اور رحم دلی ڈالتا ہے بھلا ہم کس قابل، وہی ہمارا دل بدلتا ہے۔ عید تو گزر جائے گی، صاف ستھرے کپڑے پہن کر بھی۔ کیا میں اچھی لگوں گی۔ نئے کپڑے جوتے پہن کر میرا ضمیر کیسے گوارا کرے گا۔ ہرگز نہیں، میں نہ تو بے حس ہوں نہ میرا ضمیر مردہ ہے۔ بس آپ جائیں اور شکیلہ بھابی سے مشورہ کر کے جو کچھ لینا ہے لے آئیں۔“ نورین نے اس سے ہاتھ چھڑائے اور پیسے دے کر باہر عاصم کو بھیجا۔

نورین کو یوں لگا جیسے اس کے اندر اطمینان اور سکون نے بسیرا کر لیا ہو، آرزوؤں کی جگہ عید دل کی سچی خوشی کا نام ہے۔ سچی خوشی اور اطمینانِ قلب تب ہی حاصل ہوتا ہے جب ہم کسی کو سکھ دیں۔ اس کے چہرے پر محرومیوں کی جگہ خوشیوں کے چراغ جلیں۔ عید نئے، کپڑے اور جوتے پہننے کا نام تھوڑی ہے، عید تو یہ ہے کہ ہم اپنی خوشیوں میں، مسرتوں سے محروم افراد کو شامل کریں کہ جینا اسی کا نام ہے۔

☆☆☆

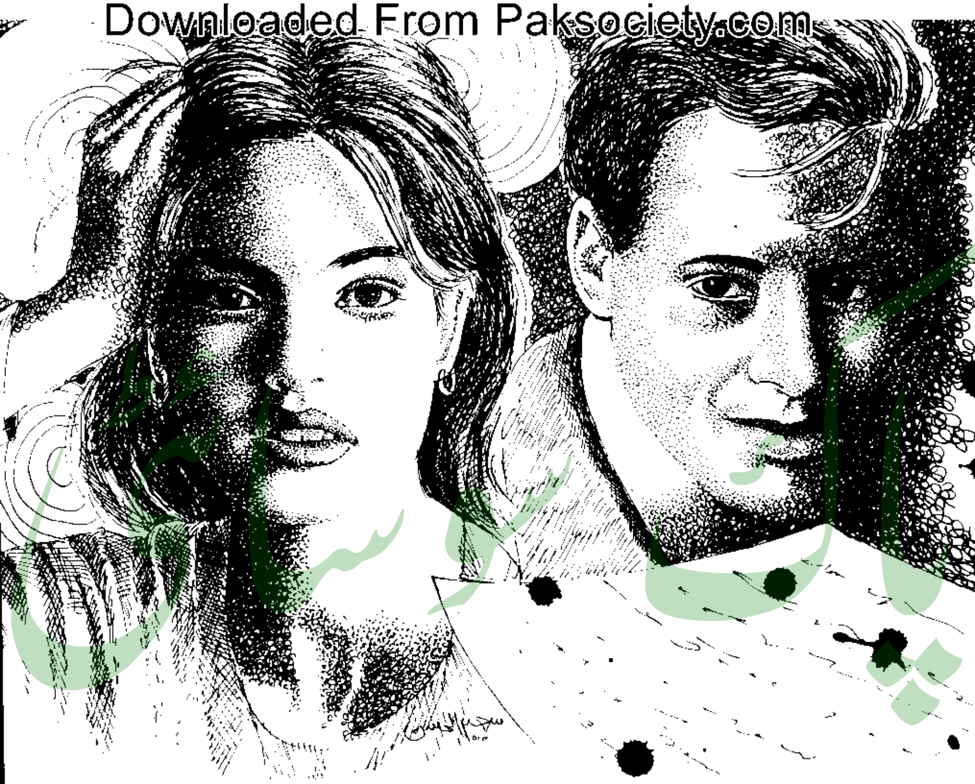

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

گھر سے چوراہے تک

صاعقہ علی جیلانی

''اچھا تو بی بی آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' حوالدار کی تیز نگاہیں مجھے اپنے اندر تک اترتی محسوس ہوئیں۔ جو کافی دیر سے میرے جواب کا منتظر تھا۔

''مجھے سوچنے کے لیے ایک دن کی اور مہلت دی جائے۔'' حوالدار کی بے درد نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے میں سسک پڑی تھی۔

اس نے مجھے گھور کر اپنی لمبی مونچھوں کو بل دیا، وہ مونچھوں کو اس طرح مروڑنے لگا جیسے حوالدار کے

ہاتھوں میں اس کی مونچھیں نہیں، میری گردن دبی ہو۔ اسی لمحے مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ سانسوں کی اتھل پتھل نے مجھے بے چین کر دیا۔ سارا دن بھٹکنے کے بعد میں پولیس کو بتانے یہاں پہنچی تھی۔ اب بھی اس شخص کی محبت میرے وجود میں کسی ناسور کی طرح پل رہی تھی۔ جو مجھے گھر سے بھگا کر چوراہے پر اکیلا چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ آخری بار اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا۔

”مریم میں ایک بے روزگار شخص ہوں، اپنا پیٹ بھرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے، میں تمہیں کہاں سے کھلاؤں گا؟“ اس کے الفاظ پہاڑ کی طرح میرے اوپر گرے تھے۔ اس بزدل کو دیکھ کر میں اندر ہی اندر ٹوٹنے لگی جس نے آسان لفظوں میں اپنا فیصلہ سنا کر میری اور اپنی راہیں الگ کر دی تھیں۔

جس نے ہر پل اپنی وفا کا دعویٰ کیا تھا...... چند لمحوں میں میری پیشانی پر بے وفائی کا داغ لگا کر فرار ہو گیا تھا۔ کاش مجھے اندازہ ہو جاتا روٹی کا بھوکا محبت کا کیا پیٹ بھرے گا۔

حوالدار کے ماتھے پر جمع ہونے والی شکنیں...... میری پریشانی میں اضافہ کر گئیں۔ اس کے چہرے پر ابھرتے ہوئے سوالوں کو پڑھ کر میں ایک بار پھر اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر گڑگڑائی۔

”حوالدار صاحب، صرف آج کی رات مجھے مہلت دی جائے۔ کل تک میں کسی نہ کسی فیصلے پر پہنچ جاؤں گی۔“ میرے ہاتھوں کی لرزش پر اس کے آدم خور چہرے پر کچھ نرم تاثر ابھرا۔

”ٹھیک ہے بی بی روؤ نہیں ...ایس ایچ او صاحب آئیں تو میں ان سے بات کرتا ہوں۔“ اس نے مجھے دلاسا دے کر چپ رہنے کی تلقین کی۔

اس کے دلاسے پر میں نے اپنی سسکیوں کو دبایا۔ تبھی کسی مرد کے بھاری بوٹ کی دھم، دھم سے میرا پورا وجود کان بن گیا تھا...... آواز کے تعاقب میں ہولے سے تھوڑا سر اٹھا کر دیکھنا چاہا، دروازے کا پردہ اٹھانے والا کوئی اور نہیں ایس ایچ او ہی تھا جو میری آدھی فریاد سننے کے بعد بڑی عجلت میں چند سپاہی اپنے ساتھ لے کر نکلا تھا...... نکلتے، نکلتے وہ حوالدار کو یہ حکم صادر کر گیا تھا کہ ”لڑکی کو کہیں جانے مت دینا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اپنی ہوس بھری نگاہوں سے میرا وجود چھیدتا ہوا باہر گیا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد وہ لوٹا تو اس کے چہرے پر بشاشت تھی...... جیسے کسی مغل بادشاہ کا قلعہ فتح کر کے لوٹا ہے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی۔ جس نے مجھے سہما دیا۔

”صاحب جی یہ لڑکی کہتی ہے، اسے آج کی رات سوچنے کے لیے دے دی جائے۔ کل تک یہ اپنے ٹھکانے کا خود بندوبست کر لے گی۔“ حوالدار نے میری کہی بات شکایتی انداز میں اس کے گوش گزار کی۔

اس کی پوری بات سننے کے بعد ایس ایچ او کے کلین شیو چہرے پر سوچ کی لکیریں تن سی گئیں...... پھر کافی سوچ بچار کے بعد وہ بولا۔

”ٹھیک ہے، آج رات لڑکی کے لیے کہیں نہ کہیں بندوبست کرتا ہوں۔“ اس نے اپنا فیصلہ سناتے وقت جیسے میری سو نسلوں پر احسان کیا۔

”ویسے تمہارے عاشق کو پولیس ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہے۔“ وہ اب مجھ سے مخاطب ہوا تھا، ساتھ ہی اس نے دانت پیس کر حقارت بھری نگاہ میری طرف ڈالی۔

”پھوامی کہا کرتی تھیں، مریم اپنے چہرے کو چھپا کر نکلا کرو، تیری یہ خوب صورتی نہ جانے کتنوں کو لے ڈوبے گی۔“ اس کے یوں دیکھنے کے انداز پر میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

وہ بھی کیا دن تھے بے فکری اور مستی کے...... پھوامی ...ٹوکتی رہتیں اور مجھے کوئی پروا نہ ہوتی۔ انہی دنوں میری ایک رانگ نمبر پر فراز سے دوستی ہو گئی تھی بعد میں اسی دوستی نے میرے اندر عشق کی جڑیں مضبوط کر دی تھیں۔ وہ جو لفظوں کا کھلاڑی تھا، اس نے اپنے لفظوں کے جال میں مجھے قید کر لیا۔ میرے دن رات

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

سہانے ہوگئے تھے۔ اس کی بڑھتی محبت نے مجھے پھپو امی اور بابا سے باغی بنا دیا۔

میرے گھر میں میری بدتمیزیاں بھگتنے والی صرف پھپوامی تھیں۔ جنہوں نے اماں کی وفات کے بعد مجھے پھوپی نہیں ماں بن کر پالا تھا۔ وہ مجھے اکثر کہتیں۔

''مریم میں نے تم دونوں بہن، بھائی کی وجہ سے شادی نہیں کی...... تمہارے باپ نے دوسری شادی سے صاف انکار کردیا تھا پھر میں بھائی کے یتیم بچوں کو چھوڑ کر کیسے اپنا گھر بسا لیتی۔''

ایس ایچ او مراد نے ٹیبل پر زور سے ڈنڈی مار کر مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا...... میں پتا نہیں کن خیالوں میں تھی، مجھے لگا یہ ٹیبل پر برسنے والی ڈنڈی ٹیبل پر نہیں بلکہ میرے جسم پر لگی ہے۔

میں اچھل کر فوراً سیدھی ہو بیٹھی۔ یوں اچھل جانے پر مراد بلوچ اور حوالدار کے چہروں پر مسکراہٹیں گہری ہوگئیں۔ اپنی تذلیل پر میری آنکھوں کا سوکھا پانی پھر جمع ہونے لگا تھا۔

ایس ایچ او کے چہرے پر یک دم سنجیدگی آگئی تھی۔ وہ میری اندرونی کیفیت بھانپ کر سنجیدہ ہوگیا۔ کچھ پل گزرنے کے بعد اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

''میں تم سے چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں بی بی؟''

''جی پوچھیں......؟'' میں نے فرمانبرداری سے نگاہیں نیچی کر کے اپنی چادر سے آدھا چہرہ چھپا کر جواب دیا۔

''فراز سے کتنے سال تمہارا چکر رہا؟'' یہ پوچھتے ہوئے اس کے لہجے میں زہر سا اتر آیا تھا۔ اس کے پہلے ہی سوال پر میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ زبان گنگ سی ہوگئی تھی۔

''تقریباً دو سال تک ہمارا موبائل پر رابطہ رہا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دو سال کے عرصے میں نہیں دیکھا تھا۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ جسے آپ آخری بھی کہہ سکتے ہیں۔'' میں بہ مشکل بولی تھی اور اپنی ہتھیلی سے میں نے اپنی آنکھوں کے نم گوشے صاف کیے۔

''اس نے تم سے سیدھے طریقے سے شادی کیوں نہیں کی؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی ایس ایچ او کے لہجے میں طنز سا اتر آیا تھا۔

''ہماری خاندانی روایت ہے ہم غیروں میں رشتہ نہیں دیتے۔ ہمارے پاس کوئی آپشن نہیں تھا سوائے بھاگنے کے۔''

''کراچی جیسے شہر میں رہ کر روایتوں کی پاسداری کی جارہی ہے۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''آپ نے کیا کہا؟'' اس کی پوری بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے بیزاری سے جواب دیا۔ پھر کچھ سوچنے کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ ''تم کو گھر چھوڑے ہوئے کتنے دن ہوئے ہیں؟'' اس کے سوال میں عجیب سی چبھن تھی۔

''جی تین دن......''

''یہ تین دن تم نے کہاں گزارے؟'' اس نے تپتی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اس وقت وہ مجھے پولیس افسر نہیں اپنے باپ جیسا لگا۔ جسے میرے ہر جواب پر غیرت آرہی تھی۔

''اس کے دوست کے گھر...... وہاں گھر میں بہت زیادہ افراد تھے اور وہ کمانے والا ایک تھا۔ اسی لیے ہمارا بوجھ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا...... تبھی فراز نے مجھے کہا تھا کہ یہ لوگ بہت تنگ دل ہیں زیادہ دیر ہمارا بوجھ برداشت نہیں کرسکیں گے۔'' میں بھی اسے رام کہانی سناتی چلی گئی۔

''وہ آج صبح آٹھ بجے مجھے اس کے گھر سے لے کر نکلا تھا، اس نے مجھے یہی کہا تھا کہ میں تمہیں اپنے گھر لے چلتا ہوں پر بس اسٹاپ پر مجھے دو منٹ رکنے کا کہہ کر لوگوں کی بھیڑ میں کہیں گم ہوگیا...... میں نے دو گھنٹے تک اس کا انتظار کیا۔ ہر جگہ اسے ڈھونڈا پر وہ کہیں نہیں ملا۔ مجھے دو منٹ رکنے کا کہہ کر وہ بھاگ گیا۔'' میرا گلا رندھ گیا تھا۔

''ایس ایچ او صاحب مجھے انصاف چاہیے۔ اس شخص کو پکڑا جائے سزا دی جائے، اس نے میرے ساتھ دھوکا کیوں کیا۔ گھر سے بے گھر کر کے مجھے چوراہے پر تنہا چھوڑ کر بھاگ گیا، میری زندگی برباد... کرنے کا اسے کوئی حق نہیں تھا۔'' میں سسک اٹھی تھی۔ میری رحم طلب نگاہیں اس کے چہرے پر کھب سی گئیں۔ جو بڑے غور سے میری بات سن رہا تھا۔

''بی بی جو بیان تم نے دیا ہے، وہ سراسر سچ ہے یا اس میں جھوٹ کی بھی ملاوٹ کی ہے۔'' اس کا کاغذ پر چلتا قلم رک گیا تھا۔ اس نے میرے چہرے کو بغور ٹٹولنا چاہا۔

''ایس ایچ او صاحب مجھے جھوٹ بول کر کیا ملے گا۔ جو حقیقت تھی وہ میں نے آپ کو بتادی ہے۔ میرے بیان میں جھوٹ کی کوئی آمیزش نہیں۔'' بولتے، بولتے مجھے لگا...... میری آواز ڈوب رہی ہو۔ مجھ سے بولا نہ گیا، میں چپ ہوگئی تھی مجھے اس کی نظروں سے گھبراہٹ ہورہی تھی...... ایس ایچ او اٹھائیس تیس سالہ جوان مرد تھا۔ اس کی آنکھوں میں جوانی کی شوخی اور میرے بیان میں بائیس سال کی نادان عمر کا تجربہ تھا۔ جس نے بائیس سال پھپوامی کی نصیحتیں سننے کے بعد بھی نادانی کا ثبوت دیا۔

''میرا مشورہ مانیں بی بی، آپ واپس اپنے گھر چلی جائیں۔'' حوالدار نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کر کے اپنا نادر مشورہ پیش کیا۔ حوالدار کی بات سننے کے بعد ایس ایچ او نے گھور کر اسے دیکھا جیسے اسے کچا چبا جائے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا میں نے اپنا سر نفی میں ہلا کر انکار کیا۔

''نہیں حوالدار صاحب، شہر کے لوگ اتنے بھی کھلے دل کے نہیں کہ بھاگی ہوئی لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ لیں۔ میرے بابا تو بہت سخت آدمی ہیں، میں واپس گئی تو وہ مجھے زندہ دفن کردیں گے۔ میں ان کی عزت خاک میں ملا کر نکلی تھی۔ زخم تازہ ہو تو آدمی کو کچھ نظر نہیں آتا۔'' میں نے رندھی ہوئی آواز میں بات ختم کی۔

''اگر فراز نہ ملا تو بی بی ہم کیا کریں گے، آپ جیسے کیسز تو مہینے میں کئی دفعہ ہمارے پاس آتے ہیں۔ ہمارے بس میں جو ہوتا ہے ہم وہی کرتے ہیں۔'' حوالدار جھنجلاہٹ سے بولا۔

''اگر فراز مل بھی جائے تو میں اس کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی۔ وہ ایک بزدل انسان ہے، جس نے میری وفا اور محبت کی قدر نہیں کی۔ ایک دھوکے باز شخص کے ساتھ میں پوری زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔ میں اب صرف یہ چاہتی ہوں قانون اسے سزا اور مجھے تحفظ دے۔'' میں نے اپنا مطالبہ دُہرایا یہ جانے بغیر کہ ایسا ہونا ممکن بھی ہے یا نہیں۔

''ٹھیک ہے بی بی، میرے خیال میں آپ کا بیان مکمل ہوچکا ہے۔ آپ تھوڑی دیر باہر جاکر بیٹھیں، ہم کوئی فیصلہ کرتے ہیں کہ آپ کو دارالامان یا کہاں جانا چاہیے۔ ویسے دوسرا آپشن یہ ہے کہ آپ مجھ پر بھروسا کر کے میرے گھر بھی چل سکتی ہیں، میری بھی فیملی ہے۔'' ایس ایچ او نے اپنی بات ختم کر کے مجھے جانے کا اشارہ دیا۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ میرے سر پر کھڑا تھا۔ ڈر کے باوجود میں اس کے ساتھ اس کے گھر جانے کو تیار ہوگئی۔ آخر کو وہ اس ملک کے شہریوں کا محافظ تھا۔

میں نے ایک مرد پر نہیں بلکہ اس شخص کی وردی پر اعتبار کیا۔ جس شخص کی وردی ہی میرے تحفظ کی ضامن تھی۔ میں اس کے گھر آگئی تھی۔ کہنے کو وہ ایس ایچ او تھا مگر اس کا بوسیدہ گھر دیکھ کر میں ایک بار پھر حیرت میں آئی تھی...... وہ اپنے چہرے مہرے سے تو اتنا شریف نہیں دکھتا تھا کیونکہ تھانے میں جس طرح وہ مجھے دیکھ رہا تھا اس سے خوف کھانے کے باوجود جانے کیوں میں نے اس کے ساتھ اس کے گھر آنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں ابھی دروازے پر ڈھیروں سوچوں کے شکنجے میں جکڑی کھڑی تھی کہ کوئی زنانہ آواز اندر سے آئی۔

''مراد! آگیا تو...آ ذرا مجھے آکر پانی تو دے، دے۔'' مراد بلوچ مجھے ہمراہ لے کر صحن سے اس بوسیدہ مکان کے ایک کمرے میں چلا گیا۔

"کون ہے مراد تیرے ساتھ...... کوئی زنانی ہے کیا، کس کو تو لے کر آیا ہے؟" ان خاتون کا لہجہ یکا یک بدلا۔ غور کرنے پر مجھے معلوم ہوا وہ ایک نابینا عورت تھیں شاید مراد بلوچ کی ماں ہوں۔

"خالہ، ہاں ایک دکھیاری لڑکی ہے۔ تھانے آ گئی تھی سوتیلی ماں نے مار کر گھر سے نکال دیا۔ پناہ چاہ رہی تھی، میں نے سوچا تجھ سے بڑھ کر اسے کون پناہ دے سکتا ہے۔" میں مراد بلوچ کی گھڑی جانے والی کہانی پر ابھی غور ہی کر رہی تھی کہ خالہ نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ میری دو چوڑیوں کی کھنک سے سمجھ گئی تھیں کہ میں لڑکی ہوں، میں جو ڈر رہی تھی اب اس کی باتوں سے خوف کی لہریں تھم چکی تھیں۔ مجھے پھپو کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ "بیٹی مریم ان پولیس والوں کو اللہ، رسول کا خوف نہیں ہوتا۔ ان کا کوئی دین ایمان نہیں ہوتا ان سے تو بچ کر ہی رہنا چاہیے۔" مگر آج جبکہ میں ایک مصیبت زدہ ہو کر انہی محافظوں کے پاس مدد مانگنے آئی تو انہوں نے اپنا فرض نبھایا اور مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔

سچ ہے پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ ہم بلاوجہ کسی ایک کی زیادتی کو اس کے پورے محکمے کی جانب سے زیادتی تصور کر لیتے ہیں جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ میں دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھی کہ مزید کہیں اور بھٹکنے سے بچ گئی تھی۔ اگرچہ میں نے پھپو اور بابا کی باتیں نہیں مانی تھیں مگر ان کی دعاؤں کا حصار شاید پھر بھی میرے ساتھ تھا۔

پھپو امی کی برسوں پرانی بات میرے کانوں میں گونجی تھی۔ "آدمی کے چہرے پر اس کے گناہ کی سیاہی آ جاتی ہے۔" پر مجھے اس شخص کے چہرے پر کوئی سیاہی نظر نہیں آئی تھی۔ اس کا اجلا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ تبھی اندر سے ابھرنے والی اس آواز پر میں لرز اٹھی۔

"مریم مگر یہ سیاہی تیرے چہرے پر ضرور آئی اس لیے کہ تو نے اپنے پیاروں کا اعتبار توڑا۔ ایک نامحرم سے اپنی مرضی کا رشتہ بنایا۔" بے اختیار میرا ہاتھ میرے ہی چہرے کی طرف بڑھا اور میں آئینہ دیکھنے کی متلاشی نظریں کمرے کی دیواروں پر ڈالتی رہی۔

مراد بلوچ، خالہ کے پاس مجھے چھوڑ کر دوسرے کوٹھری نما کمرے میں جا چکا تھا۔ میں نے اس کی کہی کہانی کے تحت خالہ سے بات چیت کی انہوں نے بہت ہمدردی کا اظہار کیا۔ خود اٹھ کر میرے لیے کھانا لے کر آئیں۔ نابینا ہونے کے باوجود میں ان کو کام کرتا دیکھ رہی تھی جیسے انہیں سب کچھ نظر آ رہا ہو۔

☆☆☆

مجھے یہاں آئے دو روز ہو چکے تھے۔ تیسرے دن میں نے خالہ سے پوچھ کر ان کے ساتھ کام کاج شروع کیے کیونکہ دو دن تک تو انہوں نے مجھے بالکل مہمان بنا کر رکھا ہوا تھا۔ ایس ایچ او مراد بلوچ مجھے یہاں لا کر جیسے مجھ سے غافل ہو گیا تھا۔ شاید اسے خالہ کے لیے ایک لڑکی چاہیے تھی یا گھر کی دیکھ بھال کے لیے؟ میرے ذہن میں طرح، طرح کی سوچیں آتیں۔

اس روز وہ نمازِ جمعہ کے بعد گھر آیا تو مٹھائی اور پھل لیے ہوئے تھا۔ خالہ کے پوچھنے پر بتایا کہ اس نے پولیس پارٹی کے ساتھ ریڈ کر کے ایک بڑے مجرم کا خاتمہ کر ڈالا تھا تبھی انعامی رقم سے یہ سب وہ لایا تھا۔ خالہ اسے دعائیں دینے لگیں اور پھر بولیں۔

"بس بیٹا اب تو شادی بھی کر لے۔ جو لڑکی میں نے بتائی تو نے منع کر دیا اب تو ہی کوئی بتا دے۔"

"ہاں خالہ بتا دوں گا فکر نہ کر۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ گیا۔ اس کے اٹھتے ہی میں نے اس کے ساتھ لایا ہوا اخبار اٹھا لیا اور یونہی نظر دوڑانے لگی۔ اچانک میری سانسیں اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں...... بڑی تفصیلی خبر تھی ساتھ ہی تصویر بھی تھی۔ میرے ماتھے پر پسینہ چمک اٹھا۔ اپنی حالت خود محسوس کر کے میں نے کچھ نارمل ہونا چاہا۔ جلدی سے اٹھ کر پانی پیا اور ایک گہری سانس لی۔

"کیا بات ہے بیٹا، کیا خبر پڑھ رہی ہو؟"

''کچھ نہیں خالہ!'' خالہ کے یوں کہنے پر میں گھبرا گئی، انہیں میرے تاثرات کا کیسے پتا چل گیا تھا۔ جس مجرم اور اس کے گینگ پر مراد بلوچ نے ریڈ کیا تھا وہ فراز کا گینگ تھا اور وہی اس کا سرغنہ تھا۔ اس کی خون میں لت پت تصویر دیکھ کر میں کانپ اٹھی تھی۔ شاید اپنے انہی کرتوتوں کی وجہ سے وہ مجھے بیچ راستے میں چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا۔ میں خالہ سے کھانے کا کہہ کر کمرے سے باہر آ گئی تھی۔

''اخبار پڑھ لیا تم نے......؟'' مراد بلوچ نے مجھ سے کہا جو منہ ہاتھ دھو کر کھانے کے لیے تیار تھا۔ وہ ساتھ، ساتھ اس ٹرے میں برتن رکھ رہا تھا جو اندر خالہ کے پاس لے کر جانا تھی۔

''جی جی......'' میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کیوں پوچھ رہا ہے۔

''اب بھی اس کا انتظار کروگی......؟ دیکھو قدرت نے اسے کیسی سزا دی...... دنیا میں بھی رسوائی اور آخرت میں بھی بربادی......'' اس کا لہجہ دھیما تھا کہ خالہ کہیں سن نہ لیں۔ میں کچھ نہ بولی اور سالن ڈونگے میں نکال کر ٹرے میں رکھا۔ میرے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

''چلو ابھی چل کر کھانا کھاؤ، شام میں بات کرتے ہیں۔'' ہم دونوں خالہ کے پاس آ گئے تھے۔

وہ رات عجیب کیفیت میں گزری تھی۔ کبھی پرانی باتیں یاد آتیں تو فراز کی چاہت دل میں گدگدی کرتی اور کبھی اس کی بے وفائی یاد آتی تو نفرت کی چنگاریاں آنکھوں سے نکلنے لگتیں۔ ساری رات عجیب بے چینی میں گزری تھی۔ معلوم نہیں مجھے اس کے مرنے کا افسوس ہوا تھا یا خوشی میں اپنی کیفیت سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

فجر کے وقت میری آنکھ نہ کھل پائی۔ سورج نکل آیا تھا جب اٹھی تو چائے کی مہک گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں ابھی دوپٹا سنبھال کر باہر کی طرف آ رہی تھی کہ قدم رک گئے۔

''خالہ، اب تم ہی بتاؤ جب اس لڑکی کا کوئی وارث نہیں ہے تو ہم ہی تو اس کے وارث ہوئے ناں...... اتنے دن میں ہی اسے پرکھ... لیا ہے...... بس اسی سے میرا نکاح پڑھا دو......''

میں وہیں دروازے پر سن سی ہو گئی...... مجھے اس وقت سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ خوش ہوں یا روؤں...... اپنے پیاروں کے ہوتے ہوئے بھی میں لاوارث تھی...... میں واپس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں مراد بلوچ کی بات کا مان رکھ لوں۔

عزت چاہے بھیک میں ہی کیوں نہ ملے مجھ جیسی لڑکیوں کو لینی پڑتی ہے کیونکہ گھروں سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کا کوئی گھر نہیں ہوتا، عزت اور محبت کی تلاش انہیں عمر کے ہر حصے میں رہتی ہے، فراز جیسے مرد مجھ جیسی لڑکیوں کو قسائی کے اڈے پر رکھ کر چھوڑ جاتے ہیں۔

کاش مجھ جیسی کم عقل جذباتی لڑکیوں کو یہ سمجھ آ جائے اپنا گھر چھوڑنے کے بعد زندگی پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کی راہ گزر بن جاتی ہے پر اس کا انکشاف گھر چھوڑنے کے بعد اور عزت کا جنازہ اپنے ہی کندھوں پر اٹھانے کے بعد ہی ہوتا ہے، جب وقت کی ناؤ ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ جاتی ہے، مجھ جیسی... بدنصیب بیٹیاں جب والدین کا دل دکھا کر نکلتی ہیں تو انہی کی بددعائیں...... نہیں کیونکہ والدین بددعائیں نہیں دیتے بلکہ ان کی دکھی آہیں ہمارے نصیب ہی اجاڑ دیتی ہیں۔

میں نے بابا، پھپھو امی سے وفا نہیں کی تو فراز مجھ سے کیا وفا کرتا۔ شاید میری نافرمانی کی مجھے بہت کڑی سزا مل چکی تھی، سچ ہے یہ معاشرہ مردوں کا ہے، جہاں حوا کی بیٹیاں اپنی ہی نادانیوں سے روز بے دام بکتی ہیں، میرے والدین کی دعائیں ساتھ تھیں جو مجھے عزت کی چھت نصیب ہو رہی تھی...... میں دو دن فراز کے ساتھ رہی تھی۔ پر شکر ہے میری عزت سلامت تھی۔ میرے دل میں یہ ملال تو نہیں کہ میں ایک شریف آدمی کے ساتھ دھوکا کر رہی ہوں۔ آنسو میرے دامن میں لگاتار گر رہے تھے۔

☆☆☆

دو میٹھے بول

فریدہ لاکھانی

"کیا وہ بہت دنوں سے میکے نہیں گئیں ہیں" پروین نے ممی سے دریافت کیا۔ "بھابی ہیں ویسے بہت چالاک، جب میکے جانا ہو تو جلدی، جلدی گھر کے تمام کام نمٹا کر بھیا کے دل میں جگہ بنانا شروع کر دیتی ہیں۔"

"خیر...... وہ کچھ نہ بھی کرے تو بھی میرے سلیم کو تو ایسا دیوانہ بنا رکھا ہے کہ وہ اس سے پوچھے بنا کوئی کام نہیں کرتا۔"

"ممی شکر ہے آپ نے یہ نہیں کہا کہ سلیم بھائی

ان سے پوچھے بغیر پانی تک نہیں پیتے۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔" خالدہ بیگم نے فوراً ناک بھوں چڑھاتے ہوئے۔ "توبہ ہے آج کل کی بہوؤں سے، ایک ہمارا زمانہ تھا۔" ممی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "جتنا بھی کام کرتے تھے چکی بھی پیستے تھے لیکن تمہارے ابا کو کبھی یہ نہیں سکھایا کہ ہماری مرضی پر چلیں۔ نہ ہی اپنے بدن کے لگے زخموں کو بولنے دیا جو کام کی تھکن سے چور ہو کر چغلی کھانے کو تیار ہوتے تھے۔ یہ خواہش ہوتی تھی کہ وفا کے نام پر دھبا نہ لگنے پائے۔ میاں کے کان بھی کبھی نہیں بھرے، رات کو ساس، نندوں کی خوب، خوب خدمتیں بھی کیں اور تمہارے ابا کو بھی شرف ہے کہ کبھی مجھے آواز نہ دیتے تھے۔ یہ ہیں وہ مثالی باتیں اور رنگ ڈھنگ جو رقم کرے اگر زمانہ سنہری حرفوں میں تو مثال نہ ملے۔" وہ اپنی حکایت زندگی سنا رہی تھیں۔

"کیا وقت تھا وہ بھی جب اعتماد قائم رکھتے، رکھتے تھک جاتے تھے لیکن بڑوں سے بلاوجہ زبان منہ چلاتے تھے۔ اعتماد کا مرنا موت سے بھی بدتر تھا۔ ایک خواہش کے پورا کروانے میں زمانے لگ جاتے۔ ہمارا میکا دو قدم پر تھا لیکن نہ کبھی ڈیوڑھی سے جھانکا نہ ہی روز بھاگ، بھاگ کر وہاں دھرنا جمایا۔ اور ایک ہماری بہو رانی ہیں کہ آج کل صبح؛ شام انہیں اپنا میکا بہت یاد آتا ہے۔ اب دیکھو کل وہ اپنے بچپن کے فضول سے قصے سنا، سنا کر سلیم کو مرعوب کر رہی تھی اور تمہارا بھائی ..... بے وقوف بنے جا رہا تھا۔"

"حد ہوگئی، ممی آپ بھی اتنی ہی بھولی ہیں جتنے بھولے سلیم بھائی۔ ویسے جس چاہ سے بھائیوں کو (بیٹوں) کو بیاہا جاتا ہے صرف اس لیے کہ گھر میں اور زندگیوں میں بہار آئے۔" وہ تاسف سے بولی۔

"ممی...... آپ یہ بھی تو یاد رکھیں کہ آپ کی بہو رانی کے پاس جو گُن ہیں کہ وہ جاب بھی کرتی ہیں، آپ کے پاس تو نہیں تھے وہ گُن اور وہ زمانہ بھی جوائنٹ فیملی والا تھا۔ بس فرق یہاں سے شروع ہو جاتا ہے۔ خیر ہمیں کچھ ننھے اکبر کے بارے میں سوچنا ہوگا...... ہر چیز کو بھول کر اس کی ذہنی سطح کو جیتنے کا سوچنا ہوگا۔ ابھی تو یہ چوتھی کلاس میں ہے مگر اس کی غور کرنے کی بہت عادت ہے۔ ہر چیز کی گہرائی میں جا کر سوچتا ہے۔"

"کون ہے؟" پروین نے دروازے کی دستک پر سوال کیا۔ "ارے بھابی، یہ آپ ہیں، کب آتی ہیں، کب چلی جاتی ہیں، پتا ہی نہیں چلتا؟ کیسے ہیں آپ کے گھر والے۔"

"بھئی صرف اپنے میکے ہی تھوڑی جاتی ہوں، کچھ دفتر کے لوگوں کے ہاں کام سے بھی جانا ہوتا ہے، کچھ دوستوں کے گھر بھی کبھی کبھار جانا پڑ جاتا ہے۔" فرحت نے جواب میں تلملا کر کہا۔ بھاوج کی بات پر پروین چپکی ہو رہی تھی۔

☆☆☆

"پھوپھو، کل میری دسویں سالگرہ ہے، ہم ممی ابو کو سرپرائز دیں گے کیا خیال ہے؟" اکبر نے نئی امید بھرے لہجے میں کہا وہ اب سمجھدار ہو چلا تھا۔ اس نے ہاں، ہاں تو کر دی تھی مگر سوچ میں پڑ گئی کہ ویسے بھی ان کی اماں جان کو فرصت نہیں ہوتی گھر کے معاملات نبھانے کی وہ سرپرائز کو تو اور بھی بہانہ بنا دیں گی کہ انہیں کسی نے اطلاع نہیں کی ورنہ وہ اپنے میکے نہ جانے کا پروگرام بناتیں۔ رات بھر وہ اسی پس و پیش میں رہی کہ آج شام کے منظر کی تابناکی کہیں دھواں نہ ہو جائے اور ننھے سے اکبر کا دل نہ ٹوٹ جائے۔

پروین کے دماغ میں ساری رات کوئی منصوبہ چلتا رہا تھا۔

"بھئی پروین، اکبر سے کہو وہ نیا جوڑا تو لا کر اپنے والدین کو دکھائے۔" پھر اچانک سے تڑپتی آواز میں ممی بولیں۔ "آئے ہائے میں نے تو اکبر کے سرپرائز کا بیڑا غرق کر دیا۔" اس بات سے فرحت بھابی کے کان کھڑے ہوگئے۔ "پھر کتنے دوست آ رہے ہیں؟" ممی نے پھر پوچھا۔

شاید یہ سب پروین کے دماغ چلنے کا ہی نتیجہ تھا۔

فرحت کے گھر والوں کو صبح صبح نیوتا سالگرہ کا بھجوا دیا تھا تاکہ وہ سب بھی یہیں آجائیں اور بہورانی کو وہاں جانے کی نہ سوجھے۔ سلیم سے بھی دروازے پر بین السطور معنی و الفاظ میں کہہ دیا کہ شام کو گھر میں تقریب ہے، اکبر تمہیں دس بجے دفتر میں فون کر لے گا...... سلیم اسی وقت چونک کر فرحت کو گاڑی میں بٹھاتے، بٹھاتے یہ خبر دینے کی کوشش کرنے لگے۔

بھائی، بھابی کے تاثرات باوجود کوشش کے میں کھڑکی سے نہ جان پائی۔ اکبر ماں، باپ کو حسبِ معمول کام پر جاتا دیکھتا رہا انہوں نے یہ تک پوچھنا گوارا نہ کیا کہ وہ آج اسکول کیوں نہیں گیا۔ بارشیں ان کے آنچل کو بھگو، بھگو کر مجبور کر رہی تھیں کہ خدارا آج تو مت جاؤ جہاں کہیں بھی جا رہی ہو۔ اکبر بھی حیرانی سے نیوتا ہاتھ میں لیے کھڑا تھا، تب سلیم نے فرحت کو اشارہ کیا کہ وہ اس کی جانب دیکھے۔

اکبر کے ننھے سے دل نے یہ بھانپ لیا تھا کہ اس کے ابو پھیلی ہوئی دھوپ کو اور بکھیرنا چاہ رہے تھے اور شفقت کا سائبان پھیلانا چاہ رہے تھے جس کی وہ تلاش میں گم تھا۔

”اب میں بچہ نہیں ہوں۔“ اکبر نے تھوڑے سے تلخ لہجے میں اپنا پیغام ماں کے کانوں تک پہنچانے کی کوشش کی، اس کی ننھی، سسکتی صدا اس کے جسم و جاں میں امید کی حرارت بھرنے لگی تھی کہ شاید اس کی ماں اس کی جانب ایک پیار بھرا اور واردات سے خالی لہجہ اختیار کرے، وہ ماں کے دو میٹھے بول بولنے کا منتظر رہا کہ ”تم جیو ہزاروں سال......“ جانے ماں کے چہرے میں اس کی تمنائیں کیوں قید تھیں۔ اسے خوش فہمی رہی تھی کہ مما اب کہیں۔ ”اب تمہارے خوابوں کی دنیا کو میں سجاؤں گی، اب ان خوابوں کی خوشبو وقت کے صحرا میں کبھی نہیں کھوئے گی۔“ وہ لاکھ کوشش میں تھا کہ وہ اسے بڑھ کر سینے سے لگائے اور کہے۔ ”بیٹا آج سے میں نے اپنا وقت تیری نذر کیا“ اور جیسے اکبر کو لگا کہ اب بے یقینی میں بھی ممتا کا دروازہ کھل سکتا ہے۔ وہ اپنی قسمت آزمانے ماں کی طرف بڑھ رہا تھا مگر شاید جہاں اپنی قسمت آزمانے کی ٹھانی، اس کی آرزوؤں نے اپنا خالی ہاتھ پھیلایا۔

ادب

ادب کا دروازہ اتنا چھوٹا اور تنگ ہوتا ہے
کہ اس میں داخل ہونے سے پہلے سر کو جھکانا پڑتا ہے۔

میٹھا

سچ کو تمیز ہی نہیں ہے بات کرنے کی
جھوٹ کو دیکھو کتنا میٹھا بولتا ہے

مرسلہ: توقیر ہاشمی، منڈی بہاؤالدین

انہیں دیر ہو رہی تھی، وہ جلدی آنے کا وعدہ کرتے اپنے داخلی جذبات کے اظہار کی راہ ہموار کرتے ہوئے سلیم سے کچھ کان میں سرگوشیاں کرتی ہوئی اور گاڑی کا دروازہ دوبارہ کھول کر بند کرتے ہوئے چلنے کا اشارہ کرنے لگی۔ اس کی معمولی مسکراہٹ سے جیسے اکبر کی راہوں میں چاندنی سی گھل گئی۔ دادی اور پوتے نے مل کر گھر کو سجانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

وہ سارا دن محوِ انتظار، دادی اور پھوپی کے ساتھ سالگرہ کی تیاری کرتا رہا۔ اس نے کسی بھی دوست کو نہیں بلایا تھا۔ گھڑی نے جیسے ہی شام کے چھ بجائے سلیم کی گاڑی کا ہارن بجا...... فرطِ مسرت سے اکبر باہر آیا تو کیا دیکھتا ہے ماں، باپ کے ساتھ اس کے چار دوست تحفوں سے لدے پھندے چلے آرہے تھے۔ پروین جو اس کے پیچھے ہی آرہی تھی۔ چہرے پر عجب تاثرات سجائے یک دم بوکھلاہٹ کا شکار ہوئی۔ اکبر کی ماں کو اس کی سالگرہ یاد تھی جبھی انہوں نے الٹا اکبر کو سرپرائز دے دیا۔ سچ ہے وقت کی کمی احساسات کو نہیں مارتی بلکہ یہ ہمارے منفی جذبے... یہ انہیں مار دیتے ہیں۔

☆☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

مکمل ناول

خلش

نادیہ احمد

سرمئی اور سیاہ بادلوں سے سر نکالتی دھنک پہلی نظر میں مصور کے کینوس کی جھلک دیتی تھی۔ پچھلے کئی دن سے حبس نے ڈیرے ڈال رکھے تھے لیکن آسمان آج دل کھول کر برس رہا تھا، زمین کی پیاس بجھ رہی تھی۔ بارش کے پانی سے نہا کر جہاں سبزہ نکھر گیا تھا وہیں ہوا کے دوش پہ لہلہاتے درختوں کے پتے تالیاں بجاتے آمدِ برسات کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

بین الاقوامی آمد کے لاؤنج سے نکل کر پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے بارش کے چند قطروں نے اس کے چہرے کو بھگویا۔ ان کی ٹھنڈک اور نمی کو اپنی روح تک محسوس کرتے اس نے سرشار نگاہوں سے مینہ برساتے آسمان کو دیکھا۔ گہرے بادلوں نے آسمان کی چھت کو ڈھانپ رکھا تھا کہ دوپہر میں شام کا گمان ہوتا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا پارکنگ کی طرف چل پڑا جہاں اس کا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

DOWNLOADE Y.COM

ڈرائیور پہلے سے اس کا منتظر تھا۔ قصداً اس نے اپنی رفتار آہستہ رکھی تھی حالانکہ بوندوں کا تسلسل اس کے قیمتی سوٹ کو بھگو رہا تھا لیکن وہ ساون کی پہلی بارش سے اپنی روح کو سیراب کرتا بے پروائی سے چل رہا تھا۔ گاڑی تک پہنچتے پہنچتے وہ اچھا خاصا بھیگ چکا تھا۔ پانی اسی تواتر سے برس رہا تھا وہ گاڑی کے شیشے سے سڑک پہ گرتی بوندوں کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ جا بجا چھوٹے، چھوٹے تالاب بن گئے تھے اور ان میں گرتے ہوئے بارش کے قطرے مختلف اشکال بنا رہے تھے۔ اس رم جھم میں اس کی آنکھوں کے پردے پہ وہ پری چہرہ ابھرا۔ عمیر کو وہ شام یاد آئی جب اس نے پہلی بار اسے بارش میں بھیگتے دیکھا تھا۔ چاندنی میں بھیگے اس کے دلکش وجود نے سیاہ رات میں روشنی کر دی تھی۔ اس کا بوندوں میں تر سراپا عمیر کے دل میں جلترنگ چھیڑ رہا تھا۔ کسی مور کی طرح ناچتی وہ اس بات سے بے پروا تھی کہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے اس وقت عمیر اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ مریضِ عشق تھا اور یہاں معشوق ہی مسیحا تھا لیکن اس بات سے انجان کہ وہ اس کی دھڑکنوں میں سما چکی ہے۔ عمیر کی زندگی میں اس کا مقام اس ایک شام نے بدل دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ اس کی دوست تھی، ہمدرد تھی، غمخوار اور ہمراز تھی لیکن وہ اس کے دل کا روگ بن جائے گی یہ عمیر نے کب سوچا تھا۔ دونوں نے زندگی کے کئی سال ایک ہی گھر میں گزارے تھے...... دونوں کی شخصیت میں ایک دوسرے کے لیے کوئی بھید نہیں تھا لیکن اس شام عمیر وہاب پہ یہ راز افشا ہوا تھا کہ وہ فریال علی سے بے تحاشا محبت کرتا ہے۔ لیکن یہ بات وہ اسے کب اور کس انداز میں بتائے...... یہ ایک ایسا مرحلہ تھا جو اس کے لیے اپنی زندگی میں آئے ہر چیلنج سے زیادہ مشکل تھا۔ محبت کر لینا جتنا آسان ہوتا ہے اسے محبوب تک پہنچانا اتنا ہی مشکل اور عمیر پہ یہ مشکل وقت آن پڑا تھا۔

دل نے ٹھان لی تھی کہ اپنا ہم سفر وہ فریال کو ہی بنائے گا لیکن انہی دنوں اسے ملک سے باہر جانا پڑا کیونکہ یہ بابا کی خواہش تھی اور بابا کی خواہش اور خوشی اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ بابا وہ واحد ہستی تھے جنہیں اس نے کبھی نہ نہیں کی تھی۔ اسے یاد تھا جب اس رات بابا اس کے کمرے میں آئے تھے۔

''میں نے تمہارے لیے ایک شاندار مستقبل کا خواب دیکھا ہے عمیر...... اللہ گواہ ہے میں نے اپنے فرائض میں کوئی کوتاہی نہیں برتی ہے اور جہاں تک ممکن تھا میں نے تمہاری اچھی تعلیم و تربیت کی ہے اور اب میں چاہتا ہوں کہ تم میرا وہ خواب پورا کرو جو میں نے تمہارے حوالے سے دیکھا تھا۔'' ان کا ہر لفظ محبت بھرے جذبات سے بھرا تھا۔

''بابا...... آپ مجھ پہ بھروسا رکھیں میں آپ کا خواب ضرور پورا کروں گا زندگی میں وہ پل کبھی نہیں آئے گا جب آپ کو میری وجہ سے مایوسی ہو۔'' ان کا ہاتھ تھام کر عمیر نے انہیں یقین دلایا تھا۔ اور پھر وہ امریکا چلا آیا تھا۔ جس سے ایک پل کی جدائی گوارا نہ تھی اس سے ہزاروں میل دور کیونکہ اسے بابا کا خواب پورا کرنا تھا۔

☆☆☆

علی حیدر صاحب کی گاڑی معمول کی طرح سگنل پہ رکی تھی۔ ہمیشہ کی طرح رومال فروش، صفائی کرنے والے اور بھکاریوں نے وہاں کھڑی گاڑیوں کا رخ کیا۔ ان میں ہر عمر کے لوگ بلا تفریق جنس تھے۔ علی حیدر نے چند کرنسی نوٹ نکالے اور وہاں موجود بچوں کی طرف بڑھائے...... گرمی میں جھلسے ان کے نڈھال چہروں پہ ہنسی جھلملائی۔ کسی نے رومال پکڑایا تو کسی نے بال پوائنٹ...... یہ ان کا روز کا معمول تھا جب دفتر سے واپسی پہ اس سگنل پر اکثر ان کا واسطہ ان لوگوں سے پڑتا تھا اور علی حیدر صاحب خاص طور پہ چھوٹے بچوں سے ان کی کوئی نہ کوئی چیز خرید لیا کرتے تھے۔

''ستو! آج تمہارا دوسرا ساتھی نہیں آیا؟'' انہوں نے یہاں وہاں نگاہ دوڑائی۔

''اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے، وہ آج نہیں

آیا۔‘‘ بارہ چودہ سال کے ایک لڑکے نے جلدی جلدی بتایا اور اتنی دیر میں سگنل ہرا ہو گیا۔ وہ اس سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہتے تھے لیکن مجبوراً انہیں گاڑی آگے بڑھانا پڑی۔ گھر پہنچ کر بھی ان کا دل بے چین رہا۔ بار بار انہیں اس بارہ تیرہ سال کے بچے کا خیال آرہا تھا جس سے بلاناغہ ان کا سامنا ہوتا تھا۔ پتلا دبلا بدن، گھسے ہوئے مگر دھلے لباس میں ملبوس وہ معصوم اور پیارا سا بچہ جس کی آنکھوں سے ذہانت جھلکتی تھی انہیں پہلی نظر میں ہی بہت اچھا لگا تھا۔

’’تم پڑھتے نہیں؟‘‘ اس دن وہ ان کی گاڑی پہ جلدی، جلدی کپڑا مار رہا تھا۔

’’پڑھتا ہوں سر...... صبح میں اسکول جاتا ہوں پھر اسکول کے بعد یہاں آجاتا ہوں۔‘‘ اس کا لہجہ مؤدب تھا۔

’’کون سی کلاس میں؟‘‘ وہ اب ان کی طرف والے دروازے پہ کپڑا مار رہا تھا۔

’’پانچویں جماعت میں۔‘‘ انہیں سن کر خوشی ہوئی تھی۔ انہوں نے جیب سے چند کرنسی نوٹ اس کی طرف بڑھائے جو اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیے تھے۔ وہ اسی طرح سڑک کنارے کام کرتے ان بچوں کی مدد کیا کرتے تھے ان سے تھوڑا بہت کام کروا کر یا پھر کوئی چیز خرید کر... وہ انہیں ایسے بھی بہت کچھ دے سکتے تھے لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ پیشہ ور بھکاری بن جائیں۔ یہ بچہ ان سب سے مختلف تھا اور چند سیکنڈ ہی سہی مگر علی حیدر کا اس سے بات کرنا اس کی خیریت دریافت کرنا معمول بن چکا تھا۔

☆☆☆

’’سنو کیا تم مجھے عمیر کے گھر کا پتا بتا سکتے ہو؟‘‘ اگلے دن گاڑی کو قریبی پارکنگ میں کھڑا کر کے وہ سگنل پہ کھڑے بچے کے پاس آئے تھے۔ اس کی رہنمائی میں وہ اس کچی بستی میں چلے آئے تھے جہاں ایک کمرے کے شکستہ گھر میں وہ تنہا بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پہ درد اور آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ان کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

’’کیا تم میرے بیٹے بن کر میرے گھر چلو گے؟‘‘ اس کی زبانی اس کی والدہ کے انتقال کا سن کر انہوں نے اپنا دستِ شفقت اس کے سر پہ رکھا۔ وہ بے یقینی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیا کوئی ایسا بھی فرشتہ ہو سکتا تھا جو اس یتیم اور بے آسرا کو پناہ دے سکتا تھا۔ اور پھر علی حیدر صاحب اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئے تھے۔

علی حیدر ایک مشہور بزنس مین تھے...... دولت کبھی ان کی خدا ترسی کے درمیان حائل نہ ہوئی تھی۔ ان کی بیوی کا انتقال چند سال پہلے ہو چکا تھا اور ان کی اکلوتی اولاد، ان کی لاڈلی بیٹی فریال اس وقت صرف آٹھ سال کی تھی جب عمیر کو وہ گھر لائے تھے۔ شروع میں وہ ڈرا سہما سا رہتا تھا لیکن آہستہ آہستہ ان کی محبت، توجہ اور حوصلہ افزائی نے اس کی جھجک اور خوف دور کر دیا تھا۔

’’تمہیں اس بات کا پورا خیال رکھنا ہے کہ عمیر کو یہاں کسی بھی چیز کی کمی نہ ہو۔‘‘ علی حیدر کی بات پر فریال نے چابی سے چلنے والی گڑیا کی طرح سر ہلایا تھا۔ وہ بہت کانفیڈنٹ تھی اور اس کی سنگت میں عمیر بھی جلد وہاں ایڈجسٹ ہو گیا تھا۔ اس کا داخلہ بھی فریال کے اسکول میں کرادیا گیا وہ ایک برائٹ اسٹوڈنٹ تھا اور تعلیمی میدان میں اس کی کامیابیوں کا گراف ہمیشہ اونچا رہا تھا۔ چند سال پہلے سگنل پہ کھڑی گاڑیاں صاف کرنے والا عمیر وہاب آج علی حیدر صاحب کی بدولت ڈاکٹر عمیر وہاب بن چکا تھا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر کا یتیم و بے آسرا بچہ جسے اگر ان کا سایۂ التفات نہ ملتا تو زمانے کی ٹھوکریں اس کا مقدر بن جاتیں۔ وہ ڈرا سہما ہوا خوفزدہ سا عمیر جو اپنی ماں کی طویل بیماری کے بعد موت اور بھوک پر آنسو بہاتا اس ٹوٹے ہوئے مکان کے کونے میں تنہائی سے خوفزدہ تھا، کسے خبر تھی وہ پھول پیروں تلے مسلے جانے کا مقدر لے کر دنیا میں نہیں آیا تھا بلکہ قدرت نے اس کے لیے علی حیدر جیسے نیک دل شخص کے باغ کا انتخاب کیا تھا۔

"میں آپ کا ہر خواب پورا کروں گا بابا....." اس کی ہاؤس جاب مکمل ہوئی تو حیدر صاحب نے اس سے اپنی اسپیشلائزیشن مکمل کرنے کا کہا۔ وہ ان کی کوئی بات رد نہیں کر سکتا تھا۔ حالانکہ دل تو فریال کی زلفوں میں جکڑا تھا اور وہ اسے چھوڑ کر کسی صورت نہ جاتا اگر یہ اس کے بابا کی خواہش نہ ہوتی اور پھر وہ اپنی اسپیشلائزیشن کے سلسلے میں امریکا چلا گیا۔ اس سے دور جا کر بھی اس کا خیال ایک پل کے لیے بھی اس کے دل سے نہیں گیا تھا۔ ہر آنے والی صبح ان کے درمیان کا فاصلہ کم کر رہی تھی اسی امید پہ عمیر نے اتنے سال اس کی جدائی سہی تھی اور آج جب واپس لوٹا تو پہلا خیال جو دل کی دیواروں سے ٹکرایا تھا وہ فریال کا ہی تھا۔

☆☆☆

"آج میری چھاتی فخر سے چوڑی ہو رہی ہے کیونکہ میرا بیٹا آج اپنی کارڈیو ویسکولر سرجری کی تعلیم کامیابی سے پوری کر کے آیا ہے۔" انہوں نے اسے خوشی سے گلے لگایا۔

"یہ سب آپ کے مجھ پہ یقین اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے بابا کہ ایک بے آسرا اور یتیم بچہ جسے کبھی دو وقت کی روٹی بھی پوری نہیں ملی تھی آج ایک کامیاب سرجن بن چکا ہے۔" ان کا ہاتھ چومتے ہوئے اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"یہ سب تمہاری محنت اور قابلیت کا ثمر ہے میرے بچے.....تم آج جہاں ہو اس میں سب سے بڑا ہاتھ تمہارا اپنا ہے، تم میرے محتاج نہیں بنے، مجھے اپنی بیساکھی بنانے کے بجائے اپنے قدموں پہ یقین رکھا اسی لیے آج یہاں کھڑے ہو۔ صرف دولت کے بل پہ اگر کوئی کامیاب ہو سکتا تو اس ملک کے سارے کروڑ پتیوں کی اولادیں شاندار اکیڈمک کیریئر کے ساتھ کامیاب قرار پاتیں۔" وہ آج بھی یہ کریڈٹ لینے کو تیار نہیں تھے کہ ان جیسے تناور درخت کے سائے نے عمیر کو دھوپ اور گرمی کی شدت سے بچا کر مرجھانے نہیں دیا۔ عمیر کو فخر تھا کہ اس کی تربیت اس عظیم شخص نے کی ہے۔

☆☆☆

"میں اندر آ سکتا ہوں۔" وہ اپنے ہی خیال میں مگن بیڈ پہ بیٹھی تھی۔ پیچ کلر کے خوب صورت کڑھائی والے سوٹ میں اس کی گوری رنگت مزید کھل رہی تھی۔ اس کے بال ہمیشہ کی طرح شانوں پہ بکھرے تھے۔ عمیر ہاتھ میں چند شاپرز تھامے اس کے دروازے پہ کھڑا تھا۔

"اندر آ جاؤ۔" وہ مسکرائی تو عمیر کو اپنا دل ہاتھوں سے نکلتا محسوس ہوا۔

"میں یہ چند گفٹ لایا تھا تمہارے لیے۔" شاپنگ بیگ اس کے قریب رکھ کر عمیر خود کمرے میں پڑے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔ یہ جاننے کی ضرورت کہاں تھی کہ اسے وہ سب پسند آئے گا کہ نہیں کیونکہ فریال کی پسند ناپسند سے اس سے زیادہ کوئی واقف نہیں تھا۔ وہ بیگ سے سامان نکال کر بیڈ پہ رکھ رہی تھی۔ ایک پیک میں سے پرفیوم نکال کر اس نے اپنی کلائی پر اسپرے کیا۔ یہ اس کی پسندیدہ خوشبو تھی۔

"فریال مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے۔" اپنی پینٹ کی جیب پہ ہاتھ رکھ کر عمیر نے اس انگوٹھی کے ہونے کی تصدیق کی جو وہ خاص طور پہ امریکا سے اس کے لیے لایا تھا۔

"عمیر نہیں پہلے' مجھے تمہیں ایک بہت ضروری بات کہنی ہے..... تمہیں اندازہ نہیں میں کتنی بے چینی سے تمہارے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔" وہ ایک جست میں بیڈ سے اٹھ کر اس کے پاس پہنچی تھی۔ عمیر اس کی بے صبری سے کچھ نروس ہوا تھا.....تو کیا فریال بھی میری طرح وہی سوچ رہی ہے...کیا یہ بھی اپنے دل میں میرے لیے وہی جذبات رکھتی ہے جو میں رکھتا ہوں۔

"عمیر مجھے تمہاری مدد چاہیے ہے..... دراصل میں ایک لڑکے کو پسند کرتی ہوں اور ہم دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں..... میری یہ خواہش بابا تک پہنچانے کے لیے مجھے تمہاری سپورٹ کی ضرورت ہے۔" وہ کہے جا رہی تھی اور عمیر کے دل کی دنیا تاریک ہوتی جا رہی تھی۔

"بولو عمیر کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کرو

گے؟'' اس کا ہاتھ تھامے وہ اس سے پوچھ رہی تھی اور عمیر اس پل صرف اس خواب کو چکنا چور ہوتے دیکھ رہا تھا جو اتنے سالوں سے اس نے کھلی آنکھوں سے دیکھنا شروع کیا تھا۔

''عمیر......!'' فریال نے اس کا کندھا ہلایا اور اچانک وہ ہوش میں آیا تھا۔

''ہاں......میں......بابا سے بات کروں گا۔'' اس نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

''میں جانتی تھی تم ضرور میرا ساتھ دو گے...... اس دنیا میں سب سے زیادہ میں تم پر ہی بھروسا کرتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تم میرے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو۔'' خوشی سے جھلملاتا اس کا چہرہ بلاشبہ اس دنیا کا سب سے حسین چہرہ تھا۔

''ہاں فریال......میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے عمیر نے اسے یقین دہانی کروائی۔

☆☆☆

''نہ تو اس کے ماں باپ ہی ہیں اور نہ کوئی رشتے دار......اس پر ایک ڈھنگ کی نوکری بھی نہیں ہے برخوردار کے پاس۔ ایسے شخص کے ساتھ میں کیسے اپنی بیٹی کی شادی کر دوں عمیر...تم خود سمجھدار ہو پھر کیا سوچ کر تم نے اسے فریال کے لیے پسند کیا؟'' علی حیدر صاحب شدید غصے میں تھے، کچھ دیر پہلے عمیر کی درخواست پہ انہوں نے شعیب سے ملاقات کی تھی اور اس ملاقات کے دوران ان پر ہونے والے انکشافات نے انہیں خاصا مشتعل کر دیا تھا۔

شعیب قریشی پیشے کے لحاظ سے صحافی تھا اور ایک درمیانے درجے کے اخبار کے لیے فیلڈ رپورٹنگ کرتا تھا۔ فریال سے اس کی پہلی ملاقات ایک مقامی ہوٹل میں ہوئی تھی جہاں وہ یونیورسٹی کی طرف سے کسی فنڈ ریزنگ پروگرام میں شرکت کر رہی تھی اور اسی جگہ شعیب کسی پریس کانفرنس کی رپورٹنگ کے سلسلے میں موجود تھا۔ یہ پہلی ملاقات آخری نہیں تھی اور ملاقاتوں کا سلسلہ طویل ہوتا گیا......شعیب کی شخصیت میں کچھ ایسا سحر تھا اس کی باتوں میں وہ جادو تھا کہ فریال اس کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور ایک فیلڈ رپورٹر کی آمدنی بھی قلیل تھی......ایسے حالات میں وہ جانتی تھی شعیب اس کے والد کی نظر میں شادی کے لیے ایک انتہائی غیر مناسب انتخاب ہے لیکن اسے یقین تھا عمیر اس کا ساتھ ضرور دے گا اور کسی نہ کسی طرح اس کے بابا کو راضی کر لے گا۔

''بابا......آپ خود ہی تو کہتے ہیں پیسہ اور خاندان کسی کی شرافت کی ضمانت نہیں ہوتے ہیں......'' اس نے بولنا چاہا۔

''بالکل کہتا ہوں اور میں آج بھی اپنی بات پہ قائم ہوں لیکن کیا تم یہ نہیں مانتے کہ میری نگاہیں زمانہ شناس ہیں اور اس عمر میں میرا تجربہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا......اس لڑکے کی آنکھوں میں عیاری ہی عیاری ہے عمیر۔ دھوکا دے رہا ہے وہ فریال کو...کوئی محبت وحبت نہیں کرتا وہ اس سے......اس کی دولت کی لالچ میں اسے محبت کے جال میں پھنسا کر بیوقوف بنا رہا ہے۔'' وہ زمانہ شناس تھے، انسانوں کو ان کے لہجوں اور باتوں کے جوڑ توڑ سے پرکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ عمیر کو ان کی بات سے ذرہ برابر اختلاف نہیں تھا لیکن یہاں معاملہ فریال کی خوشی کا تھا۔

''بابا، وہ سب جو فریال کا ہے آخر کار اس کے شوہر کا بھی ہوگا پھر کیا مضائقہ ہے اگر ہم فریال کی شادی اس کے من پسند شخص سے کر دیں۔ وہ بہت چاہتی ہے اسے......'' علی حیدر اس کی اس بودی تجویز پہ مزید سیخ پا ہو گئے۔

''ہرگز نہیں......میں کسی ایسے شخص کے حوالے اپنی بیٹی کیسے کر دوں جو پیراسائیٹ بن کر اس کے ساتھ جڑنا چاہتا ہے۔ ایسا کم سے کم میرے جیتے جی تو ہرگز نہیں ہوگا۔ فریال جذباتی ہے اور امیچور بھی......تم اسے اچھی طرح سمجھا دو کہ مجھے اس رشتے سے صاف انکار ہے اور میں اب دوبارہ اپنے گھر میں اس شخص کے متعلق کوئی

بات سننا نہیں چاہتا ہوں۔“ عمیر نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔ آج تک اس گھر میں ان کے فیصلوں کے خلاف جانے کی نہ تو کسی نے کوشش کی تھی اور نہ ہی خواہش۔

☆☆☆

”آخر بابا میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے عمیر...... میں محبت کرتی ہوں شعیب سے...... پتا نہیں انہوں نے اس کی غربت کو اتنا بڑا ایشو کیوں بنالیا ہے۔ جب مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تو بابا کو کیا اعتراض ہے۔“ وہ بھی انہی کی بیٹی تھی، ضدی ہونا اس کی اضافی خوبی تھی۔

”وہ تمہارے والد ہیں فریال اور تمہاری بہتری ان سے زیادہ کوئی نہیں چاہ سکتا...... یوں بھی شادی بیاہ کے معاملات طے کرتے وقت یہ سب باتیں دیکھنی پڑتی ہیں۔“ وہ دھیمے لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے انہیں اتنا دور تک سوچنے کی...... میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ میری خوشی میری مرضی سے نہیں ہوسکتا تو کیا خاک خیال ہے انہیں میری خوشی کا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر عمیر کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

”پلیز فریال رونا تو بند کرو...... ہم سکون سے بھی تو بات کرسکتے ہیں۔“ وہ اسے سمجھانے کی کوشش کررہا تھا۔ حالانکہ جانتا تھا دل کے فیصلے سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔

”صرف ایک ملاقات میں وہ اس نتیجے پہ پہنچ گئے ہیں کہ شعیب مجھ سے میری دولت کے لالچ میں شادی کرنا چاہتا ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے عمیر وہ اسے آدھے گھنٹے میں مجھ سے زیادہ جان گئے ہیں...... دو سال کی کمٹمنٹ ہے ہماری...... وہ صرف اور صرف مجھ سے محبت کرتا...... میں ثابت کردوں گی کہ شعیب مجھ سے میرے پیسے کی وجہ سے نہیں بلکہ میری محبت میں شادی کرنا چاہتا ہے...... اور اگر...... بابا کو اتنا ہی اپنی ججمنٹ پہ غرور ہے تو اپنی دولت میں سے ایک پائی بھی مجھے مت دیں۔ میں اور شعیب ان کے پیسے کے بغیر بھی اپنا گھر بسا سکتے ہیں۔“ عمیر کی کسی بات کا فریال پہ کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ جس طرح وہ اپنے دل سے فریال کی محبت نہیں نکال سکتا تھا فریال کے لیے بھی یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنی چاہت سے دستبردار ہوجائے۔ دونوں میں صرف اتنا فرق تھا کہ وہ اپنے دل کی بات دل میں ہی دفن کرچکا تھا اور صرف فریال کے حالِ دل سے واقف تھا۔

اُدھر علی حیدر صاحب نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اس شادی کے لیے کسی صورت راضی نہیں ہیں تو دوسری طرف فریال ضد پکڑے بیٹھی تھی کہ شادی کرے گی تو صرف شعیب سے۔ عمیر دونوں کو سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا...... اسے فریال کی خوشی عزیز تھی لیکن وہ بابا کی باتوں سے بھی متفق تھا۔

☆☆☆

”عمیر صاحب جلدی چلیں فریال بی بی دروازہ نہیں کھول رہی ہیں۔“ وہ اسٹڈی میں بیٹھا ایک جرنل کا مطالعہ کررہا تھا کہ گھر کی ملازمہ نے افراتفری میں اسے یہ خبر دی۔ وہ تیزی سے چلتا فریال کے کمرے تک پہنچا اس دوران علی حیدر بھی وہاں آچکے تھے۔

”کمرے کی دوسری چابی لاؤ جلدی سے۔“ کچھ دیر دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد اس نے ملازمہ سے کہا۔

دروازہ کھول کر جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اندر کے منظر نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ فریال بستر پہ بے سدھ پڑی تھی...... نیند کی گولیاں کھا کر اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ شاید اسے نیند کی گولیاں کھائے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا یا پھر اس نے دوا اتنی زیادہ مقدار میں نہیں کھائی تھی۔ عمیر نے گھر پہ ہی اسے ایمرجنسی ٹریٹمنٹ دیا تھا۔ وہ بے ہوش تھی لیکن اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔

☆☆☆

”عمیر اس لڑکے کو بلاؤ...... میں چاہتا ہوں جلد سے جلد ان دونوں کی شادی ہوجائے لیکن ایک بات تم فریال کو واضح کردینا...... وہ یہ شادی اپنی مرضی سے کر رہی ہے اور اس کے نتائج کی ذمہ دار وہ خود ہوگی۔ اس کی شادی کے بعد اس کا مجھ سے یا میری جائداد سے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کوئی واسطہ نہیں ہوگا......شادی کے بعد وہ کبھی اس گھر میں واپس نہیں آسکتی ......" ان کا لہجہ اٹل تھا۔ فریال کی اس حرکت نے انہیں توڑ ڈالا تھا...... اولاد انسان کو کمزور کردیتی ہے، وہ جانتے تھے وہ آگ سے کھیلنے کی ضد کررہی ہے اور وہ اپنی پوری کوشش کے باوجود اسے جلنے سے نہیں بچا پائے تھے۔ وہ شعیب سے اس کی شادی کرنے کو راضی تو ہوگئے تھے لیکن ساتھ ہی انہوں نے اپنی شرط بھی بتادی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں بابا...... وہ آپ کی اکلوتی بیٹی ہے...... یہ سب اس کا ہے آپ کیسے اسے اس کے حق سے دستبردار کرسکتے ہیں اور پھر وہ آپ سے نہیں ملے گی، اس گھر میں نہیں آئے گی...... ایسی شرائط رکھ کر آپ اس کے ساتھ زیادتی کررہے ہیں۔" وہ ان کی بات پرسن ہوگیا تھا۔

"اس نے میری محبت پہ اس لڑکے کی محبت کو فوقیت دی ہے...... اسے ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یوں بھی فریال اپنی شادی اور اس سے جڑے ہر فیصلے کی خود ذمے دار ہے اسے اپنی بقیہ زندگی میرے بغیر ہی گزارنی ہوگی۔" وہ مزید وہاں نہیں رکے تھے، پہلی بار عمیر کو وہ شکست خوردہ لگے تھے۔ زندگی ایک ایسے موڑ پہ آگئی تھی جہاں اس کے خوابوں کا شیرازہ بکھرنے کے ساتھ ساتھ اس گھر اور اس کے پیارے بابا کی خوشیاں بھی ماند پڑگئی تھیں۔

☆☆☆

"فریال یہ چیک بک رکھ لو۔" شادی کی سادہ سی تقریب میں چند قریبی لوگوں کو ہی بلایا گیا تھا۔ رخصتی کے وقت علی حیدر صاحب نے فریال کے سر پہ آخری بار ہاتھ پھیرا تھا اور اس کے بعد سے وہ اپنے کمرے میں بند تھے۔ وہ جانے سے پہلے عمیر سے مل رہی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے حیرانی سے خاکی لفافے کو دیکھا۔

"تمہاری شادی کا تحفہ ہے...... میری طرف سے۔ جو چاہو خرید لینا۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اس کی ضرورت نہیں تھی عمیر...... تم نے میرے لیے جو کیا ہے وہ بہت ہے۔" وہ اس گھر سے خالی ہاتھ رخصت ہورہی تھی اپنے ملازموں کی بیٹیوں کی شادیوں پہ بھی علی حیدر نے دل کھول کر خرچ کیا تھا۔ لیکن اس کے دل میں کوئی ملال نہیں تھا افسوس تو اسے ان کی اس شرط پہ تھا کہ وہ تمام عمر اس سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔

"ہم دوست ہیں فریال اور یہ کچھ بھی نہیں ہے...... انفیکٹ تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا...... زندگی میں کبھی بھی کہیں بھی تمہیں کوئی مدد درکار ہو تم بلاجھجک مجھے بتاؤ گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ شعیب خاموشی سے ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

"میں نے اپنے دوست سے تمہاری جاب کے سلسلے میں بات کی ہے شعیب...... یہ کارڈ رکھ لو۔ اس کے پاس تمہارے لیے بہت اچھی آفر ہے۔" وہ اب ساتھ کھڑے شعیب سے بات کررہا تھا۔ فریال نے احسان مند نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

☆☆☆

"ویسے یہ عمیر ہے بڑا گھاگ۔" ڈریسنگ ٹیبل پہ پڑے لفافے میں سے کیش بک نکال کر اس پہ لکھے ہندسوں کو بغور دیکھتے ہوئے وہ استہزائیہ ہنسی ہنسا تھا۔ فریال نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ کانوں کی بالیاں اتارتا اس کا ہاتھ رک گیا تھا۔

"ایسا کیا کیا ہے عمیر نے؟" وہ تعجب سے شعیب کے بدلے ہوئے روپ کو دیکھ رہی تھی۔

"کس قدر چالاکی سے تمہارے باپ کو شیشے میں اتار کے تمہیں دودھ میں سے مکھی کی طرح باہر نکال دیا ہے اور یہ چند لاکھ کا نذرانہ دے کر تمہاری نظروں میں ہیرو بھی بن گیا دوسری طرف کروڑوں کی جائداد ہتھیالی جس پہ صرف تمہارا حق تھا۔" فریال اس کے تجزیے پہ ششدر رہ گئی تھی۔ آج ان دونوں کی شادی ہوئی تھی...... ان کی محبت کو منزل ملی تھی۔ اس کی خاطر فریال نے اپنے بابا کو اپنے گھر کو چھوڑا اور وہ اس وقت اپنی نئی نویلی دلہن کو سراہنے کے بجائے یہ سب فضولیات سوچ رہا تھا۔

"تم اسے غلط سمجھ رہے ہو شعیب...... اس نے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد
نمرہ احمد
فرحت اشتیاق
قُدسیہ بانو
نگہت سیما
نگہت عبدُاللّٰہ
رضیہ بٹ
رفعت سراج

صائمہ اکرام
سعدیہ عابد
عفت سحر طاہر
تنزیلہ ریاض
فائزہ افتخار
سباس گُل
رُخسانہ نگار عدنان
اُمِ مریم

عُشنا کوثر سردار
نبیلہ عزیز
فائزہ افتخار
نبیلہ ابر راجہ
آمنہ ریاض
عنیزہ سید
اقراء صغیر احمد
نایاب جیلانی

اشفاق احمد
نسیم حجازی
عنایت اللّٰہ التمش
ہاشم ندیم
مُمتاز مُفتی
مُستنصر حُسین
علیمُ الحق
ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہماری شادی کے لیے بابا کو راضی کرنے میں میری مدد میرے کہنے پہ کی ہے۔ وہ دوست ہے میرا اہم بچپن کے ساتھی ہیں اور عمیر کو بابا کی جائنداد میں کوئی دلچسپی نہیں وہ خود ایک قابل سرجن ہے...... میری جائنداد ہتھیانے کے لیے اسے ایسی نیچ حرکت کرنے کی ضرورت نہیں تھی...... وہ تو خود ایک، ایک سرجری کے لاکھوں کماتا ہے۔'' فریال کی بات اسے جوتے کی طرح لگی تھی۔ مرد کی انا کو گوارا نہیں ہوتا کہ اس کی بیوی کسی دوسرے مرد کی کمائی کا ذکر اس کے سامنے کرے...... فریال نے وہ بات ایک توجیح کے طور پہ کہی تھی لیکن شعیب کو اس لمحے وہ طعنہ لگی تھی۔

''اتنا کماؤ ہے تو مجھ سے شادی کیوں کی، کر لیتیں اسی قابل ڈاکٹر سے شادی، یوں بھی بڑا دل و جان سے فدا ہے تم پر...... دیکھا نہیں کیسے وارفتہ نظروں سے دیکھ رہا تھا تمہیں......'' اپنے اندر کی گندگی کو اس نے فریال کی طرف اچھالا۔

''شعیب!'' وہ چلائی تھی۔

''آواز نیچی رکھ کے بات کرو، یہ میرا گھر ہے تمہارے باپ کا گھر نہیں جہاں تم جس پر چاہو چلا سکتی ہو۔ مجھے اونچی آواز میں بات کرنے والی عورتیں زہر لگتی ہیں۔'' اس کی کلائی مروڑتے ہوئے وہ اس سے کیا ہوا ہر وعدہ فراموش کر چکا تھا۔ درد کی شدت سے وہ تلملائی۔ غصے سے پیر پٹختا شعیب باتھ روم میں گھس گیا۔ فریال اسے بے یقینی سے دیکھتی رہی۔ شادی کی پہلی رات اسے شعیب کی اصلیت دکھا کر قدرت نے اس کی ضد اور باپ کی نافرمانی کا تحفہ دیا تھا۔ آنکھوں میں رکے آنسو بہنے لگے تھے...... وہ نہیں جانتی تھی اسے آگے کتنی بار اور کب، کب یہ آنسو بہانے تھے کیونکہ یہ تو محض شروعات تھی۔

☆☆☆

''شعیب تم نے اس جاب کا پتا کیا جس کے لیے عمیر نے اپنے دوست سے بات کی تھی فریال نے اس کی مطلوبہ رقم کا چیک اس کی...طرف بڑھایا۔ پچھلے چند مہینوں میں یہ پانچویں بار تھا کہ شعیب کو ایک بڑی رقم کی ضرورت تھی اور ہر بار فریال کوئی سوال کیے بغیر اس کی ضرورت پوری کر رہی تھی...... گنجِ قارون بھی ہوتا تو ان شاہ خرچیوں سے ختم ہو جاتا یہ تو پھر چند لاکھ تھے۔ اس کے اکاؤنٹ کا بیلنس تیزی سے گھٹ رہا تھا۔ شادی کے بعد اس کی معمولی سی تنخواہ میں تو بہرحال گزارہ ہونا مشکل تھا حالانکہ فریال نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی کہ وہ خود کو اس کے لائف اسٹائل کے مطابق بنا لے۔ ان چند ماہ میں اس نے شعیب سے نہ کوئی فرمائش کی تھی نہ ہی اسے اس کی کم آمدنی کا احساس دلایا تھا اس نے اپنی مرضی اور خواہش سے اسے جیون ساتھی کے روپ میں چنا تھا اور وہ اس کے ساتھ ہر حال میں زندگی گزار سکتی تھی لیکن شعیب شادی کے بعد بہت بدل گیا تھا۔ اکثر راتوں کو گھر سے غائب رہتا، بات بے بات اسے ڈانٹنے اور طعنے دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا اور فریال گھنٹوں اس کے لفظوں کی اذیت میں مبتلا رہتی۔

''گیا تھا وہاں...... نو سے پانچ کی ایک معمولی سی نوکری آفر کر رہے تھے، اس سے بہتر تو میری پہلی ملازمت ہی ہے۔'' چیک احتیاط سے اس نے اپنے والٹ میں رکھ لیا تھا۔

''لیکن وہ تو شاید کوئی انتظامی پوسٹ تھی...... تمہاری موجودہ ملازمت میں خواری بھی تو بہت ہے دن رات کی کوئی قید نہیں ہے...... اور پھر وہاں سیلری اس سے تو بہتر ہی ہوگی، ترقی کے مواقع بھی ہوں گے۔'' وہ اسے سمجھانا چاہتی تھی۔

''یہ جو نوکری نوکری کا شور مچایا ہوا ہے ناں اس کی حقیقت بھی سن لو...... اگلے دس سالوں میں اسسٹنٹ منیجر سے منیجر بن جاؤں گا، تنخواہ میں چند ہزار روپے کا اضافہ ہو جائے گا...... بنک سے قرض لے کر ایک چھوٹا سا گھر بنا لوں گا۔ فریال میں ساری زندگی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار کر بے نام موت مرنا نہیں چاہتا...... مجھے اس سے زیادہ چاہیے...... بہت زیادہ۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''شعیب کیا تمہارے لیے میری محبت ناکافی ہے؟'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ زندگی میں اس سے بڑا

دکھ اور کیا ہوسکتا ہے کہ جسے آپ ساری دنیا پہ ترجیح دیں، جس کے ساتھ کی خاطر اپنے پیاروں کا دل دکھائیں وہ ہی آپ کو بے مول سمجھے۔

''یہ سب گزرے وقت کی باتیں ہیں اور یہ چونچلے بھرے پیٹ کے ساتھ اچھے لگتے ہیں اب کیا میں تمہارے پلو سے بندھا بیٹھا رہوں تو ہی تمہیں میری محبت کا یقین آئے گا۔'' کتنا بدل گیا ہے یہ شخص وہ حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔

''تم کہوتو میں عمیر سے......'' فریال نے ڈرتے ڈرتے کہا لیکن شعیب کو تو جیسے پتنگے لگ گئے تھے۔ فریال کی بات ادھوری ہی رہ گئی تھی۔

''کوئی موقع مت چھوڑنا مجھے اپنے پیارے عمیر سے کم تر ثابت کرنے کا......اس کی سفارشوں کا محتاج نہیں ہوں میں اور نہ ہی تمہارے باپ کی دولت کا۔ جو سارے پیسے پہ سانپ بنا بیٹھا ہے اور یہ جو رقم تم سے لے رہا ہوں ناں یہ بھی تمہیں واپس کردوں گا۔ ہٹو سامنے سے بلاوجہ میرا راستہ کھوٹا مت کرو۔'' وہ اسے دھکیلتے ہوئے تیزی سے کمرے سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

''ارے سر ایسی باتیں فون پہ بتانے والی نہیں ہوتی ہیں......ایک بار مل لیں ساری تفصیلات جان جائیں گے۔'' وہ رازداری سے بولا، فریال کے قدم رک گئے تھے۔ شعیب کسی سے فون پہ بات کررہا تھا اور اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ فریال اندر نہیں گئی بلکہ کمرے کے باہر ہی رک گئی۔ دوسری طرف سے پتا نہیں کیا کہا گیا تھا۔

''سارے ثبوت ہیں جناب......بندے نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں، ایسے بڑے بڑے ہاتھیوں کا نام ہے کہ ایک پٹی بھی پرائم ٹائم میں چل گئی تو...... حکومت کا دھڑن تختہ ہوجائے گا۔'' شعیب کا قہقہہ بلند ہوا۔ فریال کا پورا وجود کان بن گیا تھا۔

''آپ لاہور نہیں آسکتے تو میں کراچی آجاتا ہوں......بس آ[illegible] کل [illegible] ہوائی جہاز کی ٹکٹ بھیج دیں......اور ہاں......بزنس کلاس کی بکنگ کرایئے گا وہ کیا ہے ناں کہ اکانامی کلاس میں سیٹ تھوڑی چھوٹی ہوتی ہے۔'' فریال کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ شعیب کی سرگرمیاں پچھلے کچھ عرصے سے مشکوک ہورہی تھیں۔ یقیناً اس کا دماغ کوئی سازش تیار کررہا تھا لیکن وہ جان نہیں پائی تھی کہ یہ سازشی پلاٹ کس کے لیے تیار کیا جارہا ہے اور اس سب سے شعیب کو کیا فائدہ حاصل ہوگا۔

☆☆☆

''تم کہیں جارہے ہو شعیب؟'' وہ الماری میں سے کپڑے نکال رہا تھا۔ فریال کی موجودگی کو یکسر نظر انداز کرکے وہ اب ایک سفری بیگ نکال رہا تھا۔

''ہاں۔کچھ کام کے سلسلے میں کراچی جارہا ہوں۔'' اپنے چند کپڑے چھوٹے سے بیگ میں ٹھونستے ہوئے وہ بولا۔

''اچانک وہاں تمہیں ایسا کیا کام پڑ گیا ہے؟'' وہ اسے کچھ نہیں بتا رہا تو بہتر ہے وہ خود اس سے اس معاملے پہ بات کرلے۔

''ہے کچھ ضروری کام......ملنا ہے کسی سے۔'' اسے راستے سے ہٹاتا وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ فریال بھی تیزی سے اس کے پیچھے آئی۔

''مجھے کیوں لگ رہا ہے شعیب کہ تم کسی غلط راستے پہ چل پڑے ہو......تمہاری باتیں مجھے شک میں مبتلا کررہی ہیں۔'' فریال نے اس کا ہاتھ تھاما۔ کل رات سے وہ شدید پریشانی کا شکار تھی۔ شعیب کے الفاظ اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجارہے تھے۔

''کیوں بلاوجہ میری ٹوہ میں لگی ہو...... بتایا تو ہے کام سے جارہا ہوں اب کیا لکھ کے دوں۔'' وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولا۔

''تو پھر مجھے بتاؤ کل تم کس سے فون پہ بات کررہے تھے اور وہ کون سے راز ہیں جن کا ذکر تم اس وقت کررہے تھے۔ تم کسی غلط کام میں ملوث تو نہیں ہورہے ہو شعیب؟'' وہ تشویش سے بولی تو وہ ایک لمحے کے

لیے سن سا ہوگیا۔ اس کی یک طرفہ باتوں کے آدھے ادھورے مطلب وہ نکال چکی تھی...... اس کا کام بننے سے پہلے بگڑ سکتا تھا۔ اسے فریال کو اعتماد میں لینا ہوگا۔

’’دیکھو فریال...... اب کیا میں ساری زندگی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں گا، زندگی میں اگر کچھ حاصل کرنا ہے تو، کچھ تو ہاتھ پاؤں مارنے ہوں گے۔‘‘ اس کا رویہ ایک دم بدلا تھا۔ معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس نے پینترا بدلا تھا۔

’’تم ایک بڑے گھر سے ہو...... میری خاطر تم نے اپنے اسٹیٹس اپنی آسائش یہاں تک کہ اپنے بابا کو بھی چھوڑ دیا...... تمہیں کیا لگتا ہے یہ سب دیکھ کر مجھے خوشی ملتی ہے۔ تم نہ بھی کہو تو مجھے احساس ہے فریال کہ میری وجہ سے تم کتنا سفر کر رہی ہو۔ میں نہیں چاہتا ہم ہمیشہ ایسی زندگی گزاریں۔‘‘ اچانک لہجے میں نرمی در آئی تھی۔ پچھلے چند ماہ میں اس کے بدلے ہوئے روپ نے جہاں فریال کو توڑ ڈالا تھا وہیں اس وقت اس کا محبت بھرا روپ دیکھ کر وہ پسیج گئی تھی...... اس کا انتخاب اتنی جلدی غلط ثابت ہوجائے گا یہ تو اس کے گمان میں بھی نہ تھا مگر اس وقت شعیب کی باتوں نے اسے امید کی کرن دلائی تھی کہ اس کے دل میں فریال کے لیے محبت کا جذبہ اب بھی باقی ہے۔

’’لیکن شعیب...... پیسہ کمانے کے لیے خود کو کسی مشکل میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے، ہم دونوں مل کر کام کریں گے‘ میں ہوں ناں تمہارے ساتھ اور پھر میں نے تم سے کبھی کوئی ڈیمانڈ نہیں کی مجھے صرف تمہارا ساتھ چاہیے وہ پہلے والا شعیب جو مجھ سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور جو میری خوشی کی خاطر کچھ بھی کرسکتا تھا۔‘‘ اس کی بات سن کر شعیب نے پہلو بدلا، اسے دیر ہو رہی تھی۔

’’دیکھو فریال، عشق و عاشقی اور محبت کی عمر تب ہی طویل ہوتی ہے جب انسان کی بنیادی ضروریات پوری ہو رہی ہوں...... مجھے تم سے محبت ہے اس بات کا اظہار صرف لفظوں سے تو نہیں ہوسکتا اس کے لیے مجھے تمہاری ضروریات کا خیال بھی تو رکھنا ہے ناں...... دیکھو میں اس وقت جلدی میں ہو ہم اس موضوع پر پھر بات کریں گے بس ایک بات کی تسلی رکھو میں جو بھی کر رہا ہوں اس میں کچھ غلط نہیں بلکہ یہ سب میرے کام کا حصہ ہے۔‘‘ فریال اس سے مزید کیا کہنا چاہتی ہے یہ بات سنے بغیر وہ تیزی سے گھر سے نکل گیا تھا۔ وہ بے دلی سے پاس پڑی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ چند دنوں سے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی وہ جلد تھک جاتی تھی، سر چکرانے لگتا تھا لیکن شعیب کے پاس اس کی بات سننے کا وقت ہی کہاں تھا۔

☆☆☆

مرزا ہمایوں بیگ اپنے عالیشان آفس میں بیٹھا تھا۔ اے سی کی ٹھنڈک میں رچی ائر فریشنر کی بھینی سی مہک ماحول کو مسحور کُن بنا رہی تھی۔ کمرے میں مدھم روشنی تھی۔ جہازی سائز میز کے دوسری طرف رکھی بڑی سی آفس چیئر پہ براجمان وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے چند کاغذات کو انہماک سے پڑھ رہا تھا۔ اچانک اس نے کاغذات سے نگاہ ہٹائی اور اپنے سامنے بیٹھے خوش شکل اور پُراعتماد شخص کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں عیاری چمک رہی تھی۔

’’اس کا پروف کہاں ہے؟‘‘ ہمایوں بیگ نے اپنے ریڈنگ گلاسز اتار کر میز پہ رکھے اور دونوں کہنیاں میز کے کونے پہ ٹکا کر کرسی سے ذرا آگے کھسکا۔

’’میرے پاس ہیں، آپ جب حکم کریں گے میں وہ سارے ثبوت آپ تک پہنچا دوں گا۔‘‘ شعیب کے لہجے میں رازداری مگر بلا کا اعتماد تھا۔

’’کیا قیمت ہے اس سب کی؟‘‘ پاس پڑے سگریٹ کیس میں سے ایک سگریٹ نکال کر ہمایوں بیگ نے منہ میں دبایا اور سگریٹ کے پیکٹ کا رخ شعیب کی طرف کر دیا۔ مسکراتے ہوئے شکریے کے ساتھ شعیب نے سگریٹ نکال لیا۔

’’چینل میں ایک امتیازی پوسٹ اور پرائم ٹائم ایک ٹاک شو۔‘‘ وہ اب لائٹر سے سگریٹ سلگا رہا تھا۔

’’ہم...... م......‘‘ ایک طویل کش کے بعد اس نے

دھواں فضا میں اڑایا۔

"آدمی چالاک ہو اور موقع سے فائدہ اٹھانا بھی جانتے ہو۔ مجھے تمہارا انداز پسند آیا ہے۔" شعیب کی آنکھوں کی چمک اور بھی گہری ہوئی۔ اس کا تیر ٹھیک نشانے پہ لگا تھا۔

"یہ تو شروعات ہے سر...... آپ اعتماد کر کے دیکھیں ایسے اور بہت سے راز آپ کے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔ بس اس کے لیے آپ کو تعاون کرنا ہوگا۔" ہمایوں بیگ اس کی بات سن کر مسکرانے لگا۔ یقیناً یہ شخص مستقبل میں اس کے بہت کام آنے والا ہے۔

"ٹھیک ہے مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔ میں آج ہی تمہارا اپائنٹمنٹ لیٹر نکلوا دیتا ہوں...... پروگرام کی پلاننگ کے سلسلے میں تم کریٹیو ہیڈ سے مل لینا۔" وہ اب کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے پُرسکون انداز میں سگریٹ پی رہا تھا۔ شعیب کے اندر بھی اطمینان اتر رہا تھا۔

"ویسے آپ اس معلومات کا کریں گے کیا؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ہمایوں بیگ کے ماتھے پہ چند بل نمودار ہوئے جیسے وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔

"بریکنگ نیوز ہے یہ بریکنگ نیوز...... جو اگر ایک بار منظرِ عام پہ آگئی تو سمجھو سب کچھ الٹ...... اور اس کا کریڈیٹ ہمارے چینل کو ملے گا۔" اس نئے نشریاتی ادارے کی ساکھ بنانے کا اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ ہمایوں بیگ کا لہجہ کچھ ایسا تھا جیسے آج ہی اس نیوز چینل کی ریٹنگ آسمان کو چھونے لگی ہے اور اس کے ساتھ، ساتھ وہ بھی آسمان میں اڑنے لگا ہے۔

"ویسے اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں سر......" شعیب کی آواز سن کر ہمایوں بیگ اچانک زمین پہ آیا۔

"سب کچھ الٹ بھی جائے تو آپ کو اس کا کیا فائدہ ہوگا۔ یہاں تو پچھلی آدھی صدی سے یہی چل رہا ہے۔ ہماری عوام کی یادداشت بہت بری ہے سر۔" ہمایوں بیگ کو شعیب قریشی کی باتوں میں یک دم دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔

"تو پھر تم ہی بتاؤ مجھے اس معلومات کا کیا فائدہ ہوگا...... اس کرپشن اسکینڈل کو منظرِ عام پر نہ لایا گیا تو مجھے اس کو تم سے اسے خریدنے سے کیا حاصل ہوگا؟" شعیب کے چہرے پہ شاطرانہ مسکراہٹ ابھری۔

"یہ حکم کا اِکّا ہے جناب...... اس کو جیسے چاہیں استعمال کیا جا سکتا ہے...... اتنے بڑے، بڑے مگرمچھوں سے سمندر میں رہ کر بیر نہیں لیتے بلکہ انہیں احتیاط اور ہوشمندی سے شکار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ شواہد بلینک چیک ہیں اور ان سے آپ کیا، کیا فائدے حاصل کر سکتے ہیں...... کون، کون سی فیورز حاصل کر سکتے ہیں، کتنا ٹیکس معاف کروا سکتے ہیں...... اب یہ میں نے تو نہیں بتانا ناں آپ کو...... یہ تو آپ خود بہتر جانتے ہیں۔" ہمایوں بیگ نے ناقابلِ یقین حیرت سے اپنے سامنے بیٹھے اس نوجوان صحافی کی طرف دیکھا جو آج اسے ایک اور نہج پہ سوچنا سکھا رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ پسندیدگی اُمڈ آئی تھی۔

"مجھے امید ہے شعیب قریشی...... تم ہمارے ادارے کے لیے ایک خوشگوار اور فائدہ مند اضافہ ثابت ہوگے۔" اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے ہمایوں بیگ نے اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ شعیب اس کی گرمجوشی اس کے ہاتھ کی گرفت سے محسوس کر سکتا تھا۔

☆☆☆

شعیب نے جس اخبار سے اپنی فیلڈ رپورٹنگ کا آغاز کیا تھا وہ ملک کے ان گنے چنے اخبارات میں سے تھا جو اپنی خبروں سے زیادہ حکومت کو پریشرائز کرنے سے چلتے ہیں۔ دوسروں کے راز کو ہتھیار بنا کر ملک کا بھلا کرنے کے بجائے اپنا الو سیدھا کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ اپنی ملازمت کے آغاز میں وہ بھی ان کوڈ آف ایتھکس اور فلسفۂ صحافت میں الجھا رہا تھا جہاں صحافی کا پہلا فرض حقائق کی تلاش اور مسائل کی منصفانہ اور جامع تصویر پیش کرنا تھا۔ پیشہ ورانہ سالمیت ہی ایک صحافی کی ساکھ کی ضمانت ہوتی ہے۔ اس کے

آئیڈیل صحافت کے وہ بڑے، بڑے ستون تھے جن کا نام کسی تعارف کا محتاج نہ تھا اور جنہوں نے اپنی زندگی میں عوام کو سچ سے روشناس کرایا تھا لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ نظریے اور عملی صحافت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک معمولی فیلڈ رپورٹر کی حیثیت سے دن میں چند پریس کانفرنس کور کرنے کے بعد وہ زیادہ سے زیادہ اس دوسرے درجے کے اخبار میں ایک کالم لکھ کر اپنے پیشے سے وفا کرلے گا مگر اس سے نہ تو ملک کی حالت میں کوئی سدھار آنا تھا اور نہ ہی اس کی اپنی زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی آسکتی تھی۔ کرپشن اور سازشوں کے اس میدان میں وہ ایک غیر تربیت یافتہ کھلاڑی تھا...... وہ روز بروز اپنی ملازمت سے اکتا رہا تھا۔ سارا دن دھکے کھا کر ملنے والی چند ہزار کی تنخواہ نہ تو اس کے معاشی مسائل ہی حل کر پائی تھی اور نہ ہی اس ملازمت نے اس کے جذبۂ صحافت کی آبیاری کی تھی۔

انہی دنوں اس کی ملاقات فریال سے ہوئی...... وہ لڑکی اسے پہلی نظر میں اچھی لگی تھی اور فریال کو بھی شعیب میں کشش محسوس ہوئی تھی۔ وہ ایک کروڑ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور شعیب اپنی فیلڈ سے تنگ آچکا تھا۔ اسے لگا شاید اس کے مسائل کا حل قدرت نے فریال کی صورت میں نکالا ہے۔ وہ باتوں کا شیر تھا اور اپنی بہترین لفاظی کی بدولت اس نے فریال کو کچھ اس طرح شیشے میں اتارا تھا کہ وہ پور پور اس کی محبت میں ڈوب چکی تھی۔ اسے پوری امید تھی فریال سے شادی کے بعد علی حیدر صاحب اسے اپنے کاروبار میں شامل کرلیں گے اور اس طرح اس کی زندگی میں مثبت تبدیلی آجائے گی لیکن اس کی ساری پلاننگ مٹی میں مل گئی جب علی حیدر نے فریال سے ہر تعلق ختم کرکے اس کے سارے خواب عذاب کردیے تھے۔ فریال اس کی قسمت بدل نہ پائی تھی تو اب اسے خود ہی کچھ کرنا تھا۔

کچھ مدت پہلے جذبۂ حب الوطنی اور فلسفۂ صحافت کو بنیاد بنا کر چند بڑے ناموں کی کرپشن کو منظر عام پر لانے کے لیے وہ ایک رپورٹ تیار کر رہا تھا۔

اس رپورٹ کے سامنے آنے کی صورت میں کئی لوگوں کی زندگیاں مشکل میں پھنس سکتی تھیں، اسمبلیاں تحلیل ہوسکتی تھیں، حکومت کا تختہ الٹ سکتا تھا بہت سی گردنوں کے گرد گھیرا تنگ ہوسکتا تھا لیکن اس رپورٹ کے پہلے ہی مرحلے پر اسے ناکامی کا سامنا ہوا تھا کیونکہ اخبار کے ایڈیٹر نے اسے اس کی اوقات یاد دلا دی تھی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس نے وہ تمام ڈیٹا محفوظ رکھا ہوا تھا اور فقط اپنی رائے کا اظہار کیا تھا جسے سن کر ایڈیٹر نے اسے اچھی خاصی جھاڑ پلائی ساتھ ہی ساتھ اسے اپنا دھیان اپنی روزانہ کی رپورٹنگ کی طرف رکھنے کو کہا۔ اس وقت تو وہ اس مواد کا صحیح استعمال نہ کرسکا تھا لیکن آج ان تمام فائلز نے اس کی زندگی کو تین سو ساٹھ ڈگری کے زاویے پہ بدل دیا تھا۔ اس بار اس نے ان حقائق کو ملک وقوم کی بہتری کے بجائے اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا تھا اور خوش قسمتی سے اس کا حربہ کامیاب رہا تھا۔ بدلتے وقت نے پرنٹ میڈیا کی افادیت کو بھلے کم نہیں کیا تھا لیکن الیکٹرانک میڈیا اس وقت دنیا پہ چھا چکا تھا۔ خبر کے لیے صبح تک اخبار کا انتظار کرنے والے اب ہر ہر گھنٹے بریکنگ نیوز ٹی وی پہ دیکھ لیتے تھے.... سرِشام تجزیہ نگاروں کی منڈلیاں جم جاتی تھیں جہاں سچ اور جھوٹ کو ملا کر پانی سے پانی پر پانی جیسے الفاظ لکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ایسے حالات میں شعیب کو لگا وہ اخبار میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے قسمت نے ساتھ دیا تھا اور وہ اس نیوز چینل میں پاؤں جمانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

☆☆☆

''نیوز چینل میں نوکری...... اس طرح اچانک......؟ میرا مطلب ہے تم تو رپورٹنگ کی فیلڈ میں ہوناں اور پھر پرنٹ میڈیا سے الیکٹرانک میڈیا...... تمہارا تو کوئی تجربہ بھی نہیں ہے۔'' فریال کو اس کی بات سن کر شاک لگا تھا...... وہ خوشی سے بے حال تھا، اسے اس کی زندگی کا سب سے بڑا بریک مل رہا تھا۔ فریال کو کراچی سے واپس

آ کر اس نے یہ خبر سنائی تھی لیکن اس کی حیرت اور سوال نے اس کا موڈ آف کر دیا تھا۔

‘‘تجربہ کام کرنے سے ہوتا ہے...... ایسا کیا ہے جو انسان سیکھ نہیں سکتا اور نیوز چینل ہو یا اخبار...... کام تو دونوں طرف ایک جیسا ہی ہو رہا ہے۔ دیکھتی نہیں کتنے ہی جانے مانے صحافی آج کل ٹی وی پہ نظر آ رہے ہیں، اخبار سے زیادہ شہرت اور پیسہ کما رہے ہیں اس وقت۔ بس تم دیکھتی جاؤ کیسے میں چینل کے ذریعے دنیا کو اپنی مٹھی میں کرتا ہوں۔’’ اس کا حریص لہجہ فریال کو اپ سیٹ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے کی چمک سے صاف ظاہر تھا وہ اس وقت ساتویں آسمان پر اڑ رہا تھا اور اپنے پہلو میں بیٹھی فریال کی زرد رنگت اس کو نظر نہیں آ رہی تھی۔

‘‘اچھا سنو! ہمیں ایک، دو دن میں کراچی شفٹ ہونا ہے۔ اب ہم وہیں رہیں گے۔’’ جاب کے ساتھ ساتھ اس کی رہائش کے انتظامات بھی ہمایوں بیگ نے کروائے تھے۔ فریال نے اس بار اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ خاموشی کا یہ وقفہ طویل ہو گیا تھا اور پھر فریال نے ہی بالآخر اسے توڑا۔

‘‘شعیب میں امید سے ہوں۔ تم باپ بننے والے ہو۔’’ وہ دھیمے لہجے میں بولی تو شعیب اپنی کرسی سے اچھلا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلا جہاں خوشی اور ناقابلِ یقین حیرت کا ملا جلا تاثر تھا۔

‘‘تم سچ کہہ رہی ہو فریال؟’’ اس کا ہاتھ تھام کر وہ فرطِ جذبات سے بولا۔ اتنے دنوں سے دونوں کے رشتے کے درمیان جمتی برف اس ایک خبر سے پگھلنے لگی تھی۔ فریال نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

‘‘آج میری زندگی کا بہت بڑا دن ہے، ایک ساتھ دو دو خبریں ملی ہیں مجھے، بس اب ہم جلد کراچی چلیں جائیں گے اور ایک خوش آئند زندگی کا آغاز کریں گے...... بس تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔’’ اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اس کو اپنے قریب کرتے ہوئے بولا۔ فریال نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

‘‘فریال تم عمیر سے کوئی رابطہ نہیں رکھو گی...... تمہارے بابا تم سے پہلے ہی اپنا تعلق ختم کر چکے ہیں پھر عمیر سے کوئی واسطہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے، ویسے بھی وہ شخص مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔’’ فریال حیرت سے اس کی بات سن رہی تھی، یہ تو اسے معلوم تھا کہ شعیب کو عمیر سے بلاوجہ کی چڑ ہے لیکن ایک وہی تو تھا جس سے پچھلے چند ماہ میں دو تین بار ہی سہی اسے بابا کی خیریت پتا چلتی تھی اب اگر عمیر سے رابطہ ختم ہو گیا تو بابا سے جڑے ہونے کا احساس بھی ختم ہو جائے گا لیکن اس کے پاس شعیب کی بات ماننے کے سوا کوئی دوسرا آپشن نہ تھا۔

☆☆☆

پچھلے چند ماہ سے اپنی مصروفیت اور چند بیرون ملک کانفرنسوں کی وجہ سے وہ خاصا مصروف تھا۔ علی حیدر صاحب کا حکم تھا کہ شادی کے بعد فریال سے کوئی رابطہ نہ رکھا جائے اور وہ ان کی حکم عدولی کر کے ان کا دل نہیں دکھا سکتا تھا مگر وہ فریال سے بے نیاز بھی نہیں رہ سکتا تھا اسی لیے اس کی شادی کے بعد دو تین بار اس کی خیریت پوچھتا رہا تھا مگر بہت عرصے سے اس کا فریال سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے کپڑے تبدیل کیے، بہت دنوں کی تھکا دینے والی روٹین کے بعد آج اس کا پروگرام صرف آرام کرنے کا تھا۔ فریال کی یادوں سے چھٹکارا پا لینے کی خاطر اس نے خود کو کام میں غرق کر لیا تھا لیکن پھر بھی خیال چاند پہ بدلی کی طرح چھا جاتا تھا۔ وہ سونے کے لیے لیٹا تھا اور اس فراغت کے لمحے میں اس کی یاد ایک بار پھر اس کے پاس چلی آئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور فریال کا چاندی سا سراپا اس کے سامنے لہرانے لگا تھا۔ وہ یک دم بستر سے اٹھ بیٹھا۔

‘‘تم نے کہا کیوں نہیں عمیر۔’’ اس کے دل نے ایک بار پھر شکوہ کیا تھا۔

‘‘کہہ دینے سے کیا فرق پڑتا، وہ تو شعیب سے محبت کرتی تھی۔ الٹا میرا بھرم بھی ٹوٹ جاتا۔’’ اس نے تلخی سے سوچا۔

‘‘یہ بھی تو ہو سکتا تھا وہ تمہیں شعیب پہ ترجیح

دیتی......'' اسے دل کی خوش خیالی پہ ہنسی آئی۔

''اسے تو مجھ سے کوئی تعلق رکھنا بھی گوارا نہیں کہاں وہ محبت کو قبول کرتی۔'' وہ زخمی ہنسی ہنسا تھا۔

لیکن......دل نے کچھ اور بھی کہنا چاہا مگر عمیر نے پاس پڑے ریموٹ سے ٹی وی آن کرلیا۔ وہ جتنا خود کو اس ناکام محبت کی اذیت سے رہائی دلانے کی کوشش کر رہا تھا یہ روگ بڑھتا جارہا تھا۔ چینل سرفنگ کرتے ہوئے ایک نیوز چینل پہ وہ رک گیا تھا۔ اسکرین پہ ایک پولیٹیکل ٹاک شو چل رہا تھا جہاں تجزیہ نگار کی کرسی پہ شعیب قریشی بیٹھا تھا۔ اسے خاصی حیرانی ہوئی تھی۔ اس کا انداز بہت پُرکشش تھا، اس کی پریزینٹیشن، اس کا بولنا......لگتا تھا وہ اس پروگرام کی بھرپور تیاری کرکے بیٹھا ہے۔ عمیر کو ایک خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ اس کا ہاتھ اپنے موبائل کی طرف بڑھا۔ مجھے فریال کو مبارکباد دینی چاہیے۔ کانٹیکٹ لسٹ میں سے اس کا نمبر نکال کر وہ ڈائل کا بٹن دبانے والا تھا جب اچانک اس کی سماعتوں سے ایک آواز ٹکرائی۔

''میری ایک بات مانو گے عمیر۔'' اس کی ہچکچاہٹ نے عمیر کو حیران کیا تھا۔ اس کی نظر اس کے نازک ہاتھوں پہ گئی وہ اس وقت بے دردی سے اپنی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔

''بولو فریال، میں سن رہا ہوں۔'' اس کا چہرہ اس کے اندر ہونے والی جنگ کو چھپا نہیں پایا تھا۔ عمیر کا اضطراب بڑھ گیا تھا۔

''تم آج کے بعد یہاں مت آنا عمیر۔'' وہ اٹکتے ہوئے بولی تھی۔ عمیر نے بے یقینی سے فریال کی طرف دیکھا۔ وہ کل پاکستان واپس آیا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس نے فریال کے لیے شاپنگ کی تھی اور یہی چیزیں دینے وہ اس وقت اس کے گھر گیا تھا لیکن فریال نے اسے جو کہا وہ یہ بات کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔

''عمیر پلیز مجھے غلط مت سمجھنا لیکن جس طرح بابا نے مجھ سے اپنا ہر تعلق ختم کردیا ہے اس کے بعد تمہارا بھی مجھ سے ملنا ٹھیک نہیں ہے۔'' اپنے کرب کو اپنے سامع سے چھپاتے ہوئے فریال کی آواز میں لرزہ طاری تھا۔

''کیا میرا تمہارا رشتہ صرف بابا کے وجود سے ہے فریال؟ وہ ماہ وسال جو ہم نے ساتھ گزارے ہیں، ہماری برسوں پرانی دوستی......وہ تعلق کیسے ختم ہوسکتا ہے اور تم نے کب سے لوگوں کی پروا کرنی شروع کردی۔'' وہ زخمی لہجے میں بولا۔

''سب کی نہیں عمیر لیکن کسی ایک کی پروا تو کرنی پڑتی ہے۔'' فریال نے نظریں چرائیں۔ اس کا یہ جملہ عمیر کو بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

''تو کیا یہ......شعیب......؟'' اس نے بات نامکمل چھوڑ دی تھی۔

''ٹھیک ہے فریال۔'' آج ایک بار پھر میں تمہاری ہی بات مان رہا ہوں۔ آج تک میں نے جو بھی کیا ہے وہ تمہاری خوشی کی خاطر کیا ہے اور اب بھی میں تمہاری خوشی کی خاطر وہی کروں گا جو تم چاہتی ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آج کے بعد تم سے دوبارہ ملنے کی کوشش نہیں کروں گا کیونکہ مجھے تمہاری خوشی سے زیادہ اس دنیا میں کوئی شے عزیز نہیں ہے۔'' اس کے چاند چہرے کو دیکھتے ہوئے عمیر نے اس پل ایک بار پھر اپنے دل کو ماتم کرتے محسوس کیا تھا۔ اس نوحہ گری کو محبت کی قبر میں اتار کر وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ آج بھی فریال سے اپنا راز چھپا چکا ہے مگر یہ اس کی بھول تھی کیونکہ اس پل فریال نے اس کی آنکھوں میں پہلی بار اس جذبے کی جھلک دیکھی تھی جسے محبت کہتے ہیں۔ اسے خود پہ حیرت ہوئی تھی وہ کیسے اتنا عرصہ انجان رہی تھی۔ کیوں اسے عمیر کے حالِ دل کی خبر نہ ہوسکی یا شاید اب بھی نہ ہوپاتی اگر شعیب اسے بار بار عمیر کے حوالے سے ایسی باتیں نہ کہتا۔ اس نے بغیر کچھ کہے نظریں جھکالیں۔ وہ اگر پہلے غافل تھی تو اسے اب بھی عمیر پہ یہی ظاہر کرنا تھا۔

عمیر نے موبائل بے دلی سے بیڈ سائڈ ٹیبل پہ

واپس رکھ دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا اس کی مداخلت فریال کی زندگی میں کوئی مشکل لے آئے یہی سوچ کر اس نے اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

''میری سمجھ میں نہیں آتا شعیب آخر تمہیں زندگی میں اور کیا چاہیے؟'' اچھی سوسائٹی میں شاندار گھر، نئے ماڈل کی گاڑی، اپنی مرضی کی ملازمت اور تنخواہ کے بجائے ہمایوں بیگ کے ساتھ ڈیل کرتے ہوئے اس نے چینل میں شیئرز کی ڈیمانڈ کی تھی۔ پھر بھی وہ مزید کی تلاش میں تھا۔ فریال نے چھ ماہ کی سویرا کو چپ کرانے کی کوشش کی جو سوتے میں اچانک ڈر کر رونے لگی تھی۔

''جب سامنے سمندر ہو تو میں اپنے کاسے کو خالی کیوں رکھوں۔'' اس نے تاسف سے سامنے بیٹھے شعیب قریشی کو دیکھا کیا اس شخص کی حرص کی کوئی حد بھی تھی۔

''سمندر سے کس کی پیاس بجھی ہے شعیب، وہ میلوں بھی میسر ہو...... لیکن آسودگی فقط جھیل کے میٹھے پانی کے چند قطروں سے ملتی ہے۔'' اس چینل کو جوائن کرتے وقت جن ہتھکنڈوں کا استعمال شعیب نے کیا تھا فریال کو لگا تھا وہ سب اس نے بہتر ملازمت کے حصول کی مجبوری میں کیا تھا اور اب جبکہ وہ منزل تک پہنچ چکا تھا تو فریال کو یقین تھا شعیب کسی اور غلط کام میں ہاتھ نہیں ڈالے گا لیکن یہ محض اس کی خوش فہمی تھی۔

وہ جب سے کراچی آیا تھا کسی نہ کسی سازشی منصوبہ بندی کا حصہ رہا تھا۔ اس کے پروگرام کی ریٹنگ جہاں آسمان کو چھو رہی تھی اور صحافتی حلقوں میں اس کی دبنگ تنقید کو سراہا جا رہا تھا وہیں دوسری طرف وہ آج بھی ایسے ایشوز کی ٹوہ میں رہتا تھا جن سے بڑے بڑے سیاستدانوں، بزنس مین اور ہائی پروفائل لوگوں کو بہ آسانی بلیک میل کیا جا سکے۔ ان لوگوں کا نام منظرِ عام پہ نہ آئے اس کے عوض ان سے بھاری مطالبات کر کے وہ کم وقت میں بے تحاشا دولت کما چکا تھا۔ ہمایوں بیگ اس میں برابر کا شریک تھا۔ انہی لوگوں کی پشت پناہی کی بدولت وہ بڑے بڑے ناموں کی اپنے پروگرام کے ذریعے مٹی پلید کر رہا تھا۔ اس کا وجود کئی لوگوں کی نگاہوں میں پھانس کی طرح چبھ رہا تھا۔ دوست تو بنائے نہیں تھے ہاں دشمنوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ سب نہیں لیکن چند ایک باتوں کی بھنک فریال کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ جہاں فریال کو لگتا تھا سویرا کی پیدائش ان کے رشتے کو مضبوط کر رہی ہے اور اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا وہیں شعیب اس تسلی میں تھا کہ بچی کی پیدائش اور پرورش میں الجھ کر فریال اس کی طرف سے بے نیاز ہو چکی ہے لیکن آج فریال نے جب اپنی آنکھوں سے اسے ایک مشہور اور کرپٹ سیاستداں کی طرف سے بھیجے جانے والے نوٹوں کا بریف کیس وصول کرتے دیکھا تو اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔

''فریال تم کیا چاہتی ہو میں ساری عمر ایک ہی جگہ کھڑا رہوں، بیوی ہو تم میری لیکن میری ترقی سے تمہیں کوئی خوشی نہیں ملتی...... یہ سب کچھ میں کس کے لیے کر رہا ہوں، تمہارے لیے، اپنی بچی کے لیے ہی لگا ہوا ہوں۔ تمہارے باپ کو ہی دیکھ لو کروڑوں جمع ہیں مگر آج بھی وہ پیسے کمانے کی مشین بنا ہوا ہے۔'' سویرا سو چکی تھی وہ ان کی باتوں سے دوبارہ نہ جاگ جائے اسی لیے وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر لے آیا تھا۔

''میرے بابا کو خود سے مت ملاؤ شعیب...... انہوں نے ساری عمر حرام کا ایک لقمہ نہ خود کھایا اور نہ مجھے کھلایا۔ تم اپنی حرام کی کمائی کو جسٹی فائی کرنے کے لیے مجھے ان کی مثال نہیں دے سکتے۔ تم جس راستے پہ چل رہے ہو تمہاری اس شہرت کو بدنامی بنتے وقت نہیں لگے گا۔ تمہیں حرام کھانے کا چسکا لگ گیا ہے اور وہی زہر تم میرے اور میری اولاد کے اندر بھی اتار رہے ہو اور چاہتے ہو میں خاموشی سے تمہیں یہ سب کرتے دیکھتی رہوں۔'' فریال کے اندر کا کرب آج زبان پہ آ گیا تھا وہ دکھ جو اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا وہ اسے شعیب سے چھپانا نہیں چاہتی تھی۔

''آج بڑی محبت جاگی ہے اپنے بابا کے لیے وہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

وقت بھول گئیں جب اس نے ایک جوڑے میں رخصت کر دیا تھا اور یہ جو عیش سے زندگی گزار رہی ہو یہ سب اسی حرام کی کمائی کی بدولت ہے جس پہ تم مجھے اتنی باتیں سنا رہی ہو۔'' وہ طعنہ مارنا نہیں بھولا تھا۔

''میری سب سے بڑی غلطی تھی جب میں نے بابا کی بات نہ مان کر تم سے شادی کی اور میں اس کا انجام بھی بھگت رہی ہوں۔ انہوں نے تمہارے بارے میں بالکل ٹھیک کہا تھا کہ تم ایک انتہائی مکار، خود غرض اور حریص انسان ہو......تم......''

''بکواس بند کرو۔'' شعیب کا زناٹے دار تھپڑ فریال کے گال پہ پانچوں انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا تھا۔ وہ اسے آئینے میں اس کا عکس دکھا رہی تھی۔ وہ بدصورتی جسے دو سالوں سے وہ جھیل رہی تھی، آج اس کا رخ فریال نے شعیب کی طرف کر دیا تھا اور سچ بہت کڑوا ہوتا ہے۔ یہ پہلی بار تھا جب شعیب نے فریال پہ ہاتھ اٹھایا اس سے پہلے ان کے درمیان تلخی زبانی کلامی رہی تھی۔ فریال گنگ اسے دیکھتی رہی جو غصے میں آگ بگولا کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ فریال کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈا تھا۔ وہ تمام رات اس نے جاگ کر آنسو بہاتے گزاری تھی۔ اس کے پچھتاوے اور بھی شدید ہو گئے تھے۔

☆☆☆

علی حیدر صاحب نے ٹی وی بند کیا اور ہاتھ میں پکڑا ریموٹ غصے سے پٹخا۔

''بلڈی بلیک میلر۔'' ان کا غصہ ساتویں آسمان پہ تھا۔

''بابا ریلیکس......آپ کیوں غصہ کر رہے ہیں۔'' کمرے میں داخل ہوتے عمیر نے انہیں پُرسکون کرنے کی کوشش کی۔

''دیکھا تم نے، یہ ہے اس پاگل لڑکی کی پسند......یہ......یہ بلیک میلر۔ ایک معمولی سا رپورٹر آج اینکر پرسن بنا بیٹھا ہے......لوگوں کو اپنے شو میں بلا کر ان کی عزت اتارتا ہے میڈیا کے ذریعے انہیں بلیک میل کرتا ہے۔ کرمنل ہے یہ شخص......کرمنل۔'' وہ انگلی سے

حمد باری تعالیٰ

تیری شان کا بیان کرنے کے لائق الفاظ الٰہی میں کہاں سے لاؤں
محدود الفاظ سے لامحدود شان کو کس طرح الٰہی سمجھاؤں
بنا کر سیاہی سب سمندروں کی سب درختوں کے بنا کے قلم
سب زمینوں کو بنا کر صفحہ حمد لکھنے ساری خلقت کو بلاؤں
گھس جائیں قلم، سیاہی ہو ختم، بھر جائیں صفحے بھی سارے
اور لاتعداد بار یہ عمل تحریر حمد میں دہراتا ہی چلا جاؤں
شان عالی تری، حق تعریف ترا رب کریم و عظیم پھر بھی
کما حقہ تو دور کی بات ذرا سا بھی ادا میں نہ کبھی کر پاؤں
خرم یہی دعا ہے اس سمیع الدعا سے مجھ حقیر بھکاری کی
تادمِ مرگ بس یونہی کوشش......حمد و ثنا میں کرتا چلا جاؤں

کلام: خرم علی راؤ

انتخاب: مہر رضوان، لاہور

ہمارے یہاں

ہمارے ہاں
دشمنوں سے انتقام
اور دوستوں سے قربانی لینے کی رسمیں اور طور طریقے
بڑے مختلف ہیں
یہاں اونچی، اونچی دیواروں والے زندان
اور مضبوط جیلیں بنانے کے بجائے
کوشش کی جاتی ہے کہ لوگوں کو ان کی شرمساری
میں قید کر دیا جائے
بینائی اور سماعت چھین لینے پر
زبان کاٹ دینے کو ترجیح دی جاتی ہے
خون اور سر کی قربانی لینے کے بجائے
ضمیر کی قربانی لی جاتی ہے
اور ہاتھوں کو تراشنے کے بجائے
انہیں مفلوج کر کے کلائیوں سے جڑا رہنے دیا جاتا ہے۔

اقتباس از: کتاب، فرحت عباس

مرسلہ: ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ

بند ٹی وی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غصے سے بولے تھے۔

"اسے معاف کر دیں بابا، وہ بیٹی ہے آپ کی...... کب تک آپ اسے سزا دیں گے۔" اسے ایک بار پھر فریال کی فکر نے آگھیرا تھا۔ جب سے شعیب نے نیوز چینل جوائن کیا تھا اس کی مثبت و منفی شہرت کے چرچے ہو رہے تھے‘ ایسے میں چند افواہیں ان تک بھی پہنچ گئی تھیں۔ عمیر بھی ان تمام باتوں سے واقف تھا‘ ان میں کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹ یہ تو بہرحال وہ نہیں جانتا تھا لیکن علی حیدر صاحب کو پورا یقین تھا کہ شعیب نے منزل تک پہنچنے کے لیے سیدھے راستے کا انتخاب نہیں کیا ہے۔

"عمیر...... ہرگز نہیں۔" ان کا لہجہ دوٹوک تھا۔

"میں جانتا ہوں بابا آپ کتنا تڑپتے ہیں اس کے لیے کہتے نہیں ہیں لیکن اسے یاد کرتے ہیں۔ اس کی نادانی کی اتنی بڑی سزا مت دیں بابا۔" وہ ایک بار پھر وہی التجا دُہرا رہا تھا جو اس سے پہلے بھی کئی بار کر چکا تھا۔ اس کی آج بھی یہی کوشش تھی کہ وہ فریال کو معاف کر دیں۔

"تم نہیں جانتے عمیر، جب اولاد اپنی ضد اور اندھی خواہشات کے تابع ہو کر ماں‘ باپ کی محبت اور خلوص کو ٹھوکر مارتی ہے تو دل پاش‘ پاش ہو جاتا ہے۔ بہت دکھ دیا ہے اس نے مجھے، ایک ڈھونگی اور فریبی شخص کے لیے اس نے مجھے چھوڑ دیا یہ بات میں نہیں بھول سکتا عمیر اور تم بھی یہ مت بھولنا کہ فریال کا ذکر آئندہ میرے سامنے مت کرنا۔" ان کا لہجہ تنبیہی تھا اور عمیر ان کی بات سن کر خاموش ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ان کو سینے میں بائیں طرف بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ بہت سی ہمت اکٹھی کر کے وہ کمرے کے گھٹن بھرے ماحول سے باہر نکلے تھے۔ دل پہ بوجھ تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ چند قدم چلنے سے ان کی سانس چڑھنے لگی۔ ان کا خیال تھا تھوڑی سی کوشش سے وہ لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھ جائیں گے لیکن اس سے پہلے ہی ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا، وہ ہوش کھوتے چلے گئے تھے۔

حیدر صاحب کو ہوش آیا تو خود کو اسپتال کے کمرے میں پایا۔ کچھ وقت لگا تھا انہیں یہ سمجھنے میں کہ وہ اس وقت کہاں ہیں اور پھر اُن کی نگاہ عمیر کے فکرمند چہرے پہ پڑی۔

"بابا......!" وہ تفکر اور تشکر کے ملے جلے جذبات لیے ان کی طرف بڑھا تھا۔ انہیں بولنے میں دقت ہو رہی تھی۔ محبت سے انہوں نے اس کے چہرے کو چھو کر اسے تسلی دی۔ وہ نقاہت اور اسٹریس کے زیرِ اثر بول نہیں پا رہے تھے لیکن عمیر جانتا تھا کہ ان کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ اسے تشویش تھی کہ آخر اچانک انہیں اتنا شدید ہارٹ اٹیک کیونکر ہوا۔ ان کی صحت ہمیشہ سے اچھی تھی‘ وہ اپنی ڈائیٹ کا خیال رکھتے تھے‘ باقاعدگی سے واک کرتے تھے انہیں...... بلڈ پریشر یا شوگر جیسی دائمی بیماریاں بھی نہیں تھیں پھر یوں اچانک...... وہ جاننا چاہتا تھا لیکن شاید یہ وقت مناسب نہیں تھا۔

"بابا ایک بات بتائیں، آپ کی طبیعت اچانک خراب کیسے ہوئی۔ مجھے کیوں لگ رہا ہے آپ اندر ہی اندر الجھے ہوئے اور پریشان ہیں۔" عمیر نے ان کے گھر آنے کے چند دن بعد ان سے پوچھا تھا، اس کا سوال سن کر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

"ہیلو بابا......" وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اس رات وہ اسٹڈی میں تھے جب فریال نے انہیں کال کی تھی۔ وہ خاصی پریشان تھی۔

"کیوں کال کی ہے تم نے مجھے۔" اس کی آواز سن کر وہ غصے میں بولے۔ ایک بار پھر اس کی نافرمانی اور ہٹ دھرمی یاد آئی تھی۔

"مجھے معاف کر دیں بابا...... میں نے آپ کی نہیں سنی، آپ ٹھیک کہتے تھے شعیب ہرگز وہ نہیں جیسا میں نے اسے سمجھا تھا۔" وہ انہیں اور بھی کچھ بتانا چاہتی تھی لیکن اس کی بات سننے سے انہوں نے انکار کر دیا تھا۔

''آج کے بعد کبھی مجھے کال مت کرنا فریال...... تم سے ہر رشتہ میں اسی دن ختم کر چکا جس دن تم نے اس کم ظرف انسان سے شادی کی تھی۔ اب وہ تمہیں جس حال میں بھی رکھے تمہیں اس کے ساتھ زندگی گزارنی ہوگی کیونکہ یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے۔'' انہوں نے کال کاٹ دی تھی لیکن یہ ایسی بات نہیں تھی جسے آسانی سے نظرانداز کیا جاسکتا تھا۔ آنسو کسی پتھر پہ بھی گریں تو پھر اس میں دراڑ ڈال دیتے ہیں، یہ تو ایک باپ کا دل تھا جو اپنی اکلوتی اولاد کی سسکیاں سن کر چھلنی ہوگیا تھا...... انا کے ہاتھوں مجبور ہوکر انہوں نے فریال کو دھتکار تو دیا تھا لیکن اندر ہی اندر یہ کرب اور تکلیف انہیں اذیت دے رہا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے...... وہ تکلیف میں ہے اور یہی بوجھ سینے میں چھپے قطرۂ خون سے جھیلا نہیں گیا تھا۔

انہوں نے عمیر کو فریال کی کال کے متعلق نہیں بتایا تھا، ہم جانتے بوجھتے صرف ضد اور انا کے ہاتھوں مجبور ہوکر وہ کام کرتے ہیں جن کے متعلق ہمارا دل ہمیں چیخ، چیخ کر کہہ رہا ہوتا ہے کہ یہ غلط ہے، علی حیدر صاحب بھی اپنی انا کو شکست نہیں دے پائے تھے۔ دل ہار گیا تھا، انا جیت گئی تھی۔

☆☆☆

''جلدی کرو ہمیں یہ جگہ خالی کرنی ہے۔'' وہ دو دن بعد گھر آیا تھا اور افراتفری میں گھر آتے ہی فریال سے سامان باندھنے کے لیے کہا تھا۔

''کیا ہوا ہے شعیب......؟ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو سب خیریت تو ہے ناں۔'' وہ اس کا حد سے زیادہ پریشان چہرہ دیکھ کر خود بھی گھبرا گئی تھی۔

''تم ایسا کرو بس ضرورت کا سامان رکھ لو...... ملازموں کو چھٹی کا کہہ دو۔'' اپنے والٹ سے کچھ رقم نکال کر اس نے فریال کو دی تھی۔ وہ خود ایک بڑے سے سوٹ کیس میں جلدی جلدی اپنی چیزیں رکھ رہا تھا۔

''لیکن ہم جا کہاں رہے ہیں؟'' وہ اسٹڈی کی طرف جارہا تھا، فریال اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔

''ملک سے باہر......'' اس نے مختصر بتایا۔ اپنے ضروری کاغذات اور لیپ ٹاپ کو بیگ میں حفاظت سے رکھنے کے بعد وہ اب اسٹڈی میں رکھی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ وہاں سے اپنی مطلوبہ اشیا اٹھا کر اس نے فریال کی طرف دیکھا جو اب بھی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تم اب تک یہاں کھڑی ہو...... جلدی کرو ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکلنا ہے۔'' وہ غصے سے بولا تھا۔ پریشانی اس کے لہجے سے واضح تھی۔ تبدیلی کائنات کا حصہ ہے یہاں کچھ بھی ساکت نہیں، جس طرح رشتے بدلتے ہیں، احساسات بدلتے ہیں، لوگ بدلتے ہیں ایسے ہی مقام بھی بدلتے ہیں۔ زوال عروج میں تبدیل جاتا ہے اور عروج کو زوال بدل دیتا ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے ملکی سیاست میں ہونے والی اکھاڑ پچھاڑ نے جہاں بہت سے دوسرے لوگوں کو متاثر کیا تھا وہیں ہمایوں بیگ کے نیوز چینل کا برا وقت بھی شروع ہوگیا تھا۔ شعیب قریشی جو ترقی کے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا رہا تھا اچانک بدکا تھا۔ وہ ہمایوں کی گڈ بکس میں سرفہرست تھا اس عتاب کا کچھ تو بہرحال اسے بھی چکھنا تھا اور چونکہ چھوٹی مچھلیوں کو پہلے پکڑا جاتا ہے اس لیے وہ بھی ان دنوں...... مشکل میں پھنسا ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں سے دشمنی مول لے لی تھی اور آج کل وہ اس کی گردن کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی کوشش میں تھے۔ ہمایوں بیگ جانتا تھا وہ لوگ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن شعیب اس کی گیم کا سب سے اہم مہرہ تھا اور وہ اسے بھی مشکل میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا اسی لیے اس نے شعیب کو کچھ عرصے کے لیے منظر سے غائب ہونے کا مشورہ دیا تھا۔ بیرون ملک سیف ہیون تھا۔ اس کی رہائش کے انتظامات ہوچکے تھے اور وہ اور اس کی فیملی وہاں ایک غیر معینہ مدت تک آرام سے محفوظ زندگی گزار سکتی تھی۔

''شعیب اس طرح اچانک...... تم مجھے بتاتے کیوں نہیں آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے۔'' وہ تشویش سے بولی۔ شعیب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ والے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

صوفے پہ بٹھایا۔ وہ اس وقت ان لفظوں کا انتخاب کر رہا تھا جن سے وہ فریال کو اپنی پچویشن سمجھائے۔

”دیکھو فریال...... یہاں کچھ معاملات بگڑ رہے ہیں، نئی حکومت میرے اور نیوز چینل کے خلاف کیس کرنے کی پلاننگ کر رہی ہے...... ہمایوں بیگ کا کہنا ہے مجھے کچھ عرصہ ڈی ایکٹیویٹ ہو جانا چاہیے اور ایسے میں وہی سب سے محفوظ جگہ ہے۔ ہمایوں ویسے بھی آج کل اسٹوڈیو وہاں شفٹ کرنے کا سوچ رہا ہے، ہوسکتا ہے کچھ مہینوں میں میرا پروگرام وہیں سے نشر کیا جائے۔ اب تم وقت ضائع مت کرو ہمیں ابھی کچھ وقت ہمایوں کے فارم ہاؤس پہ رہنا ہے وہاں سے چند دن میں ہم ملک سے باہر چلے جائیں گے۔“ فریال کے بدترین خدشات سچ ثابت ہونے کا وقت آگیا تھا۔ وہ اسی دن سے خوفزدہ تھی جب شعیب کو اس کے غلط راستے پہ چلنے کا انجام بھگتنا پڑے گا۔

”جب یہاں حالات قابو میں آجائیں گے تو واپس آجائیں گے۔“ وہ مزید بولا۔

”تم یہ فیلڈ چھوڑ کیوں نہیں دیتے شعیب۔ آج یہاں کے حالات سے بھاگ کر وہاں جا رہے ہیں کل وہاں سے بھاگ کر یہاں آجائیں گے اور اگر پھر یہاں مشکل پڑی تو پھر بھاگ جائیں گے۔ کیا ہماری آنے والی زندگی اب اس طور گزرنے والی ہے جہاں دوست کم اور دشمن زیادہ ہوں۔“ فریال کی پریشانی بجا تھی لیکن شعیب کی آنکھوں پہ بندھی حرص کی پٹی اسے وہ جہنم نہیں دیکھنے دے رہی تھی جو نہ صرف ان کی زندگی بنتا جا رہا تھا بلکہ آخرت کے لیے بھی بانہیں پھیلائے کھڑا تھا۔

”ایک تو میں تمہارے ان لیکچروں سے بہت تنگ ہوں...... تمہیں تو کسی کالج میں پروفیسر ہونا چاہیے تھا مفت میں اپنی صلاحتیں یہاں ضائع کر رہی ہو۔ اب بلاوجہ میرا سر مت کھاؤ اور جلدی سے جا کر اپنا اور سویرا کا سامان پیک کر دو۔ میں گاڑی میں یہ سامان رکھوا رہا ہوں۔“ وہ مریل قدموں سے چلتی اس کے پیچھے پیچھے اسٹڈی سے نکل آئی تھی۔

☆☆☆

سیاہ نائٹ گاؤن میں وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ اس کے گلے کی گہری کاٹ سے نمایاں ہوتی بیوٹی بون کو خمدار گردن میں جھلملاتا ہیروں کا نیکلس اور بھی پُرکشش بنا رہا تھا۔ سیاہ لباس اس کی گوری رنگت کو ابھار رہا تھا، اس کے سلیولیس لباس سے جھانکتی گوری بانہیں شاید چاندی سے بنی تھیں۔ شام ڈھلے روشنیوں میں ڈوبی اس محفل میں وہ بہت سی اٹھتی نگاہوں کو نظر انداز کرتی ادائے بے نیازی سے محفل کو انجوائے کر رہی تھی۔ اس کے لباس میں اس کے متناسب بدن کے خم اور بھی واضح ہو رہے تھے، دلوں پر بجلیاں گرا رہے تھے۔ اچانک اس کی نگاہ سامنے بیٹھے اس ہینڈسم اور پُرکشش شخص پہ جا ٹھہری۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ٹھہری ہوئی تھی۔ اشارے سے اس نے ویٹر کو بلایا اور دو گلاس ٹرے میں سے اٹھا کر وہ خراماں خراماں چلتی اس کے پاس آگئی تھی۔

”ڈرنک“ دائیں ہاتھ میں پکڑا گلاس اس نے شعیب قریشی کی طرف بڑھایا۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں آنکھوں پہ مہنگے ڈیزائین گلاسز لگائے، بالوں کو جیل سے سر پہ جمائے وہ آرکسٹرا پہ بجتے مدھم سُروں کو انجوائے کر رہا تھا۔

”میں یہ نہیں پیتا۔“ ایک لمحے کو اسے اپنے قریب دیکھ کر شعیب کی آنکھوں میں حیرت اتری اور اگلے پل اس نے بے ساختہ کہا۔ سیماب کا بڑھا ہوا ہاتھ ذرا سا پیچھے ہٹا اور اس کے چہرے پہ مایوسی کے بادل لہرائے۔

”لیکن کسی سمجھدار نے کیا خوب کہا ہے کہ ایک خوب صورت عورت اگر زہر بھی پلائے... تو انکار نہیں کرنا چاہیے۔“ پُرکشش لہجے میں مسکراتے ہوئے شعیب مزید بولا اور سیماب کے نازک ہاتھ سے گلاس تھام لیا۔ اس کی انگلیوں میں ہیرے جڑی بیش قیمت انگوٹھیاں اس کی شان میں اضافہ کر رہی تھیں۔ اس کی مایوسی مسکراہٹ میں بدل گئی تھی۔ وہ ہنسی تو یوں لگا جیسے

چاندنی زمین پہ اتر آئی ہے۔

”مجھے لگا تھا آپ صرف ٹی وی پہ ہی ہینڈسم نظر آتے ہیں لیکن آپ کو روبرو دیکھنا خاصا جان لیوا تجربہ ہے۔“ وہ شوخ ہو کر بولی۔ شعیب نے گلاس لبوں سے لگاتے اس کے حسین چہرے کو دیکھا۔

”ایک حسین خاتون اگر آپ کی تعریف کرے تو وہ جھوٹ تو ہرگز نہیں ہوسکتا۔“ سیماب نے قہقہہ لگایا۔

”آپ سے اچھی باتیں بھلا اور کون بنائے گا...... باتوں ہی سے تو کھیلتے ہیں آپ۔“ وہ شرارت سے بولی۔

”حسن کی تعریف نہ کرنا میرے نزدیک گناہ ہے اور آج کی شام کم سے کم میں اس گناہ کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔“ وہ اس کا چہرہ نظروں میں رکھ کر بولا۔

”آپ کچھ زیادہ ہی تعریف کر رہے ہیں شعیب قریشی صاحب۔“ اس کی نظروں کو خود پہ محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنے خوب صورت بالوں میں انگلیاں گھمائیں۔

”اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا... حسینوں کی یہی ادائے قاتل تو جان لیوا ہے۔ انہیں احساس ہی نہیں وہ کتنوں کے دل پہ وار کر رہے ہیں۔“ وہ مخمور لہجے میں بولا۔ سیماب کا زندگی سے بھرپور قہقہہ بلند ہوا۔

”پروگرام کرنا کیوں چھوڑ دیا؟“ اس نے اچانک موضوع بدلا۔

”بس آج کل آرام کا موڈ ہے...... آپ تو جانتی ہیں سیاسی اٹھاپٹخ چلتی رہتی ہے۔ سوچا کچھ دن چھٹی منالیں، ویسے جلد ہی پروگرام یہاں کے اسٹوڈیو سے کرنے کی پلاننگ ہے۔“ اس نے انگلی سے ویٹر کو اشارہ کیا اور خالی گلاس اس کی ٹرے میں واپس رکھ دیا۔

”یہ میرا کارڈ ہے، اگر کبھی میری یاد آئے تو کال کر لیجیے گا۔“ کچھ دیر تک یہاں وہاں کی باتیں کرنے کے بعد اپنے قیمتی کلچ میں سے وزٹنگ کارڈ نکال کر اس نے شعیب کی طرف بڑھایا۔

”یاد کرنے کے لیے مجھے پہلے آپ کو بھولنا پڑے گا اور اس خوب صورت شام میں ملنے والے اس حسین چہرے کو بھلانا کم سے کم میرے لیے تو ممکن نہیں۔“

مشہور بزنس مین قیصر امین کی حسین و جمیل بیوی سیماب قیصر کے ساتھ شعیب قریشی کی یہ پہلی ملاقات آخری ثابت نہیں ہوئی تھی۔ قیصر امین وہاں کا بزنس ٹائیکون سمجھا جاتا تھا۔ سیماب قیصر اس کے بزنس میں ففٹی پرسنٹ کی پارٹنر تھی۔ قیصر کے کاروبار کو اس نہج تک لانے میں سیماب کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ وہ پارٹیوں کی جان تھی۔ بہت بڑے، بڑے مرغوں کو آسانی سے اپنی زلفوں کے جال میں الجھا کر وہ ان سے قیصر کے کاروبار کے لیے بہت سی مراعات حاصل کر چکی تھی۔ شعیب اس سے ملنے سے پہلے اس کے متعلق کافی معلومات رکھتا تھا۔ جب سے یہاں آیا تھا اس کی کوئی خاص مصروفیات نہیں تھیں۔ ایسے میں ہمایوں بیگ نے اسے یہاں چند اثر و رسوخ والے لوگوں سے ملوایا اور آج کل اس کی تقریباً ہر شام کچھ ایسی ہی پارٹیوں میں گزرتی تھی جن میں وہاں کا اشرافیہ پایا جاتا تھا۔ سیماب نے اس تک خود اپروچ کی تھی اور شعیب نے اس کا ہاتھ جھٹکا نہیں تھا۔ وہ خاصی دل پھینک واقع ہوئی تھی اور آج کل اس کا دل شعیب قریشی پہ آیا ہوا تھا۔ شعیب کو فریال سے جو نہیں مل سکا تھا اس ملاقات کے بعد سیماب سے مل گیا تھا۔

☆☆☆

”یہ سیماب کون ہے؟“ اس کا نوالہ گلے میں پھنس گیا تھا۔ پانی کا گلاس اٹھا کر اس نے منہ سے لگایا اور حلق میں اٹکے نوالے کو نگلا۔ فریال اب بھی اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

”وہ مشہور بزنس مین ہے ناں، قیصر امین...... اس کی وائف ہے۔“ خود کو کمپوز کرتے ہوئے اس نے کھانا دوبارہ شروع کیا۔ فریال نے اس کی پلیٹ میں ایک چکن پیس رکھا۔

”تم...... تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ اس نے کھانا کھاتے ہوئے کن انکھیوں سے فریال کی طرف دیکھا جو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

بے بی چیئر پہ بیٹھی سویرا کو فرنچ فرائز کھلا رہی تھی۔

"میرے فون کا نیٹ ورک کچھ مسئلہ کر رہا تھا...... مسز کلیم کی کال آ رہی تو میں نے تمہارے فون سے کال ملالی...... کالنگ لسٹ میں اس کا نام بار بار تھا۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ شعیب نے سکون کی سانس لی تھی۔

"تم نے بتایا نہیں تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

اسے امید تھی شعیب اسے مزید کچھ بتائے گا لیکن اس کو خاموش پا کر فریال نے اگلا سوال کیا۔

"میں قیصر کے بزنس میں کچھ انویسٹمنٹ کر رہا ہوں...... یہ اس کی پارٹنر ہے اور سارے انویسمنٹ ایشوز یہی دیکھتی ہے۔ بس اسی لیے آج کل اس سے بات چیت ہوتی رہتی ہے۔" نپے تلے لفظوں میں اس نے فریال کو وجہ بتائی۔ فریال خاموش ہوگئی تھی۔

سیماب قریشی کے ساتھ تعلقات بڑھانا شعیب کے لیے کافی فائدہ مند ثابت ہوا تھا۔ شعیب کی قیصر کے کاروبار تک رسائی اسی کی بدولت ہوئی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا بھی بہت بڑے، بڑے لوگوں میں ہونے لگا تھا جن کی شہرت اور دولت صرف پاکستان تک محدود نہیں تھی۔ محض دس پرسنٹ انویسٹمنٹ کر کے وہ اس فائیو اسٹار ہوٹل میں برابر کا شراکت دار بن گیا تھا جس کی نوے پرسنٹ انویسٹمنٹ قیصر کی تھی اور یہ سب سیماب کے طفیل ممکن ہوا تھا۔ جس طرح اچھائی کی کوئی حد نہیں ہوتی ایسے ہی برائی بھی بے انتہا ہوتی ہے۔ برائی کی طرف اٹھنے والا پہلا قدم دشوار ہوتا ہے، انسان کی اپنے ضمیر سے جنگ صرف پہلی بار برائی کی طرف بڑھتے ہوئے ہوتی ہے اور اگلی بار یہ اتنا دشوار نہیں رہتا۔ برائی کی دلدل میں داخل ہوتے ہوئے بس پہلی بار قدم ڈگمگاتا ہے اس کے بعد وہ اس دلدل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ شعیب بھی برائی اور گناہ کی دلدل میں دھنستا چلا گیا تھا۔ شروع میں اسے یہ خوف لاحق تھا کہ اگر فریال کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا لیکن آہستہ، آہستہ اس کا یہ خوف بھی ختم ہونے لگا تھا۔ اکثر آدھی آدھی رات تک وہ گھر نہیں آتا تھا اور فریال کو یہی لگتا کہ وہ آج کل اپنے پروگرام کی تیاری میں مصروف ہے لیکن اس دن اس کی ساری خوش فہمی ہوا ہوگئی تھی جب وہ مال میں شاپنگ کی غرض سے گھوم رہی تھی اور وہاں اس نے شعیب کو سیماب کے ساتھ دیکھا۔ ان کے خوشی سے دمکتے چہرے، سیماب کا بے باک انداز...... ان دونوں کا رخ مال سے منسلک ہوٹل کی طرف تھا۔ فریال سے رہا نہیں گیا اور ان دونوں کے تعاقب میں وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے ہوٹل میں چلی آئی اور اس کے پیروں سے زمین نکل گئی تھی جب اس نے شعیب اور سیماب کو بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوٹل کے کمرے میں جاتے دیکھا۔

"تمہیں شرم نہیں آتی مجھے دھوکا دیتے ہوئے...... تم ایک شادی شدہ عورت کے ساتھ افیئر چلا رہے ہو، وہ بھی اپنے بزنس ایسوسی ایٹ کی بیوی کے ساتھ۔" آدھی رات کو وہ جلے پاؤں کی بلی طرح کمرے کے چکر لگا رہی تھی۔ رات کے دو بجے شعیب لڑکھڑاتے قدموں سے گھر میں داخل ہوا۔ فریال پر یہ راز بھی آج ہی کھلا تھا کہ وہ شراب پینے لگا ہے۔ شاید آج سے پہلے وہ اتنی ڈرنک نہیں کرتا تھا کہ ہوش کھو بیٹھے یا فریال ہی کچھ بے پروا ہوتی جا رہی تھی، اکثر جب وہ گھر آتا فریال اور سویرا سو چکے ہوتے لیکن آج جو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ آئی تھی اس کے بعد نیند آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔" وہ اس کا گریبان تھامے کھڑی تھی۔

"بند کرو یہ ایتھکس اور مورل ویلیوز کا رونا۔" وہ دہاڑا تھا۔

"پتا نہیں کون سی دنیا میں رہ رہی ہو تم...... اس گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کے دیکھو دنیا کس رخ جا رہی ہے۔ کانٹیکٹس بنانے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے بہت بڑے، بڑے فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔" اس کے ہاتھ سے اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے اس نے اسے پرے دھکیلا۔

”میں لعنت بھیجتی ہوں اس زندگی میں جہاں آسائشوں اور شہرت کی قیمت یہ سب ہوں۔ اپنی غلاظت اور بدکرداری پہ پردہ ڈالنے کی کوشش مت کرو۔ پہلے تو تم صرف اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھے لیکن تم اس قدر گر جاؤ گے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔“ وہ چلائی تھی۔ رو رو کر اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ شعیب شرمندہ ہونے کے بجائے الٹا بڑی ڈھٹائی سے وہاں کھڑا تھا۔

”تمہارا یہ رویہ مجھے تم سے مزید دور کر رہا ہے۔

ایک وہ ہے سیماب، جو اپنے شوہر کو فائدہ پہنچانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی ہے...... کون کون سی ڈیلیں نہیں کروائیں اس نے قیصر امین کے لیے۔ کہنے کو تو تم بھی ایک ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتی ہو لیکن تمہاری سوچ انتہائی سطحی اور مڈل کلاس ہے۔ تمہاری وجہ سے آج تک کوئی فائدہ تو ہوا نہیں ہاں البتہ اگر کچھ بھلا ہو رہا ہے تو تم حرام حلال اور گناہ ثواب کی گردان لے کر بیٹھ گئی ہو۔“ فریال اس کی طرف ناقابلِ یقین حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کس حد تک گر چکا تھا اس کی سوچ کی پستی اسے پاتال میں لے آئی تھی۔

”ایک بات سن لو شعیب، اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں پہلے کی طرح تمہاری بدکرداری کو بھی برداشت کرلوں گی تو یہ تمہاری سوچ ہے...... تمہیں اس عورت سے ہر تعلق ختم کرنا ہوگا...... ورنہ......“

”ورنہ کیا؟ اپنے باپ کے گھر چلی جاؤ گی...... ارے کل کی جاتی ابھی چلی جاؤ، میں تو خود تم سے عاجز آچکا ہوں۔ کان کھول کے سن لو میری بات میں جو ہوں جیسا ہوں ایسا ہی رہوں گا اور تمہیں اگر اس گھر میں رہنا ہے تو اپنی زبان بند کر کے رہنا ہوگا ورنہ ایک منٹ میں طلاق دے کر فارغ کردوں گا۔“ شعیب نے دونوں انگلیوں سے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں اشتعال تھا۔

”میں نے تم سے زیادہ گھٹیا اور خبیث شخص زندگی میں نہیں دیکھا شعیب قریشی...... تم اب مجھے طلاق کی دھمکی دے کر ڈراؤ گے......“ اسے شعیب کی بات سن کر شاک لگا تھا وہ اس کی بچی کی ماں تھی اور اس کی نظروں میں فریال کی بس یہ اوقات رہ گئی تھی۔ شرمندہ ہونا تو دور کی بات شعیب اس کی بات پہ مزید مشتعل ہوگیا اور فریال کو ایک زناٹے دار تھپڑ مارنے کے بعد اب وہ اس کے بالوں کو نوچتے ہوئے اس دنیا کا سب سے بڑا جاہل اور جنگلی لگ رہا تھا۔ آنکھیں تو بس آنسو بہا رہی تھیں اس تفریق سے مبرا کہ تکلیف اس کی مار اور تشدد سے زیادہ ہو رہی تھی یا دل کی دنیا اجڑنے سے۔

”تم اس وقت صرف اور صرف میرے رحم و کرم پہ ہو...... آئندہ کبھی میری زندگی میں مداخلت کی تو یاد رکھنا وہ دن میرے گھر میں تمہارا آخری دن ہوگا، میں سویرا کو بھی چھین لوں گا اور ساری زندگی اپنی اولاد کی شکل دیکھنے کے لیے ترس جاؤ گی۔“ اسے پرے دھکیلتے ہوئے وہ باتھ روم میں گھس گیا تھا۔ زمین پہ گھٹنوں کے بل بیٹھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☆☆☆

وہ ہوٹل سے نکل کر اپنے ایک پرانے دوست سے ملنے اس کے گھر جا رہا تھا۔ گاڑی اس وقت ڈیفنس کی ایک اندرونی سڑک سے گزر رہی تھی کہ ڈرائیور نے ایمرجنسی بریک لگائی اور گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔

”کیا ہوا ہے یار...... گاڑی احتیاط سے چلاؤ۔“ وہ اس وقت ایک میگزین میں کوئی آرٹیکل پڑھنے میں مصروف تھا اس طرح ایمرجنسی بریک لگنے سے گھبرا کر اس نے ڈرائیور کو ڈپٹا۔

”سر میں تو گاڑی احتیاط سے ہی چلا رہا تھا لیکن سامنے اچانک ایک چھوٹی سی بچی آگئی اسی وجہ سے ایمرجنسی میں گاڑی روکنی پڑی۔“ عمیر نے گاڑی کے شیشے سے باہر دیکھا جہاں ایک چار، پانچ سال کی گڑیا سی بچی سہمی کھڑی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر جلدی سے گاڑی سے اترا۔ وہ کچھ دن سے کراچی میں تھا، ایک سیمینار کے سلسلے میں اسے یہاں ایک مقامی ہوٹل میں لیکچر دینا تھا۔

"آپ ٹھیک تو ہو بیٹا۔" اس کے پاس جا کر محبت سے پوچھتے وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تھا۔ ڈرائیور بھی گاڑی سڑک کے کنارے لگا کر اس کے پاس ہی آ گیا تھا۔ بچی نے کچھ کہنے کے بجائے محض سر ہلایا۔ عمیر نے اردگرد نگاہ دوڑائی جہاں اس وقت تمام کوٹھیوں کے دروازے بند تھے سوائے سامنے والے گھر کے...... شاید یہ بچی وہیں سے نکلی تھی اور اس کے گھر والوں کو یقیناً علم نہیں ہوگا کہ وہ اس وقت گھر سے باہر ہے۔

"آپ یہاں اکیلی روڈ پہ کیا کر رہی ہو؟" اس بچی کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر عمیر نے محبت سے پوچھا۔

"میں کیٹ کے ساتھ کھیل رہی تھی...... ڈور اوپن تھا تو میری کیٹ باہر آ گئی۔ چوکیدار نے ڈور اوپن چھوڑ دیا۔ میری کیٹ چلی گئی۔" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ عمیر کو اس کیوٹ سی بچی پہ جی بھر کے پیار آیا۔ اس گھر کا چوکیدار دروازہ کھلا چھوڑ کر کہیں آس پاس گیا ہوگا اور یہ بلی سے کھیلتی باہر نکل آئی۔ اس نے پیار سے اسے پچکارا اور گود میں اٹھا کر اس کے گھر کے اندر لے آیا۔ ڈرائیو وے کے ساتھ ہی لان تھا جس کی آرائش شاندار تھی۔

"ممی......" بچی نے ہاتھ کے اشارے سے لان میں بچھے کین کے صوفے پہ بیٹھی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ عمیر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اسے گود سے اتار دیا۔ وہ گڑیا بھاگتی ہوئی اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔

"ممی...... ممی......" بچی نے اس کے پاس جا کر شور مچایا لیکن عورت نے ایک بار بھی اس کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ عمیر بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتا صوفے تک آ گیا تھا۔ خاتون کی پشت تھی اس لیے شاید وہ اس کی آمد سے بے خبر تھیں۔

"ممی...... میری کیٹ چلی گئی۔" بچی اس کا ہاتھ پکڑے بولی "ممی... انکل"۔ عمیر کو پاس کھڑا دیکھ کر اس بار اس نے اس کا بازو کھینچا۔ اس نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا اور پھر بچی کی نگاہوں کے تعاقب میں گردن گھما کر پیچھے کھڑے عمیر کی طرف دیکھا۔

"تم......" عمیر کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ فریال نے عمیر کو دیکھ کر کسی بھی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔

"فریال...... تم...... یہ تم نے حال کیا بنا رکھا ہے اپنا۔" وہ اس کے سامنے چلا آیا تھا۔ زرد رنگت، آنکھوں میں ویرانی، بے تاثر چہرہ۔ یہ وہ فریال نہیں تھی جس کا گلاب سا کھلا چہرہ دیکھ کر عمیر سانسیں لینا بھول جاتا تھا۔ وہ گم صم وہاں بیٹھی تھی۔ عمیر کو دیکھ کر بھی اس نے کسی قسم کا کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو عمیر......؟" وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا، دونوں کے درمیان خاموشی طویل ہو گئی تھی جب اچانک فریال نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"میں یہاں...... وہ باہر تمہاری بچی۔ تم یہ بتاؤ تم نے اپنی حالت کیا بنائی ہوئی ہے، کتنا بدل گئی ہو ان پانچ، چھ سالوں میں اور شعیب...... شعیب کہاں ہے وہ تمہارا خیال نہیں رکھتا کیا؟" اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ جو کھنڈر بنی اس کے سامنے بیٹھی ہے وہ وہی فریال ہے۔

"اپنا کیا...سب کو اس دنیا میں ہی بھگتنا ہوتا ہے عمیر، میں نے جو کچھ بابا کے ساتھ کیا اس کی سزا بھگت رہی ہوں۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ عمیر کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"تم مجھے یہ بتاؤ تم اتنے عرصے سے تھیں کہاں اور تم نے مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔ اگر تم کسی پریشانی میں تھیں تو کم سے کم تمہیں ہمیں بتانا چاہیے تھا ناں۔ ہم تمہارے اپنے تھے فریال لیکن تم نے ہمیں غیر کر دیا۔"

فریال نے برستی آنکھوں سے عمیر کی طرف دیکھا۔ کتنے سال ہوئے کسی نے اس سے اتنی محبت اور اپنائیت سے بات نہیں کی تھی اور اس لمحے اسے وہ رات یاد آئی جب اس نے پپا کو کال کی تھی اور رو، رو کر اپنی غلطیوں کی معافی مانگی تھی اور انہوں نے اس کی ایک نہ سنی تھی۔

"آج کے بعد کبھی مجھے کال مت کرنا فریال...... تم سے ہر رشتہ میں اسی دن ختم کر چکا ہوں جس دن تم نے اس کم ظرف انسان سے شادی کی تھی۔

اب وہ تمہیں جس حال میں بھی رکھے تمہیں اس کے ساتھ زندگی گزارنی ہوگی کیونکہ یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے۔'' فریال کے کانوں میں اس پل ان کی آواز گونجی۔ اس رات فریال نے تہیہ کرلیں تھا کہ وہ اب پلٹ کر دوبارہ نہیں دیکھے گی۔ چھ سال اس نے شعیب کا ہر ظلم ہر زیادتی سہی تھی...... وہ پتھر کی ہو چکی تھی۔ شعیب ترقی کی سیڑھیاں تیزی سے چڑھتا چلا جارہا تھا اور اس کی دسترس سے دور ہوتا گیا تھا۔ معمولی سی بات پہ طعنے دینا، فریال پہ ہاتھ اٹھانا تو معمولی باتیں تھیں...... قیامت تو وہ تھی جو فریال اس کی عیاشی کی صورت میں سہہ رہی تھی۔ ان سب باتوں نے اسے نفسیاتی مریضہ بنا دیا تھا۔ دو سال پہلے وہ لوگ پاکستان شفٹ ہوئے تھے اور یہاں آکر بھی شعیب کے لائف اسٹائل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، اس کی رنگینیاں فریال کی زندگی کو بے رنگ کرتی چلی گئی تھیں۔ وہ پتھر کی ہوگئی تھی۔

عمیر، شعیب کے اس روپ سے بالکل ناواقف تھا۔

''مجنوں، فرہاد، رانجھا کے تو بس نام ہی تھے ارے بھئی سچا عاشق اسے کہتے ہیں...... ذرا دیکھو تو چوٹ وہاں لگی ہے اور درد یہاں ہو رہا ہے۔ اسے کہتے ہیں سچی محبت۔'' فریال کا ہاتھ تھامے عمیر اس لمحے ناقابلِ یقین حیرت سے اس ان پتھرائی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا، وہ لان میں ہی بیٹھے تھے جب شعیب گھر میں داخل ہوا اور عمیر کو وہاں دیکھ کر اس کے تلووں میں آگ لگ گئی تھی۔ اس پہ عمیر نے اس سے جب فریال کی اس حالت کی وجہ دریافت کی تو وہ اور بھی سیخ پا ہوگیا تھا۔

''کیا فضول بکواس کر رہے ہو شعیب، شرم نہیں آتی اپنی بیوی کے متعلق ایسی باتیں کرتے ہوئے، حالت دیکھی ہے تم نے اس کی؟ تم نے اسے لاوارث سمجھ رکھا ہے کیا، یہ اگر تمہاری بیوی ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تم اس کے ساتھ جیسا چاہو سلوک کرسکتے ہو۔'' شعیب پستی کی انتہا پہ تھا اور عمیر کو اس کے لفظوں سے جھٹکا لگا تھا۔

''کیوں، سچ کڑوا لگا کیا ڈاکٹر صاحب! حقیقت میری زبان سے سن کر برداشت نہیں ہو رہی ہے...... کیا رشتہ ہے تمہارا اس سے جو تم اس کے لیے اتنا تڑپ رہے ہو، جب اس کے اپنے باپ کو اس کی پروا نہیں پھر تمہارے یہاں آنے کا کیا جواز ہے؟'' عمیر نے بھلے فریال سے کبھی اعترافِ محبت نہیں کیا تھا لیکن وہ اتنے سالوں میں اسے بھلا بھی نہیں پایا تھا...... وہ اس کے محسن علی حیدر صاحب کی بیٹی تھی اور اس کو تکلیف میں دیکھ کر عمیر ایسے ہی پریشان ہوتا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ اس کی چاہت بھی تھی، محبت تھی اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر عمیر کا دل تڑپ اٹھا تھا۔ اس کا دل کر رہا تھا وہ شعیب کو جان سے مار دے جو فریال کی اس حالت کا ذمے دار تھا۔

''سنو مسٹر...... یہ تمہارے باپ کا گھر نہیں جہاں کھڑے ہو کر تم مجھے کچھ بھی کہہ سکتے ہو...... اتنی ہمدردی ہو رہی ہے اپنی محبوبہ سے تو لے جاؤ اسے اپنے ساتھ۔'' اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔ پھر اچانک ہی اس کے چہرے پہ استہزائیہ ہنسی نمودار ہوئی۔

''ارے ہاں...... میں تو بھول ہی گیا تھا...... تمہارے باپ کا گھر کیسے ہوگا...... اس کے لیے تو باپ کا پتا ہونا ضروری ہے اور تم ٹھہرے لاوارث...... پتا نہیں کس کی (گالی) اولاد......'' اس کا طنزیہ لہجہ عمیر کو مزید بھڑکا گیا تھا۔

''شعیب...... تم نے ایک لفظ بھی اور نکالا تو میں بھول جاؤں گا کہ تم فریال کے شوہر ہو۔'' وہ غصے میں بولا لیکن اسی پل فریال نے مداخلت کی، وہ اب تک خاموشی سے سر جھکائے ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

''عمیر...... پلیز تم یہاں سے چلے جاؤ...... اگر تمہارے دل میں میرے لیے ذرا سی بھی عزت ہے تو یہاں سے چلے جاؤ اور مجھ سے دوبارہ کبھی رابطہ مت کرنا۔ یہ میری جنگ ہے تم اس میں مت آؤ۔ اپنے لیے یہ راستہ میں نے خود چنا ہے اب یہاں پھول ہوں یا کانٹے، پتھر ہوں یا پہاڑ...... مجھے اسی پہ چلنا ہے۔ یہی

میرا مقدر ہے۔'' وہ لڑتے، لڑتے تھک چکی تھی، ہار چکی تھی..... شعیب کے ہر روپ کو قبول کر چکی تھی قسمت کی اس ستم ظریفی پہ سمجھوتا کر چکی تھی۔ پرندے کے پر کتر دو تو اس میں اڑان بھرنے کی خواہش بھی دم توڑ دیتی ہے، جب پیچھے کوئی دروازہ ہی نہیں کھلا تھا تو پھر وہ اس جہنم سے فرار کی خواہش دل میں رکھ کر کیا کرتی۔

''فریال تم اس شخص کے ساتھ رہنا چاہتی ہو جو تمہیں ٹارچر کرتا ہے..... اس آدمی کے لیے اپنی زندگی برباد کر رہی ہو جسے تمہاری رتی بھر پروا نہیں ہے۔'' عمیر کہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ جانتے بوجھتے اسے اس مصیبت میں تنہا چھوڑ جائے یہ اس کے دل کو گوارا نہیں تھا۔

''سنا نہیں تم نے اس نے کیا کہا، اگر تھوڑی سی بھی عزتِ نفس ہے تو چلے جاؤ یہاں سے۔'' شعیب کی بلند آواز سن کر اس نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر ایک تاسف بھری نظر فریال پہ ڈالتا وہاں سے چلا گیا۔

وہ دن اس کی زندگی کا سب سے بھاری دن تھا۔

☆☆☆

''سر جلدی آئیں ایک ایمرجنسی آئی ہے..... ایک خاتون نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔'' ڈاکٹر فائق اپنے آفس میں بیٹھا تھا جب ایک نرس نے اطلاع دی۔ وہ اس اسپتال کے ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ کا انچارج تھا اور عمیر کا کلاس فیلو سوا پنی کانفرنس کے بعد وہ فائق سے ملنے اس کے اسپتال آیا تھا۔

''عمیر تم پلیز دو منٹ رکو، میں ابھی آتا ہوں۔''

عمیر کچھ دیر پہلے اس کے پاس پہنچا تھا۔ کل جو کچھ ہوا اس کے بعد عمیر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کسی سے مل پاتا۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ کاش وہ فریال کی سپورٹ نہ کرتا..... اس کی شادی شعیب سے نہ ہونے دیتا..... بابا کی بات مان کر وہ بھی اس کے فیصلے کے خلاف ڈٹ جاتا تو آج فریال کو اس حال میں نہ دیکھنا پڑتا۔ یا پھر وہ بابا کو سمجھا پاتا کہ فریال کو تنہا نہ چھوڑیں، ان کی ضد اور غصے نے اسے اس دوزخ میں زندگی گزارنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ فریال کی یادوں سے نجات پانے کے لیے اس نے خود کو دن رات کام میں غرق کر لیا لیکن وہ اس کی محبت کو دل سے نوچ کر پھینک نہیں پایا تھا اور آج اسے اپنے سامنے دیکھ کر اس کے زخم ایک بار پھر ہرے ہو گئے تھے اور آج لاہور واپسی سے پہلے وہ چاہتا تھا کہ فائق سے مل کر اس کے گھر نہ آسکنے کی معذرت کر لے۔

''نو پرابلم..... تم اطمینان سے کیس دیکھو میری فلائٹ میں ابھی وقت ہے۔'' عمیر نے مسکراتے ہوئے اپنی کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور فائق کی میز پہ پڑے ایک اخبار کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ وہی روزمرہ کی خبریں چوری، ڈکیتی، قتل و خوں ریزی، دہشت گردی۔

''پتا نہیں لوگ کیوں اس قدر سفاک ہوتے ہیں..... مجھے حیرت ہے آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی یہ ظلم و جبر اور زمانۂ جاہلیت کی اقدار موجود ہیں۔ آئے دن ڈومیسٹک وائلنس اور شوہر کے مظالم سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرنے والی لڑکیوں کے کیس یہاں آتے ہیں لیکن ان میں سے اکثریت جاہل اور نچلے طبقے کے لوگوں کی ہوتی ہے مگر میں حیران ہوں یہ پڑھے لکھے اور بظاہر سویلائزڈ نظر آنے والے لوگ بھی اپنے اندر اتنی درندگی رکھتے ہیں۔'' فائق اپنے کمرے میں واپس آیا تو اس کا موڈ کچھ آف تھا۔ کرسی پہ بیٹھتے ہوئے وہ تاسف سے بولا تھا۔

''دراصل یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے اور تعلیم سے اس کا کوئی تعلق نہیں..... لباس چاہے جو بھی ہو انسان کے اندر چھپا درندہ جب اپنے خول سے باہر آتا ہے تو درحقیقت جانور سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ ویسے ہوا کیا ہے؟'' عمیر نے سوال کیا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا عمیر کہ یہ بندہ اپنی بیوی کے ساتھ ایسا سلوک بھی کر سکتا ہے..... تم جانتے ہو گے اس کو، میں خود اس سے کئی پارٹیوں میں مل چکا ہوں بات چیت اور اطوار سے بہت ہی ویل کلچرڈ اور سلجھا ہوا لگتا ہے، باتیں تو بڑی اصول والی اور بے باک کرتا ہے لیکن

ذاتی زندگی میں اتنا گھٹیا ہوگا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔‘‘ ڈاکٹر فائق کے لہجے میں حیرت کے ساتھ مایوسی بھی تھی۔

’’کس کی بات کررہے ہو تم فائق؟‘‘ عمیر کو تجسس ہوا۔

’’شعیب قریشی کی...... جانتے ہو ناں وہ جو جرنلسٹ اور تجزیہ نگار ہے......‘‘ فائق نے بتایا۔ عمیر کے چہرے کی رگیں تن گئی تھیں۔

’’ابھی جو سوسائڈ کا کیس آیا ہے وہ لڑکی اس کی بیوی ہے۔ گھریلو ملازمہ اسے یہاں بے ہوشی کی حالت میں لائی ہے۔ بیچاری کی بہت ہی بری حالت ہے......اس کی مینٹل کنڈیشن تو بری ہے ہی ساتھ ہی اس کے جسم پہ تشدد کے نشانات ہیں۔‘‘ فائق رازداری سے بولا۔

’’فریال......‘‘ عمیر زیرلب بڑبڑایا۔

’’تم جانتے ہو اسے؟‘‘ فائق نے عمیر کی بدلی ہوئی رنگت کو دیکھا۔

’’فائق مجھے اس کے پاس لے چلو۔‘‘ وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور چند قدموں میں طویل کاریڈور سے گزر کر ایمرجنسی میں پہنچا تھا۔ ایک، ایک لمحہ اسے صدیاں لگ رہا تھا اور وہاں جا کر اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔ ایمرجنسی کے بستر پہ بے بسی کی تصویر بن کے لیٹی فریال اس وقت ہوش میں نہیں تھی۔

کل عمیر کے وہاں سے نکلنے کے بعد شعیب نے اسے زدوکوب کیا تھا۔ اس نے عمیر اور فریال کے رشتے کے حوالے سے بہت سے گھٹیا الزامات لگائے تھے جس پہ فریال خاموش نہیں رہ سکی تھی اور پھر اس نے اپنی جہالت کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بہت مارا تھا۔ وہ خود تو رات کو ہی بیرونِ ملک چلا گیا تھا لیکن فریال نے وہ رات درد سے کراہتے ہوئے گزاری تھی اور پھر نفسیاتی دباؤ اور ذلت کے شدید احساس نے اسے یہ قدم اٹھانے پہ مجبور کیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی نس کاٹ لی تھی لیکن گھر پہ موجود ملازمہ اسے ڈرائیور کی مدد سے اسپتال لے آئی تھی۔ یہ سب باتیں عمیر کو اسی ملازمہ نے بتائی تھیں جو روتی ہوئی سویرا کو بھی سنبھال رہی تھی۔ ماں کی حالت دیکھ کر چھوٹی سی بچی ڈر گئی تھی۔ عمیر نے اسے گود میں اٹھالیا کچھ ہی دیر میں وہ اس کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔

☆☆☆

’’مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے یہ سن کر عمیر۔‘‘ ساری بات عمیر سے سننے کے بعد فائق نے افسوس سے کہا۔

’’اس بندے کو ایسا سبق سکھاؤ کہ اس کی سات پشتیں یاد رکھیں۔ میڈیا تو ایسی خبروں کو سونگھتا پھرتا ہے۔ یہ جو دوسروں کے کردار کی دھجیاں بکھیرتا پھرتا ہے ناں خود دھجیاں بکھر جائیں گی اس کے اپنے کیرئیر کی۔‘‘ وہ غصے سے بولا۔ اسے رہ، رہ کر غصہ آرہا تھا۔

’’لیکن اس سب سے کیا فائدہ ہوگا......ایسے لوگ تو منفی شہرت کو بھی استعمال کرنے کا گُر جانتے ہیں الٹا فریال کی بدنامی ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ بابا کا نام اچھالا جائے گا......اس عمر میں اخباروں اور نیوز چینل پہ اپنی بیٹی کا نام دیکھ کر وہ کس کرب سے گزریں گے۔ یوں بھی فریال کی دماغی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ الٹے سیدھے سوالوں کے جواب دے۔‘‘ عمیر دھیمے لہجے میں بولا وہ ان سب پہلوؤں پہ غور کر چکا تھا۔

’’یوں بھی وہ بڑا کایاں انسان ہے جو بغیر سچ جانے فریال اور اس کے تعلق کے طعنے مار رہا ہے اس بات کو اپنے حق میں کس انداز میں استعمال کر سکتا ہے۔‘‘ شریف انسان بدنامی سے ڈرتا ہے اور جس محبت کو اس نے اتنے سالوں سے اپنے سینے میں دفن کر رکھا تھا یہ وقت اس کی تشہیر کا نہیں تھا۔

’’تو پھر کیا سوچا ہے تم نے اب کیا کرو گے؟‘‘ اسے کچھ سوچتا پایا تو فائق نے کریدا۔ عمیر فیصلہ کر چکا تھا۔

’’اس کا سب سے بہترین حل یہی ہے کہ میں، فریال اور اس کی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جاؤں اور اس بے حس انسان کے چنگل سے آزادی دلوادوں۔ فی الحال تو مجھے فریال کی فکر ہے......اسے ری ہیبلیٹیشن کی ضرورت ہے وہ اتنے سالوں سے جس ذہنی دباؤ سے گزر رہی ہے اسے نارمل کرنے میں بہت وقت لگے گا۔ بابا کی طرف سے بھی میں خاصا فکرمند

ہوں ان کی صحت اچھی نہیں ہے، تم تو جانتے ہو پچھلے سال ان کی اوپن ہارٹ سرجری ہوئی ہے اور اس کے بعد ان کی ریکوری کی رفتار بہت سست ہے۔ وہ اعتراف نہیں کریں گے لیکن میں جانتا ہوں، فریال کی جدائی کا دکھ انہیں اندر ہی اندر توڑ رہا ہے اب جو وہ اس حال میں دیکھیں گے تو پتا نہیں ان کا کیا ردِعمل ہوگا۔'' اس کے ذہن پہ بہت سی سوچیں حاوی تھیں۔ سب کچھ پہلے جیسا نہیں ہوسکتا تھا یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا لیکن یہ اس کی ذمے داری تھی کہ جو غلط ہو چکا ہے وہ اسے ٹھیک کردے۔ بہت سے قرض ہیں اس پر، آج وہ وقت آگیا تھا کہ اس خاندان کی خوشیاں انہیں لوٹا کر وہ اس قرض کو چکادے۔

☆☆☆

''میں اب تمہیں دوبارہ اس کے پاس نہیں جانے دوں گا فریال۔'' اسپتال میں اس کا خصوصی خیال رکھا گیا تھا اور اس کی طبیعت کافی بہتر تھی۔ سویرا اب بھی عمیر کے ساتھ تھی اور اس کی گود میں تھک کر سو چکی تھی۔

''تو پھر میں کہاں جاؤں گی؟'' فریال اداسی سے بولی۔ نقاہت کی وجہ سے اس کی آنکھیں بھی نہیں کھل رہی تھیں۔

''اپنے گھر...... بابا کے گھر۔'' عمیر نے کمرے میں پڑے ایکسٹرا بیڈ پہ سویرا کو احتیاط سے لٹایا۔ وہ اب گہری نیند میں تھی۔ عمیر فریال کے پاس آگیا۔

''لیکن بابا...... وہ تو مجھ سے ہر تعلق توڑ چکے ہیں۔'' وہ رونے لگی تھی۔

''ماں باپ اولاد سے وقتی طور پہ ناراض تو ہوسکتے ہیں مگر تعلق کبھی نہیں ختم ہوا کرتے۔ تم ان کی اکلوتی اولاد ہو اور وہ تم سے بے تحاشا محبت کرتے ہیں...... وہ کہتے نہیں ہیں مگر میں جانتا ہوں وہ تمہیں کتنا مس کرتے ہیں...... تمہارے لیے کتنے فکرمند ہیں...... تمہیں دیکھ کر وہ ہر رنجش بھول جائیں گے۔'' عمیر نے اسے یقین دلایا۔ اور وہ عمیر کی بات ماننے کو تیار تھی۔

☆☆☆

''فریال میری بچی۔'' وہ عمیر کے ساتھ گھر پہنچی تھی اور علی حیدر صاحب اسے دیکھتے ہی بے اختیار اس کی طرف لپکے تھے۔ اتنے سالوں کی ناراضی ایک پل رخصت ہوگئی تھی۔

غزل

کیا ملا عشق کی تفسیر مختصر کر کے
خدا گنوا ہی دیا، دل کو منتشر کر کے
تجھے بھی علم ہو، ہے جستجو کا برزخ کیا!
کسی کو مانگ کبھی شام سے سحر کر کے
خدا کے روبرو یہ پیش ہو کہ دل نے کہا
وہ شخص چاہیے دے زیر یا زبر کر کے
تجھے خبر بھی ہے؟ اے روح کھینچنے والے!
میں مر چکی ہوں ختم اپنا ہر سفر کر کے
مجھے بھی علم ہے کیا ضبط کی حقیقت ہے
صبر ہی ملتا ہے جی! دیکھ لیں صبر کر کے

شافیہ خان شافی۔ ڈیفنس کراچی

''بابا...... مجھے معاف کردیں۔ بابا...... میں نے آپ کی بات نہیں مانی۔ آپ کا دل دکھایا اور آج اس کی سزا بھی بھگت رہی ہوں۔ اتنے سالوں میں کوئی ایک پل ایسا نہیں گزرا جب مجھے اپنی غلطی کا احساس نہ ہوا ہو۔ میں پچھلے چھ سال سے ان پچھتاوؤں کے ساتھ جی رہی ہوں۔'' وہ چھوٹے بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔ ان کے سینے سے لگی وہ ان بیتے ماہ و سال کا غم ان سے بانٹ رہی تھی جب اس نے اپنی زندگی میں ان کی کمی کو محسوس کیا، ان کی نافرمانی کے پچھتاوے کی اذیت جھیلی اور اس نے کب ان کی کمی کو محسوس نہیں کیا تھا، کب وہ نہیں پچھتائی تھی۔ ہر لمحہ، ہر دن، ہر سال وہ وقت جو اس نے شعیب کے ساتھ روتے ہوئے گزارہ اس کی بے وفائی کا کرب سہا، ان تمام لمحوں میں اس کے ضمیر نے اسے کوسا تھا، اس کا گلٹ بڑھتا گیا۔

''نہیں میری جان...... غلطی تو میری تھی۔ ناراض تھا، مرا تو نہیں تھا تمہیں اس طرح بے آسرا چھوڑ کر کن

کچھ عرصہ قبل بھی ہم نے عذرا رسول صاحبہ کی ڈائری سے نہایت آزمودہ ٹوٹکے پاکیزہ قارئین کی نذر کیے تھے اب یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا۔

عذرا رسول کی ڈائری سے انتخاب

☆ اگر سر میں خشکی ہو تو ہفتے میں دو بار لیموں کا عرق پانی میں ملا کر سر دھوئیں خشکی صاف ہو جائے گی۔

☆ تیل میں لیموں کا رس ڈال کر بالوں میں لگانے سے بال چمک اٹھیں گے۔

☆ بالوں میں گاجر کا رس تیل کی طرح لگائیں بال جھڑنا بند ہو جائیں گے۔ گاجر کا رس پینے سے خوب صورتی میں بھی اضافہ ہوگا۔

☆ ایک چمچ ٹماٹر کا رس اور چند قطرے لیموں کا عرق اچھی طرح ملا لیں۔ اس لوشن کو دھیرے دھیرے ملیں، چہرہ ملائم اور صاف ہو جائے گا۔ تازہ پانی سے منہ دھو لیں۔

☆ پودینہ کی پتیوں کو باریک پیس کر رس نکال لیں، رات کو سونے سے پہلے اس.. عرق کو چہرے پر لگائیں پھر تازہ پانی سے منہ دھو لیں، چہرہ بے داغ اور پُرکشش ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ پودینے کی تازہ پتیاں ابال کر نتھار کر اس کا پانی پئیں۔

حالوں میں پہنچا دیا ہے میں نے۔" عمیر انہیں ساری بات بتا چکا تھا۔ پچھتاوے یک طرفہ نہیں تھے۔

☆☆☆

شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے خود پہ ایک بھرپور نظر ڈالی۔ وہ آج بھی ہمیشہ کی طرح ہینڈسم لگ رہا تھا۔ اپنی ٹائی کی ناٹ درست کرتا وہ اب اپنے سیاہ سوٹ پر ہم رنگ جیکٹ پہن رہا تھا۔ کمرے سے نکل کر اس کا رخ اسٹڈی کی طرف تھا۔ کل رات وہ یہاں بہت دیر تک بیٹھا کام کرتا رہا تھا۔ کاغذات کا ایک پلندہ اس کی اسٹڈی ٹیبل پہ پڑا تھا جو کل رات ہی اس نے تیار کیے تھے۔ ان کی ترتیب چیک کر کے اس نے احتیاط سے انہیں اپنے لیدر بیگ میں رکھا اور پھر اسٹڈی سے باہر نکل گیا۔ اسے لاؤنج سے نکلتا دیکھ کر اس کا ڈرائیور مؤدب انداز میں کھڑا ہو گیا تھا۔

"آج گاڑی میں خود چلاؤں گا...... مجھے کسی سے ملنا ہے۔ آج یہ کام نپٹا ہی لینا چاہیے۔" دائیں ہاتھ میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"دروازہ کھلواؤ۔" اپنی سیاہ لینڈ کروزر میں بیٹھنے سے پہلے اس نے کہا۔ ڈرائیور اب چوکیدار کو دروازہ کھولنے کی ہدایت دے رہا تھا۔

گاڑی گھر سے نکل کر مین روڈ پہ آ گئی تھی۔ وہ بہت انہماک سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس دوران چند کالز اس کے موبائل پہ آئیں لیکن اس نے بہت مختصر بات کی تھی۔ اس وقت اس کا دھیان صرف ایک ہی بات پہ تھا۔ اگلے چند منٹوں میں وہ اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔ یہ کام اگر ہو گیا تو اس کی دیرینہ خواہش پوری ہو جائے گی۔ اس ایک فیصلے سے اس کی زندگی بدل جائے گی۔ وہ زیرِ لب مسکرایا۔ اپنی ایکسائٹمنٹ کو چھپانے کی کوشش میں اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ گاڑی نے بائیں طرف موڑ کاٹا تو سڑک پہ گاڑیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کے آگے ایک جیپ نما کھلی چھت کی گاڑی میں چند اسلحہ بردار لوگ سوار تھے...... شاید وہ کسی اہم شخصیت کی سیکیورٹی کی گاڑی تھی۔ اکثر شہر کی سڑکوں پہ ایسی گاڑیاں نظر آتی ہیں جو دراصل سیاستدانوں، جاگیرداروں اور وڈیروں کی گارڈ... گاڑیاں ہوتی ہیں۔ شہر کے حالات بھی تو روز بروز خراب ہوتے جا رہے تھے۔ اس نے اپنی گاڑی کی رفتار بڑھائی اور جیپ کے برابر سے گاڑی نکالنا چاہی...... اسی لمحے کلاشنکوف سے نکلتی گولیوں کی بارش نے اس کی گاڑی کے شیشوں کو چھلنی کر دیا۔ اس اچانک افتاد سے وہ گھبرا گیا اور گاڑی کا اسٹیئرنگ اس کے ہاتھ سے چھوٹا...... گاڑی بے قابو ہو کر فلائی اوور کی

☆ لیموں کا عرق نکال کر اس کا چھلکا دھیرے دھیرے ہونٹوں پر ملیں، کالا پن دور ہوجائے گا پھٹیں گے بھی نہیں۔

☆ چہرے کی چھائیاں دور کرنے کے لیے نیم کی تازہ پتیوں کو پیس کر اس کا رس لگائیں۔

☆ لوکی کے چھلکے پیس کر دھیرے دھیرے چہرے پر ملیں، چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھے گا۔ علاوہ ازیں لوکی ابال کر کھائیں اور اس کا پانی پئیں، وزن کم ہوگا۔

☆ ہرا دھنیا پیس کر جلد کے دانوں پر ملیں دانے غائب ہوجائیں گے۔

☆ کھیرے کا رس دودھ میں ملا کر چہرے پر لگانے سے رنگ صاف ہوجاتا ہے۔

☆ روزمرہ غذا میں وٹامن ”C“ والی اشیا مثلاً کھٹے رس والے پھل، امرود، چیری، اناناس، بند گوبھی، شلغم، ٹماٹر، پپیتے اور مکوہ شامل ہیں۔

☆ وٹامن ”A“ مکھن، دودھ، انڈے، کلیجی، مچھلی، گاجر، خوبانی، آڑو، پپیتے اور شلغم میں پایا جاتا ہے۔ روزمرہ کی غذا وٹامن A کے بغیر نامکمل ہے۔

☆ وٹامن B.1 گوشت، مٹر، چنا، چاول، چھلکے دار اناج، گندم کے انکرے، سویابین کے آٹے، انڈے، مچھلی، آلو بخارا، پھول گوبھی، بادام، اخروٹ اور پستے میں پایا جاتا ہے۔

دیوار سے ٹکرائی اور اس کا اگلا حصہ بری طرح تباہ ہوگیا۔ جیپ کے ڈرائیور نے اپنی گاڑی کی رفتار بڑھائی اور تیزی سے گاڑی دوڑاتا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

☆☆☆

”ممی......ٹی وی پہ پاپا آرہے ہیں۔“ سویرا بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی تھی۔

”اچھا......“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ شعیب کے گھر سے آنے کے بعد ان دونوں کے درمیان دوبارہ کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا، اس نے گھر چھوڑا تو شعیب نے اس کی خبر بھی نہیں لی۔ وہ اپنی زندگی میں اتنا مگن تھا کہ فریال کا ہونا نہ ہونا اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ اتنا مادہ پرست ہوچکا تھا کہ اسے اپنی اولاد کے جانے کا بھی کوئی افسوس نہیں تھا۔

”ممی چلیں ناں......وہ چلے جائیں گے۔“ اس نے ہاتھ پکڑ کے فریال کو کھینچا۔

”تم جا کر دیکھو۔“ شعیب کا لائیو ٹاک شو دن میں ایک دو بار ٹیلی کاسٹ ہوتا شاید اب سویرا وہی دیکھ کر اس کے پاس اسے بلانے چلی آئی تھی۔ فریال بیزاری سے اٹھی۔ جب وہ اس شخص کو اپنے دل و دماغ سے کھرچ کر نہیں نکال سکتی تو اس پانچ سال کی بچی سے کیسے امید رکھے کہ وہ اپنے باپ کو بھول جائے۔ اس کا ہاتھ تھامے وہ ٹی وی لاؤنج میں آگئی تھی۔ ٹی وی پہ اس وقت بریکنگ نیوز چل رہی تھی اور وقفے، وقفے سے چند تصاویر اور مختلف پروگراموں کی جھلکیاں دکھائی جارہی تھیں۔

”مسلح افراد کی فائرنگ سے مشہور تجزیہ نگار اور صحافی، شعیب قریشی موقع پر جاں بحق ہوگئے۔“ نیوز رپورٹروں نے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ وہ ایک ٹک اسکرین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”تمام صحافی برادری ان کے دن دیہاڑے قتل کے واقعے پہ شدید غم و غصے کا اظہار کررہی ہے۔“ ٹی وی پر اس وقت جائے وقوعہ کا منظر دکھایا جارہا تھا، اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

”شعیب قریشی کے ظالمانہ قتل کے خلاف میڈیا نے تین روزہ سوگ کا اعلان کیا ہے۔“ وہ اس سیاہ گاڑی کو پہچانتی تھی جس کے شیشے چھلنی ہوچکے تھے۔ آنسوؤں کی لڑیاں اس کے رخساروں پہ بہہ رہی تھیں۔

”ایک صحافی کے کھلے عام سفاکی سے قتل کیے جانے پہ عالمی صحافی برادری تحفظات کا شکار ہے۔“ گاڑی کی سیٹ خون سے لال ہورہی تھی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن اس کی چیخ حلق میں پھنس گئی تھی۔

''شعیب قریشی نے بہت کم وقت میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا کر صحافتی دنیا میں اپنی جگہ بنائی۔ دنیائے صحافت ان کی بیش قیمت خدمات کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔'' تجزیہ نگاروں کا ایک گروہ اس کی موت کے اسباب اور محرکات پہ بحث کر رہا تھا۔ اتنے سالوں سے خبروں کو منظرِ عام پہ لانے والا شعیب قریشی آج خود ایک خبر بن گیا تھا۔ وہ نڈھال سی ہو کر صوفے پہ گر گئی تھی۔

☆☆☆

''یہاں اندھیرے میں اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟'' عمیر نے اندر آ کر کمرے کی بتی جلائی۔ اچانک تیز روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

''یہ تنہائی اور اندھیرے ہی تو مقدر میں ہیں۔'' وہ اتنا ہی کہہ سکی۔ بابا اور عمیر اس کی ہر طرح سے دل جوئی کرتے تھے لیکن فریال کی اداسی دور نہیں کر پائے تھے۔ وہ زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی گزارتی تھی۔

''یہ تو تمہارا انتخاب ہے ذرا اس کمرے سے باہر نکلو تو پتا چلے تم ہرگز اکیلی نہیں ہو...... میں ہوں، بابا ہیں اور پھر سویرا بھی تو ہے اور یہ دنیا آج بھی اتنی ہی حسین اور رنگین ہے بس تمہیں خود کو اس مایوسی اور گھٹن سے نکالنے کی ضرورت ہے۔'' وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔ فریال بغور اس کو دیکھ رہی تھی۔

''تم کب تک میرے لیے خود کو ہلکان کرتے رہو گے عمیر...... یہ مایوسی اور گھٹن تو میری زندگی کی سچائی ہے تم کب تک مجھے روشنیوں کی امید دو گے۔'' اسے اس شخص پہ حیرت ہوتی تھی۔ کوئی رشتہ نہیں تھا اس سے پھر بھی یہ اس کا سب کچھ تھا۔

''جب تک تمہیں دوبارہ پہلے والی فریال نہیں بنا دیتا...... ہنستی مسکراتی، زندگی سے بھرپور...... ہر پل کو زندگی سمجھ کر جینے والی، میری وہ ساتھی جس نے کبھی مجھے ہنسنا سکھایا تھا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

''تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو...... وہ فریال تو کب کی مر چکی۔ اس نے اپنی خوشیاں اپنے ایک غلط فیصلے کی بھینٹ چڑھا دیں۔'' فریال نے نظریں جھکا لیں۔ اداسی کے سائے اس کے حسین چہرے پہ لہرا رہے تھے۔

''ایسا تم سوچتی ہو اور غلط سوچتی ہو اگر کچھ برا ہو جائے تو زندگی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ غلطیاں ہمارے تجربے میں اضافہ کرتی ہیں۔ کامیاب انسان وہ ہے جو اِن سے سبق سیکھے۔ تمہیں جو دکھ اندھیرا غار لگ رہا ہے یہ دراصل ایک سرنگ ہے جہاں سے نکلو گی تو زندگی خوشیوں کا چراغ تھامے تمہاری منتظر ہوگی۔'' وہ قنوطیت اور ڈپریشن کے فیز سے اب تک نکل نہیں پائی تھی۔ اس کی زندگی بس ایک نقطے پہ آ کر ٹھہر گئی تھی لیکن عمیر نے اپنی کوشش نہیں چھوڑی تھی۔ وہ اسے زندگی کی طرف واپس لانا چاہتا تھا۔

''عمیر ایک بات کہوں......'' اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن عمیر نے اسے روکا۔

''بس فریال...... آج نہیں...... اتنے سال صرف تم کہتی رہیں اور میں سنتا رہا لیکن آج مجھے کہنے دو، میرے دل کی وہ بات جو میں کب سے تمہیں بتانا چاہتا تھا، وہ خواہش جو میرے دل میں اتنے سالوں سے دفن ہے اسے مجھے کہنے سے مت روکو۔ مجھے بتانے دو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں...... کل بھی کرتا تھا، آج بھی کرتا ہوں...... اور مرتے دم تک کرتا رہوں گا۔ زندگی کا یہ سفر تمہارے بغیر کانٹوں بھرا راستہ ہے اور اگر اس دشت میں تمہارا ساتھ میسر ہو تو دل کی یہ ویرانی گل و گلزار ہو سکتی ہے۔ کہہ دو کہ تمہیں اپنی زندگی کی ان تنہا راہوں میں میرا ساتھ قبول ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا ہر غم بھلا دوں گا...... کہہ دو فریال...... بس ایک بار کہ تمہیں میری محبت قبول ہے۔'' اس کا ہاتھ تھامے وہ دل کی گہرائیوں سے کہہ رہا تھا وہ بات جو سالوں پہلے وہ فریال سے کہنا چاہتا تھا اور کہہ نہیں پایا تھا۔ اس ادھوری محبت کے کرب میں اس نے ہر دن، ہر پل کس عذاب میں کاٹا تھا۔

''قبول ہے۔'' عمیر کی طرف دیکھ کر وہ مسکرائی اور اس کی مسکراہٹ دیکھ کر عمیر کو یوں لگا جیسے ویرانے میں بہار آ گئی۔

☆☆☆

شمعِ ہدایت

اختر شجاعت

تقویٰ...... عرفانِ الٰہی

اے اللہ! میں تیری حمد و ثنا کرتا ہوں تو ہی سزاوار حمد وثنا ہے۔ تو نے اپنی رحمت سے مجھے زیادہ سے زیادہ دیا مجھ پر وہ احسانات کیے جن کے شکر سے میں عاجز ہوں پس تو بہت عظمت و بزرگی والا ہے۔ تو رحمت نازل فرما آقا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپ کی آل پر......

ہمارا آج کا موضوع ''تقویٰ'' ہے۔ تقویٰ کے لغوی معنی پرہیز گاری ، پارسائی، اللہ کا خوف ہے۔ لفظ تقویٰ عربی میں بچنے اور اجتناب کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک روز حضرت کعبؓ سے تقویٰ کے بارے میں سوال کیا...... تو آپؓ نے کہا۔

اے عمرؓ کبھی آپ کا گزر ایسی جگہ پر ہوا ہے جہاں ہر طرف خاردار جھاڑیاں ہوں...... آپؓ نے فرمایا۔ ہاں تو انہوں نے پوچھا پھر آپؓ نے وہاں کیا، کیا؟ آپؓ نے فرمایا ہم نے دامن سمیٹ لیے اور نہایت احتیاط سے چلے انہوں نے فرمایا۔ بس یہی تقویٰ ہے یعنی دنیا ایک خاردار جنگل ہے جہاں گناہوں کے کانٹے ہی کانٹے ہیں اس میں سے اس طرح گزرنا کہ دامن گناہ کے کانٹوں سے پاک رہے تقویٰ کہلاتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اے ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہر کام میں اس طرح کی جائے کہ کوئی کام اطاعت کے خلاف نہ ہو اور اس کو ہمیشہ یاد رکھیں کبھی غافل نہ ہوں اور اس کا ہمیشہ شکر ادا کریں کبھی ناشکری نہ کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا...... ''لوگو! اللہ سے پورے، پورے ڈرتے رہو۔''

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ تقویٰ یہ ہے کہ ظاہر کو گناہوں سے آلودہ نہ کرے۔ باطن کو واہیات باتوں سے بچائے اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں قیام کرے۔''

حضرت ابن عطاؒ فرماتے ہیں کہ تقویٰ کا ایک ظاہر ہے ایک باطن...... ظاہر تو خدا کی نگہداشت ہے اور باطن میں نیت اور اخلاص اس کی ابتدا معرفت اور انتہا توحید ہے۔''

زہد و تقویٰ کے تین درجے ہیں......

1۔ ادنیٰ درجہ کفر و شرک سے بچتا ہے۔

2۔ اس چیز سے بچا جائے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔

3۔ تیسرا درجہ تقویٰ کا اعلیٰ مقام ہے جو انبیائے کرام اور ان کے نائبین اولیائے کرام کو نصیب ہوتا ہے جو اپنے قلب کو ہر غیر اللہ سے بچاتے اور اللہ کی یاد اور اس کی رضا جوئی سے معمور رکھتے ہیں۔

تو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی تمام نیکیوں کا مرکز ہے۔ ہر انسان کو اپنے رب کی طرف زیادہ متوجہ ہونا چاہیے اور اس کی رحمت کا طلبگار رہے اس کی نعمتوں کا شکر گزار ہو کر اس کی اطاعت کر کے خود کو اس کے دوستوں میں شمار کرائے۔ اطاعت اور شکر گزاری ہی سے اللہ تعالیٰ انسان کو اپنے محبین (چاہنے والوں) کے دفتر میں لکھ لیتا ہے۔

تقویٰ ایک بہت عمدہ خزانہ ہے، دنیاوی اور آخروی

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety
پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1
پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہماراویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.

All Done

... بھلائیاں تقویٰ میں جمع کردی گئی ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تقویٰ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ”جب تک کسی شخص کے دل میں شہوات و لذات دنیوی کی ہوس موجود ہے وہ اپنی عاقبت کو نہیں سنوار سکتا۔ اور جب تک کوئی شخص عاقبت میں لذاتِ نفسانی مثلاً بہشت و مافیہا کا خواہشمند ہے وہ خالصتاً دیدار و رضائے الٰہی کا طلب گار نہیں ہے۔ اس شخص نے ابھی تک تقویٰ کی حیثیت نہیں پائی۔ تو جب تک کسی شخص کے دل پر غیر اللہ کا غلبہ رہے گا وہ حقیقی خوشی اور طمانیت نہیں پا سکتا۔“

☆☆☆

اللہ تعالیٰ کی حقیقی اطاعت قلب کا عمل ہے۔ اعضا کی عبادت اسی عمل کا مظہر ہے۔ حضرت رابعہ بصریؒ ارشاد فرماتی ہیں کہ ”میں نے ایک دفعہ ایک بادشاہ کے چراغ کی روشنی میں اپنا پھٹا ہوا پیراہن سیا...... پھر مدت تک میرا دل مکدر رہا یہاں تک کہ میں نے وہ پیوند پھاڑ ڈالا تب میرا دل یادِ حق میں آسودہ ہوا اور کشادہ ہوا۔“

حضرت امام ابو حنیفہؒ ایک روز بازار سے گزر رہے تھے کہ کچھ مٹی آپ کے کپڑوں پر لگ گئی۔ آپؒ نے اسی وقت پانی کے ساتھ اسے دھو ڈالا۔ لوگوں نے یہ دیکھا تو کہا۔ امام صاحب...... آپ نے نجاست کی ایک معین مقدار کو جائز رکھا ہے تو اس قدر مٹی کو کیوں دھوتے ہیں؟ آپؒ نے فرمایا۔ ”وہ فتویٰ ہے لیکن یہ تقویٰ ہے۔“ ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ نے حضرت شیخ حارث محابیؒ کو اپنے گھر کی طرف سے گزرتے دیکھا حضرت حارث محابیؒ کے چہرے پر شدید نقاہت کے آثار تھے۔ آپ نے اندازہ کر لیا کہ شیخ فاقے سے ہیں...... آپ نے بغیر کسی تامل کے کہا...... ”چچا! گھر میں تشریف لائیں اور کچھ نوش فرما لیجیے۔“

حضرت شیخ حارث محابیؒ نے ایک نظر اپنے شاگرد کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ ”بہتر ہے۔“ یہ کہہ کر آپ گھر میں تشریف لے آئے۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے شیخ کے سامنے دسترخوان بچھایا اور پُرتکلف کھانا رکھ دیا۔ اتفاق سے گزشتہ رات پڑوس میں شادی تھی اور یہ کھانا وہیں سے آیا تھا۔ حضرت شیخ کو علم نہ تھا انہوں نے ایک لقمہ لیا اور اسے منہ میں رکھ لیا۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے حیرت سے دیکھا کہ حضرت شیخ نے کئی بار اس لقمے کو منہ میں گھمایا۔ پھر دفعتاً دسترخوان چھوڑ کر گھر سے باہر تشریف لے گئے۔ دروازے سے نکل کر ایک گوشے میں وہ لقمہ اگل دیا۔ اور خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے...... حضرت جنید بغدادیؒ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان کے اس طرزِ عمل کے بارے میں کچھ دریافت کر سکیں۔

دو چار دن بعد جب تنہائی ملی تو حضرت جنید بغدادیؒ نے استادِ محترم کو اس روز کا واقعہ یاد دلایا...... حضرت شیخ حارث محابیؒ نے فرمایا۔

”اس دن میں فاقے سے تھا میں نے چاہا کہ کچھ کھا کر تمہارا دل خوش کر دوں مگر اللہ نے مجھ پر ایک خاص کرم فرمایا ہے کہ اگر غذا کے کسی لقمے میں کسی قسم کا شبہ ہو تو میرے حلق سے نہیں اترتا یہی وجہ تھی کہ میں تمہارا دیا ہوا کھانا نہیں کھا سکا۔“ اس کے بعد شیخ نے پوچھا۔ ”وہ کھانا کہاں سے آیا تھا؟“ حضرت جنیدؒ نے شرمسار انداز میں عرض کیا۔ دراصل وہ کھانا پڑوسی نے بھیجا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ ”مجھے اسی وقت خیال آیا تھا کہ یہ کھانا تمہارے گھر کا نہیں ہو سکتا۔“ تب حضرت جنیدؒ نے شیخ سے دوبارہ درخواست کی کہ اس روز آپ بغیر کھانا کھائے تشریف لے گئے۔ آج مجھے یہ سعادت بخشیں۔ حضرت شیخ آپ کی درخواست پر فوراً آمادہ ہو گئے...... مگر اتفاق سے اس روز حضرت جنید بغدادیؒ کے یہاں سوکھی روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپ کو خفت سی محسوس ہوئی۔ مگر شیخ کے بھوکے ہونے کے خیال سے آپ نے وہی خشک روٹی پیش کر دی مگر اس وقت حضرت جنید بغدادیؒ کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب حضرت شیخ نے وہ سوکھی روٹی بڑے ذوق شوق کے ساتھ کھائی اور پھر بڑے پُرجوش لہجے میں فرمایا۔ ”جب

کسی فقیر کی دعوت کرنا ہو تو ایسی ہی چیز پیش کیا کرو۔“

☆☆☆

ایک شخص حضرت بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں بیعت کرنے کے لیے آیا۔ ایک دو ماہ آپ کے پاس رہنے کے بعد بغیر بیعت واپس جانے کے لیے تیار ہوا تو آپؒ نے دریافت کیا تم کس غرض سے آئے تھے اور واپس کیوں جا رہے ہو؟ اس نے عرض کیا۔ حضرت بیعت کی غرض سے آیا تھا اب واپس جا رہا ہوں کیونکہ میں نے اتنی مدت آپ کے پاس رہنے کے باوجود آپ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے دریافت فرمایا۔ ”کیا تم نے اتنی مدت میں میری زندگی کا ایک لمحہ بھی خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی میں گزرتے دیکھا؟“ اس نے جواباً عرض کیا۔ نہیں آپ نے فرمایا...... ”ہمارے پاس اس سے بڑھ کر کوئی کرامت نہیں۔“ اس لیے یہ بات مشہور ہے کہ دین میں استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے۔ اہلِ دل حضرات کی پوری زندگی اگر اطاعت و استقامت میں بسر ہو جائے تو ان کے نزدیک یہی سب سے بڑی کرامت ہے۔ اہلِ دل حضرات نے قربتِ الٰہی کو اللہ کی محبت کے تصور سے ہی پایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ پہلے ایک عورت کی محبت میں گرفتار تھے۔ ساری رات چھپ کر اس کا چہرہ تکتے رہتے۔ ایک رات اسی طرح تکنے میں مصروف تھے کہ فجر کی اذان ہو گئی اور وہ اس عورت کی رعنائیوں میں اس قدر گم تھے تھوڑی دیر بعد جب روشنی پھیلی تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اپنا گریبان پکڑ لیا اور کہا اے عبداللہ...... اے ظالم، اے بدبخت...... تو کتنا بدنصیب ہے کہ تیری ساری رات دنیا کے حسن کی رعنائیوں میں بیت گئی اور اگر تو خدا کی محبت میں...اتنا ہی غرق ہو جاتا اور ساری رات اس کی یاد میں بسر کرتا تو تیرے احوال کی کیفیت کچھ اور ہی ہوتی۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ روتے رہے اور روتے، روتے سجدے میں گر پڑے...... اور حالتِ گریہ میں پڑے رہے اور سجدے سے سر اس وقت

دعا مومن کا ہتھیار

رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد پاک ہے۔

”دعا کبھی بیکار نہیں جاتی لیکن اس کے قبول ہونے کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔“

مثال کے طور پر بندہ جو مانگ رہا ہے اگر وہ اس کے حق میں بہتر ہے تو اسے وہ چیز ضرور ملتی ہے اور اگر وہ چیز اس کے حق میں بہتر نہ ہو تو نہیں ملتی ہے، کیونکہ وہ پروردگار جس نے ہمیں پیدا کیا ہے اور جو ہمیں ستر ماؤں سے زیادہ چاہنے والا ہے، وہ ہمیشہ ہماری بہتری چاہتا ہے۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دعا کو آخرت کے لیے ذخیرہ بنا دیتا ہے۔

دعا مشکلات کو آسان، پریشانیوں کو دور، بلاؤں اور آفات کو ٹالنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ دعا مومن کی معراج ہے کیونکہ جب بندہ اس خالقِ کائنات کے سامنے سجدہ ریز ہو کر خود کو کم تر مان کر اس کی کبریائی کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے کچھ طلب کرتا ہے تو اس پروردگارِ عالم کو اپنے بندے کا یہ عجز و انکسار بہت پسند آتا ہے۔

دین کی خدمت کے لیے دعا بھی ایک قوت ہے بلکہ غور کیا جائے تو پتا چلے گا کہ یہ سب سے بڑی قوت ہے۔ اللہ کا نیک بندہ اللہ کی راہ پر چلتے ہوئے اس کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے لیے، اس کے دین کے غلبے کے لیے اور اس کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہا ہے پھر ہاتھ پھیلا کر اسی سے مدد بھی مانگ رہا ہے یہ دعا ہے جو بندے کو اللہ کا مقرب بناتی ہے، یہی وہ دعا ہے جس کے بعد دنیا میں سرفرازی اور کامیابی مومنوں کے قدم چومتی ہے اور آخرت میں ان کے لیے جنت کے دروازے کھول دیتی ہے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اونچے سے اونچا مقام دلاتی ہے۔

از: رفیعہ ابدالی۔ کراچی

اٹھایا جب محبت الٰہی کا پودا قلب میں جڑ پکڑ چکا تھا۔ اور پھر اس محبت نے آپ کو ہر طرف سے بیگانہ اور بے نیاز کردیا۔

انسان کے اندر عشق و محبت کا جو فطری جذبہ رکھا گیا ہے تصوف اسے جمالِ مصطفویؐ اور جلال و کمال خداوندی کی رعنائیوں کی طرف پھیر دینا چاہتا ہے تو جو لوگ اللہ کی محبت میں مگن ہوجاتے ہیں دنیا کی کوئی لذت، کوئی چاشنی، کوئی کشش اور کوئی نظارہ انہیں اپنی طرف متوجہ نہیں کرسکتا۔ محبت الٰہی امتحان لیتی ہے۔ تقاضا کرتی ہے کہ اپنی محبوب ترین شخصیات اور معاملات کو اللہ کی خاطر چھوڑ دو تاکہ کسی غیر کی محبت کا تصور بھی تمہارے دل میں موجود نہ رہے۔ اگر کسی گوشے میں کسی اور کی محبت کا ایک ذرہ بھی رہ گیا تو محبت ناقص رہ جائے گی کامل نہ ہوپائے گی۔

☆☆☆

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک بار ایک عورت آپ کے پاس ایک قیمتی کپڑے کا تھان لے کر آئی۔ کہنے لگی کہ اسے فروخت کرادیجیے۔ آپؒ نے قیمت دریافت کی اس عورت نے سو درہم بتائے۔ آپ نے فرمایا۔ دام کم ہیں اس عورت نے کہا دو سو سمجھ لیجیے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا۔ اس تھان کی قیمت کسی طرح بھی پانچ سو درہم سے کم نہیں...... عورت حیران ہوکر آپ کے چہرۂ مبارک کو دیکھنے لگی پھر آہستہ سے بولی...... آپ شاید مذاق کررہے ہیں، جواب میں امام صاحب نے عورت کو اپنے پاس سے پانچ سو روپے درہم دے دیے...... اور کپڑے کا تھان رکھ لیا۔ اس احتیاط اور دیانت دارانہ طرزِ عمل نے آپ کے کاروبار کو زیادہ فروغ دیا۔

حضرت داؤد طائیؒ کا بیان ہے کہ میں نے بیس سال تک کبھی آپ کو تنہائی یا مجمع میں برہنہ سر اور ٹانگیں پھیلاتے ہوئے نہیں دیکھا...... جب میں نے عرض کیا کہ کبھی تنہائی میں تو پاؤں سیدھے کرلیا کیجیے، امام ابوحنیفہؒ ..... نے فرمایا۔ مجمع میں تو بندوں کا احترام کروں اور تنہائی میں خدا کا احترام ختم کردوں .... یہ کیسی عجیب بات ہے؟

ایک شخص آپ کا قرض دار تھا اتفاق سے اس کے علاقے میں کسی کی موت ہوگئی جب آپ وہاں نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے تشریف لے گئے تو چاروں طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی صرف ایک مکان کے قریب کچھ سایہ تھا اور یہ مکان اس شخص کی ملکیت تھا جس کے ذمے آپ کی رقم واجب الادا تھی۔ شدید گرمی کے باعث کچھ لوگوں نے امام ابوحنیفہؒ سے سائے میں کھڑے ہونے کی درخواست کی مگر آپ نے انکار کردیا۔ بعد میں آپ نے چند دوستوں کے پوچھنے پر بتایا کہ ”وہ شخص میرا مقروض تھا اگر میں اس کے مکان کے سائے میں کھڑا ہوجاتا تو کچھ لمحوں کا یہ آرام سود میں شامل ہوجاتا۔“

☆☆☆

ایک بار ایک عورت حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے پاس یہ مسئلہ دریافت کرنے آئی کہ میں اپنی چھت پر سوت کات رہی تھی کہ اتنے میں شاہی سوار روشنی لے کر گزرے اور میں نے اسی روشنی میں تھوڑا سا سوت کات لیا اور اب بتائیں وہ سوت جائز ہے یا ناجائز......؟ یہ سن کر امام صاحب نے فرمایا کہ بی بی پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ اس عورت نے جواب دیا کہ میں بشر حافیؒ کی بہن ہوں...... امام صاحب اس کی بات سن کر رو پڑے...... اور فرمایا ”وہ سوت تمہارے لیے جائز نہیں تم بشر حافیؒ کی بہن ہو جو اہلِ تقویٰ ہیں اور تمہیں اپنے بھائی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے جو مشتبہ کھانے پر اگر ہاتھ بڑھاتے تو ہاتھ بھی ان کی پیروی نہیں کرتا تھا۔“

عبادت کا دارومدار تین چیزوں پر ہے۔ اول توفیقِ عبادت حتیٰ کہ اعمال صالح کرنے کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ پھر کوتاہیوں کی اصلاح جس سے اعمال مکمل ہوتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان

اعمال کی قبولیت کی امید......

اللہ تعالیٰ نے ان تینوں چیزوں کا وعدہ تقویٰ کی بنیاد پر فرمایا ہے تقویٰ کے سوا کوئی اور چیز زادِ راہ نہیں چاہے تو اسے لے، لے اور چاہے تو چھوڑ دے۔

حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ تورات میں یہ لکھا ہے "اے ابن آدم...... اللہ سے ڈر پھر جہاں چاہے تو ہو......"

حضرت عامر بن قیسؒ اپنی موت کے وقت رو دیے حالانکہ وہ ہر روز ایک ہزار نوفل ادا کیا کرتے تھے پھر اپنے بستر پر تشریف لاتے تو کہتے بستر سے اے ہر برائی کے ٹھکانے بخدا میں پلک جھپکنے کی مقدار بھی تجھ سے خدا تعالیٰ کی خاطر راضی نہیں...... ایک دن آہ و زاری کررہے تھے کہ کسی نے پوچھا۔

حضرت روتے کیوں ہو؟ تو آپؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پاک نے رُلا دیا ہے کہ "قبول فرماتا ہے۔ اللہ صرف پرہیزگاروں سے۔" (سورۂ معائدہ)

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ میں تقویٰ کے ان بارہ اوصاف کا ذکر کرتا ہوں جو ایک متقی میں ہوتے ہیں۔

1۔ متقی شخص اللہ تبارک و تعالیٰ کی حمد و ثنا کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔

2۔ دشمنوں سے امن و حفاظت میسر آجاتی ہے۔

3۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت حاصل ہوتی ہے۔

4۔ تکالیف و مصائب سے نجات اور رزقِ حلال نصیب ہوتا ہے۔

5۔ اعمال میں اصلاح نصیب ہوتی ہے۔

6۔ گناہوں کی مغفرت و بخشش کی سعادت سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

7۔ اللہ کا قرب اور اس کی محبت نصیب ہوتی ہے۔

8۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اعمال کی مقبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

9۔ بارگاہِ الٰہی میں شان اعزاز و اکرام نصیب ہوتی ہے۔

10۔ موت کے وقت دیدار و بخشش کی بشارت دی جاتی ہے۔

11۔ جہنم سے آزادی کا پروانہ مل جاتا ہے۔

12۔ جنت الفردوس میں ہمیشہ کے ٹھکانے کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔

تو دونوں جہاں کی ہر خیر اور سعادت مندی اس تقویٰ کے تحت جمع ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ مہربان ذات ہے کہ جس کے ہاتھ میں ہر مشکل کی کنجی ہے تو تقویٰ کو جاننے کے بعد اللہ سے مدد طلب کرنی چاہیے اور یہ کہ وہ علم پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔ تو گناہوں سے دل کو پاک صاف کرلینا درحقیقت تقویٰ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "جو شخص اطاعت کرتا ہے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور ڈرتا رہتا ہے کہ اللہ سے اور بچتا رہتا ہے اسی کی نافرمانی سے تو یہی لوگ کامیاب ہیں۔

ایک بزرگ کا فرمان ہے کہ دنیا تو فقط تین سانسوں کا نام ہے، ایک سانس جو گزر چکی اس میں تم نے جو کرلیا سو کرلیا۔ ایک آنے والی سانس اس کے بارے میں کوئی علم نہیں کہ وہ نصیب بھی ہوتی ہے یا نہیں کیونکہ کئی سانس لینے والے اگلی سانس سے پہلے ہی اچانک لقمۂ اجل بن گئے لہٰذا حقیقت میں تو ایک گھڑی یا ایک دن کا نہیں بلکہ ایک سانس کا مالک ہے...... تو اس ایک سانس کو غنیمت جانتے ہوئے عبادت و اطاعت اور توبہ استغفار کی طرف دوڑ پڑو...... کہ موت آکر تمہیں اپنی گرفت میں لے، لے اور دوسری سانس نصیب نہ ہو۔

تو ہمیں اس نصیحت پر غور کرنا چاہیے۔ اور جب تقویٰ کا معاملہ درست ہوجائے تو بے شک اس سے بڑھ کر کوئی اور نورِ بصیرت اور ہدایت کی دولت نہیں......

اللہ تعالیٰ ہم سب کو علم و عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

نوٹ

قارئینِ کرام محترمہ اختر شجاعت بے حد مستند اور قابلِ احترام شخصیات کی کئی، کئی جلدوں پر مشتمل تصانیف سے اس مضمون کے لیے استفادہ کرتی ہیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

باتیں بہار و خزاں کی

زندگی رات دن کی گردش ہے
کچھ خزاں کی ہے کچھ بہار کی بات

ہم ہمیشہ ہی سے کچھ نہ کچھ نیا اور دلچسپ کرتے چلے آئے ہیں سو آج بھی ایک مختصر مگر جامع سوالنامہ حاضرِ خدمت ہے تاکہ آپ کی اپنی شخصیت کے بھی کچھ نہاں پہلو سب کے سامنے آئیں اور آپ کے ذاتی افکار، خیالات اور تجربات سے ہم سب بھی آگاہ ہوں اور لطف بھی اٹھائیں۔ امید ہے آپ کو یہ اچھوتا سلسلہ بہت پسند آئے گا۔

سوالات حاضرِ خدمت ہیں۔

☆ شازیہ ہاشم میواتی۔ کھڈیاں خاص

1- خواتین اپنی شخصیت کو صرف اور صرف اسلامی شعار اپنا کر پُراثر بنا سکتی ہیں، جب تک قرآن و سنت کا دامن نہیں پکڑا جائے گا خواتین اپنی شخصیت کو نکھار نہیں سکتیں کیونکہ ان اکرمکم عنداللہ اتقکم، میں نے اپنی زندگی میں یہی سیکھا ہے اور سمجھا ہے۔

2- میری زندگی کا خوب صورت لمحہ وہ ہے جب میری استادِ اُم حسان نے میری پیشانی کو فرطِ محبت سے چوما تھا۔ اور اسے میں کبھی نہیں بھلا سکتی۔

3- پاکیزہ کے تمام سلسلے اچھے ہیں مگر جو ناولٹ اور افسانے لکھے جاتے ہیں بڑے لاجواب ہوتے ہیں، فضولیات سے پاک ہوتے ہیں، اور معلومات افزا سلسلے بھی اچھے ہوتے ہیں۔

4- پاکیزہ کی رائٹرز اچھا لکھتی ہیں بس اتنا کہنا چاہوں گی کہ مزید دینی مسائل پر اتنی روشنی ڈالیں کہ ہماری معصوم بہنیں مغربیت کی وادی میں نہ گریں اور اللہ آپ کو مزید اچھے سے اچھا کام کرنے کی توفیق دے۔

5- میں بنت عائشہؓ ہوں میں ان کے جیسا علم حاصل کرنا چاہتی ہوں اور میں انہی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتی ہوں۔ اللہ مجھے آقا علیہ السلام صحابہ اکرامؓ اور صحابیاتؓ کے ہدایت والے راستے کا ہی راہی بنائے۔

☆ دردانہ نوشین خان، مظفر گڑھ

1- روز مرہ کی گھریلو زندگی میں ہر عورت خواہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے یا کم تعلیم یافتہ یا ناخواندہ، خوب صورت ہے یا قبول صورت، گھس گھسا کے ایک ہی سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ تقریباً ہر عورت بچوں کی فکر میں ہلکان ہوتی، گھر کی صفائی سجاوٹ میں ادھ موئی ہوتی یا نوکرانی کی خامیوں پر کڑھتی جھگڑتی کھانا پکانے کے ہنر آزماتی، برادری کے لین دین کو ناپتی، تولتی ایک سی صبح، ایک سی شام کرتی دکھائی دیتی ہے۔

بھئی یہ سب اپنی جگہ کچھ نہ کچھ اہم ہے۔ مگر عورت ذاتی earning ضرور کرے...... جی ہاں...... جاب کرے، جاب نہیں ملتی تو کسی نہ کسی سطح پر بزنس کر لے...... کوئی ہنر آتا ہے تو اس کو اپلائی کرے...... اس طرح عورت کی شخصیت میں پختگی اور اعتماد آتا ہے۔ سیکڑوں لڑکیاں ایم اے، ایم ایس سی حتیٰ کہ ایم بی بی ایس کر کے شادی کے بعد گھر بیٹھ جاتی ہیں، کچھ ہی سالوں میں ان کی وہ کلاس فیلوز جو جاب کر رہی ہیں اور ان کے ذہنی لیول میں فرق آ جاتا ہے۔ سماجی قدر و قیمت میں فرق آ جاتا ہے، مجھے معلوم ہے کہ عورت، بچوں کے مسائل کی وجہ سے نوکری نہیں کرتی، کرنا چاہتی...... ماں کی اس غیر معمولی قربانی کا بچے بڑے ہو کر کوئی غیر معمولی صلہ نہیں دیتے۔ اگر کوئی معقول حل نکل سکتا ہو تو ضرور نکالا جائے...... عورت خود کمائے۔

2- یہ واقعہ میری زندگی کا دلچسپ واقعہ تو نہیں ہے تاہم فکر و خیال کا رخ موڑ دینے والا ہے۔ میں نے کچھ عرصہ ہائی اسکول میں اسکیل 16 پر کام کیا ہے (میں ڈبل ایم اے بی ایڈ ہوں) اس دوران ہیڈ مسٹریس نے اسکول کی لائبریری کی صفائی، کتب کی چھانٹی، بوسیدہ تر کتب کو بوریوں میں بند کرنا، بقایا کتب کی شعبہ بندی کا بہت بڑا پروجیکٹ میرے ذمے لگا دیا۔ وہ جانتی تھیں کہ مجھ سے بڑھ کر کام کے ساتھ مخلص، کمیٹڈ، دیانت دار کوئی نہیں ہے (اس کے باوجود میں ان کی منظورِ نظر نہ تھی) لائبریری ایک بڑے ہال میں تھی، اس میں لگ بھگ بیس بڑی، بڑی لکڑی اور شیشے کے دروازوں والی الماریاں تھیں جو کتابوں سے ٹھنسی تھیں، ان کے علاوہ دیواری الماریاں تھیں جو برسوں سے جوں کی توں گرد و غبار سے اٹی ہوئی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ان پر نمبروں کا اندراج ادھورا تھا۔ اگر ایک کتاب اسلامیات کی تھی تو دوسری

1 ۔ روز و شب کے اس گزرتے گورکھ دھندے میں خواتین اپنی شخصیت کو کیسے پُراثر بناسکتی ہیں، آپ کا مشورہ اپنے تجربے کے حوالے سے......

2 ۔ آپ کی زندگی کا کوئی دلچسپ قصہ، واقعہ یا لمحہ جس نے آپ کے فکر و خیال کا رخ موڑ دیا۔

3 ۔ پاکیزہ کے مختلف سلسلے کیوں پسند ہیں؟ اور آپ کون سا ایسا سلسلہ شروع کرنا چاہیں گی جو سب کو پسند بھی آئے؟

4 ۔ پاکیزہ مصنفات سے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں...... کوئی دل کی بات؟

5 ۔ اپنے تعارف کو دو جملوں یا دو اشعار میں بیان کیجیے۔

آپ کے قیمتی خیالات کا انتظار رہے گا۔ آپ چاہیں تو اپنی تصویر بھی ارسال کرسکتی ہیں۔

ادبی تیسری بچوں کی، الغرض یہ بدنظم پھیلا وا تھا جسے ایک منظم آسانی سے تلاش کی جانے والی لائبریری بنانا تھا۔

مجھے مدد کے لیے ptc کی تین لڑکیاں دی گئی تھیں۔ اس کام میں میرے کپڑے گرد و غبار سے اٹ جاتے۔ میرے بڑھے ہوئے ناخن ٹوٹ گئے، ہال کے ایک سرے سے دوسرے تک چلتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ میں نے گھر سے ایک سوفٹی چپل اور ململ کا دوپٹا لا کر رکھا تھا کام کے دوران استعمال کرتی۔ کام کے دوران مجھے پیریڈز بھی اٹینڈ کرنا ہوتے تھے۔ جس کے لیے صابن لا کر رکھا، منہ ہاتھ دھو کر بال جھاڑ کر کلاسوں میں جاتی۔ بعض اوقات اس حالت میں مجھے اسکول کے دوسرے کونے کے آفس میں بیٹھی ہیڈ مسٹریس ذرا سی بات پر بلا بھیجتی۔ کام رکنے کی مجھے کوفت ہوتی۔ آفس میں اجلی چمکتی میڈم کو چائے پیش کرتی، اسٹاف ممبرز ہوتیں تنخواہ انہیں بھی وہی ملتی جو مجھے ملتی۔ یہ سب برداشت کیا۔ اسی خوشی میں کام کرتی رہی کہ میں حیران کن لائبریری دکھا کر داد وصول کروں گی۔ اپنے ذاتی خرچے پر موٹے مارکر، گوند، کاغذ لے آئی، ایک، ایک الماری سیٹ کر کے اس کے باہر شعبہ، از نمبر فلاں تا فلاں، لیبل لگاتی...... خیر...... اس ہال کے تین دروازے تھے۔ چھٹی کے بعد دروازے بند کرنا ملازمین کا کام تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ چھٹی کے بعد کوئی دروازہ کھلا رہ گیا چھوٹی لڑکیوں نے ہال میں گھس کر میزوں پر رکھی کتابیں اِدھر اُدھر گرائیں فرش پر پھیلائیں...... میں ابھی ایک گھنٹا قبل اسکول سے گھر پہنچی تھی۔ اسکول زیادہ دور نہ تھا۔ ملازمہ ہیڈ مسٹریس کا بلاوا لے کر میرے ہاں آگئی۔ میں اپنے بچوں کو دوبارہ نوکر لڑکے کے حوالے کر کے

نکلی۔ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ایسی کیا افتاد آگئی ہے۔ ہیڈ مسٹریس کے آفس میں اس کی ٹیچر بیٹی اور چند دیگر حلقہ احباب ٹیچرز بیٹھی تھیں۔ ہیڈ مسٹریس نے دروازہ بند نہ ہونے پر مجھے سخت سست کہا۔ اس قدر توہین کی کہ میں اپنے تاثرات اور آنسو چھپانے سے قاصر رہی۔ میری مخالف بھی دبے، دبے لفظوں میں میری محنت کی تعریف کے فقرے کہہ کر اشک شوئی کرنے لگیں۔

ملازمہ جو مجھے بلانے آئی تھی میرے ساتھ لائبریری تک آئی کہنے لگی۔ ”میڈم نے زیادتی کی ہے۔“ یہ اس کی جرأت و ہمت کی انتہا تھی ورنہ جہاں بڑے، بڑے زبان نہ کھولتے اس کی کیا مجال تھی...... بہرحال...... اس دن اس وقت میں نے فیصلہ کرلیا...... کسی کام کے لیے جان ماری نہیں کرنی، کوئی فرض اپنی حد سے بڑھ کر نہیں ادا کرنا...... اپنی فطرت کے خلاف کردہ یہ فیصلہ میں زندگی میں پوری طرح اپنا تو نہ سکی مگر کوشش کرتی ہوں...... سسٹم کی بدصورتی اس طرح دیانت دار ورکر کو توڑ دیتی ہے۔

نمبر3 ۔ پاکیزہ میں جلترنگ کا سلسلہ اچھا لگتا ہے، کالج میگزین کی طرز پر کوئی مزے دار مختصر سوال اور ان کے چلبلے جوابات کا سلسلہ لگائیں۔

نمبر4 ۔ پاکیزہ کی مصنفات کو ون بائی ون نہیں جانتی۔ یہ معلوم ہے کہ پاکیزہ میں چھپنے والی تحریریں معیاری ہوتی ہیں، وقت کم میسر ہونے کے سبب ناول نہیں پڑھ پاتی...... میں متعدد ادبی جرائد میں لکھتی ہوں، بہت سی کتابیں برائے ریویو آتی ہیں۔ یہ سلسلہ مصروف رکھتا ہے۔

نمبر5 ۔ دو جملوں میں میرا تعارف یہ ہے۔

مجھے بیمار کی خدمت کر کے خاص راحت ملتی ہے میں، الحمدللہ دیر سے تھکتی ہوں، میں خان ہوں، میں مختلف ہوں......

آپ سب بہنوں کے لیے مسکراہٹ کے کنول اور دعاؤں کے گلاب حاضر ہیں۔

وہ آئے ہماری بزم میں......

نزہت اصغر

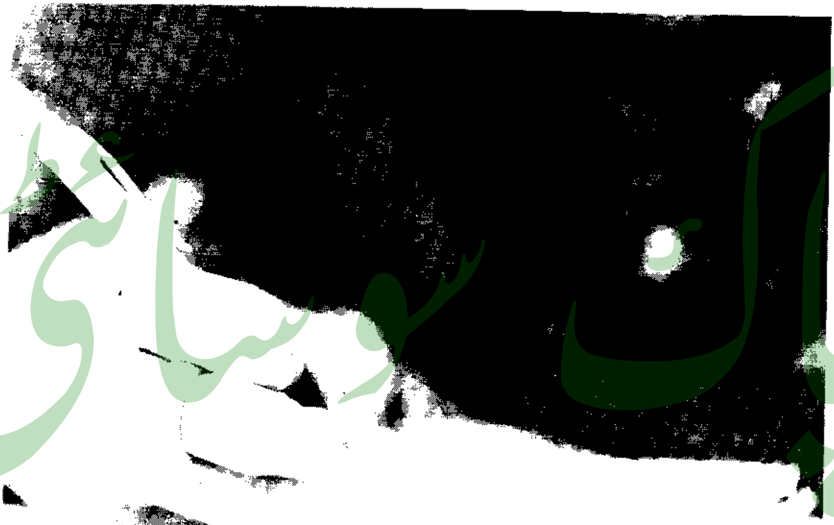

عید کا تحفۂ خاص

پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی نہایت باذوق و باصلاحیت اور مشاق قلم کار

فریدہ اشفاق سے دلنشیں گفتگو

عزیز قارئین! سلام عرضِ خدمت ہے۔ ماہ رمضان کی برکتیں اور سعادتیں یقیناً آپ سب نے سمیٹی ہوں گی اور اب عید کی پُرمسرت گھڑیاں بتانے کا وقت آگیا ہے۔ سو عید مبارک بھی قبول کریں۔ اسی لیے تو یہ بزم ہم نے عیدی کے طور پر سجائی ہے کہ آج اس قلمکار سے ملاقات کی گھڑی آ ہی گئی جو کبھی اپنی تحریروں کے سحر میں پاکیزہ قارئین کو جکڑے رکھتی تھیں...... اپنے زبان و بیان کا حسن بکھیرے رکھتی تھیں۔ جبھی تو آپ سب کے

اصرار پر آج ہم نے انہیں مدعو کر ہی لیا۔

فریدہ اشفاق، ڈائجسٹ کی دنیا کا ایک بڑا نام جنہوں نے اپنے منفرد اندازِ تحریر سے بے انتہا مقبولیت و شہرت پائی۔ خوب صورت خیالات اور حساس جذبوں کا اشعار کے برمحل استعمال سے اظہار ...... بلاشبہ انہی کا خاصہ ہے تو عزیز بہنو آئیں اپنی بہت پیاری فریدہ سے سوالات کا آغاز کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آج یہ بزم اس لحاظ سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے کہ آپ جیسی پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی ...... ہمارے درمیان ہیں۔ آپ کیا کہیں گی اس بارے میں؟

فریدہ اشفاق ❖...... یہ تو خیر آپ کا حسنِ نظر، عزت افزائی بلکہ ذرہ نوازی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم ...... اور یہ فارسی کے محاورے یقیناً ہماری نئی نسل کے سروں پر سے گزر جائیں گے جبکہ مجھے زبان کا حسن ان ہی میں نظر آتا ہے۔ ہمیں بھی ضد ہے بقول فیض

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے

اور اس بارے میں کیا کہوں کہ واقعی ساتھ تو بہت پرانا ہے۔ آپ کی دستک نے کچھ اس طرح چونکا دیا...... پتا نہیں کب کہاں سے سفر آغاز ہوا۔ کون، کب، کہاں بچھڑا...... کون کہاں سے ساتھ شامل ہوا۔ اور ہم مسافرِ راہ وفا پرچے کے ساتھ، ساتھ چلتے یہاں تک آپہنچے۔ (بہت خوب سفر طے کیا)

پاکیزہ ✧...... پہلے تو یہ بتائیں آج کل لکھنے لکھانے سے دوری کیوں؟

فریدہ اشفاق ❖...... بس یہی نہ پوچھیں، لکھنے لکھانے سے دوری تو نہیں کہا جاسکتا ہاں وہ ذہنی یکسوئی میسر نہیں آپا رہی جو ہر تخلیقی ذہن کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہے۔ اب انتشار کے عالم میں جو کچھ قلم سے نکلے گا...... وہ خلفشار تو ہوسکتا ہے۔ شاہکار بہرحال نہیں کہلایا جاسکتا۔

پاکیزہ ✧...... چلیں پاکیزہ مطالعے میں تو رہتا ہوگا ناں...... تو نت نئے موضوعات پڑھ کر کیا تحریک ہوتی ہے؟

فریدہ اشفاق ❖...... ہاں مطالعہ تو ہماری روح کی ایسی غذا ہے کہ کھانا کھائے بغیر تو آرام سے سو جاتے ہیں مگر کچھ پڑھے بغیر نیند ہی نہیں آتی۔ اور نت نئے موضوعات کی کیا بات کی آپ نے...... وہ جو سیف الدین سیف نے کہا ہے ناں کہ......

سیفؔ اندازِ بیاں رنگ بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

یقین کریں نزہت اور میری عزیز از جان افسانہ نگاران برا نہ مانیں تو کہنے کی جسارت کروں کہ نت نئے موضوعات کے چکر بلکہ زعم میں ہم وہ کچھ سپردِ قلم کر رہے ہیں جو نہ تو ہماری معاشرت، ہماری تہذیب، ہماری اقدار سے لگا کھاتا ہے، نہ اخلاقیات اور مذہب میں اس کی گنجائش ہوتی ہے۔ ویسے ایک دلچسپ بات بتاؤں میں نے جب ان پرچوں میں لکھنے کی ابتدا کی تھی ایسی ہی ذہنی کیفیت میں کی تھی۔ اس زمانے میں جو کچھ چھپ رہا تھا اس کے ردِعمل کے طور پر اور میری پہلی ہی تحریر نے لوگوں کو متوجہ کرلیا تھا۔ اسے خودستائی پر معمول نہ کیا جائے کہ آنے والے توصیفی اور تنقیدی خطوط نے مجھے یقین دلایا تھا کہ میرا پیغام کس حد تک دلوں اور ذہنوں پر اثر انداز ہوا ہے۔

پاکیزہ ✧...... بات اگر آپ کے لکھنے کے حوالے سے ابتدائی زمانے کی کریں تو اپنی پہلی تحریر کی تاریخ اور محرک یاد ہے کہ کس طرح کہانی بنی؟

فریدہ اشفاق ❖...... کیا یاد دلایا نزہت آپ نے؟ کتنی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں۔

میں پیشتر بھی بہت مرتبہ بتا چکی ہوں کہ میری سب سے پہلی تحریر ایک علامتی طرز پر لکھا ہوا بہت مختصر بالکل ڈیڑھ دو صفحات پر مشتمل ایک افسانہ تھا۔ حقیقتوں کے کفن کے نام سے جو اردو ڈائجسٹ میں بڑے اہتمام سے شائع ہوا اور خاصے معتبر لوگوں نے نہ صرف اسے سراہا تھا بلکہ مجھے مزید لکھنے کی ترغیب بھی دی تھی۔ خاص طور پر قمر جمیل، سلیم احمد اور ضمیر علی بدایونی۔ ان سب کا تعلق ریڈیو پاکستان سے بھی تھا اور اس کا محرک میرے استاد محترم ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب کا اصرار بنا تھا۔ اور یہ بات ہے ہماری اسٹوڈنٹ لائف کی۔ جب ہم جامعہ کراچی کے بڑے دھوم دھامی طالب علم ہوا کرتے تھے۔ یہ میں نے

ڈاکٹر کشفی کے اصرار پر یونیورسٹی میگزین کے لیے یونیورسٹی ہی کے پس منظر میں تحریر کیا تھا اور جب اگلے ہی ماہ یہ تحریر پوری آب و تاب کے ساتھ پرچے کی زینت بنی نظر آئی تو نہ پوچھیے اس مسرت اور خوشی کا عالم...... پھر بہت کچھ اس سے زیادہ تعریفی، توصیفی انداز میں سراہا گیا۔ لیکن وہ خوشی پھر اس طرح کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ اس حوالے سے یادیں بہت ہیں۔

پاکیزہ ✧...... پاکیزہ سے ناتا جوڑنے کی کیا روداد ہے؟

فریدہ اشفاق ❖...... پاکیزہ سے ناتا جوڑنے کی روداد بڑی مختصر سی ہے۔ انجم انصار کے اصرار پر ہم بھی بزم میں آ بیٹھے تھے۔ کچھ چپ، چپ سے انجانے سے۔

پاکیزہ ✧...... آپ نے اپنے اولین دور میں کن موضوعات کو قلم بند کیا؟

فریدہ اشفاق ❖...... میں نے چونکہ لکھنے کی ابتدا ہی رد عمل کے طور پر کی تھی تو میرے تمام تر موضوعات خواتین کے جذباتی مسائل یا وہ جذباتی حادثے یا خطائیں تھیں جو ہمارے معاشرے، ہماری تہذیب سے متصادم ہونے کی بنا پر نہ صرف فرد کی ذات بلکہ خاندان اور زندگی کے لیے بے شمار مسائل کا سبب بن جاتی ہیں۔

سلیم احمد مرحوم نے کبھی کہا تھا۔

زندگی کا رخ جن سے دفعتاً بدل جائے
حادثے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں محبت میں

تو میری بیشتر کہانیاں ان ہی حادثوں پر مشتمل تھیں۔ کیونکہ اس وقت مجھے یوں لگتا تھا کہ جو کچھ محبت کے نام پر اس زمانے کے پرچوں میں چھپ رہا تھا۔ وہ ترغیبی انداز لیے ہوئے ہے جو جذبات میں کچھ اس طرح ہلچل مچا کر کچے ذہنوں کے لیے سود و زیاں سے بیگانہ کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اور مشاہدے یا مطالعے سے سیکھنے کے بجائے ذاتی تجربے سے سیکھنے کی طرف راغب کر دیتا ہے۔ (ویسے کسی حد تک تو آپ کی بات درست ہے، لڑکیاں آج بھی اسی سحر انگیز ماحول میں کھو جاتی ہیں)

پاکیزہ ✧...... کیا آج کے لکھنے والے پُر اثر تحریریں دے رہے ہیں؟

فریدہ اشفاق ❖...... میرا خیال ہے ایک بڑے ہجوم کے درمیان شناخت بنانا مشکل کام ہے...... اور تحریریں وہی زندہ رہتی ہیں جو پُر اثر ہوں۔ آج کل کے لکھنے والے سب نہیں مگر کچھ ضرور پُر اثر تحریریں دے رہے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کے ہم عصروں کی کوئی نمایاں بات؟

فریدہ اشفاق ❖...... میرے ہم عصروں میں سب سے نمایاں بات یہی تھی کہ کسی نے بھی بے مقصد نہیں لکھا...... رفعت ناہید سجاد، نگہت سیما، غزالہ نگار، رفعت سراج، عنیزہ سید، ہما کوکب بخاری یا اور بھی، ہم سب بیک وقت لکھ رہے تھے اور چھپ رہے تھے۔ مگر سب کی شناخت منفرد تھی۔ سب اپنے، اپنے طرزِ تحریر اور مقصدیت سے پہچانے جا رہے تھے۔ (یہی تو بات ہے سب کا ہنر اور انداز مختلف ہوتا ہے، اس لیے یہاں مقابلہ نہیں بنتا)

پاکیزہ ✧...... ویسے آپ نئے لکھنے والوں کی تحریروں میں کیا خاص چیز دیکھتی ہیں؟

فریدہ اشفاق ❖...... بے پروائی، غیر ذمّے داری جبکہ قلم بہت بڑی ذمّے داری ہوتا ہے کہ یہ تلوار سے زیادہ کاٹ رکھتا ہے اور زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ مذہب، تہذیب اور اخلاقیات سے دوری تو میں نہیں کہوں گی، ہاں تحریروں میں اس طرح اہمیت نہ دینا جس طرح زندگی میں ان کی اہمیت ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔ اور نئے لکھنے والوں نے میرے اپنے خیال میں انڈین فلموں، ڈراموں اور تہذیب (جسے ہم بڑے پیار سے انڈین کلچر کا نام دیتے ہیں) سے بہت زیادہ اثر لے لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زنا، جیسے فعلِ قبیح کو بھی جو قابل تعزیر جرم ہے جس کی معافی نہیں ہے اور جس کے لیے ’حد‘ کی سزا مقرر ہے بعض تحریروں میں بڑے نارمل انداز میں زندگی کا حصہ بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ یہ خدا کے نزدیک کتنا بڑا اور ناقابلِ معافی گناہِ کبیرہ ہے جس کی وجہ سے ذہن سے وہ کراہیت اور برائی کا شدید احساس محو ہو جاتا ہے جو قدم تھامنے کا سبب بنتا ہے۔ اور یہ ترغیب کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔ (بالکل صحیح)

پاکیزہ ✧...... افسانہ نگاری، ناول، ناولٹ نگاری

کے بعد ڈراما نگاری کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ہاں تو آپ نے یہ کیا یا نہیں؟

فریدہ اشفاق ❖...... قطعی ضروری نہیں ہوتا ...... افسانہ، ناول یا ناولٹ ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ جس میں منظر نگاری سے کہیں زیادہ بیانیے پر توجہ دی جاتی ہے۔ جبکہ ڈراما ایک بالکل مختلف صنفِ تحریر ہے جس کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمام بڑے ادیب بہترین ڈراما نگار بھی ہوتے ہیں۔ اور اس صنف کی پہچان آغا حشر کاشمیری نہ ہوتے۔ جس طرح امجد اسلام امجد نے بہترین ڈراما نگاری کی مگر افسانہ......؟ ہاں اگر قلم پر اتنی کمانڈ حاصل ہو جائے تو پھر احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ جیسا بلند مقام بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ......

ہم جہاں پہنچے فروزاں ہوئے لاکھوں چراغ
جس جگہ ٹھہرے فروغِ انجمن بنتے گئے

ویسے تو اصغر ندیم سید اور نور الہدیٰ شاہ نے بھی ابتدا افسانہ نگاری سے کی مگر ڈرامے کی صنف میں بھی مضبوط شناخت بنائی۔ (جی بے شک)

پاکیزہ ✧...... ڈراما، اسکرپٹ نگاری، سوپ لکھنا، ڈرامائی تشکیل یا مکالمے لکھنا...... کیا الگ الگ عمل ہے؟

فریدہ اشفاق ❖...... الگ، الگ عمل تو نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں یہ ڈرامے ہی کے مختلف پہلو یا مختلف جہتیں ہیں۔

پاکیزہ ✧...... پھر ٹیلی فلم کا بھی دور آیا...... آج کل ڈراما شاید اپنی ہی زیادتی کی وجہ سے روبہ زوال ہے آپ کیا کہتی ہیں؟

فریدہ اشفاق ❖...... ٹیلی فلم ایک اچھا تجربہ ہے۔ طویل دورانیے کے ڈرامے ہی کی ایک شکل ...... یہ آپ نے بالکل سچ کہا کہ ڈراما اپنی زیادتی کی وجہ سے روبہ زوال ہے۔ کیونکہ ڈرامے اب موضوعاتی تنوع سے بہت دور چلے گئے ہیں۔ ایک ہی موضوع پر مختلف لکھنے والوں کی ایک جیسی کاوشوں نے ڈرامے کو نہ صرف یکسانیت کا شکار کر دیا ہے بلکہ بعض اوقات تو ایسا لگتا ہے جیسے ایک ہی اسکرپٹ کو تھوڑے سے ردو بدل کے ساتھ ہر چینل پر پیش کیا جا رہا ہے۔ نتیجہ ناظرین کی بیزاری کی صورت میں نکلتا ہے۔ حالانکہ آج بھی اگر مضبوط اسکرپٹ کے ساتھ ہمارے معاشرے اور تہذیب کا عکاس کوئی ڈراما اسکرین کی زینت بنے تو بڑی تیزی سے نہ صرف توجہ مبذول کراتا ہے بلکہ دیکھنے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ لکھنے والا تحریر پر مضبوط گرفت کے ساتھ ہی ڈرامے کی اصل روح یعنی ٹریٹمنٹ (بُنت) پر بھی پوری طرح قادر ہو۔ اور دیکھنے والے پوری دلچسپی، توجہ اور تجسس کے ساتھ اس کے آگے بڑھنے کے منتظر رہیں۔

پاکیزہ ✧...... یہ سوال اس لیے کیا کہ پچیس پلیز میں شاید دو ہی مقبولیت پاتے ہیں، کیا ایسا نہیں ہے؟

فریدہ اشفاق ❖...... میں نے پچھلے سوال کا جواب اسی لیے اتنی تفصیل سے دیا کہ اگر پچیس ڈراموں میں سے دو کا اسکرپٹ ذرا سا بھی مختلف نظر آئے تو وہ یکسانیت کی اکتاہٹ میں تھوڑی سی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسے کامیابی تو نہیں کہا جا سکتا۔ اب آپ کہیں گی میں تو دو کا بھی مارجن دینے کو تیار نہیں۔ (ہاں یہ تو ہے)

پاکیزہ ✧...... ڈائجسٹوں اور رسالوں میں دھیمے، دھیمے انداز میں لکھنے والے رائٹرز ڈرامے پر ڈرامے دے رہے ہیں یہ ان کی صلاحیتوں کا عروج ہے...... انتہا ہے یا تنوع......؟

فریدہ اشفاق ❖...... یہ عروج ہے نہ تنوع ...... یہ بس ایک قسم کی دوڑ ہے جس میں مقابلے کا رجحان بھی صرف تعداد کی حد تک رہ گیا ہے کہ کس نے کتنے ڈرامے دیے۔ اور نظر صرف اسی ہدف تک رہتی ہے...... اس کوشش میں اگر صلاحیتیں پامال بھی ہو رہی ہوں تو سودا برا نہیں۔ یہ آپ نے مجھے کہاں پھنسا دیا نزہت، میری تلخ نوائی معاف بھی ہو سکے گی یا نہیں......؟ (ویسے تو ہر انسان کی اپنی الگ رائے اور اپنے خیالات ہوتے ہیں فریدہ، مگر آپ کے جواب عقل مندوں کے لیے رہنما بھی ہو سکتے ہیں)

پاکیزہ ✧...... اچھا یہ بتائیں آپ نے اپنی کاوشیں مجموعے کی صورت مرتب کیں؟

فریدہ اشفاق ❖...... ہاں مرتب...... اپنی حد تک تو

تمام تحریریں یکجا کر چکی ہوں...... لیکن مرتب کرنے والا کون ہوگا نہیں جانتی...... میری تحریروں کو سراہنے والی بہت سی محترم ہستیوں نے میری خواہش پر بصد خلوص پیشکش بھی کی ہے مگر......

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

دیکھیے یہ کام بھی کب ہو پائے گا۔ ویسے انٹرنیٹ پر میری تحریروں سے روشناس ہونے والے اکثر پوچھ بیٹھتے ہیں۔ آپ کی تحریریں کہاں سے دستیاب ہوں گی اور میں ہنس کر جواب دیتی ہوں فی الحال تو صرف میرے گھر میں دستیاب ہیں، دعا کریں کہ جلد سے جلد اشاعت کے مرحلے سے گزر کر بک اسٹالز پر بھی دستیاب ہو جائیں۔ (انشاءاللہ)

پاکیزہ ✧...... اساتذہ ادیبوں، مصنفین کو تو آپ نے ضرور پڑھا ہوگا کن کی تحریریں پسند آئیں، دل کو لگیں اور کن کا رنگ آپ کی تحریر پر چڑھا؟

فریدہ اشفاق ❖...... پڑھا تو ہم نے بے تحاشا ہے۔ پریم چند، میر امن سے لے کر موجودہ دور کے مصنفین تک۔ جب اتنا زیادہ پڑھا جائے تو پھر پسندیدگی کا وہ انداز نہیں رہتا۔ مختلف ادوار میں مختلف مصنفین کی منتخب تحریریں پسندیدگی کی سند حاصل کرتی رہیں۔ اک زمانے میں شفیق الرحمٰن اور ڈاکٹر ذکا الرب پسندیدہ ترین مصنف تھے اور پھر عبداللہ حسین کی اداس نسلیں، احمد شجاع پاشا کی وہاں بھی اِک گاؤں تھا۔ قرۃ العین حیدر کی مرے بھی صنم خانے، اور آخرِ شب کے ہم سفر، الطاف فاطمہ کی دستک نہ دو، اور چلتا مسافر، صالحہ عابد حسین کی یادوں کے چراغ، انتظار حسین کی بستی، یہ سب ایسی کتابیں ہیں جو تقسیم برصغیر کے پس منظر میں لکھی گئیں...... اور جنہوں نے ہمارے والدین کے اس اپنے ماضی اور اپنی سرزمین سے بچھڑنے کے دکھ کو ہمارے اندر کہیں پاتال تک نہ صرف اتارا بلکہ ہمیشہ زندہ بھی رکھا۔

وہ اک شاخِ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

اور یہ آج بھی میری پسندیدہ تحریروں میں شامل ہیں...... بار، بار پڑھ کر بھی ذہن سیر نہیں ہوتا۔ ہر مرتبہ کوئی نیا پہلو کوئی نیا زاویہ نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ ویسے انتظار حسین اور الطاف فاطمہ کی ہر تحریر میری پسندیدہ ترین تحریر ہے۔ اور رنگ چڑھنے کا تو سوال ہی کیا ہے...... وہی تو کجا من کجا، والی صورتِ حال ہے، ہاں میری ہمیشہ خواہش یا تمنا رہی ہے کہ کبھی الطاف فاطمہ کے انداز میں لکھ سکوں چھوٹے، چھوٹے فقروں میں بڑی، بڑی باتیں جو سیدھی دل میں اتر جائیں۔

پاکیزہ ✧...... آج کن رائٹرز کی تحریروں میں دم ہے جو بیس سال بعد تک بھی یاد رکھی جائیں گی؟

فریدہ اشفاق ❖...... یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کتنا دم ہے اور کتنے عرصے تک یاد رکھی جائیں گی۔ ہاں بعض تحریریں ایسی ضرور ہیں جنہوں نے گہرے نقوش مرتب کیے ہیں اور وہ یقیناً ذہنوں میں محفوظ رہنے والی کہی جاسکتی ہیں۔

پاکیزہ ✧...... اپنی تحریروں کی چیدہ، چیدہ باتیں بتائیں کہ کیا عنوانات، موضوعات ملحوظ خاطر رکھے؟

فریدہ اشفاق ❖...... اپنی ہی تحریر کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ترین کام ہوتا ہے میں نے کہا ناں کہ میں نے لکھنا ردِ عمل کے طور پر شروع کیا تھا اور اس سلسلے میں ایک بڑی دلچسپ صورتِ حال بھی ہوئی تھی۔ میں ایک پرچے کے دفتر میں مدیرہ صاحبہ سے ملاقات کی غرض سے گئی تھی۔ کمرے میں کافی لوگ موجود تھے۔ چائے کے ساتھ اچھی ہلکی پھلکی دلچسپ گفتگو اور تبصروں کا سلسلہ جاری تھا کہ اسی ادارے کے ایک اور پرچے کے مدیر صاحب بھی تشریف لے آئے دورانِ گفتگو انہوں نے اپنے پرچے کے لیے بھی کچھ لکھنے کی فرمائش کی اس زمانے میں ان کے پرچے میں جو کچھ چھپ رہا تھا اس سے مجھے شدید اختلاف تھا۔ اور ان کا دعویٰ تھا کہ وہ نوجوان نسل کا نمائندہ پرچہ نکال رہے ہیں...... میرا کہنا تھا انتہائی امیچور اور جذباتی قسم کی تحریریں سامنے آرہی ہیں۔ ان کی خواہش پر میں نے ہنس کر کہہ دیا کہ آپ چھاپ کیا رہے ہیں۔ اس میں لکھنے سے تو یہ بہتر ہے کہ میں اور مدیرہ (جن سے میری آج بھی بہت اچھی اور قریبی دوستی ہے) مل کر ایک علیحدہ دفتر کھول لیتے ہیں جس میں ٹمن ا........ لڑکیوں کو

جذبات کے ہاتھوں کھلونا بننے اور گھروں سے بھاگنے کے عملی طریقے سکھائے جائیں، میرے اس بے دھڑک اظہارِ خیال پر حاضرین کی جانب سے زبردست قہقہوں پر ان کے چہرے کے بدلتے رنگوں نے بتادیا تھا کہ اس وقت ان کے دل پر کیا گزر گئی۔ اور مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس بھی ہوا تھا لیکن...... تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ہر چند کہ میں نے فوراً ہی معافی مانگ لی تھی۔ مگر ان کی خفت اور خجالت...... حالانکہ بعد میں ہمارے بڑے اچھے اور خوشگوار روابط ہوگئے تھے۔ مگر وہ ایک جملہ جس کے لیے مجھے آج بھی احساس ہوتا ہے کہ اس طرح بے دھڑک نہیں کہنا چاہیے تھا۔

پاکیزہ ✧...... تحریروں سے ہٹ کر کچھ اپنی شخصیت کے بارے میں بھی بتائیں کہ کس نیچر کی ہیں؟

فریدہ اشفاق ❖...... اپنی شخصیت کے بارے میں خود کچھ کہنا شاید لوگوں کے لیے آسان ہو لیکن میرے لیے بہت مشکل کام ہے۔ یہ تو دوسرے ہی بتاسکتے ہیں کہ انہوں نے ہماری شخصیت کو کیسا پایا۔ ورنہ بزعم خود تو ہر شخص ہمہ صفت موصوف ہی ہوتا ہے۔ اپنے اردگرد "میاں مٹھو ہوں، پیارا مٹھو ہوں"، ٹائپ لوگ آپ نے بھی دیکھے ہوں گے خاص طور پر سیاست کے میدان میں ہاں یہ ضرور ہے کہ مجھے خود سے متعلق کوئی غلط فہمی یا خوش فہمی کبھی نہیں رہی ویسے علامہ اقبال کا یہ شعر آپ کی نظر سے بھی گزرا تو ضرور ہوگا۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

خود آگہی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے لیکن ہمیشہ خرابیِ آگہی ہی ثابت ہوتی ہے وہ جو بہادر شاہ ظفر نے کہا ہے ناں۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

پاکیزہ ✧...... کیسے لوگوں میں جلد گھل مل جاتی ہیں؟

فریدہ اشفاق ❖...... مخلص اور صاف دل جو منافقت سے پاک ہوں، اندر باہر سے ایک جیسے، ظاہر و باطن میں تضاد نہ رکھنے والے۔

پاکیزہ ✧...... دوستی کے رشتے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آج بھی اسکول کالج کی سہیلیاں رابطے میں ہیں؟

فریدہ اشفاق ❖......

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا
نرم لفظوں سے بھی لگ جاتی ہیں چوٹیں اکثر
دوستی اِک بڑا نازک سا ہنر ہوتی ہے

جی جناب آج بھی اسکول، کالج کی سہیلیاں رابطے میں ہیں، ہر چند کہ مصروفیتوں نے وہ پہلا سا التفات نہیں رہنے دیا۔

پاکیزہ ✧...... ایک ادیب، مصنف، نثر نگار کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے...... دنیاوی تعلیم کس طرح سے معاون ثابت ہوتی ہے؟

فریدہ اشفاق ❖...... اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ سہی مگر تعلیم یافتہ ہونا بہت ضروری ہے۔ قدرتی صلاحیتیں بھی وسیع مطالعے ہی سے جلا پاتی ہیں...... جتنا زیادہ مطالعہ بڑھے گا اتنی ہی تحریر میں پختگی اور زبان و بیان کا سلیقہ پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ دنیاوی تعلیم دراصل خود شناسی کی پہلی سیڑھی ہوتی ہے۔

پاکیزہ ✧...... لڑکیوں کی تعلیم کی ہمارے معاشرے میں کیا اہمیت ہے؟

فریدہ اشفاق ❖...... کسی دانا کا قول ہے، اِک مرد کی تعلیم ایک فرد کی تعلیم ہے لیکن اِک عورت کی تعلیم پوری قوم کی تعلیم ہے...... کیونکہ قومیں ماؤں کی گود میں ہی پرورش پاتی ہیں۔ تب ہی تو نپولین نے کہا تھا...... تم مجھے اچھی مائیں دو میں تمہیں اِک اچھی قوم دوں گا اور یہ ہمارے قائداعظم کا پسندیدہ قول تھا جسے انہوں نے بارہا دُہرایا۔ میرا خیال ہے اب ہمارے معاشرے میں بھی لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے اور یہ خاصی خوش آئند بات ہے۔

پاکیزہ ✧...... مگر یہ بھی تو دیکھا گیا ہے کہ اعلیٰ تعلیم

یافتہ کبھی، کبھی جاہلوں کے طعنے بھی سن رہی ہوتی ہیں……

کیا ہمارا معاشرہ اب بھی سو سال پرانی سوچ کا حامل ہے؟

فریدہ اشفاق ❖……ہاں یہ مشکل ضرور پیدا ہوگئی ہے کیونکہ ابھی ہمارے معاشرے میں تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل نہیں ہو پائی ہے۔ سو شادیوں کے سلسلے میں اچھی خاصی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے رشتے طے کرتے وقت لڑکے کی تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ اور بہت سی لڑکیاں مس میچ کے سبب بہت سے مسائل بھی بھگتتی ہیں اور تکالیف بھی اٹھاتی ہیں۔ مگر اولاد کی پرورش بہر حال بہتر طریقے پر کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ معاشرے کی سوچ بدلنے کے لیے گھروں کا ماحول بدلنا بہت ضروری ہے۔ اور میں ناامید نہیں ہوں کہ یہ عمل سست ضرور ہے مگر ان ہی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے ہاتھوں بدلے گا ضرور……انشاءاللہ!

پاکیزہ ✧……آپ رشتے داریاں کس حد تک نبھاتی ہیں……؟

فریدہ اشفاق ❖……ہر ممکن حد تک کہ رشتے ہمارا اپنا انتخاب نہیں ہوتے قدرت کی عطا ہوتے ہیں۔ اور ناقدری اللہ تعالیٰ کو کبھی پسند نہیں آسکتی۔ حالانکہ بعض دفعہ مصروفیات کے سبب بے انتہا جبر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے مگر پوری کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح نباہ ہی لیں۔

پاکیزہ ✧……بچوں کی یا چھوٹے بہن بھائیوں کی تربیت میں کن باتوں کا خیال رکھا؟

فریدہ اشفاق ❖……اچھی ستھری عادات و اطوار کے ساتھ معاشرے کے بہترین انسان بنیں، اچھائی‘ برائی کا بھرپور اندازہ اور ادراک رکھتے ہوئے۔

پاکیزہ ✧……ورکنگ ویمن (معاشی طور پر خاندان کی کفالت میں مددگار خواتین) ان کا ہمارے معاشرے میں کیا مقام ہے؟

فریدہ اشفاق ❖……ورکنگ ویمن نے دراصل دُہری ذمّے داریاں سنبھال لی ہیں۔ ہمارا معاشرہ خواتین کے معاملے میں ایک مخصوص مائنڈ سیٹ رکھتا ہے۔ بہت سارے علاقوں میں تو خواتین کا گھر سے نکلنا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے اور اس اندازِ پرورش کے مردوں کا واسطہ جب معاشی طور پر خاندان کی کفالت میں مددگار خواتین سے پڑتا ہے تو وہ ان کو وہ عزت اور مقام نہیں دے پاتے نتیجے میں وہ ورکنگ لیڈیز مسلسل ذہنی عذاب سے گزرتی رہتی ہیں اور گھروں کے کام کاج اور بچوں کی پرورش چونکہ ہمارے معاشرے میں بہر صورت خواتین کی ذمّے داری سمجھی جاتی ہے۔ تو اچھے خاصے پڑھے لکھے گھرانوں میں بھی ان خواتین کو مردوں کی طرف سے وہ ذہنی، اخلاقی سپورٹ بھی نہیں مل پاتی جو اُن خواتین کا حق ہے۔ عملی معاونت تو دور کی بات ہے۔

پاکیزہ ✧……فریدہ جی یہ بتائیں مشرقی معاشرے میں رہنے والے مغربی معاشرے کی اقدار، ماحول، لباس زبان کیوں اختیار کرنا چاہتے ہیں؟

فریدہ اشفاق ❖……میرے اپنے ذاتی خیال میں یہ ایک قسم کا احساسِ کمتری ہے جو انہیں اس طرف راغب کرتا ہے۔ اپنے آپ اور اپنے ماحول سے غیر مطمئن اور نالاں لوگ ہی ایسا کرنا چاہتے ہیں جو ذہنی طور پر اپنے آپ سے اور اپنے ماحول سے مطمئن ہوتے ہیں۔ وہ نارمل رویے رکھتے ہیں۔ میرے بھائی کی پوری فیملی امریکا میں رہتے ہوئے بھی اپنا ہی لباس اور اپنی ہی زبان استعمال کرتے ہیں۔ ہماری بھتیجی تقریباً ہر سال عید بقرعید پر خاص طور سے فرمائش کر کے پاکستانی لباس منگواتی ہے اور وہ بھی اس اصرار کے ساتھ کہ پھوپی ہی سی کر بھیجیں۔ نتیجے میں زونیرہ (بہن) بے حد ایکسپرٹ ہوگئی ہے۔ غرارے، شرارے، فراکیں، میکسیز، پاجامے وغیرہ سینے میں اور اب ہمارے بھانجے ڈاکٹر محمد صارم جو اردو یونیورسٹی میں رجسٹرار کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کی بچیوں کا بھی یہی اصرار ہوتا ہے۔ اور زونیرہ بیگم فرمائشیں پوری کرنے کے چکر میں گھن چکر بنی رہتی ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وقت کی کمی اور عدیم الفرصتی کے سبب اپنے کپڑے درزی سے سلوانے پڑتے ہیں۔ زونیرہ کو تو اِک زمانے میں ڈیزائننگ اور سلائی کا بے انتہا کریز رہ چکا ہے۔ نت نئے ڈیزائن کے بے حد اسٹائلش کپڑے

خود اپنے ہاتھ سے سی کر پہنا کرتی تھی۔ جو خاندان بھر کی توجہ اور تعریف کا مرکز ٹھہرتے تھے۔ اور باہر کے لوگ تو جس طرح سراہتے تھے اس کا تو کہنا ہی کیا۔ اب یہ شوق ان بچیوں کے کپڑوں کی شکل میں پورا ہوتا رہتا ہے۔ ہر سالگرہ اور ہر تہوار پر...... میری یہ فائن آرٹسٹ بہن ہر معاملے میں بڑا آرٹسٹک ذہن رکھتی ہے۔ (ماشاءاللہ)

پاکیزہ ✧...... ساس بہو، شوہر بیوی، نند بھاوج کے معاملات میں خالص مشرقی ہندوستانی سوچ اور دیگر اپنی پسند کے معاملوں میں مغربی رنگ...... یہ کیا تضاد ہے؟

فریدہ اشفاق ❖...... یہ تضاد نہیں ہے...... بلکہ خود ساختہ اذیت ہے، اپنی روایات اور اقدار سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے، رشتے، ناتوں اور تعلقات میں مشرقی ہندوستانی سوچ معاشرے کا جبر ہے۔ صدیوں کا رچا بسا رویّہ...... جو مجبوری ہے اور دیگر اپنی پسند کے معاملوں میں مغربی رنگ وہ ذہنی بغاوت ہے جو تسکین کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یہ دُہرے معیار کس خرابی کی طرف لے جاتے ہیں اس کا اندازہ خرابی سے گزرنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ خاص طور پر آج کل جب اکثر ماؤں سے بچیوں کے سلسلے میں یہ سننے کو ملے کہ کیا کریں یہ کسی کی سنتی ہی نہیں ہیں۔ اپنی چلاتی ہیں تو پھر......

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

پاکیزہ ✧...... اچھا خیر یہ باتیں تو لمبی بحثوں سے بھی شاید حل نہ ہوں، آپ ہمارے قارئین کو اپنی ذاتی پسند ناپسند کے بارے میں بھی آگاہ کریں مثلاً پسندیدہ لباس، خوشبو، ذائقہ، کھانا، مقام، رشتہ، جملہ، کتاب، شخصیت وقت، موسم، لمحہ؟

فریدہ اشفاق ❖...... ہر مہذب اور شائستہ لباس جو شخصیت سے ہم آہنگ بھی ہو...... تمام بھینی، بھینی اور خوشگواری کا احساس دلاتی خوشبوئیں کوئی خاص خوشبو میرا انتخاب کبھی نہیں رہی۔ ذائقہ چیزوں کے اعتبار سے پسند آتا ہے۔ نہاری پھیکی سیٹھی ہو تو بالکل اچھی نہیں لگے گی اور یخنی پلاؤ میں تیز مسالے سخت ناگوار گزرتے ہیں۔ کھانا میں ہر قسم کا کھا لیتی ہوں بس کھانے لائق ہونا چاہیے۔ مقام، مری کی تمام گلیات خاص طور پر ڈونگا گلی، چھانگلہ گلی اور پتریاٹہ۔ رشتہ، ہر وہ رشتہ جو منافقتوں سے پاک اور محبتوں اور خلوص سے گندھا ہوا ہو۔ جملہ، کوئی ایک نہیں بے شمار ہیں۔ جو موقع محل کی مناسبت سے پسندیدہ قرار پاتے ہیں۔ کتاب، الطاف فاطمہ کی چلتا مسافر، اور مختار مسعود کی آوازِ دوست...... شخصیت، میرے استاد محترم قاضی عبدالقادر مرحوم جنہوں نے ابھی کچھ عرصہ قبل ہی اس جہانِ فانی سے کوچ کیا ہے۔ (اللہ مغفرت کرے) جو میرے لیے صرف استاد نہیں۔ بہترین دوست، بڑے بھائی اور باپ کی طرح کی محبتیں اور شفقتیں رکھتے تھے۔ اور میری سب سے بڑی ذہنی سپورٹ بھی تھے۔ وقت، شام کا...... جب سرمئی اجالا ہے، چمپئی اندھیرا ہے، والی کیفیت ہو یعنی جھٹپٹے کا وقت...... موسم، گلابی جاڑوں کا جسے کھلا موسم بھی کہتے ہیں۔ لمحہ، وہ ایک لمحہ جب احساس ہوا کہ زندگی کتنی بے ثبات ہے۔

سانس ہی تو ہے، آیا، آیا نہیں آیا نہیں آیا۔

پاکیزہ ✧...... شعر و شاعری کی آپ کی زندگی مین کس قدر اہمیت ہے؟ یہ تو ہمیں پتا چل ہی گیا ہے۔ اب یہ بھی بتائیں کہ خود بھی کبھی شاعری کی؟

فریدہ اشفاق ❖...... اشعار میں اظہارِ خیال مجھے اسی لیے زیادہ پسند ہے کہ جو بات ایک پورے پیراگراف میں بھی نہیں کہی جا سکتی وہ صرف دو مصرعوں میں واضح ہو جاتی ہے۔ میری تحریر کا یہی پہلو اشعار کا برمحل، برجستہ اور خوب صورت استعمال سب سے زیادہ سراہا گیا۔ خاص طور پر اس میدان کے معتبر لوگوں کی طرف سے...... ایک زمانے میں تو اشعار ہر وقت نوکِ زباں رہا کرتے تھے۔ ہماری تو لڑائیاں، شکوے، شکایتیں سب ان ہی اشعار کے ذریعے ہوا کرتی تھیں۔ اب وہ پہلی سی بات تو نہیں لیکن بے شمار اشعار اب بھی ذہن میں محفوظ ہیں۔ جی، میں نے زیادہ تر طبع آزمائی نظموں پر کی ہے دو درجن سے زائد شائع بھی ہوئیں...... کچھ تو غزلیں بھی ہیں...... لیکن چھپوانے کی جرأت اس لیے نہیں ہوئی کہ اوزان اور عروض کی بندشوں سے ڈر لگتا ہے۔ اور اصلاح کسی سے لی نہیں

بلکہ ادبی زبان میں کہا جائے تو زانوئے تلمذ کسی کے سامنے طے نہیں کیا۔

پاکیزہ ✧......سماجی سرگرمیاں کسی بھی حوالے سے ہوں حتیٰ کہ چند دوستوں کا مل بیٹھنا ہی ہو، کس حد تک نبھاتی ہیں؟

فریدہ اشفاق ❖......سماجی سرگرمیاں اب تو خاصی محدود ہوگئی ہیں، ورنہ مشاعرے، آرٹس کونسل کی تمام تقریبات، ریڈیو پاکستان اور ٹی وی پروگراموں میں شرکت ہمارے روز مرہ کے معمولات میں شامل تھیں۔ لیکن اب بھی وقت اور مصروفیت مہلت دے تو نباہنے کی کوشش ضرور کرتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......اپنے ماضی میں اکثر سفر کرتی ہیں؟ حال سے مطابقت ہے یا مستقبل کے خواب دیکھتے بسر ہو رہی ہے؟

فریدہ اشفاق ❖......جی بالکل ماضی کی حسین اور خوشگوار یادیں حال کے مسائل میں ٹانک کا کام کرتی ہیں، ہم سب بہنیں اور کزنز اکثر مل بیٹھ کر ماضی میں سفر کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ڈھلنے والا ذہن اسی لیے دیا ہے کہ وہ ہر حال سے مطابقت پیدا کرسکے پھر والدین کی تربیت بھی یہی تھی کہ جو گزر گیا اس کی اچھی باتیں یاد کرو کہ اللہ نے تمہیں شکر گزاری کے کتنے موقع دیے۔ جو گزر رہا ہے اس پر شکر کرو کہ تم ہزاروں سے نہیں لاکھوں سے بہتر زندگی میں ہو...... اور مستقبل کے خواب دیکھنے کی عمر نہیں رہی...... لیکن جب تک زندگی ہے تب تک امید ہے اور امید ہمیشہ بہتر ہی کے لیے کی جاتی ہے۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ✧......کوئی یادگار، خوشگوار ناخوشگوار، لمحہ، واقعہ کہ جب آپ کی سوچ کا دھارا یکسر بدلا...... زندگی میں یک دم تبدیلی آ گئی ہو؟

فریدہ اشفاق ❖......ہماری اماں بی کا انتقال...... جب وہ اسپتال میں ایڈمٹ تھیں اور ڈاکٹرز نے انتہائی کوششوں کے بعد ہمیں بلا کر بھائی سے کہا تھا کہ اب دوا کا وقت گزر گیا۔ دعا کیجیے خدا انہیں بہتر کردے۔ وہ ایک لمحہ...... جس نے زندگی اور سوچ کا دھارا یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ اور پھر اب ہماری سب سے چھوٹی لاڈلی چہیتی بہن مہر افشاں کی بالکل اچانک چلتے پھرتے، بولتے چالتے، کام کاج نمٹاتے اچانک غیر متوقع موت جس نے اپنے غیر سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ (اوہ! اللہ آپ لوگوں کو صبر دے، آمین)

پاکیزہ ✧......نئی لکھنے والیوں سے کیا کہنا چاہیں گی؟

فریدہ اشفاق ❖......یہی کہ لکھتے وقت ماحول، تہذیب، مذہب اور کسی بھی موضوع کے تمام اچھے برے پہلوؤں پر خوب اچھی طرح غور کرکے پھر قلم اٹھایا کریں کہ آپ کی تحریریں ذہنی تربیت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، اسی لیے تو علامہ اقبال نے کہا ہے۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

اور جب دیدہ دل وا ہو جائے تو جو کچھ سامنے نظر آ رہا ہوتا ہے اس کے پیچھے بھی بہت کچھ نظر آنے لگتا ہے۔ ہاں اس وقت آپ نے مجھے ایک اچھا موقع فراہم کردیا ہے۔ بصد ادب واحترام میں اپنی افسانہ نگار بہنوں سے اک التماس کرنا چاہوں گی کہ آج کل لفظ زہر خند کا استعمال بے تحاشا ہو رہا ہے۔ جا اور بے جا اس کے مطلب یا معانی پر غور کیے بغیر، محلِ استعمال پر توجہ دیے بغیر...... بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ اس ترکیب لفظی کا بری طرح استحصال کیا جا رہا ہے۔ اچھی خاصی سینئر لکھنے والیوں کے قلم سے بھی پامالی ہو رہی ہے۔ زہر خند، کا مطلب ہے زہریلی ہنسی، یا زہر میں بجھی مسکراہٹ اور فیروز اللغات کی رو سے وہ ہنسی جو غصے، ناگواری یا شرمندگی سے ہو۔ اور جب یہ ترکیب لفظی اس طرح استعمال ہو کہ زہر خند لہجے میں یا زہر خند مسکراہٹ تو دل پر کیا گزرتی ہوگی...... خند، تبسم، مسکراہٹ یا ہنسی کو کہتے ہیں...... اور اس لفظ سے مرکب کئی تراکیب اردو زبان میں شامل ہیں جو ہمیشہ سے استعمال ہوتی آئی ہیں۔ مثلاً خندہ رو یعنی ہنستا ہوا چہرہ، اسی طرح خندہ جبیں، خندہ پیشانی، خندہ زنِ خندہ دہن، چاہ زن خندہ، یا چاہ زنخنداں یعنی ہنستے ہوئے کسی عورت کے گال پر

پڑنے والا گڑھا (جسے ڈمپل بھی کہتے ہیں) جب اس ترکیب کو اس انداز میں استعمال کیا جائے تو یہ ایسی بات ہوگی جیسے کہا جائے لبِ سڑک کے کنارے یا شب برات کی رات...... لبِ سڑک اور سڑک کے کنارے کے ایک ہی معنی ہیں اور انہیں ایک ساتھ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ شب اور رات بھی ہم معنی الفاظ ہیں۔ میرا مقصد صرف توجہ دلانا ہے۔ اس کو اعتراض کے معنوں میں نہ لیا جائے۔ یقیناً مجھ سے بھی زبان و بیان کی غلطیاں ہوتی ہوں گی۔ اور انسان تو ساری زندگی طالب علم ہی رہتا ہے۔ آپ سوچ رہی ہوں گی بھلا لسانیات سے متعلق اس لیکچر کی کیا ضرورت تھی اس ہلکے پھلکے انٹرویو میں......! فریدہ اشفاق اپنے آپ کو بہت لائق فائق اور نستعلیق سمجھتی ہیں، قابلیت جھاڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں......سرِ تسلیم خم ہے، آپ بالکل صحیح سوچ رہی ہیں۔

پر کیا کریں کہ ہوگئے لاچار جی سے ہم

اور ہمارے اس انٹرویو کی غلطی نزہت اصغر کی ہے سو برداشت کریں بلکہ بھگتیں آپ سب لوگ بھی...... (اُف فریدہ ڈیئر آپ نے تو ہماری ہی کلاس لے لی بہر حال اتنی معلومات اور تصحیح کا شکریہ)

پاکیزہ ✧...... ماہنامہ پاکیزہ پر تنقیدی، تعمیری کچھ بھی مختصر سا تبصرہ......کوئی مشورہ، تجویز......؟

فریدہ اشفاق ❖......نزہت جی بات ساری یہ ہے کہ کوئی بھی پرچہ نکالنا دراصل جان جوکھوں کا کام ہے اور جو لوگ یہ کام کر رہے ہوتے ہیں وہی جانتے ہیں کہ کیا گزرتی ہے قطرے پر گہر ہونے تک۔ کتنے خون جگر کے بعد کوئی صورت سامنے آتی ہے۔ اب ایسے میں تنقید، تبصرہ، مشورہ، تجویز یہ سب تو...... سب سے آسان کام ہے...... بس صرف زبان ہی تو ہلانی پڑتی ہے۔ ہاں غلطیوں کی نشاندہی کرنا ضرور ثواب کا کام ہے جو ابھی میں کچھ دیر پہلے کر بھی چکی ہوں۔ (واہ جی بہت خوب)

پاکیزہ ✧......اپنے روز و شب کی روٹین مختصراً بیان کریں؟

فریدہ اشفاق ❖......اپنے روز شب کی روٹین کیا بیان کروں......؟

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے

بہت کچھ ذہن میں اودھم کھڑا کیے رکھتا ہے مگر......؟ حال کچھ یوں ہے کہ

گزر رہی ہے اسی بھروسے ابھی تو عمرِ رواں ہماری
کبھی تو بدلیں گے دن ہمارے کبھی تو راس آئے گا زمانہ

اور بات ساری کچھ یوں ہے کہ اپنی روٹین کو اشتہار بنانا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا کہ میری تمام تر مصروفیات کا تعلق میرے گھر، گھر والوں اور متعلقین سے ہے۔ اور ہم اب بھی ہزاروں نہیں تو سیکڑوں لوگوں سے بہتر لائف روٹین میں ہیں۔ سو ہم خدا کے شکر گزار بندوں میں ہی رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شکوہ گزار نہیں بننا چاہتے۔ اور یہی میری روٹین ہے، کیا سمجھیں؟ میں نے اتفاق سے فلسفے میں ایم اے کیا ہے، سو آپ لوگ بھی مجھے معاف کر دیجیے گا یہ سوچ کر کہ اصل میں انہوں نے منطق پڑھی ہے، ان کا اپنا کوئی قصور نہیں...... ویسے بھی بچپن میں مجھے بہت سارے معاملات میں بقراط کی روح کا خطاب ملا کرتا تھا۔ (بہت خوب، فلسفہ تو ہمارا بھی مضمون رہا ہے فریدہ جی!)

پاکیزہ ✧...... کن موضوعات پر اب مزید لکھنا چاہیں گی؟

فریدہ اشفاق ❖......جن موضوعات پر اب تک لکھتی آئی ہوں۔ ”حقیقتوں کے کفن“ میں افسانہ نگاری سے متعلق جو کمٹمنٹ میں نے کی تھی میں اس پر ہمیشہ قائم رہنا چاہوں گی۔ (اب تو وہ افسانہ پھر سے پڑھنا پڑے گا)

پاکیزہ ✧......کوئی یادگار خوب صورت قابلِ عمل بات آج کی بچیوں کے لیے؟

فریدہ اشفاق ❖......علامہ اقبال نے کہا ہے۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

زندگی کو زندگی سمجھ کر گزاریں اپنے دل اور دماغ کو کسی بھی قسم کی غلامی میں مت آنے دیں۔ وہ موبائل فون کی غلامی ہو، انٹرنیٹ کی یا کھیل ٹی وی کی۔ ہمیشہ زندگی کے لیے ایک مقصد کا تعین کر کے آگے کی سمت سفر کریں۔ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی ذی روح کو بلاوجہ یا بلا مقصد دنیا میں نہیں بھیجا...... صرف خود کو سمجھنے کی ضرورت اور دیر ہوتی ہے، کامیابیاں ہمیشہ منتظر رہتی ہیں، زندگی میں کامیاب انسان بننے کی کوشش کریں۔

پاکیزہ ✧......اور آخر میں ہماری اس بزم کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور اظہارِ خیال کریں۔ سوالات سے گھبرائی تو نہیں؟

فریدہ اشفاق ❖......بہت اچھا لگا اس بزم میں شامل ہو کر سوالات بہت دلچسپ تھے۔ اِک عرصے بعد اس طرح کھل کر اظہارِ خیال کا موقع ملا۔ پھر سوالوں سے گھبرانا کیسا...... ہاں بار، بار یہ احساس ضرور ہوتا رہا۔

بے جا نہیں ہے ناز ہمیں اپنی ذات پر
انسان ہو کے رہبرِ انسان ہم بھی ہیں

اگر کوئی مان لے تو...... آپ نے کم از کم اس قابل تو سمجھا ویسے تو آپ جانتی ہیں۔

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

آج کے اس قحط الرجال میں سخت ضرورت ہے محبتیں بانٹنے کی...... (جی بالکل)

پاکیزہ ✧...... پاکیزہ میں اپنی نئی تحریر کب دے رہی ہیں؟

فریدہ اشفاق ❖......جب اللہ تعالیٰ توفیق دے دیں، پہلے تو یہ ہوتا تھا

بے عذر یہ سوچ کے کر لیتے ہیں وعدہ
اہلِ مروت ہیں تقاضا نہ کریں گے

مگر اب ایسا نہیں ہے اگر وعدہ وفا نہ ہو سکے تو بے حد شرمندگی ہوتی ہے۔ جبکہ ایم ڈی تاثیر کا خیال ہے۔

امید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا

اور چچا غالب نے کہا ہے۔

ترے وعدے پہ جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

ویسے یہ ضرور ہے کہ جیسے ہی میری بہت ساری ناتمام ادھوری تحریروں میں سے کوئی بھی مکمل ہوئی سب سے پہلے آپ ہی کی طرف روانہ کروں گی۔ مجھے دعاؤں کی سخت ضرورت ہے، اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔ اللہ تعالیٰ ہماری اور تمام لوگوں کی زندگیوں میں آسانیاں پیدا کرے، الٰہی آمین۔

پاکیزہ: فریدہ آپ کا بے حد شکریہ...... اپنی نجی مصروفیات اور صحت کے مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہوئے آپ نے ہماری اور پاکیزہ بہنوں کی فرمائش پوری کی...... آپ کے اور آپ کے خانوادے کے لیے... پُرخلوص دعاؤں کے ساتھ اجازت......!

☆☆☆

جی تو پیارے قارئین، آپ کو فریدہ جی کی تلخ و شیریں اور ناصحانہ گفتگو کیسی لگی۔ ارے انہوں نے تو اپنے آپ کو ہماری طرف سے نصیحت النساء بیگم کا خطاب بھی دے ڈالا۔ اب آپ بتائیں بہنوں کہ آپ کے کیا خیالات ہیں؟ سینئر و جونیئر رائٹرز سے ملاقات کا یہ سلسلہ انشاء اللہ آپ کی آرا اور تجاویز کی روشنی میں بہتر سے بہتر ہوتا چلا جائے گا۔ فریدہ اشفاق کے لیے اور اپنی تمام رائٹرز کی قلم کی روانی کے لیے خصوصی دعاؤں کے ساتھ وہی چھوٹی سی پیاری سی بات کہ اپنا خیال رکھیں، اپنے پیاروں کا خیال رکھیں اور جگنو کے مانند معاشرے میں روشنی بکھیریں اور اپنے مثبت اندازِ فکر اور طرزِ عمل سے زندگی کی راہوں کو اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بھی آسان بنائیں۔ اللہ نگہبان!

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

مہنگائی اور عید کے اخراجات

شائستہ زریں

ساغر صدیقی نے کہا تھا کہ

حاکمانِ وقت دیکھیں قوم کا کیا حال ہے
چند لوگوں کی ہے عید بس معاشرہ کنگال ہے
آٹا، گھی، چینی کا بھاؤ اور کہاں تک جائے گا
قیمتیں ہیں آسماں پر کون نیچے لائے گا

محض اجناس پر ہی کیا موقوف ہے اگر عید کے اخراجات پر نظر ڈالیں تو تمام متعلقہ اشیا کے دام ہوش ربا ہیں۔ عید کے مفہوم خوشی کے ہیں اور مہنگائی کے پیشِ نظر یہ کہا جاتا ہے کہ عید تو بچوں کی ہوتی ہے سو بچوں کی عید کی تیاری کر لی۔ لیکن یوں بھی ہوتا ہے کہ

غریب ماں اپنے بچوں کو پیار سے مناتی ہے
پھر بنائیں گے نئے کپڑے عید تو ہر سال آتی ہے

بے شک عید ہر سال آتی ہے اور ہر نیا آنے والا سالانہ بجٹ اپنے ساتھ مہنگائی کا طوفان لے کر آتا ہے، جس سے نہ صرف ماہانہ بجٹ بلکہ عید کے سالانہ روایتی اخراجات بھی دسترس سے باہر نظر آتے ہیں۔ گھر کی سجاوٹ، گھریلو استعمال کی اشیا عید کا دسترخوان، عید کی دعوت، عیدی اور دیگر اخراجات کے اہتمام میں اب پہلی سی رونق اور بات نہیں رہی۔ غیر مسلم اپنے مذہبی تہوار کے موقع پر مہنگی اشیا بھی سستے داموں فروخت کرتے ہیں تاکہ امیر غریب سب یکساں تہوار کی خوشیوں میں شریک ہوں۔ اور ہماری اسلامی مملکت میں ملازمت پیشہ افراد کی محدود آمدنی عید کے لامحدود اخراجات کے لیے ناکافی ہوتی ہے۔ غریب، محنت کش، مزدور پیشہ افراد اور ان کے اہلِ خانہ کی عید کی مسرتوں کو مہنگائی کا عفریت نگل لیتا ہے۔ سفید پوش طبقہ سب سے زیادہ زد میں آتا ہے کہ مہنگائی اسے کچل کر رکھ دیتی ہے۔ یوں ہمارے سب سے بڑے مذہبی تہوار کی شادمانی روزافزوں بڑھتی ہوئی مہنگائی کی بھینٹ چڑھ رہی ہے۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ہم نے عید نمبر کے لیے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق خواتین سے دریافت کیا کہ

سوال: آج کی مہنگائی عید کے اخراجات پر کیسے اثر انداز ہو رہی ہے؟

پروین سعید (کھانا گھر)

غریب عید کے اخراجات کے لیے مانگ تانگ کر گزارہ کرتا ہے مہنگائی زیادہ ہے اور اجرت کم۔ ...مہنگائی، بے روزگاری اور غربت عید کی تیاری پر براہ راست اثر انداز ہو رہی ہے۔ غریب آدمی...... کے لیے سرمایہ داروں کو آسانیاں فراہم کرنی چاہئیں۔ حکومت عام استعمال کی اشیا کے دام کم کرے تو غریب بھی عید کے اخراجات پورے کرنے کا متحمل ہوگا۔ میں اپنے طور پر کوشش کرتی ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو سکے جو نہیں کر سکتے ان کے عید کے اخراجات پورے کر سکوں۔

عطیہ عامر

(صحافی، پروگرام منیجر ریڈیو پاکستان کراچی)

روز بروز بڑھتی ہوئی مہنگائی کی بنا پر آہستہ، آہستہ عید کی رونقیں ماند پڑتی جا رہی ہیں۔ پہلے لوگ چاند رات تک عید کی شاپنگ کیا کرتے تھے لیکن آج کل لوگ رمضان سے کچھ پہلے لگنے والی سیل میں شاپنگ کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ والدین اب بھی حتی المقدور اپنے بچوں کو اس خوشی کے موقع پر نئی چیزیں دلوانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بازار میں ہمیں ایسے واقعات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں کہ بچہ جوتوں اور کپڑوں کے لیے ضد کر رہا ہے اور والدین کہتے ہیں کہ بیٹا! یہ آپ کو اگلے سال عید پر دلوائیں گے۔ اس سال یہ والا لے لو جو ہم آپ کو لے کر دے رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال بہت تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔ تایا کی وفات کے بعد میرے والد کے گھر میں عید والے دن خاندان کے تمام افراد جمع ہوتے تھے اور ہم سب اکٹھے عید منایا کرتے تھے۔ تقریباً ایک سو کے قریب رشتے دار ہمارے گھر دعوت میں مدعو ہوتے تھے لیکن جب آہستہ، آہستہ مہنگائی بڑھتی گئی تو سب نے طے کیا کہ عید کے دن ون ڈش پارٹی ہوا کرے۔ کسی ایک پر اتنا بوجھ نہ پڑے تو مہنگائی کی بنا پر عید کے دنوں میں جو گہما گہمی ہوا کرتی تھی۔ جو ملنا ملانا ہوا کرتا تھا وہ بھی کچھ کم ہو گیا ہے۔

شائستہ اعجاز

(گھریلو خاتون)

مہنگائی کے جن کو قابو کرنا بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے عید کا بہت زیادہ اہتمام ہوتا تھا۔ عید پارٹیاں ہوتی تھیں، عید کے لیے از سرِ نو گھر کی سجاوٹ کی مد میں بھی خاصی خریداری کر لی جاتی تھی۔ لیکن اب بڑھتی ہوئی مہنگائی کی وجہ سے ہر چیز کو دیکھ بھال کر کرنا پڑتا ہے اور کوشش یہی ہوتی ہے کہ ہر چیز محدود وسائل کے اندر استعمال کریں۔ پہلے عید کے تین جوڑے بنتے تھے اور اب ایک پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ عید کے ضروری اخراجات پر تو سمجھوتا نہیں کیا جا سکتا۔ سوان پر مہنگائی براہ راست اثر انداز ہو رہی ہے، عید دعوت، فیملی بچوں کو عیدی دینا سرِ فہرست ہے اور حسبِ حیثیت اپنی اولاد کو عید کی خوشیوں میں شامل کر رہے ہیں۔ اگر مہنگائی نہ ہو تو یہ تمام کام آسانی سے کیے جا سکتے ہیں اور عید کا صحیح لطف بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔

شازیہ انوار

(سینئر منیجر، جوائنٹ ایڈیٹر)

رمضان اور عید کی آمد کے ساتھ ہی مہنگائی کے بڑھنے کا واویلا ہوتا ہے۔ پھل مہنگے، سبزیاں مہنگی، اجناس مہنگی، کپڑے مہنگے اور جوتے بھی مہنگے جسے دیکھو وہ یہی باتیں کرتا نظر آتا ہے لیکن عجب بات یہ ہے کہ پورے رمضان بازاروں میں تل دھرنے کی جگہ نظر نہیں آتی، خریداروں کا ایک جمِ غفیر سڑکوں اور شاپنگ مالز کے اندر اور باہر نظر آتا ہے یہاں تک کہ چاند رات کو مہندی لگوانے کے لیے بیوٹی پارلرز کے باہر بھی جمِ غفیر نظر آتا ہے جہاں مہندی 200 سے 5000 روپے تک میں لگائی جاتی ہے، اب یہ علیحدہ بات

ہے کہ ہر ایک اپنی استطاعت کے مطابق خرچہ کرتا ہے۔ یہ بات بالکل، درست ہے کہ ہر سال مہنگائی میں 10 سے 15 فیصد کا اضافہ ہوتا ہے اس کے باوجود خریداروں کی تعداد میں کمی ہوتی نظر نہیں آتی۔ دراصل کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے بچوں کو عید کے موقع پر خوش نہ دیکھنا چاہتا ہو۔ بدقسمتی سے پاکستان کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں 60 فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ غربت کی لکیر کے لیے عالمی پیمانہ دو امریکی ڈالر روزانہ آمدنی ہے یعنی تقریباً دو سو پاکستانی روپے۔ پاکستان کی 21 فیصد آبادی میں لوگوں کی روزانہ آمدنی 1.25 امریکی ڈالر سے بھی کم ہے اس کے باوجود ہر ماں، باپ کوشش کرکے اپنے بچوں کو عید کی شاپنگ کرا ہی دیتے ہیں، بازاروں میں لوگوں کا ہجوم نظر تو آتا ہے جو اپنی، اپنی استطاعت کے مطابق خریداری کرتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی سے فرق پڑا ہے تو اتنا کہ لوگ پہلے اپنے ساتھ، ساتھ غریب پڑوسیوں' دوستوں اور جاننے والوں کا خیال بھی رکھتے تھے۔ مہنگائی کی وجہ سے عید کے اخراجات کی فہرست میں سے دیگر افراد کا نام نکل گیا ہے۔ اب عید کی خریداری صرف اپنے گھر والوں کے لیے رہ گئی ہے اور وہ بھی محدود ہوگئی ہے۔ جو لوگ معاشی طور پر مستحکم ہیں انہیں تو فرق نہیں پڑتا لیکن محدود آمدنی والے عید اور بڑی عید کے اخراجات کے لیے پورے سال بچت کرتے ہیں تب کہیں جا کر اپنے اہلِ خانہ کو عید کی خوشیوں سے ہمکنار کر پاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مہنگائی عید کی خریداری سے زیادہ اقربا پروری پر اثر انداز ہو رہی ہے جس کی وجہ سے دینے اور لینے کا سلسلہ ماند پڑ گیا ہے۔

ڈاکٹر عنبرین حسیب عنبر

(شاعرہ، مدیرہ اسالیب)

ہمارے خیال میں تو ہر طرح سے اثر انداز ہو رہی ہے۔ کچھ عرصہ قبل عید کے قریب گھروں میں نیا رنگ و روغن ہوا کرتا تھا اپنی استطاعت کے مطابق نئے برتن، چادریں اور میز پوش کا خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا اور عموماً عید کے تینوں دنوں کے کپڑے بنائے جاتے تھے۔ اور عید کی حقیقی خوشیوں کو آسودگی کے ساتھ محسوس کیا جاتا تھا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ لوگ قرض ادھار کر کے عید پر... بہ مشکل ایک جوڑا کپڑے بناتے ہیں۔

متوسط گھرانوں میں اب ہر سال رنگ و روغن خواب و خیال ہوگیا ہے۔ دنیا دکھاوے کو اب بھی بہت کچھ کیا جاتا ہے لیکن مالی پریشانی نے عید کی حقیقی خوشی سے محروم کردیا ہے۔ دوسری طرف معاشرے میں ایک ایسا طبقہ بھی نظر آتا ہے جسے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مہنگائی کا جن ان کا غلام ہے۔ لہٰذا معاشرے میں ان دونوں طبقوں کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے اور احساسِ محرومی معاشرے میں بڑھتے ہوئے جرائم کا ایک اہم سبب ہے۔

سمیرا عدیل (شیف)

آج کی مہنگائی تو ہر طرح سے ہی عید کے اخراجات پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ مثلاً پہلے اگر ایک فیملی میں میاں بیوی اور تین بچے ہوتے تھے تو سب کے عید کے دو یا تین سوٹ بن جاتے تھے۔ لیکن آج کی مہنگائی کی وجہ سے.. بہ مشکل ایک ہی سوٹ بن پاتا ہے۔ اور غریب اور متوسط طبقہ تو صرف بچوں ہی کے سوٹ بنا پا رہا ہے۔ پہلے عید پر اپنوں کو تحفے تحائف

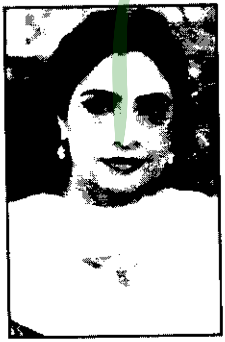

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دینے کا رواج تھا لیکن اب مہنگائی کی وجہ سے یہ رواج بھی دم توڑتا جا رہا ہے اس کے علاوہ عیدی دینا تو اس مہنگائی میں بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اور آج کل بچوں کو سو روپے کی عیدی بھی کم لگتی ہے۔ اور دینے والے بیچاروں کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ عید کے دنوں میں چاہے مہمانوں کی دعوت کے اہتمام کی بات ہو یا خود کہیں دعوت پر جانے کے لیے مٹھائی وغیرہ لے جانے کی بات ہو۔ مہنگائی کی وجہ سے مشکل اور کم ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر فرح خان

(ریڈیو، ٹی وی ہوسٹ، سماجی کارکن)

مہنگائی کا اثر امیروں پر تو پڑتا ہی نہیں اور غریب بھی اپنے حساب سے تھوڑا بہت ہی متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن متوسط طبقے کے لوگوں کو عید کی تیاریوں میں نہایت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ طبقہ پڑھا لکھا، سمجھدار اور برداشت کا مادہ رکھتے ہوئے اپنے معاملات کو کسی نہ کسی طرح سلجھا لیتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں مہنگائی کا رونا تو رویا جاتا ہے مگر پھر بھی اپنی عید کی خوشیاں منانے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیا جاتا ہے۔

صائمہ کنول

(فلم، ٹی وی اسٹیج آرٹسٹ)

مہنگائی نے جینا اجیرن کر دیا۔ عید کے اخراجات تو درکنار غریب کو دو وقت کی روٹی میسر نہیں بچے تو بچے ہیں وہ تو عید کے کپڑوں، جوتوں اور دوسری چیزوں کی فرمائش کریں گے ہی اور جب والدین کی وجہ سے بچوں کی فرمائش پوری نہیں کر پاتے صرف تو بچوں کا دل ہی نہیں ٹوٹتا والدین بھی بہت تکلیف میں ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ عید کے لازمی اخراجات بھی مہنگائی کی وجہ سے بہت متاثر ہو رہے ہیں پہلے جو چیزیں بخوشی لی جاتی تھیں اب وہ بہت سوچ سمجھ اور کھینچ تان کر لی جاتی ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ مہنگائی کم کرانے کے لیے مؤثر اقدامات کرے۔ تاکہ عید کی خوشیاں بھرپور طریقے سے منائی جا سکیں۔

☆☆☆

معزز قارئین! بلاشبہ آج کی مہنگائی عید خوشیوں کی قاتل بنتی جا رہی ہے۔ ماضی میں دفاتر میں خصوصی عید الاؤنس دیے جاتے تھے جو گھر میں چپکے سے بہار آ جائے کی مثال ہوا کرتے تھے۔ اب عید الاؤنس تو قصۂ پارینہ بن گیا ہے تنخواہوں کے لالے پڑ گئے ہیں۔ عید کے اخراجات پورے کرنے کے لیے لوگ قرض دار ہو جاتے ہیں۔ بہر حال عید ہم مسلمانوں کے لیے روزوں کا انعام ہے۔ رمضان کے روزے جو فرض عبادت میں شمار ہوتے ہیں۔ اگر ہم کفایت سے کام لیں اور عید کے نام پر غیر ضروری اخراجات اور نمود و نمائش سے گریز کریں تو عید کے بعد بھی آرام سے ہی گزرے گی ورنہ بہ صورت دیگر انوار عزمی کے ان اشعار کی عملی تصویر ہی نظر آئیں گے کہ

یاد کیوں قوم کو آئے نہ خدا عید کے بعد
قوم کی جیب میں کچھ بھی نہ رہا عید کے بعد
ایک اِک پائی کو محتاج ہوئے ہم آخر
شاہ خرچی کی ملی ہم کو سزا عید کے بعد
عید کی نذر ہوا خرچ مہینے بھر کا

بہر حال ادارۂ پاکیزہ اور میری جانب سے تمام قارئین کو دلی عید مبارک اس دعا کے ساتھ کہ

ہر آنگن میں خوشیوں بھرا سورج ابھرے
چمکتا رہے ہر آنگن عید کے دن (آمین)

☆☆☆

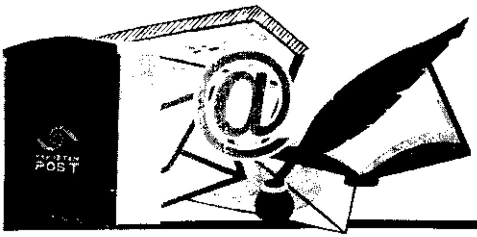

بہنوں کی محفل

مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ وبرکاتہ

حمد وستائش اس ذاتِ بابرکات کے لیے جس نے اس کائنات کو وجود بخشا اور درود وسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا اور بنی نوع انسان کو ایک مکمل ضابطۂ حیات دیا جو نہ صرف انسانوں کے لیے بلکہ تمام مخلوقات کے لیے بھی ہے۔ یعنی انسان کو یہ درس دیا کہ دیگر مخلوق کا حق بھی تم پر ہے۔ اللہ پاک جل شانہ ہم سب کو ایمان کی قوت و پختگی کے ساتھ شاد وآباد رکھے اور اپنے کنزِ مخفی سے وہ سب کچھ عطا فرمائے جو ہمارے حق میں بہتر ہو (الٰہی آمین)

پاکیزہ قارئین کو عید مبارک

”عید کے اس پُر مسرت موقع پر آپ سب بہنوں کو دلی عید مبارک پیش کرتی ہوں...... دعا ہے کہ یہ عید سب بہنوں کو صحت وسلامتی کے ساتھ گزارنا نصیب ہو (الٰہی آمین)

آپ سب کی محبتیں مستقل مجھ تک پہنچتی رہتی ہیں اور میں انہی کے سہارے اس مشکل وقت کو آسانی کے ساتھ گزار رہی ہوں جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں معراج صاحب کی طبیعت کے بارے میں۔ جو خراب چل رہی ہے مگر آپ سب کی پُر خلوص دعاؤں سے الحمد للہ کچھ وقت کے لیے ان کی طبیعت میں بہتری بھی آجاتی ہے تو دل چاہتا ہے کہ آپ بہنوں سے باتیں کرلوں۔ ٹیلی فون کے ذریعے خیر خیریت معلوم کرنے والی بہنیں، خصوصاً ڈاکٹر ممتاز ضیا جو بہت خلوص اور محبت بھرا فون کرتی ہیں اور ان کی باتیں مجھے بہت انرجی بھی دیتی ہیں، ان سب کے لیے میں دل سے ممنون ہوں۔ محترمہ افتخار شوق سے گفتگو کر کے بہت اچھا لگا اتنی سادہ پُر خلوص، پڑھی لکھی اور بزلہ سنج خاتون ہیں۔ انہوں نے اتنی پرانی باتوں کا حوالہ دیا کہ مجھے برملا ان کی یادداشت اور حافظے کو داد دینا پڑی۔ ایسی دلچسپ اور پُر لطف باتیں کرنے والی خاتون سے بار، بار بات کرنے کو دل چاہے مگر ظاہر ہے وقت اور موقع بھی چاہیے۔

اب انہوں نے کراچی آنے کا وعدہ تو کیا ہے جو دیکھتے ہیں کب پورا ہوتا ہے۔ افتخار آپ کی دعاؤں اور پُر خلوص باتوں کا بہت شکریہ بہت اچھا لگا بات کر کے۔

فریدہ جاوید فری سے پہلی بار فون پر بات ہوئی ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے ساتھ اتنے پُر خلوص اور اچھے لوگ ہیں۔ فریدہ کے لیے بہت دعائیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جلد از جلد صحت یابی عطا کرے۔ فریدہ تمہارے اتنے زبردست تحفے کا شکریہ ادا نہ کرنا یقیناً زیادتی ہوگی تم تو پاکیزہ کے لیے خود کسی تحفے سے کم نہیں بس تم اپنی تحریر کے تحفے ہمیں بھیجتی رہو کہ اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

انجم انصار کے جانے کا خلا نزہت اصغر اپنی محنت، لگن اور جانفشانی سے پُر کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان کی محنت اور خلوص پاکیزہ میں نظر آتا رہے گا۔

دعا ہے کہ یہ عید آپ اپنے چاہنے والوں اور اپنے پیاروں کے ساتھ مل کر بہت خوشگوار طریقے سے گزاریں۔ عید کی کوئی بہت خاص بات اگر ہو تو اسے اپنی پاکیزہ بہنوں سے بھی ضرور شیئر کریں۔

انشاء اللہ آپ لوگوں سے باتیں ہوتی رہیں گی فی الحال آپ اپنے پیاروں سے عیدی سمیٹیں اور خوب انجوائے کریں۔

اللہ حافظ......

دعا گو عذرا رسول“

جی بہنو! ابھی تو رمضان المبارک کی خصوصی عبادتوں اور ریاضتوں کا سُرور ہے، اجتماعی دعاؤں کا ثمر ہے کہ بفضلِ تعالیٰ یہ مبارک ماہ اپنی برکتوں کا نزول کر کے بخیریت گزر ا اور ہم گناہگاروں کی بخشش کا سامان بھی کر گیا۔ ہمیں تو پورا یقین ہے اپنی دعاؤں پُر وہ ہی رب غفور ہے جو ہمیں ستر ماؤں کی محبتوں سے بڑھ کر چاہتا ہے تو کیوں نہ ہمارے بہترین نصیب کرے گا۔

پیاری بہنو! اب بتائیے کہ عید کیسی گزری اور آج کل کیا ہو رہا ہے، یقیناً عید ملن پارٹیاں عید ڈنرز اور عید کے دیگر پروگرام چل رہے ہوں گے۔ کچھ لوگ عید کے ماہ میں شادیاں کرنے کو بھی ترجیح دیتے ہیں ارے بھائی ظاہر ہے اپنے بچوں کی شادی آپ لوگ بھی کیا سمجھ بیٹھے ہاں اس کے علاوہ موسم گرما کی چھٹیاں بھی ہیں تو ابھی مہمان نوازی بھی چل رہی ہوگی۔ اندرون اور بیرون ملک سے مہمانوں کا آنا جانا بھی ہوگا آپ خود بھی مہمان ہوں گی……تو اس عید کی کوئی خاص بات، کوئی واقعہ، کوئی خوشگوار یاد ہمیں بھی ضرور لکھ بھجیں۔

پیاری پاکیزہ بہنو! آپ کا بہت شکریہ کہ آپ سب نے میری بہت حوصلہ افزائی کی اور بے انتہا دعاؤں سے نوازا……آپ سب کے حسین تعاون سے ہی ہم ماہنامہ پاکیزہ ترتیب دیتے ہیں بس آپ اسی طرح پُرخلوص تعاون جاری رکھیے۔ پاکیزہ کے یہ صفحات آپ کو سدا خوش آمدید کہتے رہیں گے۔ آپ کے لیے تمام ٹیلی فون نمبرز دیے جا رہے ہیں۔

نزہت اصغر 03316266612 آفس لینڈ لائن۔ 0213538683.2135802552 0I ایکسٹینشن 107.118.122

اور حسبِ روایت نت نئی خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوص دل سے درود ابراہیمیؑ اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ ساتھ تمام اہلِ وطن کو بھی یاد رکھیں۔ اللہ رب العزت عالم اسلام کی تمام پریشانیوں کو رفع کرے اور تمام مسلمانانِ عالم کو سرخروئی نصیب ہو۔ (الٰہی آمین)

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ مستقل قاری عظمیٰ زہریٰ اوستہ محمد کے پیارے بیٹے نے اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن لی ہے (مبارکاں) عظمیٰ کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ یہ لوگ موسم گرما گزارنے قلات جا رہے ہیں۔ (بہت خوب)

☆ شمیم فضل خالق کی پیاری بیٹی عندلیب خالق، لندن میں ڈرائیونگ ٹیسٹ پاس کر لیا ہے اور وہ اس کامیابی پر بہت خوش ہیں۔ (مبارک ہو)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور چکوال شہر کے ایک روزنامے کی معروف کالم نگار نرگس نسیم، صابہ موہڑہ چھٹیاں گزارنے اپنے گاؤں جا رہی ہیں۔ (خیر سے جائیے اور خیر سے آئیے)

☆ مستقل تبصرہ نگار نگینہ ضیا بنگش، کراچی کی بیٹی مہرین ضیا کی منگنی اعزاز احمد خان، کوہاٹ کے ساتھ بخیر و خوبی انجام پائی۔ (مبارکاں)

☆ مصنفہ لائبہ خان، لاہور کی ایک نجی تعلیمی ادارے میں پرنسپل کے عہدے پر تقرری ہو گئی ہے۔ (ماشاءاللہ اور مبارک باد)

☆ مصنفہ سیما مناف جو پچھلے دنوں بخار اور پھر اپنے پاؤں میں فریکچر کی وجہ سے علیل تھیں اب خدا کے فضل سے روبہ صحت ہو کر اپنے بچوں سے ملنے امریکا روانہ ہو گئی ہیں۔ (چلیں اچھا ہے، سیما، بچوں کے پاس سے فریش ہو کر آئیے گا)

☆ مصنفہ سکینہ فرخ کے ہاں پیاری سی نواسی ہوئی ہے جس کا نام زینب رکھا گیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ مصنفہ شاہدہ ذاکر دبئی سے آج کل کراچی آئی ہوئی ہیں۔

☆ تبصرہ نگار حافظہ ست البنات تونسہ شریف کے بھائی پچھلے دنوں کراچی کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے آئے جبکہ ست البنات باوجود خواہش کے نہ آسکیں۔ (چلیں آئندہ سہی)

☆ مستقل تبصرہ نگار مسرت پرویز، کراچی کی بیٹی نے کراچی یونیورسٹی سے چائنیز لینگویج کا کورس، امتیازی نمبروں سے مکمل کیا اور وہ اس سلسلے میں چین بھی اسکالرشپ پر بھیجی گئیں۔ (مبارک باد)

☆ مصنفہ صائمہ اکرم کا لکھا ڈراما عنقریب ایک نجی چینل سے نشر کیا جائے گا۔ (مبارک باد)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ تبصرہ نگار صبا آصف کی والدہ کی طبیعت بہت خراب ہے۔

☆ پاکیزہ سے وابستہ شائستہ زریں کی والدہ کی طبیعت خراب ہے۔

☆ مصنفہ سویرا فلک کے شوہر جو جگر کے مرض میں مبتلا ہیں اب آپریشن کے بعد روبہ صحت ہیں۔ (الحمدللہ)

☆ شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی...... کمر اور سروائیکل کی تکلیف کا شکار رہیں اب قدرے بہتر ہیں اور جناب انہوں نے یوگا سے اس بیماری کا علاج کیا۔

☆ پاکیزہ کی رائٹر نایاب جیلانی کے بیٹے صائم کا ٹانگوں کا آپریشن ہوا ہے۔ نایاب آج کل پریشان ہیں ان کے بچے کے لیے خصوصی دعا کی التماس ہے۔

☆ پچھلے دنوں ادارے سے وابستہ کئی افراد اور رائٹرز اور ریڈرز بھی چکن گونیا کا شکار ہوئے۔ اللہ سب کو صحت دے اور نت نئی بیماریوں سے بچائے۔

☆ پاکیزہ قاری ہمایا سمین کی والدہ یورین انفیکشن کا شکار ہیں خصوصی دعا کی درخواست ہے۔

☆ مصنفہ اور شاعرہ افتخار شوق، میاں چنوں ایک حادثے میں زخمی ہوگئیں۔

☆ پاکیزہ کی شاعرہ و مرسلہ نگار امینہ عندلیب کے لیے خصوصی دعائیں۔

☆ پیاری فریدہ جاوید فری کو آپ سب کی دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔

انتقالِ پُرملال

☆ مصنفہ فاخرہ گل کی والدہ برضائے ربی انتقال کرگئیں۔

☆ ثوبیہ ظہور، ضلع اٹک کے چچا انتقال کرگئے۔

☆☆☆

سے عقیلہ حق بڑے عرصے بعد تبصرہ لے کر حاضر ہیں۔ ”سب سے پہلے نزہت اصغر صاحبہ کو ایڈیٹر کی کرسی بہت، بہت مبارک ہو (بہت شکریہ) انجم باجی نے 28 سال بہت خوب صورتی سے ایڈیٹر شپ سنبھالی لیکن ایسا تو ہوتا ہی ہے کہ ایک دن ہمیں دوسروں کے لیے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے اور ایک اچھا کیپٹن وہی ہوتا ہے جو اعلیٰ مقام پر جا کر نئے خون، نئے جذبے، اور نئے ٹیلنٹ کو موقع دے اس کے لیے میرا تہ دل سے انجم انصار باجی کو خراجِ تحسین، اب نزہت صاحبہ آپ کیونکہ ایڈیٹر کی کرسی پر تشریف رکھ چکی ہیں تو پلیز ایڈیٹرز کی مشہور ترین ردی کی ٹوکری اٹھا کر باہر رکھ دیں۔ (جی وہ ٹوکری ہمارے پاس کبھی ہی نہیں) الحمدللہ ہمارا افسانہ خوش قسمت، خوش قسمتی سے شائع ہوا۔ قارئین کو پسند آیا، عذرا رسول صاحبہ نے بہت محبت سے کال کر کے بتایا کہ رفعت سراج صاحبہ کو میری تحریر بہت پسند آئی۔ رفعت سراج صاحبہ ہم نے تو آپ جیسی رائٹرز کو پڑھ، پڑھ کر لکھنا سیکھا، آپ کی تعریف میرے لیے کسی سند سے کم نہیں، ذرا جو کہا ہے وہ لکھ کر دے دیں تاکہ پڑھ، پڑھ کر خوش ہوتی رہوں، تعریف سے یاد آیا، شائستہ صاحبہ کو میرے ہاتھوں اور عذرا رسول صاحبہ کے پیروں کی مہندی بہت پسند ہے، شائستہ عزیز صاحبہ آپ کی محبتوں کا بے حد شکریہ...... اللہ آپ کو خوش رکھے کہ تعریف کرنے والے لوگ بڑا اعلیٰ ظرف رکھتے ہیں اور یہ ظرف ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ نئی ایڈیٹر شپ آگئی ہے تو ظاہر ہے رسالے میں کچھ تبدیلیاں بھی آئیں گی جو یقیناً مثبت ہوں گی جو انجم باجی کی محنت اور محبت کو زنگ نہیں لگنے دیں گی...... میرے خیال سے ہر ماہ ایک افسانے کو ایوارڈ دینے کا سلسلہ شروع کیا جائے اس کے لیے ضروری نہیں کہ کوئی تقریب ہو کیونکہ معراج رسول صاحب کی طبیعت اور عذرا رسول صاحبہ کی مصروفیات سے میں بخوبی واقف ہوں تو جو افسانہ ایوارڈ کا مستحق قرار پائے اس کا ایوارڈ بذریعہ ڈاک بھیج دیا جائے۔ دراصل ہم رائٹرز لوگ...... بڑے حساس ہوتے ہیں اعزاز سے زیادہ وہ جو شیلڈ ہماری ٹیبل پر رکھی ہماری حوصلہ افزائی کر رہی ہوتی ہے ایکچوئیلی بہت ساری نایاب تحریریں وہ شیلڈ لکھوالیتی ہے۔ میں امید کرتی ہوں، میرا مشورہ سب کو پسند آئے گا...... (جی ضرور) میں ان تمام قارئین کی شکر گزار ہوں جن کو میری تحریر پسند آئی۔ پیاری شائستہ زریں آپ نے پاکیزہ سروے میں ایک دفعہ کے علاوہ شامل نہیں کیا...... کیوں؟ جواب

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد
نمرہ احمد
فرحت اشتیاق
قُدسیہ بانو
نگہت سیما
نگہت عبدُاللّٰہ
رضیہ بٹ
رفعت سراج
صائمہ اکرام
سعدیہ عابد
عفت سحر طاہر
تنزیلہ ریاض
فائزہ افتخار
سباس گُل
رُخسانہ نگار عدنان
اُمِ مریم
عُشنا کوثر سردار
نبیلہ عزیز
فائزہ افتخار
نبیلہ ابر راجہ
آمنہ ریاض
عنیزہ سید
اقراء صغیر احمد
نایاب جیلانی
اشفاق احمد
نسیم حجازی
عنایت اللّٰہ التمش
ہاشم ندیم
مُمتاز مُفتی
مُستنصر حُسین
علیمُ الحق
ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://paksociety.com

نہیں معلوم، ورنہ کچھ لوگوں کی شمولیت تو اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ جس ماہ ان کی شمولیت نہ ہو، میں تصور ہی میں ان کے جوابات پڑھ لیتی ہوں، اب پاکیزہ میری سالگرہ اور ویڈنگ انیورسری کی تاریخ بھی بھول جاتا ہے۔ تو ڈیئر ایڈیٹر صاحبہ میں جون میں پیدا ہوئی اور نومبر میں شمیم حق صاحب کے سر پر مسلط کردی گئی، آپ لوگ مبارک باد بغیر تحفے کے بھی دیں گے تو قبول ہے۔'' (بہت محبت بھرے خط کا شکریہ...... چلیں...... سالگرہ کی مبارک باد اب لے لیں اور آئندہ بھی ہم یاد رکھیں گے کہ ہماری تو کوشش ہوتی ہے اپنی رائٹرز کی محنت کو جلد از جلد قارئین تک پہنچائیں مگر اس قطار میں دیر تو ہو ہی جاتی ہے ڈیئر عقیلہ! آپ پورے رسالے پر تبصرہ بھیجیں شیلڈ کی بابت بھی غور کیا جائے گا۔)

✍ اَمیس جبار خان، آزاد کشمیر سے۔ ''بہت سے گزرتے مہینوں کے بعد میرا دل آج پھر سے خط لکھنے کو چاہ رہا ہے۔ اگرچہ کہ میں بہت خفا ہوں پر نزہت اصغر آنٹی کی دی گئی تسلی نے خفگی کو کچھ کم کردیا ہے۔ (ارے بھئی اتنی پیاری لڑکی پر غصہ اچھا نہیں لگتا) انتظار اگر لمحوں کا بھی ہو تو صبر آزما ہوتا ہے۔ ہاں پاکیزہ سے خاموش تعلق پر اس خفگی نے کوئی اثر نہیں ڈالا۔ (شاباش) انجم آنٹی اللہ آپ کو سلامت رکھے اور صحت اور تندرستی والی زندگی دے (الٰہی آمین) پاکیزہ کے تمام سلسلے ہی اچھے جارہے ہیں، من جاں بازم میرا فیورٹ ناول، سحر ساجد آپ کے لفظ واقعتاً سحر زدہ کردینے والے ہیں...... آرمی والوں کی صرف لائف ہی فیسی نیٹ کرتی تھی۔ آپ نے ان کی زندگی کے نئے پہلو سے روشناس کروایا۔ اکثر اب دعاؤں میں وہ لوگ یاد آتے ہیں جن کے رتجگوں سے ہماری نیندیں قائم ہیں۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✉ نسرین جمیل سیال، گجرات۔ دعاؤں کا شکریہ آپ کی کہانیاں لگتی رہیں گی۔ اب کچھ نہ کچھ انتظار تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

✍ صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ ''انجم باجی ہم جیسے بہت سے بھولے بھٹکوں کے لیے آپ روشنی ہیں اور ہمیں احساس ہے کہ آپ تھک گئی ہیں لیکن آپ بہت سارے ہیلپرز رکھ لیں بے شک وقت کسی کے لیے نہ رکتا ہے اور نہ کسی کا انتظار کرتا ہے۔ دنیا میں ہزاروں لوگ آتے ہیں اپنا ٹائم گزار کر چلے جاتے ہیں مگر بہت کم ایسے ہوتے ہیں حکومت کرتے ہیں دلوں پر۔ ہماری زندگی میں بہت سے لوگ آتے جاتے ہیں ہر انسان مسافر ہے مگر بعض لوگ محبت کشید کرتے ہیں۔ وہ اپنے تمام تر خلوص و محبت کے ساتھ آپ سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ انجم باجی آپ کے ساتھ بہت سے لوگوں کی زندگیاں محبتیں جڑی ہوئی ہیں، ہمیں بہنوں کی محفل اپنا گھر لگتی ہے۔ ہمیں ہر قدم پر آپ کے قیمتی مشوروں کی ضرورت ہے۔ اللہ آپ کو صحت و تندرستی دے۔'' (پُرخلوص جذبات کے لیے انجم باجی آپ کی شکر گزار ہیں۔ آپ کو دعائیں کہتی ہیں، انشاء اللہ پاکیزہ کی محفل اسی طرح آپ سب کے پُرخلوص تعاون سے سجتی رہے گی)

✍ طاہرہ، خوشاب سے۔ ''باجی ہم پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ انجم باجی کے جانے کا دکھ ہے انہوں نے ہماری بہت رہنمائی کی ہے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میرا اور پاکیزہ کا بہت پرانا ساتھ ہے۔ اب آپ سے پوری امید ہے کہ آپ پاکیزہ کو بہت اچھی طرح سنبھالیں گی۔ ہم بچوں کی چھٹیوں میں صوابی گئے ہوئے تھے۔ اس دفعہ آنٹی نسرین جمیل کا ناول بہت ہی عمدہ تھا۔ سحر ساجد کا ناولٹ من جاں بازم بھی بہت عمدہ جارہا ہے، دیگر تمام سلسلے بھی بہت اچھے ہیں۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✍ نگہت آصف، اسلام آباد سے۔ ''پاکیزہ بے انتہا خوب صورت کہانیاں لیے اے ون رہا...... اس مرتبہ ایک رائٹر عذرا آفتاب کی کہانی بہت عمدہ تھی۔ نام وڈی تھا انگریزی میں بھی لکھتیں۔ بہت علامتی کہانی تھی۔ پاکیزہ کا یہی حسن ہے کہ یہاں ورائٹی بہت ہے اور سبق آموز کہانیاں ہیں۔ سحر ساجد کا ناولٹ بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✍ نگینہ ضیا بنگش، کراچی سے۔ ''جون کا پاکیزہ بہت اچھا تھا۔ ماہِ رمضان کی مصروفیات کے ساتھ پڑھا۔ عقیلہ حق نے بہت زبردست کہانی لکھی اور رفعت شبانہ کی اونچی اڑان بھی بہت اچھی تھی...... نسرین جمیل کا مکمل ناول پڑھ کر تو آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کے علاوہ نیلم احمد بشیر، ہاجرہ ریحان کی مختصر کہانیاں بھی زبردست تھیں۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت کے مضمون تو ہوتے ہی بہت ایمان افروز ہیں۔ ان کے لیے بہت سی دعائیں، آپ کا شکریہ میری اور مہرین کی

تحریریں لگاتی رہتی ہیں، ہمیں پاکیزہ بہت اچھا لگتا ہے، میری سب سہیلیوں اور بچیوں کی ٹیچریں بھی شوق سے پڑھتی ہیں، ہاں بشریٰ سیال نے جاؤں میں کہاں بہت خوب لکھا۔ شائستہ زریں نے شوبز کی دنیا سے اجبی کا انٹرویو بھی بہت اچھا کیا۔ اور آخر میں ناولوں کی بات جو شیریں حیدر اور رفعت آپی بہت خوب صورت لکھ رہی ہیں، اس کے علاوہ سحر ساجد کا من جاں بازم بھی پسند آ رہا ہے لگتا ہے اب اینڈ ہونے والا ہے۔ آپ نے بھی بہت خوب صورت محفل سجائی۔ عذرا رسول آپی کے لیے بہت دعائیں۔'' (نگینہ تمہاری دعاؤں اور محبتوں کا بہت شکریہ...... تمہارے تبصرے ہی ہمیں رہنمائی دیتے ہیں)

✍ ثنا کنول اللہ دتہ، لودھراں سے۔ ''باجی آپ کا شکریہ کہ میری کہانی چھاپی مجھے آپ گائڈ کریں کہ کس طرح لکھوں میں تمام رائٹرز کو بہت شوق سے پڑھتی ہوں، پاکیزہ رسالہ بہت اچھا ہوتا ہے۔'' (ثنا بیٹی جیسے کہ آپ سے فون پر بات ہوئی آپ تمام سینئر اور جونیئر رائٹرز کو پڑھیں۔ بڑے، بڑے ادیبوں کی تحریریں پڑھیں اور مشق جاری رکھیں)

✍ سنبل ملک اعوان، شاہدرہ سے۔ ''گم شدہ محبت اختتام پزیر ہوئی...... اور شکر ہے کہ صبا کو ندیم خان مل گیا...... چلو ایک خواب کی ہی صورت سہی مگر آ گا ہی تو مل گئی ناں۔ امرت تو ہے ہی امرت اور امرت گل نام بھی بے حد خوب صورت اور حسین ہے۔ مئی کا پورا مہینہ گرمی کا تھا مگر مئی کے سارے افسانے اور ناول بہت ہی عمدہ اور لازوال تھے۔ حسن نکھار یے بہت ضروری ہے کیونکہ پارلر میں جانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے، کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ افورڈ نہیں کر سکتے۔ آپ میری ریسپی لگا دیتی ہیں، اس کے لیے میں ہزار دل سے آپ کی ممنون ہوں، اللہ آپ کو جزائے خیر عطا کرے۔ آپی عظمیٰ کی ڈائری بھی لاجواب اور عمدہ ہوتی ہے۔ آنٹی عنبر وسیم کیا اب خط لکھنا چھوڑ گئی ہیں۔ (ہاں بھئی عنبر کہاں ہو تم؟) صبا کیسی ہو، امینہ عندلیب آپ کی طبیعت اب کیسی ہے، میں نے آپ کے لیے دعائیں کی ہیں بلکہ بہنوں کی محفل کی ہر بہن آپ کے لیے دعا گو ہے۔ (جی بالکل) انجم آنٹی جی، آپ خود بھی بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کی اولاد آپ کے در در پر بھاگی چلی آئی۔ اللہ فرمانبردار اولاد سب کو عطا کرے، آمین۔ مئی کے تمام افسانے بڑے ہی اچھے اور سبق آموز تھے۔ اور ناولٹ بھی لاجواب تھے۔ آپی بہت لکی اور خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے پاس رشتوں کی خوشبو ہوتی ہے۔ آنٹی نسرین سیال کو سلام...... موسیٰ کے آپریشن کا کیا بنا؟ میں نے مکہ اور مدینہ میں ان کے لیے بہت دعا کی۔ آنٹی آپ کی محبت اور دعا سے میں نے گھر کی بنیاد رکھ لی ہے اور یہ گھر بیوہ، لاوارث، بے سہارا عورتوں کو سہارا دے گا، انشاء اللہ تعالیٰ (بہت خوب سنبل)... اللہ مہمان، عاشقہ مسعود کا افسانہ میرے لیے بہت ہی مددگار ثابت ہوا۔ اللہ پاک ماہِ صیام خیریت سے گزارے۔'' (سنبل آپ کے طویل خط کا شکریہ! دیکھیں آپ کے صبر کا صلہ تھا جو نبی پاکؐ کے روضے کی زیارت ہوگئی۔ اللہ پاک آپ کی تمام مشکلات دور کرے، آمین۔)

✍ نرگس نسیم، صابہ موہڑہ سے۔ ''ماہ جون کا پاکیزہ چلچلاتی دھوپ میں موصول ہوا۔ بہت بے تابی سے رسالہ کھولا...... سابقہ مدیرہ دلکش رسالہ نزہت اصغر کا نام دیکھ کر جہاں خوشی ہوئی، وہیں انجم آپی کا نام نہ دیکھ کر آنکھ سے آنسو بھی نکل آئے۔ ہمارے دل کی کیفیت کا اندازہ صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ ویلکم بیک نزہت جی ہم آپ کو پاکیزہ کی ایڈیٹر بننے پر مبارک باد دیتے ہیں۔ (بہت شکریہ) آپی انجم کو میری طرف سے پوتے کی اسپیشل مبارک باد دے دیں۔ (جی بالکل) جناب محترم معراج رسول کی صحت کے بارے میں جان کر بہت دکھ ہوا...... اللہ ان کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ عذرا آپی بہت باہمت اور لائقِ تحسین خاتون ہیں۔ (عذرا آپی دعاؤں کے لیے جزاک اللہ کہتی ہیں) اونچی اڑان رفعت شبانہ نے اچھے ٹاپک پر قلم اٹھایا ہے، ایسے کردار ہر دوسرے تیسرے شہر میں مل جاتے ہیں۔ خوش قسمت اچھے موضوع پر صبر و برداشت سے گندھی تحریر تھی۔ خاص مہمان بھی اچھی تحریر تھی۔ پاکیزہ میں اس ماہ بیسٹ تحریر میری اپنی رائے میں سیما بنت عاصم کی کڑوا گھونٹ تھی۔ ہمارے معاشرے میں پھیلے ہوئے ناسور کی بھرپور عکاسی کرتی ہوئی۔ ویلڈن سیما جی کاش کہ کسی سنگدل کی اس تحریر پر نظر پڑ جائے اور وہ سبق حاصل کرے...... جلترنگ بھی خوب تھا۔'' (نرگس نسیم، میں آپ کو ہرگز نہیں بھولی۔ جی ہاں آپ دلکش میں باقاعدگی سے لکھتی تھیں، آپ جیسے پُرخلوص قارئین ہی سے تو پاکیزہ میں رونق ہے۔ جہاں تک انٹرویوز کی بات ہے وہ بھی لگ جائے گا ویسے دلکش اور پاکیزہ میں یہ کئی مرتبہ آچکا ہے)

✍ پروین عذرا تشنہ، کراچی سے۔ ''بیٹی ہم تو دواؤں پر چل رہے ہیں بس تم سب دعاؤں میں یاد رکھو، فی الحال کچھ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

نہیں لکھ پا رہی...... انجم انصار کیسی ہیں؟ اب تم نے بھی کافی حد تک سنبھال لیا ہے، پاکیزہ تو ہم شروع سے ہی پڑھتے آ رہے ہیں۔‘‘ (پروین آپا اللہ آپ کو صحت و سلامتی دے، آپ اپنی شاعری بھی بھیجیں اور میری رہنمائی بھی ضرور کریں)

✍ سحرش فاطمہ، کراچی سے۔ ’’باجی میری تحریر پر بھی نظرِ کرم کرلیں۔ پاکیزہ تو خیر باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں۔ رفعت سراج اور شیریں حیدر کے بہت عمدہ ناول ہیں۔‘‘ (ان رائٹرز تک آپ کی تعریف پہنچائی جا رہی ہے۔ آپ کی تحریروں کی بھی جلد ہی باری آئے گی)

✉ زرینہ مشتاق، منڈی بہاؤالدین۔ جی زرینہ تمام سلسلوں میں شامل ہونے کا شکریہ...... ہاں آپ اپنا تعارف ضرور بھیجیں۔ باتیں بہار و خزاں میں بھی شامل ہوں اور اپنے کسی بھی رشتے دار کی شادی کا احوال بھی بھیج سکتی ہیں۔

✉ سائرہ، سرگودھا۔ روحانی مشورے پسند کرنے کا شکریہ...... اس سے تمام قارئین استفادہ کرسکتے ہیں...... ہم بے حد جیّد اور مستند عالمِ دین سے رجوع کر کے آپ کے مسائل کا حل قرآن و سنت نبویؐ کے احکام کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، پاکیزہ کے صفحات پسند کرنے کا شکریہ

✍ صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ سے۔ ’’نزہت صاحبہ آپ نے بہت اچھی طرح ادارت سنبھالی مبارک ہو (جی شکریہ) انشاءاللہ عذرا آپی سے بھی فون پر بات کروں گی۔ مجھے تو چالیس سال سے زیادہ ہوگئے ہیں آپ کے تمام رسالے پڑھتے ہوئے بے حد دلچسپ، اصلاحی اور سبق آموز کہانیاں اور باتیں ہوتی ہیں۔ رسالے میں انجم انصار کی کمی تو ہے مگر پھر بھی پورا پاکیزہ ویسے ہی ہے۔‘‘ (مختصر ٹیلی فونک تبصرے کا شکریہ...... بس آپ کی دعائیں چاہئیں۔)

✍ مسرت رانی خلیل، کراچی سے ’’نزہت آپ کو نئی ذمے داری مبارک ہو...... ہماری دعائیں، نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں، آپ بہت اچھے انٹرویوز لیتی ہیں، بہت عمدہ سوالات ہوتے ہیں، ہم تو عرصہ دراز سے پاکیزہ کے قاری ہیں، (جی ہاں میں آپ سے واقف ہوں) انجم انصار نے نہایت محنت اور محبت سے بہنوں کی محفل کا سلسلہ چلایا۔ ان سے ایک انسیت ایک وابستگی تھی۔ اللہ انہیں صحت دے (الٰہی آمین) آپ کے اور سب اراکینِ پاکیزہ کے لیے دعائیں۔ عذرا صاحبہ کی باتیں بھی بہت اچھی لگیں۔ ہم تو گھریلو ذمّے داریوں کے باوجود پاکیزہ سے رابطہ رکھے ہوئے ہیں۔ (آپ کی محبت قابلِ قدر ہے) ایک کمی محسوس ہوتی ہے اگر برا نہ مانیں تو بتاؤں (جی ضرور) کہ اس میں ڈاکٹر کی کمی لگتی ہے کچھ گھریلو نسخے، اودویات وغیرہ بتائیں کوئی گھریلو تدابیر صحت سے متعلق کوئی مضمون دیسے تو یہ مکمل پرچا ہے۔‘‘ (مسرت رانی آپ کے خوب صورت تبصرے کا شکریہ، تجویز قابلِ غور ہے، دعاؤں کے لیے شکر گزار ہیں)

✍ فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ ’’جون کا پاکیزہ ملا سادہ سے سرورق سے سجا، ماڈل سادگی میں بھی بے حد اچھی لگ رہی ہیں کیونکہ سادگی میں حسن ہے ہماری پیاری دلعزیز بہن انجم انصار جی کو اللہ تعالیٰ صحتِ کاملہ سے نوازے (الٰہی آمین) وہ تو میرا دل ہیں جس میں وہ ہر وقت رہتی ہیں، نزہت اصغر کو ایڈیٹر کی صدارت مبارک ہو (بہت شکریہ) وہ بھی بے حد پیاری ہیں۔ پاکیزہ میں لکھے اور پڑھے بغیر تو میں نہیں رہ سکتی۔ دین کی باتیں پڑھ کر دلی سکون ملا آپ نے مجھے کچھ کہنا ہے بہت ہی اچھا لکھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک افسانے‘ واہ مزہ آگیا۔ ذکیہ بلگرامی کو میری طرف سے بے حد سلام اور دعا...... ہم بھی ذکیہ جی کے نقشِ قدم پر چلیں، انجم جی کو پوتے کی بے حد مبارک باد۔ خوش قسمت‘ عقیلہ حق جی کیا کمال کا لکھتی ہو خوش رہو۔ فرح طاہر بے حد اچھا لکھ رہی ہیں، خاص مہمان بے حد پیاری تحریر آپ کو بر تھ ڈے مبارک ہو۔ غلام گردش، ہلکے دکھ، بہت دیر کی اور ناولٹ بے حد پسند آئے سب کو دعا اور سلام جو وفات پا گئے اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے، بیماروں کو اللہ تعالیٰ صحت دے، آمین۔ سب کو عید مبارک......‘‘ (فریدہ فری پیارے سے خط کا شکریہ...... دعاؤں کے لیے جزاک اللہ، اللہ پاک آپ کو صحت سے رکھے۔)

✉ خالد محمود، اسلام آباد۔ آپ کی تعزیت بالہ احمد تک پہنچا دی ہے، رسالے کے مطالب پسند کرنے کا شکریہ...... آپ کی دعائیں ہیں، انشاءاللہ پاکیزہ میں آپ سب کے ہی مشوروں سے نئے نئے سلسلے دیتے رہیں گے۔

✉ ملیا سمیون، سکھر ی۔ آپ کا محبتوں بھرے الفاظ سے گندھا خط ملا...... آپ لکھنے کی مشق ضرور کیجیے مگر پہلے جی بھر کر مطالعہ کیجیے۔ لکھنا خداداد صلاحیت ہے ہم تو صرف نوک پلک سنوارتے ہیں ساری محنت تو مصنفین کی ہی ہوتی ہے، امید

ہے آپ سمجھ گئی ہوں گی۔ ہاں تبصرہ ضرور بھیجیں۔

✍ نیلوفر، بہارہ کہو سے۔ ''ماہِ صیام اختتام پر ہے، آپ نے بہت خوب صورت دعائیں اور رمضان کے حوالے سے تحریریں دیں، بے شک پاکیزہ ایک معیاری اور ادبی رسالہ ہے، تمام کہانیاں بھی اصلاحی تھیں، دلچسپی کے ساتھ، ساتھ سبق بھی ہو تو اچھا لگتا ہے۔ (جی بالکل) ماہ جون کے شاعر کی غزلیں بہت عمدہ تھیں، اگر اس کے صفحات بڑھا دیں (کوشش کریں گے) شوبز سے اجنبی کا انٹرویو مزے کا تھا۔ کسی رائٹر کا اب کب دیں گی (جی اسی ماہ شامل ہے) آپ سب کو عید کی پیشگی مبارک باد...... باجی عذرا رسول کی باتیں دل کو لگیں، وہ ضرور کچھ نہ کچھ لکھیں۔'' (نیلوفر مختصر خط کا شکریہ جی ہاں عذرا صاحبہ اپنی بہنوں سے گفتگو کرتی رہیں گی۔ رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ)

✍ عذرا آفتاب خان، بہت محبت سے لندن سے تشریف لائی ہیں۔ ''معراج صاحب کی علالت کے بارے میں پڑھا...... تشویش ہے، میں دعا کرتی ہوں، اللہ کرے آپ کا یہ خوب صورت ساتھ، قائم رہے، آمین۔ انجم انصار اللہ کرے آپ مکمل طور پر صحت یاب ہوں۔ میں اکثر پاکستان میں نہیں ہوتی، اس لیے خبریں دیر سے ملتی ہیں، ڈیر نزہت اصغر آپ نے بروقت پاکیزہ کا چارج سنبھال لیا۔ بہت مبارک ہو۔ نیلم احمد بشیر صاحبہ کی دلچسپ اور معلوماتی باتیں بہت اچھی لگیں اور بشریٰ سیال کا ناولٹ جاؤں کہاں میں ایک ایسی داستان ہے جو ہر ماں اور باپ کا دل دہلا دے۔ ظلم اور انسانیت سوز سلوک ہمارے معاشرے میں ازل سے ہو رہا ہے، اس ترقی یافتہ دور میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بشریٰ نے بہت خوبی اور ہمت سے اس ٹاپک کو چھیڑا ہے۔ خدا کرے ہم سب کے اندر کا احساس جاگ جائے، آمین۔''

✍ تسنیم کوثر، کراچی سے۔ ''پاکیزہ ہمیشہ ترقی کی راہوں میں سب سے آگے رہے گا، انشاء اللہ! پاکیزہ سے ہمیں دلی انسیت ہے اور میں اپنی پیاری مدیرہ نزہت سے پوری، پوری امید رکھتی ہوں کہ وہ ہمیں بہنوں کی محفل میں ہمیشہ شامل رکھیں گی۔ (جی ضرور) من جاں بازم، سحر ساجد کا ناول بہت طویل ہوتا جا رہا تھا اسے ہیپی اینڈ کے ساتھ جلد مکمل کریں۔ البتہ ہم کو عبث بدنام کیا، سیما رضا ردا کے ناول کی اسٹوری اب نکھرنے لگی ہے۔ مزہ آنے لگا ہے اور جناب شیریں حیدر کے امرت کا کیا کہیں اللہ اتنا مشکل ناول ہے، ہر مہینے دماغ پر زور ڈال کر کہانی اور کردار یاد کرنے پڑتے ہیں، اس وجہ سے اب اس ناول میں دل نہیں لگ رہا ہے، ویسے اوور آل تو بہتر ہے، (اب ناول میں خاندانی رشتے داریاں تو ہوتی ہی ہیں) ناولٹ میں بشریٰ سیال کا جاؤں میں کہاں اچھا لگا۔ ناہید سلطانہ اختر کا رسائی نارسائی بہت خوب دل کو چھو گیا، ویلڈن مصنفہ مبارک باد کی مستحق ہیں، یہ کہاں بچیں کہ دل ہے، خوب صورت اور دلکش طرزِ تحریر طلسماتی شاہانہ زندگی' امیرانہ ٹھاٹ باٹ دولت ہیرے موتی یہ سب تو ناول میں شامل ہیں لیکن اسٹوری میں جان نہیں ہے، اسے آرٹیفشل ناول کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ (ارے یہ حقائق ہیں۔ ہر طبقے کے متعلق معلومات مصنفہ دے رہی ہیں یہ ان کا کمال ہی تو ہے جبھی تو کردار نگاری بھی سمجھ آئے گی) باقی تمام افسانے اور دوسرے سلسلے اچھے تھے۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✍ صدف نورین، لاہور کینٹ سے۔ ''سب سے پہلے آپ کو پاکیزہ کی سالگرہ کی بہت، بہت مبارک باد...... آنٹی مصروفیت کی وجہ سے خط نہیں لکھ پائی۔ آپ کی دعاؤں سے مجھے ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب مل گئی ہے، بس اسی وجہ سے پاکیزہ سے غیر حاضر رہی لیکن پاکیزہ پڑھنے کے لیے ٹائم نکال ہی لیتی ہوں۔ ماشاء اللہ سب سلسلے بہت عمدہ ہیں، انجم انصار...... کا ناول بہت اچھے انداز میں اختتام پذیر ہوا۔ پاکیزہ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، اللہ تعالیٰ مزید ترقی اور کامیابی عطا فرمائے، آمین۔'' (جاب کی بے حد مبارک باد، تمام تحریروں پر تبصرہ بھیجیں)

✍ عظمیٰ زہری، اوستہ محمد بلوچستان سے۔ ''سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ ہر مسلمان کو صحتِ کاملہ عطا کرے۔ جو بیمار ہیں ان سب کے لیے خصوصی دعائیں، سنبل اعوان اور ان کی امی کو عمرے کی ڈھیروں مبارک باد، اس ماہ مبارک کے صدقے رب کائنات سب کی نیک تمنائیں قبول کرے آمین۔ آپ کو عید کی پیشگی مبارکاں۔ سحر ساجد کا من جان بازم اور شیریں حیدر کا امرت پورے چاند کی طرح اپنے قبضے میں کیے ہوئے ہیں۔ زبردست کہانیاں ہیں میری فیورٹ، شیریں جی لگتا ہے امرت کو کامل نہیں کریں گی مطلب یہ دونوں نہیں مل پائیں گے (پڑھتی رہیے دیکھیں کیا ہوتا ہے) پتا نہیں کیوں رائٹرز کو مزہ آتا ہے ہیرو ہیروئن کو تڑپانے میں۔ ویسے رائٹر ہی جانے الفاظ اور کہانیوں کو گھمانا ہم تو پڑھنے والے ہیں

جی سحر ساجد آپ کی کہانی نے اچھا موڑ لیا ہے میرے خیال سے حیدر اور مومی کی شادی ہونی ہی چاہیے کیونکہ مومی اس کا درد بہتر طریقے سے سمجھ سکتی ہے، سلام ہے آپ کو فوجیوں کی زندگیوں پر قلم اٹھایا۔ جاؤں میں کہاں‘ بشریٰ سیال کی بہت ہی اچھی کہانی تھی کیا ہوا وہ ہیجڑے ہیں انہیں بنایا تو اللہ نے ہی ہے ناں اگر اللہ نے ہمیں مکمل بنایا ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ دوسروں کی توہین کریں۔ اللہ سب کو معاف کرے، وڈی، غلام گردش اور ہلکے دکھ نے بھی دل جیت لیا۔ سبق آموز کہانیاں تھیں کڑوا گھونٹ نے کچھ خاص مزہ تو نہیں دیا پر پانی والی بات نے دل ضرور چھوا واقعی پانی انسان کے لیے نہایت ضروری ہے۔ پانی کے بغیر انسان نامکمل ہے۔ (جی بالکل) پانی ہے تو انسان ہے، باقی رسالہ ابھی نہیں پڑھا۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ اللہ حافظ......“ (پیارے سے تبصرے کا شکریہ آپ کی نظم موصول ہوگئی دعاؤں کے لیے شکریہ)

✍ شازیہ ہاشم میوانی، کھڈیاں خاص سے۔ ”اللہ رب العزت ہمیں حقیقی اور صحیح معنوں میں رمضان المبارک کی مبارک ساعتوں اور گھڑیوں سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ مغفرت کا کچھ سامان ہو جائے۔ اس ماہ میں کوئی کمی تو نہیں تھی وہی کمی تھی جس کا پچھلے ماہ میں نے تذکرہ کیا (آپ کی شکایت جلد دور ہوگی) اداریہ پڑھتے ہوئے دین کی باتیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے گرامی سے دل کو روشنی دیتے ہوئے پہنچی۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی داستانِ عشق کی طرف میں خود تفسیر کی معلمہ ہوں، الحمدللہ صحاح ستہ کی چار کتابیں بخاری ثانی، ترمذی اول و ثانی، سنن ابی داؤد اور مسلم شریف کو پڑھانے کا اعزاز حاصل ہے۔ (ماشاء اللہ) اس دفعہ سب سے پہلے مکمل ناول یہ خالی دامن میرا مقدر پڑھ کر آنکھیں اشکبار بھی ہوئیں اور اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھ گیا کہ زن، زر اور زمین ہی ہمیشہ فساد کی جڑ رہی ہیں اور انہی پر دنیا مرتی ہے۔ جاؤں میں کہاں پڑھ کر تو بشریٰ سیال کو فیس ٹو فیس داد دینے کو دل چاہا ہائے کیا کریں یہ دوریاں...... بہت اچھے اور منفرد موضوع پر لکھ کر دل کو جیت لیا...... واقعی یہ بھی تو اللہ کی مخلوق ہے، ضروری نہیں یہ صرف ناچنے کے لیے ہی ہوتے ہیں، ان کا بنیادی حق ہے کہ ان کو بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جائے۔ پھر جست لگائی سحر ساجد کے من جاں بازم کی طرف ویسے ڈیئر سحر! مومی کو آپ نے حیدر کے ساتھ لا کھڑا کر دیا جو مجھے ایک آنکھ بھی نہ بھایا۔ میرا دل جس بات پر مجھے ابھارتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہنیا ہی حیدر کے ساتھ ہو۔ امرت اچھا جا رہا ہے، پتا نہیں اس کے خوابوں کا کیا انجام ہوگا۔ ہلکے دکھ پڑھ کر دل میں دکھ کی اک دبیز تہ جم گئی۔ رسائی نارسائی میں حارث اور عائلہ کی محبت کا جذبہ تو قابلِ داد تھا مگر حارث کو شادی کے بعد صرف اپنی بیوی سے ہی تعلق رکھنا چاہیے تھا اور عائلہ کو بھی حارث سے رابطہ نہیں کرنا چاہیے۔ بہرحال یہ ایک سبق آموز تحریر تھی۔ خاص مہمان، پڑھا، فرح طاہر کا یہ افسانہ سپرہٹ تھا۔ تسنیم منیر، اللہ آپ کے والد کی مغفرت فرمائے۔ اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔ ڈیئر مدیرہ پاکیزہ اسٹاف اینڈ پاکیزہ ریڈرز میری طرف سے ایڈوانس میں عیدِ سعید عید الفطر مبارک ہو۔“ (تبصرے کا شکریہ...... آپ کو بھی عید مبارک)

✍ ساجدہ ظفر، کمالیہ سے۔ ”گزشتہ ماہ آپی انجم انصار نے پاکیزہ کی ادارت سے دستبردار ہونے کی خبر سنائی تو بے حد...... دل گرفتہ ہوئی اور احتجاج کے طور پر خط بھی نہیں لکھا۔ پھر بے دلی سے جون کا پاکیزہ کھولا تو آنکھیں حیرت کے مارے کھلی کی کھلی رہ گئیں کیونکہ سب کچھ ویسا ہی تھا...... کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ بہنوں کی محفل میں خطوط پڑھے تو ان کے جواب اسی انداز میں پُرخلوص طریقے سے دیے گئے تھے۔ آپی نزہت اصغر شیرینی کا تڑکا لگا کر جب بات کرتی ہیں تو ان کے الفاظ اخلاص کی بگل مارے سیدھے دل میں ترازو ہو جاتے ہیں، (بہت نوازش) بہت خوب آپی نزہت صاحبہ! آپ نے تو پہلی نشست میں ہی ہمارے دل موہ لیے۔ انجم آپی کے جانے سے جو ماحول سوگوار ہو گیا تھا آپ نے پھر سے خوشگوار بنا دیا ہے۔ جون کا پاکیزہ ابھی تھوڑا سا پڑھا ہے کیونکہ رمضان المبارک میں مصروفیات سو فیصد بڑھ جاتی ہیں، اختر شجاعت صاحبہ نے اخلاص پر بہت محنت سے اپنا مضمون تحریر کیا ہے۔ بزمِ پاکیزہ ادر میں اکثر گنگناتی ہوں بے حد معیاری تھے۔ پاکیزہ ڈائری میں اس بار تحریریں کم تھیں اور جلترنگ تو کہیں نظر ہی نہیں آیا (ارے دوبارہ سے دیکھیں نظر آ جائے گا) آخر میں میری جانب سے ادارہ پاکیزہ کے پورے اسٹاف کو دل کی گہرائیوں سے عید الفطر مبارک ہو۔“ (آپ کو بھی دلی عید مبارک ہو، تبصرے کا شکریہ)

✍ مسز افتخار شوق کا ٹیلی فونک تبصرہ میاں چنوں سے۔ ”سب سے پہلے تو عذرا رسول صاحبہ کی باقاعدہ آمد بہت اچھی لگی۔ اور ان کی مصروفیت پڑھ کر دل سے دعائیں نکلیں کہ وہ بطریقِ احسن کس طرح وفا کے تقاضے نبھا رہی

ہیں...... میں تو ان کی زندگی کا احوال رضوانہ پرنس کے قلم سے پڑھ کر بہت متاثر ہوئی تھی بہت دل سے دعائیں نکلتی رہیں۔ اللہ معراج صاحب کو صحت عطا فرمائے اور معراج صاحب اور عذرا صاحبہ اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھیں (الٰہی آمین) میں نے پہلے بھی بتایا تھا۔ ماہ فروری میں ملتان ایک ایجوکیشن میٹنگ کے سلسلے میں گئی تھی جہاں روڈ ایکسی ڈینٹ کا شکار ہوگئی۔ خراشیں تو الگ لیکن دائیں کاندھے پر شدید چوٹ لگی ایک طرح سے معذور ہوکر رہ گئی ہوں۔ (اللہ آپ کو صحت وسلامتی عطا کرے افتخار) میری بہنیں، بھاوجیں سب خدمت کو میرے اردگرد ہیں مگر کیا کروں آرام نہیں آرہا۔ آپ سب بہنیں بھی دعا کیجیے گا یہ تو آپ جانتی ہیں مجھے پاکیزہ سے عشق ہے اس بیماری کے عالم میں بھی پورا رسالہ بصد شوق پڑھا۔ انجم انصار کی صحت کے لیے دعائیں، اب وہ کیسی ہیں (الحمدللہ ٹھیک ہیں)، آپ نے کافی حد تک رسالہ سنبھال لیا ہے، مبارک ہو۔ پاکیزہ تو ہماری جان ہے، رفعت سراج اور شیریں حیدر کے ناول سپر جارہے ہیں۔ کہانیوں میں بھی کافی ورائٹی ہے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ پاکیزہ مزید ترقی کی منزلیں طے کرے۔ آپ سب کو عیدالفطر کی مبارک باد......“ (افتخار مختصر گفتگو کا شکریہ آپ سب کا تعاون رہا تو مزید بہتری آئے گی...... اللہ پاک آپ کو صحت دے تاکہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر تبصرہ بھیجیں الٰہی آمین)

صبا آصف، کراچی سے۔ ”آپ کا بہت شکریہ کہ منزہ کی نظم شائع کی...... آپ سے بات کرکے بہت اچھا لگتا ہے...... آج کل امی کی وجہ سے پریشان ہوں جب سے بہن کا انتقال ہوا ہے امی سنبھل نہیں پارہیں۔ آپ دعاؤں میں یاد رکھیں۔ جون کا شمارہ آہستہ آہستہ پڑھا جس میں عقیلہ حق کا بہترین افسانہ تھا اور بھی کہانیاں اچھی تھیں۔ آپ کو رسالے کی ادارت مبارک ہو۔ ہماری دعا ہے پاکیزہ ترقی پر ترقی کرتا رہے۔“ (اللہ پاک آپ کی والدہ کو صبر دے۔ دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)۔

لائبہ خان، لاہور سے۔ ”سب سے پہلے تو ماہ مئی کے اداریے کی بات کروں گی کہ آپ نے بالکل ٹھیک لکھا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر انسان سے غلطی سرزد ہوجاتی ہے...... کبھی چھوٹی، کبھی بڑی کبھی دانستہ اور کبھی نادانستہ...... آپی جان بس ایسے ہی ایک نادانستہ غلطی مجھ سے بھی ہوئی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ میرے غلطی تسلیم کرنے اور سوری کہنے پر میری سویٹ آپی جان جھٹ سے کہہ دیں گی۔ چلو کوئی بات نہیں۔ آپی آپ نے میری تحریر ڈراپ سین کو اتنی جلد پاکیزہ کے صفحات میں جگہ دی اور جس پر میں نے آپ کو شکریہ کہنے میں اتنی تاخیر کردی۔ (ارے ایسی کوئی بات نہیں یہ آپ کا اپنا رسالہ ہے شکریے کی کیا بات ہے) اپنا آپ اس وقت اور بھی بہت چھوٹا محسوس ہوا جب آپ نے میری دوسری تحریر امتحان گاہ کو بھی قابلِ اشاعت گردانتے ہوئے فوراً ہی لیس کا رسپانس دے ڈالا۔ کہاں آپ کہ اتنے ڈھیروں خطوط موصول ہونے کے باوجود اتنی ذمے داری اور پیار سے مجھے ٹائملی رسپانس دیں اور کہاں میں کہ مارچ سے اب تک آپ سے رابطہ ہی نہیں کرپائی۔ آئم رئیلی سوری آپی جان...... بس کیا بتاؤں آپی کہ وزیٹنگ لیکچرر شپ کے ساتھ، ساتھ مارننگ ٹائم میں دارارقم اسکول میں پرنسپل جوائننگ نے اس قدر مصروف کرڈالا کہ بندی کو اپنا آپ گم ہوتا محسوس ہوا۔ (کامیابیاں مبارک ہوں) تمام پاکیزہ اسٹاف کو رمضان مبارک۔“ (مختصر خط کا شکریہ، بھرپور تبصرہ بھی لکھیے)

ظل شاہین، رحیم یار خان سے۔ ”مئی کا پاکیزہ ملا، ہمیشہ کی طرح آغاز اللہ تعالیٰ کے پاک نام سے کیا۔ دین کی باتیں قلبی سکون عطا کرتی ہیں، سبحان اللہ۔ پھر آپ کا اداریہ پڑھا غلطی کے موضوع پر سادہ سے پیرائے میں گہری بات کہہ دینا یہ آپ کے قلم کا کمال ہے۔ انجم باجی اللہ کریم آپ کا سایہ ہم سب پر سلامت رکھے آپ جہاں رہیں اللہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔ آپ نے اپنی طبیعت کو مدِنظر رکھ کر اگر یہ فیصلہ کیا ہے تو ٹھیک ہے کہ آپ کا اپنی ذات کے لیے بھی حق ہے۔ آپ پاکیزہ سے دور ہورہی ہیں مگر ہمارے دلوں سے نہیں ہم تاحیات آپ سے رابطے میں رہیں گے۔ انشاءاللہ کیونکہ ہمارا آپ سے قلمی تعلق سے زیادہ قلبی رشتہ ہے۔ آپ کے ناول گم شدہ محبت کی آخری قسط تھی اینڈ اچھا لگا ہم تو سمجھے کہ واقعی عامر سے صبا کی شادی ہوگئی مگر بعد میں جانا کہ وہ خواب تھا۔ ویسے افسانوں اور ڈراموں میں خواب بھی بہت منظم طریقے سے آتے ہیں۔ ذکیہ آنٹی کی تحریر اللہ اور اس کا نور پڑھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس بار شمع ہدایت کی کمی محسوس ہوئی۔“ (آپ کی محبتوں اور دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)

✍ فریدہ ہاشمی تحفی، کراچی سے۔ ''حسب عادت بہنوں کی محفل کا صفحہ کھولا تو آپ کی ریٹائرمنٹ کے بارے میں پڑھ کر دل کو دھچکا سا لگا...... انجم انصار اور پاکیزہ کا نام تو لازم و ملزوم ہوگئے تھے۔ اس طویل عرصے میں جتنی محبت لگن اور خلوص کے ساتھ آپ نے کام کیا اور ہم سب پاکیزہ بہنوں کو اپنی محنت اور خاص توجہ سے جوڑے رکھا۔ اس کے لیے ہم سب بہنیں آپ کی شکر گزار ہیں۔ (جی! انجم شکریہ کہتی ہیں) خدا آپ کو ہمیشہ اچھا رکھے اور آپ کی نیکیوں اور خلوص کا آپ کو بہت اچھا اجر نصیب فرمائے، آمین۔ تینوں ناول پڑھ لیے۔ آپ کے ناول کا خاتمہ بہت اچھا لگا۔ ہر نئے موڑ پر دل دھڑکتا تھا۔ مگر آپ نے اپنی مشاق تحریر سے سارے مسئلے حل کر دیے۔ پاکیزہ ڈائری بھی میری پسندیدہ ہے۔ بہنوں کی نہایت عمدہ تحریریں شائع ہوئی ہیں۔''

✍ حمیرا وحید، واہ کینٹ سے۔ ''بچپن سے لکھتی آئی ہوں کچھ وجوہات کی بنا پر زیادہ منظر عام پر نہیں آئی۔ باقاعدہ لکھنے کا آغاز شادی کے بعد شروع کیا۔ شاعری بھی کرتی ہوں افسانہ بھی لکھتی ہوں، مختلف ٹاپک پر بھی لکھتی رہتی ہوں۔ پاکیزہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔'' (ارے حمیرا تفصیلی تبصرہ بھیجیے گا۔ آپ کی شاعری کو اصلاح کی ضرورت ہے۔ لکھنے کی مشق جاری رکھیے)

✍ ایک دکھی بہن، کراچی سے۔ ''میں آپ کے پرچے کی ایک خاموش قاری، بہنوں کی محفل شوق سے پڑھتی ہوں...... اور دیکھتی ہوں کہ محفل بے حد اپنائیت کے رنگ لیے ہے اور اس میں ہر شعبہ ہائے زندگی سے منسلک خواتین ایک دوسرے کی دکھ سکھ کی ساتھی ہیں۔ میری عمر چوالیس 44 سال ہے اور میں ان میرڈ ہوں۔ باوجود کوشش اور دعا کے شادی نہیں ہو پا رہی کہ مناسب رشتہ اس دور کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ آج سے چار سال پہلے اک معمولی سی بے قاعدگی کے بعد جو رپورٹس سامنے آئیں ان کے تحت یوٹرس میں فائی برائیڈز ہوگئے ہیں۔ عزیز بہنو! ڈاکٹرز اب آپریشن کا کہتی ہیں، جس میں یوٹرس نکالے جانے کے چانسز ہیں۔ میری آپ سے استدعا ہے زندگی کے جو معاملات میرے بس میں نہیں وہ دعا کے محتاج ہیں۔ نہ جانے کس کی دعا سے پروردگار میری مشکل آسان کر دے۔ پاکیزہ کی محفل میں ہر شعبہ ہائے زندگی سے منسلک خواتین شرکت کرتی ہیں...... اگر کسی کے پاس کوئی ٹوٹکا، علاج، روحانی دعا یا کوئی بھی حل ہو برائے مہربانی میری مدد ضرور کریں۔'' (پیاری بہن ایک تو آپ اپنا نام ضرور لکھیے گا تاکہ نام کے ساتھ دعا ہو سکے۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہے۔ تمام پاکیزہ بہنیں آپ کے حق میں ضرور دعا کریں گی بس آپ بھی اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھیں وہی سب پریشانیوں کا دور کرنے والا ہے)

✍ فائزہ افتخار سحر، لاہور سے۔ ''پاکیزہ بہنوں کو بہت، بہت پیار و سلام و دعا۔ رمضان کی آمد، آمد ہے سب کو رمضان مبارک اللہ سب کو اپنی رحمتوں اور ڈھیروں خوشیوں سے نوازے۔ (الٰہی آمین اور اب تو عید بھی آگئی) اپیا آپ کی گم شدہ محبت کا انجام بڑا فلمی سا لگا مگر بہت، بہت اچھا تھا۔ شیریں حیدر کی امرت بھی خوب جا رہی ہے۔ رفعت سراج بھی خوب صورت لکھ رہی ہیں۔ نفیسہ سعید کی تحریر سالگرہ کا دن آیا ہے، کچھ بچگانہ سی تھی۔ ہما بیگ کی ساجن کی سہیلی بہت اچھی لگی۔ مجھے مختصر کہانیاں بہت بھاتی ہیں، جلترنگ ریپیٹ ہو رہے ہیں کیا؟ (جی ہاں) خوب صورت رفاقتیں، خوب تھا، آپ کی بدولت تقریباً سبھی رائٹروں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔'' (مختصر ترین تبصرے کا شکریہ...... ماہِ رمضان کی برکتیں اور عید کی سعادتیں آپ کو بھی مبارک ہوں)

✍ مسرت پرویز کا ٹیلی فونک تبصرہ کراچی سے۔ ''عذرا صاحبہ کی خدمت میں سلام اور ان کے لیے بہت سی دعائیں معراج صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے، آج کل رمضان کی ظاہر ہے مصروفیات ہیں پرچہ آہستہ، آہستہ پڑھ رہی ہوں، انجم باجی کی کمی تو ظاہر ہے محسوس ہوتی ہے ان کو سلام مگر نزہت آپ نے بھی بہت اچھا سنبھالا ہے۔ میری بہن کا نام بھی نزہت ہے۔'' (ارے میں بھی تو آپ کی بہن ہی ہوں ناں چلیں اب عید کے بعد تفصیلی تبصرہ بھی کیجیے گا۔ معراج صاحب کی طبیعت آپ ڈاؤن چلتی رہتی ہے عذرا صاحبہ دعاؤں کے لیے جزاک اللہ کہتی ہیں۔)

✍ ثمینہ کوکب، جہلم سے۔ ''مئی کا شمارہ ہمیشہ کی طرح بہت خوب صورت اور مکمل لگا۔ بہنوں کی محفل میں اپنا نام دیکھ کر ناقابلِ بیان حیرت حاصل ہوئی۔ خوش آمدید کہنے کے لیے آپ کا بے حد شکریہ...... ذکیہ بلگرامی صاحبہ کی تحریر اللہ کا نور دلوں پر گہرا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ تمام سلسلے وار ناولوں کی تعریف بھی احاطۂ قلم میں لانا بہت مشکل ہے کہ لفظوں میں موتی پروئے

ہوئے ہیں، جلترنگ لبوں پر ہنسی بکھیرنے کو کافی ہے۔ روحانی سلسلے کا بھی کوئی مقابلہ نہیں ہے، بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ ایک مکمل دل کو چھو لینے والا ادبی رسالہ ہے۔ جس سے ہم زندگی میں بہت ہدایت و رہنمائی لے رہے ہیں، میری طرف سے تمام بیمار بہنوں کو دائمی صحت کی دعا۔ تمام پاکیزہ بہنوں کو سلام۔'' (سب کی طرف سے وعلیکم السلام، مختصر تبصرے کا شکریہ اور حیرت کی کیا بات ہے یہ آپ لوگوں کی ہی محفل ہے)

✉ **منعم ملک، ڈیرا غازی خان۔** آپ کے پیارے سے خوش خط کا شکریہ۔ ڈیرا غازی خان کی تو زمین ادبی لحاظ سے بہت زرخیز ہے۔ ہماری بہت سی پیاری اور باصلاحیت لکھاری اس سرزمین سے تعلق رکھتی ہیں۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ دوسرے سنی سنائی پر نہیں بلکہ آنکھوں دیکھی اور خود اپنے کانوں سے سنی پر یقین کیا کریں۔ آپ کے پیارے سے خط کا شکریہ!

✉ **فردوس امین بلوچ، گاؤں بارٹھی سے۔** آپ کی کہانی ملی، فردوس آپ پہلے رسالے کا کئی ماہ تک اچھی طرح مطالعہ کریں، کہنہ مشق قلمکاروں کی تصانیف پڑھیں پھر کہانی لکھیں۔ رسالے میں شرکت کے لیے آپ تبصرہ مختلف شعرا کی دلچسپ شاعری اور سبق آموز کارنرز وغیرہ بھیجیں۔ آپ کا بہت شکریہ پاکیزہ کو پسند کرنے کا۔

✉ **سیدہ عزیز، فاطمہ، گلگشت کالونی ملتان۔** پاکیزہ سے آپ کی محبت لائقِ ستائش ہے یعنی تمام عمر گزر گئی اس رسالے کو پڑھتے۔ اللہ آپ کے آنکھوں کی روشنی برقرار رکھے۔ آپ تو ہماری سینئر ترین قاری ہو گئیں ماشاءاللہ۔

✉ **انیقہ انا، چکوال۔** خیریت ہے آپ کہاں گم ہیں، خوب صورت مراسلوں کے ساتھ فوراً حاضری دیں۔

✉ **عین الحیا ترمذی، وادی کاغان۔** آپ کیسی ہیں پاکیزہ آپ کو بلا رہا ہے۔ آپ کے بھیجے مراسلے تو وقتاً فوقتاً لگتے ہیں۔

✉ **دردانہ نوشین خان، مظفر گڑھ۔** پاکیزہ نے آپ کو ہمیشہ خوش آمدید کہا ہے، آپ کی کہانی قریبی اشاعت میں شامل ہوگی۔ باتیں بہار و خزاں میں شرکت کا شکریہ۔ آپ کو عید الفطر کی خوشیاں مبارک ہوں۔

عید کی خوشیاں مناتے پیارے، پیارے قارئین اب آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں کہ صفحات میں مزید باتوں کی گنجائش نہیں سو اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گے۔ ماہ ستمبر کے لیے نوٹ کرلیں کہ دلہن نمبر ہوگا بقرعید کی خوشیوں کے ساتھ شادی کے احوال، تصاویر، مراسلات سے لطف اندوز ہونے کا وقت ہوگا لہٰذا آپ سب بھی بھرپور شرکت کریں۔

آپ سب کی سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ، ساتھ ہمیں بھی پروردگار عالم نے مہلتِ حیات عطا کی تو اگلے ماہ انشاءاللہ مزید آب و تاب سے محفل سجائیں گے۔ کوشش کیا کیجیے کہ ہر ماہ کی پندرہ سے اٹھارہ تاریخ کے درمیان تبصرے ہمیں مل جائیں۔ دفتر کا مکمل پتا اور رابطہ نمبرز نیچے تحریر ہیں اس کے علاوہ محفل کے آغاز میں پوسٹ باکس نمبر اور ای میل ایڈریس بھی درج ہے۔ محفل کے اختتام پر آئیں پہلے درود پاک پڑھتے ہیں اور وحدہ لاشریک کی بارگاہ میں دعا مانگتے ہیں اے بلندیوں پر رہنے والے ہمارے رب ہم تجھ سے بہت راضی ہیں، مالک تو بھی ہم سے راضی ہو جا...... اے مہربان خالق ہماری توبہ قبول کرلے اور ہمیں معاف کردے...... یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم، یا کریم ہمارے اور اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری امت کے تمام گناہوں کو معاف فرمادے اور ہمارے تمام گناہوں کو نیکیوں میں بدل دے۔ اے پاک پروردگار! موت سے پہلے ہماری مغفرت فرما اور موت کے وقت ہم پر رحم فرما اور موت کے بعد ہمیں عذاب نہ دینا اور قیامت کے روز ہمارا نامۂ اعمال ہمارے داہنے ہاتھ میں دینا...... بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

یا مجیبُ، یا مجیبُ، یا مجیبُ آخر میں ایک پھر درودِ ابراہیمؑ پڑھ لیں۔

دعا گو

نزہت اصغر

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500
فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783,021-35802552 EXT 107,118

پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمد باری تعالیٰ

اڑتے بادل، بہتے جھرنے
گرتی بوندیں تجھ سے ہیں
میرے مالک میرے اللہ
ساری دنیا تجھ سے ہے
تجھ کو سوچوں، تجھ کو چاہوں
تجھ سے ہی ہر آس لگاؤں
سب کو دینے والا تو ہے
میرا ایک سہارا تو ہے
تو ہی مالک تو ہی خالق
تو ہی سارے جہان کا رازق
ہر دعا تو پوری کرے گا
کچھ ابھی کچھ بعد میں دے گا
تیرا کرم ہو ہر پل مولا
یہی دعا ہے تجھ سے اللہ

پسند: ارم کمال، فیصل آباد

نعت رسول مقبولؐ

میں قسمت کو جگانا چاہتی ہوں
مدینے میں ٹھکانا چاہتی ہوں
گناہوں سے بھری دنیا سے جا کر
وہاں آنسو بہانا چاہتی ہوں
جسے دیکھوں تو روشن ہوں یہ آنکھیں
وہی منظر سہانا چاہتی ہوں
جو ہاتھ آجائے اب خاکِ مدینہ
اسے سرمہ بنانا چاہتی ہوں
جو میری روح کو گلزار کر دے
وہی پودا لگانا چاہتی ہوں
جہاں ملتا ہے بن مانگے ہی سب کو
وہاں خاموش جانا چاہتی ہوں
میں دنیا سے کنول اکتا چکی ہوں
یہاں سے جلد جانا چاہتی ہوں

شاعرہ: یاسمین کنول، پسرور

طب نبویؐ سے علاج

حضرت عثمان بن ابی العاصؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے جسم کے درد کو بتایا تو رسول اللہؐ نے فرمایا۔ جہاں پر درد ہوتا ہے وہاں پہ ہاتھ رکھ کر تین بار بسم اللہ اور سات مرتبہ یہ دعا پڑھے۔ (**اَعُوْذُ بِاللّٰہِ وَ قُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّمَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ**)

ترجمہ: میں اللہ اور اس کی قدرت کی پناہ چاہتا ہوں اور اس کی تکلیف سے جو مجھے پہنچی ہے اور جس سے میں ڈرتا ہوں چنانچہ اس صحابی نے جب یہ کلمات کہے تو ان کا درد ختم ہو گیا پھر وہ صحابی اپنے گھر والوں اور دوسرے ضرورت مندوں کو ہمیشہ ان کلمات کی تلقین کرتے تھے۔ (مسلم)

مرسلہ: سلمٰی رمضان، کھڈیاں خاص

سنہری باتیں

☆ مصیبت میں صبر کرنا ایمان ہے۔
☆ منافق کبھی دوست نہیں بن سکتا۔
☆ انسان کی تمام خوبیوں کا مرکز زبان ہے۔
☆ عقل ایک ایسا کپڑا ہے جو کبھی پرانا نہیں ہوتا۔
☆ دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔

پھول

وفا کرنی ہو تو پھولوں سے سیکھ جو شاخ سے جدا ہو کر مرجھا جاتے ہیں۔ خوش خلقی ایک پھول ہے، جس کی خوشبو سے سب لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔

خدا بڑی سے بڑی سلطنتوں سے خفا ہو سکتا ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

لیکن چھوٹے چھوٹے پھولوں سے کبھی ناراض نہیں ہوتا۔

☆☆☆

بیتے جو شام تیرے بغیر
وہ شام، شام نہیں ہوتی
گزر تو جاتی ہے......
لیکن قیامت سے کم نہیں ہوتی

مرسلہ: صدف نورین، لاہور

میرے خدا

گرچہ اس لائق تو نہیں
پھر بھی
میں چاہتی ہوں
صرف وہی کروں
جو
تو چاہے

مرسلہ: جینا، کراچی

دعا

اے میرے رب......تو نے میرے ہر عیب کی پردہ پوشی کی ہے۔ میرے قلب و ذہن کو اتنی وسعت عطا کر دے کہ میں ڈوبتی، ابھرتی اور بنتی، بگڑتی خواہشوں کے راستے میں پیش آنے والے ناپسندیدہ لمحوں کو ہمیشہ کے لیے بھلا سکوں۔

ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ

چہ خوب

ایک روز نواب مرزا داغ دہلوی نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک صاحب ان سے ملنے آئے اور انہیں نماز میں مشغول دیکھ کر لوٹ گئے۔ اس وقت داغ نے سلام پھیرا ملازم نے کہا فلاں صاحب ملنے آئے تھے اور چلے گئے۔ فرمانے لگے دوڑ کر جا ابھی راستے میں ہوں گے۔ وہ بھاگا، بھاگا گیا اور ان صاحب کو بلا کر لایا۔ داغ نے ان سے پوچھا کہ آپ آ کر چلے کیوں گئے تھے؟ وہ کہنے لگے۔ آپ نماز پڑھ رہے تھے اس لیے میں چلا گیا۔ داغ نے فوراً کہا حضرت! میں نماز پڑھ رہا تھا۔ لاحول ولا تو نہیں پڑھ رہا تھا جو آپ بھاگے۔

انتخاب: گلہائے رنگارنگ

مرسلہ: حافظہ ست البنات، تونسہ شریف

پیار

اگر کسی سے پیار کرو تو اتنا کرو اتنا کرو کہ وہ چاہ کہ بھی تم سے نفرت نہ کر سکے۔

نفرت: زندگی تو محبت کے لیے ہی کم ہے تو نفرت کی گنجائش کہاں سے نکلے۔ ہاں اگر نفرت ہی کرنی ہے تو برائی سے کرو، بدی سے کرو شر سے کرو......

احساس: جب تک دلوں میں احساس نہ ہو کوئی رشتہ کامیاب نہیں ہوتا۔

غصہ: اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہیں چاہیں تو اپنے اندر سے غصہ اور تکبر ختم کر دو۔

یقین: اگر کسی پر یقین کرنا ہے تو حد سے گزر جاؤ یا تو ایک اچھا انسان ملے گا یا پھر اچھا سبق۔

مرسلہ: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

غزل

محبت میں مجھے تیری جفائیں مار ڈالیں گی
ارے ظالم مجھے تیری ادائیں مار ڈالیں گی
محبت ہے تو پھر میری طرف جلدی سے آ جاؤ
زمانے کی طرح تم کو انائیں مار ڈالیں گی
کبھی گھر کے دریچوں سے ہمیں آواز مت دینا
تمہیں اِک دن کبھی وحشی ہوائیں مار ڈالیں گی
کسی کے عشق میں اتنے بھی پاگل تم نہ ہو جانا
وگرنہ سر پھری تم کو بلائیں مار ڈالیں گی
ابھی بھی وقت ہے میری طرف واپس پلٹ آؤ
بچھڑنے کی تمہیں اِک دن سزائیں مار ڈالیں گی
ابھی تو ہاتھ پر مہندی سے اس کا نام لکھتی ہوں
تمہیں اِک دن یہ تمثیلہ حنائیں مار ڈالیں گی

کاوش: تمثیلہ لطیف، لاہور

امام ابو حنیفہ کی ذہانت

ایک شخص امام ابو حنیفہ کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ''بہت عرصہ ہوا میں نے اپنا کچھ مال کسی جگہ دفن کیا تھا اب وہ جگہ یاد نہیں آ رہی کوئی تدبیر بتائیں؟'' امام

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

صاحب نے فرمایا۔ ”یہ کوئی فقہ کی بات تو ہے نہیں البتہ ایک تدبیر بتاتا ہوں گھر جاؤ اور آج ساری رات نماز پڑھو، امید ہے کہ انشاء اللہ تمہیں وہ جگہ یاد آجائے گی۔“ وہ شخص چلا گیا ابھی چوتھائی رات ہی گزری تھی کہ اسے وہ جگہ یاد آگئی۔ اس نے جا کر امام ابوحنیفہؒ کو بتایا تو انہوں نے کہا۔ ”مجھے خیال یہی تھا کہ شیطان تمہیں ساری رات نماز نہیں پڑھنے دے گا لیکن تمہیں چاہیے تھا کہ جگہ یاد آنے کے بعد بھی پوری رات نماز پڑھتے رہتے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے۔“

مرسلہ: جمیلہ بلوچ، لوہی

عید اور بہار

عید کا دن بہار کا دن ہے
یہ ہمارے وقار کا دن ہے
ہم مناتے ہیں خوش دلی سے اسے
کس قدر اختیار کا دن ہے
گل مہکنے لگے ہیں گلشن میں
چاندا اترا ہے آج آنگن میں
سرخ رو ہیں سبھی تمنائیں
زندگی آگئی ہے دامن ہے
آشنائے حیات عید کا دن
زندگی کا ثبات عید کا دن
صبر و عزم و عمل کی اِک تصویر
مظہرِ التفات عید کا دن
عید کا دن نشانِ وحدت ہے
عید کا دن خدا کی رحمت ہے

شاعر: ناصر زیدی

مرسلہ: جبین نیاز، ملتان

غزل

کوئی حرکت نہ ہو اور کوئی بھی آواز نہ ہو
دل دھڑکنے کا سلگتا ہوا انداز نہ ہو
کہکشاں ساتھ میں تاروں کے نہ چشمک سی کرے
صبح کی نرم ہوا کا بھی کوئی ساز نہ ہو
گلستاں ہار سے پھولوں کے نہ خوشبو چھلکے
کوئی پھولوں کا نہ کلیوں کا بھی دم ساز نہ ہو
وہ بھی آئے نہ سرِگل نہ کوئی ورد بڑھے
بلبلِ نالہ کناں کا بھی کوئی راز نہ ہو
سرِ آئینۂ دنیا ہو فقط حسن ازل
بس ترا حسن ہو اور کوئی انداز نہ ہو

کلام: فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی

یاد رکھیں

☆دوست وہ نہیں جو رلائے دوست وہ ہے جو رونے نہ دے۔

☆پھولوں کی خوشبو سے لطف اندوز ہونے کے لیے کانٹوں کی چبھن کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

☆کسی کو اتنا مت چاہو کہ زندگی کے کسی موڑ پر وہ تمہاری کمزوری بن جائے۔

☆آندھیاں چاہے کتنی ہی تندو تیز ہوں انسانی عزائم کے آگے ہرگز نہیں ٹھہر سکتیں۔

☆اللہ تعالیٰ کہتا ہے کسی کو تکلیف دے کر مجھ سے اپنی خوشی کی دعا مت کرنا لیکن اگر کسی کو ایک پل کی خوشی دیتے ہو تو اپنی تکلیف کی فکر مت کرنا۔

☆دل پر مصیبتیں آنکھوں کی وجہ سے آتی ہیں۔

پروین افضل شاہین، بہاول نگر

چٹکلے

☆فقیر کنجوس سے۔ ”دس روپے کا سوال ہے بابا!“
کنجوس: ”پوچھو، پوچھو ہوسکتا ہے کہ مجھے جواب آتا ہو۔“

☆☆☆

☆ساس بہو سے۔ ”تم کو کچن میں کچھ آتا ہے۔“
بہو: ”جی، جی چکر۔“

☆☆☆

☆بیوی نے انگلی کے اشارے سے شوہر کو بلایا۔
شوہر: ”بولو...... کیا کام ہے؟“
بیوی: ”کچھ نہیں، بس انگلی کی طاقت چیک کر رہی تھی۔“

زریں زبیر کوٹھاری، کراچی

☆☆☆

فکاہیہ کالم

گوشۂ ظرافت

ادارہ

مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں...... مگر ایسی نشتر زنی بخاطرِ اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔

اپنے پیارے پاکیزہ قارئین کے اس ذوق کی سیرابی کے لیے ہم ہر ماہ ان صفحات پر فکاہیہ ادب کے پُر لطف و یادگار شہ پاروں سے انتخاب پیش کریں گے۔ اس ماہ مقبول و معروف مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کے مجموعے آبِ گم سے منتخب کردہ شہ پارے آپ کے اعلیٰ ذوق کی نذر ......

”ممتاز دانشور ڈاکٹر اسلم فرخی کی رائے...... مشتاق احمد یوسفی کے بارے میں۔

”وہ بات میں بات پیدا نہیں کرتے بلکہ بات خود کو ان سے کہلوا کر ایک طرح کی طمانیت اور افتخار محسوس کرتی ہے۔“

وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

یادش بخیر! میں نے 1945 ء میں جب قبلہ کو پہلے پہل دیکھا تو ان کا حلیہ ایسا ہو گیا تھا جیسا اب میرا ہے۔ لیکن ذکر ہمارے یارِ طرح دار بشارت علی فاروقی کے خسر کا ہے لہٰذا تعارف کچھ انہی کی زبان سے اچھا معلوم ہوگا۔ ہم نے بارہا سنا، آپ بھی سنیے۔

”وہ ہمیشہ سے میرے کچھ نہ کچھ لگتے تھے۔ جس زمانے میں میرے خسر نہیں بنے تھے تو پھوپا ہوا کرتے تھے۔ اور پھوپا بننے سے پہلے میں انہیں چچا حضور کہا کرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی یقیناً وہ کچھ اور لگتے ہوں گے مگر اس وقت میں نے بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ ہمارے ہاں مرادآباد اور کانپور میں رشتے ناتے ابلی ہوئی سویوں کی طرح الجھے اور پیچ در پیچ گتھے ہوتے ہیں۔ ایسا جلالی، ایسا مغلوب الغضب آدمی زندگی میں نہیں دیکھا۔ بارے ان کا انتقال ہوا تو میری عمر آدھی اِدھر، آدھی اُدھر چالیس کے لگ بھگ تو ہو گی لیکن صاحب! جیسی دہشت ان کی آنکھیں دیکھ کر چھٹپن میں ہوتی تھی، ویسی ہی نہ صرف ان کے آخری دم تک رہی بلکہ میرے آخری دم تک بھی رہے گی۔ بڑی، بڑی آنکھیں اپنے ساکٹ سے نکلی پڑتی تھیں۔ لال سرخ، ایسی ویسی، بالکل خون کبوتر...... لگتا تھا بڑی، بڑی پتلیوں کے گرد لال ڈوروں سے ابھی خون کے فوارے چھوٹنے لگیں گے اور میرا منہ خونم خون ہو جائے گا۔ ہر وقت غصے میں بھرے رہتے تھے۔ جنے کیوں۔ گالی ان کا تکیہ کلام تھی۔ اور جو رنگ تقریر کا تھا وہی تحریر کا...... رکھ ہاتھ نکلتا ہے دھواں مغزِ قلم سے۔ ظاہر ہے کچھ ایسے لوگوں سے بھی پالا پڑتا تھا جنہیں بوجوہ گالی نہیں دے سکتے تھے۔ ایسے موقعوں پر زبان سے تو کچھ نہ کہتے لیکن چہرے پر ایسا ایکسپریشن لاتے کہ قدِ آدم گالی نظر آتے۔ کس کی شامت آئی تھی کہ ان کی کسی بھی رائے سے اختلاف کرتا۔ اختلاف تو درکنار، اگر کوئی شخص محض ڈر کے مارے ان کی رائے سے اتفاق کر لیتا تو فوراً اپنی رائے تبدیل کر کے الٹے

اس کے سر ہوجاتے۔ ارے صاحب! بات اور گفتگو تو بعد کی بات ہے۔ بعض اوقات محض سلام سے مشتعل ہوجاتے تھے! آپ کچھ بھی کہیں، کیسی ہی سچی اور سامنے کی بات کہیں، وہ اس کی تردید ضرور کریں گے۔ کسی کی رائے سے اتفاق کرنے میں اپنی ہتکی سمجھتے تھے۔ ان کا ہر جملہ ”نہیں“ سے شروع ہوتا تھا۔ ایک دن کانپور میں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ آج بڑی سردی ہے، بولے ”نہیں۔ کل اس سے زیادہ پڑے گی۔“

”وہ چچا سے پھوپا بنے اور پھوپا سے خسر الحذر لیکن مجھے آخر وقت تک نگاہ اٹھا کر بات کرنے کی جسارت نہ ہوئی۔ نکاح کے وقت وہ قاضی کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ قاضی نے مجھ سے پوچھا۔ ”قبول ہے؟“ ان کے سامنے منہ سے ہاں کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بس اپنی ٹھوڑی سے دو مؤدبانہ ٹھونگیں ماردیں جنہیں قاضی اور قبلہ نے رشتۂ مناکحت کے لیے ناکافی سمجھا۔ قبلہ کڑک کر بولے۔ ”لونڈے! بولتا کیوں نہیں؟“ ڈانٹ سے میں نروس ہوگیا۔ ابھی قاضی کا سوال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ میں نے ”جی ہاں، قبول ہے۔“ کہہ دیا۔ آواز یکلخت اتنے زور سے نکلی کہ میں خود چونک پڑا۔ قاضی اچھل کر سہرے میں گھس گیا۔ حاضرین کھلکھلا کے ہنسنے لگے۔ اب قبلہ اس پر بھنّا رہے ہیں کہ اتنے زور کی ہاں سے بیٹی والوں کی ہیٹی ہوتی ہے۔ بس تمام عمر اُن کا یہی حال رہا۔ اور تمام عمر میں کربِ قرابت داری و قربت قہری دونوں میں مبتلا رہا۔

حالانکہ اکلوتی بیٹی بلکہ اکلوتی اولاد تھی۔ اور بیوی کو شادی کے بڑے ارمان تھے لیکن قبلہ نے مایوں کے دن عین اس وقت جب میرا رنگ نکھارنے کے لیے ابٹن ملا جارہا تھا کہلا بھیجا کہ دولھا میری موجودگی میں اپنا منہ سہرے سے باہر نہیں نکالے گا۔ دو سو قدم پہلے سواری سے اتر جائے گا اور پیدل چل کر عقدگاہ تک آئے گا۔ عقدگاہ انہوں نے اس طرح کہا جیسے اپنے فیض صاحب قتل گاہ کر ذکر کرتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ قبلہ کی دہشت دل میں ایسی بیٹھ گئی تھی کہ مجھے عروسی چھپر کھٹ بھی پھانسی گھاٹ لگ رہا تھا۔ انہوں نے یہ شرط بھی لگائی کہ باراتی پلاؤ زردہ ٹھونسنے کے بعد یہ ہرگز نہیں کہیں گے کہ گوشت کم ڈالا اور شکر ڈیوڑھی نہیں پڑی۔

خوب سمجھ لو، میری حویلی کے سامنے بینڈ باجا... ہرگز نہیں بجے گا۔

چارپائی

سچ تو یہ ہے کہ جہاں چارپائی ہو وہاں کسی فرنیچر کی ضرورت نہ گنجائش نہ تُک۔ انگلستان کا موسم اگر اتنا ذلیل نہ ہوتا اور انگریزوں نے بروقت چارپائی ایجاد کرلی ہوتی تو نہ صرف یہ کہ وہ موجودہ فرنیچر کی کھکھیڑ سے بچ جاتے بلکہ پھر آرام دہ چارپائی چھوڑ کر، کالونیز بنانے کی خاطر گھر سے باہر نکلنے کو بھی ان کا دل نہیں چاہتا۔ ”اوور ورکڈ“ سورج بھی ان کی سلطنت پر ایک صدی تک ہمہ وقت چمکتے رہنے کی ڈیوٹی سے بچ جاتا۔ اور کم از کم آج کل کے حالات میں اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑے رہنے کے لیے ان کے گھر میں کوئی ڈھنگ کی چیز تو ہوتی۔ ہم نے ایک دن پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی ٹی سے کہا کہ بقول آپ کے، انگریز تمام ایجادات کے موجد ہیں۔ آسائش پسند، بے حد پریکٹیکل لوگ ہیں۔ حیرت ہے چارپائی استعمال نہیں کرتے۔ بولے، ادوان کسنے سے جان چراتے ہیں، راقم الحروف کے خیال میں، ایک بنیادی فرق ذہن میں ضرور رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ یورپین فرنیچر صرف بیٹھنے کے لیے ہوتا ہے جبکہ ہم کسی ایسی چیز پر بیٹھتے ہی نہیں جس پر لیٹ نہ سکیں۔ مثال میں دری، گدیلے، قالین، جازم، چاندنی، چارپائی، کوچۂ یار اور پہلوئے دلدار کو پیش کیا جاتا ہے۔ ایک چیز ہمارے ہاں البتہ ایسی تھی جسے صرف بیٹھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اسے حکمرانوں کا تخت کہتے تھے۔ لیکن جب انہیں اسی پر لٹکا کر اور پھر لٹا کر نہلا دیا جاتا تو یہ تختہ کہلاتا تھا اور اس عمل کو تختہ الٹنا کہتے تھے۔

(”حویلی“ سے اقتباس)

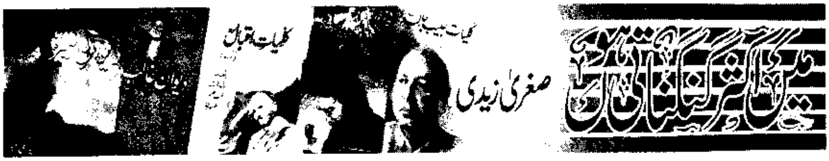

صغریٰ زیدی

☆شبنم میر......سیالکوٹ
چشم تو وسعتِ افلاک میں کھوئی ساغر
دل نے اک اور جگہ ڈھونڈلیا عید کا چاند
☆تسنیم قریشی......کوہاٹ
جن کے ملنے کا آسرا ہی نہیں
عید ان کا خیال لاتی ہے
☆فضہ بتول......بہارہ کہو
آئی ہے عید آج بھی ہر سال کی طرح
پریوں کے جشنِ طرب کا کچھ سلسلہ نہ ہو
پچھلے برس تھا خوف تجھے کھو نہ دوں کہیں
اب کے برس دعا ہے تیرا سامنا نہ ہو
☆رفیعہ ابدالی......کراچی
مناؤ عید بہارِ چمن کو یاد کرو
پیامِ شوق کے اِک اِک سخن کو یاد کرو
ہجومِ شوق سے فرصت ملے تو اہلِ وطن
وطن سے دور کسی بے وطن کو یاد کرو
☆فاطمہ......حیدرآباد
نظر کا چین دل کا سرور ہوتے ہیں
کچھ ایسے لوگ جہاں میں ضرور ہوتے ہیں
سدا چمکتا رہے ان کی عید کا تہوار
قریب رہ کے بھی جو ہم سے دور ہوتے ہیں
☆ثمینہ سلیم......حیدرآباد
غیروں میں ہے جو شاد اسے عید مبارک
جس کو نہیں ہم یاد اسے عید مبارک
معصوم سے ارمانوں کی معصوم سی دنیا
جو کر گیا برباد اسے عید مبارک

☆لائبہ علی......کوٹ ادو
کتنی عیدیں گزر گئیں تم بن
اب خدا کے لیے نہ تڑپانا
دیکھو پھر عید آنے والی ہے
عید کے ساتھ تم بھی آ جانا
☆نسرین یاسین......لطیف آباد
ہم تو احتیاج کی چکی میں پس رہے ہیں عدمؔ
ہمارے واسطے کیا عید اور کیا بقر عید
☆ساجدہ ظفر......کمالیہ
تو ہنسے تو مہک اٹھیں دل کی کلیاں
تیری اِک مسکراہٹ سے ہماری عید ہوجائے
☆زرینہ مشتاق......منڈی بہاؤالدین
خدا معلوم اس طائر کے دل پر کیا گزرتی ہے
جو پر تولے ہوئے ہو اور زیرِ دام آجائے
قمرؔ اِک دن سفر میں خود ہلالِ عید بن جاؤں
اگر قبضے میں مرے گردشِ ایامِ آجائے
☆حمنیٰ قندیل......کمالیہ
زندگی کی بہاریں دیکھیں آپ
محفلیں لیل و نہار دیکھیں آپ
آج کی عید ہی پہ کیا موقوف
ایسی عیدیں ہزاروں دیکھیں آپ
☆فصیحہ آصف خان......ملتان
نہ نظر ملی ،نہ قریب آئے، نہ ہی گلے ملے
یہ کیسی عید ہے جسے سب عید کہتے ہیں
☆تسنیم کوثر......کراچی
کر کے گھائل مجھے اس کا بھی برا حال ہوا
اس کی زلفیں بھی نہ سلجھیں میری الجھن کی طرح

☆فرحت احمد......گلشن حدید
وہ تیرا غم تھا کہ تاثیر میرے لہجے کی
کہ جس کو حال سناتے اسے رُلا دیتے

☆سعیدہ بانو......لوئر مال، مری
ہے میرے دل کو خدا کی رحمتوں کی طلب
جو وسیع بھی ہیں، بے حساب بھی ہیں

☆پروین افضل شاہین......بہاول نگر
میرے چاہنے والے مجھ کو بھول گئے تو کیا
موسم ہو تبدیل تو پتے جھڑنے لگتے ہیں

☆رانی سجاد......کراچی
رقص شعلوں کا اگر ہے تمہیں اتنا ہی پسند
خود اپنے گھر کو کبھی آگ لگا کر دیکھو

☆عشرت فاطمہ......رحیم یار خان
تاریخ ہزاروں سالوں میں بس اتنی ہی بدلی ہے
تب دور تھا پتھر کا اب لوگ ہیں پتھر کے

☆فرح طاہر قریشی......ملتان
یہ دکھ نہیں کہ اندھیروں سے صلح کی ہم نے
ملال یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

☆نازنین رشید......گلشن حدید، کراچی
میں اکثر شام ڈھلنے سے لرزتا اس لیے بھی ہوں
افق پہ ڈوبتا منظر میرا انجام لگتا ہے

☆صبا سجاد......دبئی
اس شہرِ بے مثال میں، اِک ہم کو چھوڑ کر
ہر شخص باکمال ہے، ہر شخص لاجواب

☆عروبہ ناز......کوٹلی
نماز پڑھ کے ترا غم گلے لگا لوں گا
اکیلے عید منانا مری سرشت نہیں

☆ناعمہ تحریم......کراچی
یہ دن بھی مبارک ہے ملو آ کے گلے سے
پھر ہم سے ذرا ہنس کے کہو عید مبارک

☆ایلیا شیراز......لاہور
عید کے چاند میں کھو کر جانے
کتنی ماؤں نے اپنے چاندوں کو تلاشا ہوگا

☆نگہت غفار......کراچی
نہ میرے قلم سے لکھی گئی نہ میری زباں سے ادا ہوئی
جو نظر سے کہنے کی بات ہے کسی حرف میں نہ سمائے گی
کوئی پھول چنتا ہے کس طرح کوئی دھول ہوتا ہے کس طرح
یہ وقت، وقت کی بات ہے تجھے زندگی بتائے گی

☆ایمن رانی......کمالیہ
سوچ کی زمینوں پر راستے جدا ہوں تو
دور جا نکلنے میں دیر کتنی لگتی ہے
ہے یہ وقت کے بس میں جانے کتنی مہلت دے
ورنہ بخت ڈھلنے میں دیر کتنی لگتی ہے

☆نیلوفر خان......بہارہ کہو
چمن والوں سے مجھ صحرا نشیں کی زندگی اچھی
بہار آ کر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

☆عرشیہ جنید......کراچی
چمن والوں سے اسیرانِ چمن کی یہ تمنا ہے
بہار آئے تو ہم بھولے ہوؤں کو یاد کر لینا

☆سعیدہ فروغ......راول پنڈی
چمن کے غنچوں نے رنگ بدلا فلک کے تاروں نے ساتھ چھوڑا
میں جن سہاروں سے مطمئن تھی انہی سہاروں نے ساتھ چھوڑا

☆نفیسہ نہال......لاہور
اس زلف کا کیا کہنا جو دوش پر لہرائی
سمٹی تو بنی ناگن پھیلی تو گھٹا چھائی

☆یاسمین رشید......کراچی
اس جہاں میں کب کسی کا درد اپناتے ہیں لوگ
رخ ہوا کا دیکھ کر اکثر بدل جاتے ہیں لوگ

☆ثریا کمال......منڈی بہاؤالدین
یونہی چپکے، چپکے رونا یونہی چپکے، چپکے باتیں
بڑی کشمکش کے دن ہیں بڑی الجھنوں کی راتیں

☆کوثر خالد......جڑانوالہ
عید آئی ہے تم بھی آؤ ناں
اپنی صورت ہمیں دکھاؤ ناں
میں نے مہندی ہے گھول کے رکھی
آ کے نام اپنا لکھ جاؤ ناں

منتخب غزلیں

ماہِ جولائی دو نہایت معروف شعرا احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی کا ماہِ وفات ہے اسی مناسبت سے ہم اپنے باذوق قارئین کے لیے ان نامور شاعروں کا کلام پیش کر رہے ہیں۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

تیرا در چھوڑ کے میں اور کدھر جاؤں گا
گھر میں گھر جاؤں گا صحرا میں بکھر جاؤں گا

تیرے پہلو سے جو اٹھوں گا تو مشکل یہ ہے
صرف اِک شخص کو پاؤں گا جدھر جاؤں گا

اب ترے شہر میں آؤں گا مسافر کی طرح
سایۂ ابر کی مانند گزر جاؤں گا

تیرا پیمانِ وفا راہ کی دیوار بنا
ورنہ سوچا تھا کہ جب چاہوں گا مر جاؤں گا

چارہ سازوں سے الگ ہے مرا معیار کہ میں
زخم کھاؤں گا تو کچھ اور سنور جاؤں گا

اب تو خورشید کو گزرے ہوئے صدیاں گزریں
اب اسے ڈھونڈنے میں تا بہ سحر جاؤں گا

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

کلام: احمد ندیم قاسمی

20 نومبر 1916ء تا 10 جولائی 2006ء

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے
میں اپنے پاؤں تلے روندتا ہوں سائے کو
بدن مرا ہی سہی، دوپہر نہ بھائے مجھے
برنگِ عود ملے گی اسے مری خوشبو
وہ جب بھی چاہے بڑے شوق سے جلائے مجھے
میں گھر سے تیری تمنا پہن کے جب نکلوں
برہنہ شہر میں کوئی نظر نہ آئے مجھے
وہی تو سب سے زیادہ ہے نکتہ چیں میرا
جو مسکرا کے ہمیشہ گلے لگائے مجھے
میں اپنے دل سے نکالوں خیال کس کس کا
جو تو نہیں تو کوئی اور یاد آئے مجھے
وہ میرا دوست ہے سارے جہاں کو ہے معلوم
دغا کرے وہ کسی سے تو شرم آئے مجھے
وہ مہرباں ہے تو اقرار کیوں نہیں کرتا
وہ بدگماں ہے تو سو بار آزمائے مجھے
میں اپنی ذات میں نیلام ہو رہا ہوں قتیل
غمِ حیات سے کہہ دو خرید لائے مجھے

کلام: قتیل شفائی

24 دسمبر 1919ء تا 11 جولائی 2001ء

خوش ذائقہ
پاکیزہ بہنیں

جھٹ پٹ چکن بالز

اشیا ✿ چکن کا قیمہ، پاؤ بھر۔ ہرا مسالا، ہری مرچ، پودینہ، ہری پیاز۔ سب ملا کر کاٹ کر بس ایک کپ لے لیں۔ نمک، مرچ، حسبِ ذائقہ...... میدہ، دو کھانے کے چمچ۔ کارن فلاور، ایک کھانے کا چمچ بھر کر۔ ڈبل روٹی کا ایک سلائس، سفید زیرہ پیا ہوا، ایک چائے کا چمچ۔ گرم مسالا پیا ہوا، آدھا چمچ۔ انڈا، ایک عدد۔ بریڈ کرمز، حسبِ ضرورت۔ تیل، تلنے کے لیے۔

ترکیب ✿ تمام اشیا قیمے کے ساتھ باریک پیس لیں۔ میدہ اور کارن فلاور بھی شامل کر لیں۔ اب ہاتھ میں ذرا سا آئل لگا کر چھوٹی، چھوٹی بالز بنا لیں۔ ایک پیالے میں انڈا پھینٹ لیں اور ایک پلیٹ میں بریڈ کرمز نکال لیں چھوٹا سا گولا بنائیں اور انڈے میں ڈپ کر کے بریڈ کرمز میں رول کریں اور ایک پلیٹ میں رکھتی جائیں۔ جب بالز بن جائیں تو دو گھنٹے کو فریزر میں رکھ دیں۔ ضرورت کے وقت حسبِ ضرورت گرم تیل میں ڈیپ فرائی کریں۔ ہری چٹنی اور کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔ انتہائی مزیدار خستہ چکن بالز سے عید کے مہمانوں کی خاطر کریں۔

مرسلہ: سنبل ملک اعوان، شاہدرہ لاہور

مزیدار سویاں

اشیا ✿ سویاں، دو کپ۔ چینی، دو کپ۔ بالائی یا کریم، ایک کپ۔ میوے، حسبِ پسند کٹے ہوئے۔ لونگیں دو، سبز الائچی دو۔

ترکیب ✿ ایک ٹیبل اسپون گھی میں لونگ اور سبز الائچی کڑکڑا کر سویاں ہلکی بھون لیں اب اس میں چینی اور بالائی شامل کر لیں اور ہلکی آنچ پر رکھیں جب سویاں نرم ہو جائیں تو میوہ ڈال کر مکس کریں اور پھر سرو کریں۔ چاہیں تو اس میں قلاقند، برفی یا کھویا بھی شامل کر سکتی ہیں۔

مرسلہ: کلثوم عباس، کراچی

اسپیشل فروٹ چاٹ

اشیا ✿ خربوزہ، ایک عدد۔ کیلے، چھ عدد۔ سیب، دو عدد۔ انگور، ایک پاؤ، پائن ایپل، ایک کپ۔ شکر قندی، تین عدد۔ انار، ایک عدد۔ (سرخ رنگ کا) دودھ، آدھا کلو۔ فریش کریم، آدھا پیکٹ، چینی، تین چائے کے چمچ۔

ترکیب ✿ سب سے پہلے دودھ ابال کر ٹھنڈا کر لیں پھر اس میں چینی اور کریم ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ تمام پھل چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں کاٹ لیں، ایک گہرے برتن میں پھینٹا ہوا دودھ ڈالیں اور پھر اس میں کٹا ہوا تمام پھل شامل کر دیں، اس چاٹ کو ایک گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ مزے دار فروٹ چاٹ تیار ہے، جو بے حد ذائقے دار بھی ہے اور صحت بخش بھی۔ (اگر انار کا موسم نہیں ہے تو آم بھی ڈال سکتی ہیں)

مرسلہ: نفیسہ آرا، راس الخیمہ

ملائشین چکن

اشیا ✿ بون لیس چکن بریسٹ، آدھا کلو۔ انڈے کی سفیدی، تین عدد۔ (پھینٹ کر فوم بنا لیں) کارن اسٹارچ، (تین چمچ کارن فلاور گھول کر پکا لیں) آدھا کپ۔ میدہ، آدھا کپ۔

بیکنگ پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ ہری پیاز، (سبز حصہ) دو عدد (کاٹ لیں)۔ آئل، فرائنگ کے لیے۔

سوس کے لیے:

ہورائیزن سوس، آدھا کپ۔ سرکہ، ایک چوتھائی کپ۔ پانی، آدھا کپ۔ سویا ساس، تین کھانے کے چمچ۔ کارن اسٹارچ، تین کھانے کے چمچ۔ ویجی ٹیبل آئل، ایک کھانے کا چمچ۔ ادرک (چوپڈ)، دو کھانے کے چمچ۔ لہسن، چار جوے (چوپڈ) کٹی سرخ مرچ، آدھا چائے کا چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔

ترکیب ✿ سوس بنانے کے لیے ہورائیزن سوس، سرکہ، کارن اسٹارچ، سویا سوس اور پانی مکس کر لیں۔ پین میں آئل گرم کر کے لہسن ادرک اور نمک اور کٹی سرخ مرچ ہلکی فرائی کریں۔ پھر ہورائیزن سوس والا مکسچر شامل کر کے

گاڑھا ہوجانے تک پکائیں۔ کارن اسٹارچ، میدہ اور بیکنگ پاؤڈر مکس کرلیں۔ چکن کو انڈے کی سفیدی میں ڈپ کریں اور پھر میدے والے مکسچر میں رول کر کے گرم آئل میں ڈیپ فرائی کرلیں۔ تیار کی ہوئی سوس میں فرائڈ چکن مکس کردیں۔ ہری پیاز سے سجا کر سرو کریں۔

مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

آئس کریم فج

اشیا ❁ کریم، دو کپ۔ چاکلیٹ، چھ پیں (چوکور) لے لیں۔ چینی، حسبِ ذائقہ۔ مکھن، دو کھانے کے چمچ۔ ہاف اینڈ ہاف، ایک چوتھائی کپ۔ لائٹ کارن سیرپ، ایک چوتھائی کپ۔ ونیلا ایکسٹریکٹ، دو چائے کے چمچ۔ انڈے، دو عدد۔ آئس کریم، سانچے ایک عدد۔

ترکیب ❁ ایک پین کو گرم کر کے چاکلیٹ اور مکھن ڈال کر پگھلالیں ..... اور چمچ چلا کر آمیزے کو اچھی طرح مکس کرلیں۔ پھر اسی پین میں کارن سیرپ، چینی اور ہاف اینڈ ہاف ڈال کر خوب مکس کرلیں۔ آنچ دھیمی رکھیں اور آمیزے کو پکائیں۔ جب آمیزہ ابلنے لگے تو چولھا بند کر کے اس آمیزے کو ایک باؤل میں ڈال کر انڈے (پھینٹ کر) ڈال کر مکس کریں پھر چاکلیٹ، مکھن آمیزہ بھی اس میں شامل کر کے اچھی طرح مکس کریں۔ اب اس آمیزے کو چاکلیٹ والے پین میں ڈال کر پین ہلاتے ہوئے پکائیں۔ جب آمیزہ گاڑھا ہوجائے تو اس میں ہاف اینڈ ہاف، ونیلا ایسنس، کریم (پھینٹ کر) مکس کردیں۔ (ہاف اینڈ ہاف بنانے کے لیے ایک کپ فل کریم دودھ میں چار چائے کے چمچ پگھلا ہوا سادہ مکھن (بغیر نمک والا) ملائیں اور ہلکا سا مکس کردیں یہ ہاف اینڈ ہاف بن جائے گا) چمچ سے سب اشیا کو اچھی طرح مکس کرنے کے بعد آئس کریم کے .... (سانچے) میں یہ آئس کریم مکسچر ڈال دیں۔ اگر کون بنانا ہے تو کون کے سانچے لے لیں اور اس میں آئس کریم مکسچر ڈال کر بند کردیں اور فریزر میں رات بھر کے لیے رکھ دیں۔ بہترین آئس کریم فج انجوائے کریں جو صحت بخش اور گرمی سے محفوظ رکھتا ہے۔

مرسلہ: مہک جاوید، سیالکوٹ

اسپیشل یخنی پلاؤ

اشیاء ❁ چانپیں، (بڑے ٹکڑے کاٹ لیں) ایک کلو..... بکرے کی۔ پیاز، ایک عدد۔ ثابت گرم مسالا، تھوڑا سا۔ ادرک، دو انچ کا ٹکڑا۔ لہسن، ادرک پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ سونف، دو کھانے کے چمچ۔ ثابت دھنیا، دو کھانے کے چمچ۔ لہسن دس سے بارہ جوے۔ پیاز، گولڈن کرنے کے لیے، دو عدد۔ گھی یا تیل، ایک کپ۔ دہی، ایک کپ۔ لال مرچ پاؤڈر، حسبِ ذائقہ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ دھنیا پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ زعفران، کیوڑہ، حسبِ ضرورت۔ دودھ، آدھا کپ۔

ترکیب ❁ چانپوں کو دھو کر ایک پتیلی میں ڈالیں اس میں آٹھ گلاس پانی اور نمک ڈالیں اور ایک ململ کا سفید کپڑا لیں اس میں ثابت گرم مسالا، سونف، دھنیا اور ادرک، لہسن کے جوے اور پیاز کے بڑے، ٹکڑے ڈال کر پوٹلی بنا کر چانپوں کی پتیلی میں ڈالیں اور درمیانی آنچ پر اس وقت تک پکائیں کہ چانپیں گل جائیں۔ اس کے بعد چانپوں کو نکال کر الگ رکھ دیں اور یخنی کو چھان کر علیٰحدہ رکھ لیں۔ چاول کو پانی میں پندرہ منٹ تک بھگودیں۔ ایک پتیلی میں تیل گرم کریں اور اس میں سلائس کی ہوئی پیاز فرائی کریں براؤن ہونے پر آدھی نکال کر علیٰحدہ رکھ لیں اس کے بعد باقی بچی ہوئی پیاز میں ابلی ہوئی چانپیں اور لہسن، ادرک پیسٹ ڈال کر تھوڑی دیر فرائی کریں اس کے بعد اس میں دہی، لال مرچ پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر اور نمک ڈال کر بھونیں اس کے بعد اس میں چھانی ہوئی یخنی ڈال کر تیز آنچ پر ایک مرتبہ ابالنے کے بعد اس میں چاول ڈالیں اور پانی خشک ہونے پر چاولوں کو دم پر لگادیں۔ دودھ میں زعفران اور کیوڑہ مکس کر کے چاولوں پر ڈالیں اور مزید دس منٹ تک دھیمی آنچ پر دم پر رکھیں۔ مزیدار اسپیشل یخنی پلاؤ تیار ہے، گرم، گرم سرو کریں۔

مرسلہ: جبین نیاز، ملتان

بزم پاکیزہ پاکیزہ بہنیں

پہلا انعام یافتہ سوال

☆کرن......کراچی

سوال: انسان کے چودہ طبق کب روشن ہوتے ہیں؟

جواب: جب آپ کے سامنے آپ سے بھی زیادہ چالاک شخص آجائے۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ساجدہ ظفر......کمالیہ

سوال: اس عید پر میں کیا گل کھلاؤں کہ سب مجھے دیکھتے رہ جائیں۔

جواب: پتوں کا ڈریس بنالو۔

☆اسما کاشف، لطیف آباد

سوال: عید کے دن میں ڈرتی رہتی ہوں کہ کہیں......؟

جواب: قرض دار آج بھی نہ آجائیں۔

☆ امامہ تجمل......کراچی

سوال: نادان ماں کو، عقل مند کمال کو ڈھونڈتا ہے تو عام آدمی کیا ڈھونڈے گا؟

جواب: وہ تو بیچارہ روزی، روٹی کو ہی ڈھونڈتا ہے۔

سوال: عید پر میں نے اپنی نند کو نولکھا ہار دیا مگر وہ بولی؟

جواب: ارے بھابی اب اس ہار کو پھینک دو کب سے باری، باری ہر ایک کو چڑھا رہی ہو۔

سوال: آپ مجھے بتائیں میں عید پر ان سے عیدی کس طرح لوں؟

جواب: سج بن کر مہندی چوڑیوں بھرے ہاتھ لیے لہک کر آداب عرض کر کے۔

☆امبر مظاہر، کراچی

سوال: وہ ہر عید پر مجھے صرف چوڑیاں ہی کیوں دیتے ہیں؟

جواب: کیا گولڈ کی چوڑیوں پر بھی اعتراض کرو گی۔

سوال: میرے میاں ہر بار عیدی میں ڈنڈی مار جاتے ہیں، میں کیا کروں؟

جواب: ایک اچھی بیوی کی طرح برداشت کریں کبھی نہ کبھی یہ ڈنڈی ٹوٹ ہی جائے گی۔

سوال: عید کے دن دوسروں کے گھر جائیں یا ان کا اپنے ہاں آنے کا انتظار کریں تاکہ عیدی ملے؟

جواب: عید کا دن تو سب کے ساتھ خوشیاں بانٹنے کا دن ہے سو آپ بھی جائیں اور مہمان نوازی بھی کریں۔

☆نسرین یاسین، حیدرآباد

سوال: عید والے دن جب میں نے اپنے میاں سے کہا کہ اتنا پرفیوم مت لگائیں اگر کوئی چڑیل عاشق ہوگئی تو......انہوں نے بھلا مجھے کیا جواب دیا ہوگا؟

جواب: مہا چڑیل کے آگے عام چڑیلوں کی کیا مجال۔

سوال: عید والے دن میں اپنے میاں کے سنگ سنگ کیوں رہتی ہوں؟

جواب: عیدی پر نظر رکھنے کے لیے۔

سوال: عید والے دن سے ہی میرا جوتا میرا پاؤں کاٹ رہا ہے، مجھے بہت غصہ آرہا ہے۔ اپنا غصہ کس پر اتاروں؟

جواب: جس نے جوتا دلایا ہے، نام ہم نہیں لیں گے۔

☆شمیم احمد......کراچی

سوال: ساس بانٹے عیدی اور کس کو دے؟

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

جواب: اپنی پیاری، پیاری بہوؤں کو بھی۔

سوال: ان کی بھیجی ہوئی عیدی تو بس؟

جواب: دکھانے لائق تھی ہی نہیں...... اوں، اوں، اوں....

سوال: عید پر میں نے کون سی ایسی ڈش بنائی تھی کہ ہر کھانے والے نے کہا کہ؟

جواب: مہربانی کر کے آئندہ یہ ڈش مت بنانا۔

☆ ایمن رانی......ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال: عید پر مجھے بھول نہ جانا......خود نہ آسکو تو عیدی ہی بھیج دینا؟

جواب: جی ضرور۔

سوال: عید پر آئے اور عیدی نہ آئے۔ ایسے تو حالات نہیں تھے؟

جواب: آپ کی عیدی کہیں اور چلی گئی پچھلی دفعہ اعتراض نہ کرتی ناں۔

☆ ماہ نور خان......بہارہ کہو

سوال: یہ عید کیسے اسپیشل بناؤں؟

جواب: اپنے پیاروں کو محبت اور خلوص کے تحفے دے کر یقین دلاؤ وہ ہی تمہارے لیے اسپیشل ہیں۔

☆ حسینہ ممتاز خان......اسلام آباد

سوال: اگر دیواروں کی آنکھیں ہوتی تو؟

جواب: تمہارا کیا خیال ہے اب نہیں ہوتیں، کان کے ساتھ چار آنکھیں بھی ہوتی ہیں بی بی۔

سوال: خوشیوں بھری زندگی کیسے ہوتی ہے؟

جواب: دوسروں کے دکھ درد بانٹ لو خوشیاں برسنے لگیں گی۔

☆ حمنیٰ قندیل......کمالیہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال: وہ کہتے ہیں عقل نہ ہو تو موجاں ہی موجاں......میں جواباً کیا کہوں؟

جواب: اب بیچارے بے عقلے کو تم کیا سبق پڑھاؤ گی۔

☆ فرح ناز......ملکوال

سوال: خاموشی ہر عیب کو چھپائے رکھتی ہے یہ بات کس حد تک درست ہے؟

جواب: جب تک کہ زبان دانتوں کے اندر رہ ہے۔

سوال: کیا عورت کی ہر بات پر اعتبار کرنا چاہیے؟

جواب: جی بالکل......کیا جانچنے کے لیے عقل نہیں اگلے کے پاس۔

سوال: خوشی کے دن کم اور غم کی مدت زیادہ کیوں ہوتی ہے؟

جواب: خوشی میں دماغ کی گھڑی تیز، تیز چلنا شروع ہو جاتی ہے۔

☆ ارم کمال......فیصل آباد

سوال: گھڑی رات کا ایک بجائے اور جانو گھر نہ آئے تو کیا کرنا چاہیے؟

جواب: جانو کے آنے کا انتظار پکا۔

سوال: شعر کا جواب دیں؟

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

جواب: جھوٹ بولے کوا کاٹے کالے کوّے سے ڈریو!

سوال: چکنے گھڑے کی چکنائی کیسے اتاری جاتی ہے؟

جواب: جوتوں سے رگڑائی کرو۔

سوال: یہ انہوں نے کیا کہا کہ میرے ہاتھوں کے کبوتر ہی اڑ گئے؟

جواب: پہلے محاورہ درست کرو پھر ہینڈ واش سے ہاتھ دھو کر جا کر گرم، گرم روٹی پکاؤ تا کہ ان کے ہاتھوں میں کھجلی نہ ہو۔

☆ پروین افضل شاہین......بہاول نگر

سوال: لڑکے گرلز کالج کے باہر تیز آواز میں ہارن بجاتے ہوئے تیز رفتار میں اپنی موٹر سائیکل کیوں چلاتے ہیں؟

جواب: بیچارے اپنی، اپنی بہنوں کو بلاتے ہیں، تم بھی ناں۔

☆☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

حسن نکھاریے

مہ جبیں

☆زرینہ مشتاق......منڈی بہاؤ الدین

جواب: آپ کا مسئلہ ہم شائع نہیں کر رہے اس کے لیے ماہر امراضِ جلد سے جا کر خود ملیں، چہرے کے بالوں کے لیے عرض ہے کہ جسم میں ہارمونز کے بگاڑ کی وجہ سے... بھی بال زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کا علاج ویکس ہی ہے لیزر ٹریٹمنٹ کا مشورہ ہم نہیں دے سکتے۔ یہ تو ماہرِ جلد ہی دیں گے۔ بلیچ یا ویکسنگ کروانے سے کسی حد تک مسئلہ حل ہو جائے گا۔

نوزائدہ بچے کے بہت رواں ہوتا ہے۔ سوا مہینہ بعد میدے کو دودھ یا پانی میں گوندھ کر لوئی سے بنا لیں اور اس سے نرم ہاتھوں سے بچے کی جلد پر پھیریں۔ کافی حد تک رواں اتر جائے گا۔ تھریڈنگ یا ویکسنگ کروانے کے بعد ٹونک کریں یا آئسنگ......

نکہت اعوان......سرگودھا

سوال: چہرے کی صفائی کے لیے کچھ گھریلو نسخے بتادیں۔

جواب: چہرہ جسم کا خوب صورت اور نازک حصہ کہ جس کی صفائی اور دیکھ بھال کے لیے ہم سدا پریشان تو ضرور رہتے ہیں مگر مناسب علاج اور تراکیب مستقل مزاجی سے استعمال نہیں کرتے۔

کوئی بھی نسخہ مہینے بھر کے استعمال سے اثر چھوڑتا ہے ہاں اگر منفی اثرات ہوں تو وہ دو تین دن میں ہی ظاہر ہو جاتے ہیں، چہرے کی صفائی کے لیے ضروری ہے کہ آپ بھرپور بے فکر نیند لیں۔ ذہن میں پریشانیاں اور نامکمل کاموں کی فہرست لے کر ہرگز نہیں سوئیں بلکہ درود شریف اور استغفار کا ورد کرتے ہوئے نیند کی وادی میں جائیں۔ رات سونے سے پہلے چہرہ ضرور دھوئیں۔ گھریلو نسخے مثلاً دودھ اور بیسن گھول کر چہرہ دھونا۔ ملتانی مٹی کا ماسک لگا کر چہرہ صاف کرنا یا کھیرے کو کرش کر کے اس کے گودے سے چہرے کو صاف کریں۔ اسی طرح گلاب کی تازہ پتیاں دودھ یا پانی میں پیس کر اس سے چہرہ دھوئیں۔ استعمال شدہ لیموں سے بھی جلد صاف ہوتی ہے۔ بشرطیکہ دانے نہ ہوں ورنہ مرچیں لگیں گی۔ شہد، لیموں کا عرق اور انڈے کی سفیدی خوب مکس کر کے پندرہ منٹ کے لیے چہرے پر لگائیں۔ اور سادے پانی سے چہرہ دھو لیں۔ یہ عمل ان میں دو دفعہ کریں۔

بالائی میں شہد ملا کر چہرے پر لگائیں اور پندرہ منٹ بعد دھولیں۔ اللہ تعالیٰ نے شہد میں بڑی شفا رکھی ہے۔ صبح نہار منہ نیم گرم پانی میں آدھا لیموں اور ایک چمچہ شہد گھول کر پئیں۔ قہوے میں شہد ڈال کر پئیں یہ کثافتوں کو دور کرتا ہے۔

جو کے آٹے کا دلیا دودھ کے ساتھ گھول کر چہرے اور ہاتھوں پر ملیں اس سے جلد صاف شفاف ہوگی۔

سبزیوں سے بھی حسن نکھاریے

1۔ چقندر کا رس پئیں اور چہرے پر لگائیں بھی۔

2۔ ہرے پتوں والی سبزیاں خوب استعمال کریں مگر کم مسالے ڈالیں اور کم بھونیں۔ ہو سکے تو کچی سبزیاں استعمال کریں۔

3۔ ٹماٹر بغیر بیج اور بغیر چھلکے کے مفید ہیں...... یہ قدرتی بلیچ بھی ہیں۔

4۔ ہری پیاز اور شملہ مرچ کا استعمال کھیرے اور ککڑی کے ساتھ کریں۔ اور اگر دہی کے رائتے میں استعمال کریں تو بہت اچھا ہے۔

5۔ کچے آلو کا گودا چہرے کے داغ دھبوں کے لیے بے حد مفید ہے۔

☆ ☆ ☆

مہندی کے ڈیزائن

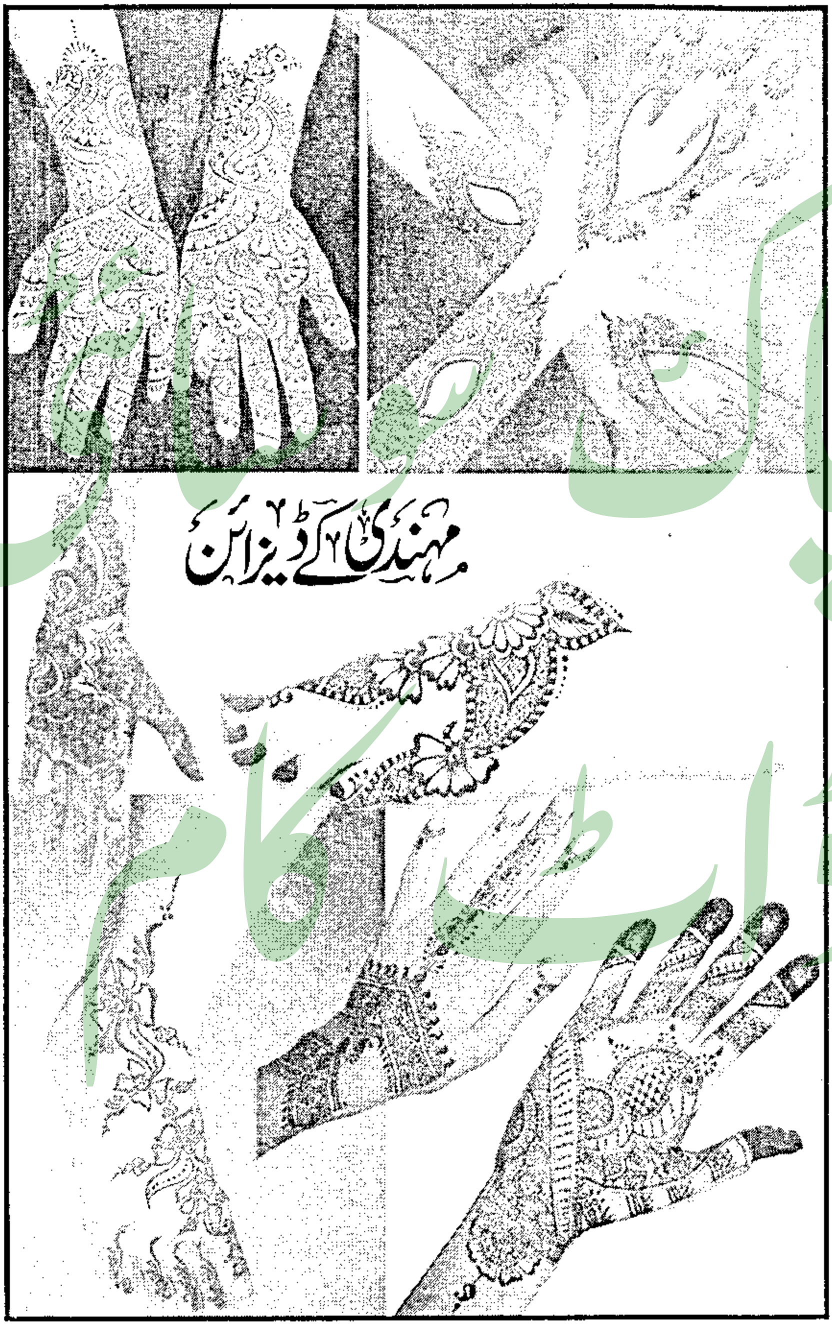

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

روحانی مشورے

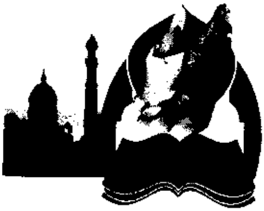

ادارہ

اسمائے ربانی کے اَسرار

یوں تو پروردگار عالم کے تمام ذاتی اور صفاتی اسمائے مبارکہ بے انتہا فضیلت، اہمیت اور جلالت کے حامل ہیں مگر یہاں ہم ہفتے کے دنوں کے حساب سے کچھ اسمائے مبارکہ بتارہے ہیں۔ (پروردگار ہم سب کی دینی توفیقات میں اضافہ کرے، الٰہی آمین)

☆**یافتاحُ** (اے ابتدایا کھولنے والا)

ہریکشنبہ (بروز اتوار) بعد نمازِ فجر اس اسمِ الٰہی کو 488 مرتبہ پڑھنے والے کی ہر مشکل آسان ہوتی چلی جائے گی۔

☆**یا لطیفُ** (بہت لطف، مہربانی کرنے والا)

اللہ تعالیٰ کے اس اسم کو ہر دوشنبہ (پیر، سوموار) کو بعد نمازِ فجر 129 مرتبہ پڑھنے والا اللہ کے بے حد لطف وکرم میں رہے گا اور ہر دل عزیز ہوگا۔

☆**یا قابضُ** (اے ہر شے پر قبضہ رکھنے والے)

ہر سہ شنبہ (بروز منگل) بعد نمازِ فجر اس اسم پاک کا 903 مرتبہ ورد کرنے والے پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوگا اس کی خواہشات پوری ہوں گی اور اللہ کے رحم وکرم میں ہوگا۔

☆**یا متَعَالیُ** (اے بلند مرتبے والے)

ہر چہار شنبہ (بروز بدھ) بعد نمازِ فجر 55 مرتبہ اس کا ورد کرنے والے کا مرتبہ بلند و بالا ہوگا اور اللہ اس کی حاجات پوری فرمائے گا۔

☆**یارزّاقُ** (بے حساب روزی عطا کرنے والا)

ہر پنج شنبہ (روزِ خمیس جمعرات) کو کوئی بعد نماز فجر 308 مرتبہ اس اسم پاک کا ورد کرے تو اللہ تعالیٰ اس اسم پاک کی برکت سے روزی عطا فرماتا ہے اور اس میں اضافہ کرتا ہے۔

☆**یانُور** (اے نور، روشنی ہی روشنی)

بروز جمعتہ المبارک جو سیّد الایام بھی ہے یعنی دنوں کا سردار، بعد نمازِ فجر اس اسمِ الٰہی کو 256 مرتبہ پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس اسم کی برکت سے اس کے پڑھنے والے کو لوگوں کی نظر میں محترم و بزرگ بنادے گا۔ لوگ اس کی دل سے عزت وتکریم کریں گے۔

☆**یاغنیُ** (اے ہر شے سے بے پروایا آزاد)

بروز شنبہ یعنی ہفتہ، سنیچر کو بعد نمازِ فجر جو شخص اس اسم الٰہی کا 1060 مرتبہ ورد کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اس اسم کی برکت سے ہر شخص کے ضرر سے محفوظ اور بے پروا کردے گا، کسی کا اس پر بے جا زور نہ ہوگا۔

(یاد رکھیے...... یہ اسمائے پاک خلوصِ نیت سے پڑھیے کہ دل میں اپنے ہی برادرِ ایمانی کے لیے کوئی بد خواہی نہ ہو، پروردگار ہم سب پر اپنا کرمِ خاص کرے، آمین۔)

بے حد مجرّب عمل

بے شک آیاتِ قرآن پاک شفا ہیں، اس سے فیضیاب ہونے کے لیے بصیرت چاہیے صرف بصارت سے کام نہیں چلتا۔ سو قرآن پاک کو سمجھ کر پڑھنے ہی میں شفا اور کامیابی ہے۔

سورہَ حشر قرآن پاک کا 59 واں سورہَ جس کی آخری چار آیت کے لیے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ یہ مرض الموت کے علاوہ تمام امراض کی دوا ہے اور موت کے وقت آسانی لاتی ہے۔ ہر نمازِ فریضہ کے بعد اس کا ورد زندگی میں آسانیوں کا باعث ہے۔ اسی طرح سورہَ حدید 57 واں سورہَ کی ابتدائی چار آیات کے بارے میں بھی یہی حدیث رسولؐ ہے۔

نظرِ بد کا علاج

نظرِ بد خدانخواستہ کسی کو لگ جائے تو صرف آیات قرآنی ہی اس کا توڑ ہیں۔ اول تو چار قل اور آیت الکرسی، اول و آخر تین بار درود شریف کے ساتھ پڑھ کر دم کریں۔ نیا کپڑا پہنتے وقت سورۂ اخلاص ایک مرتبہ پڑھ لیا کریں۔ کوئی بھی نئی چیز استعمال کرنے سے پہلے اس کا صدقہ دیا کریں۔ رات سوتے وقت بچوں، بڑوں سب کو تاکید کریں کہ چار قل اور آیت الکرسی اور کلمۂ طیبہ پڑھ کر اپنے اور اپنے گھر والوں پر ضرور پھونکیں۔ جو عزیز رشتے دار یا اولاد دور ہو تو اس کا تصور کرکے یہ عمل کریں...... بالخصوص معوذتین (سورۂ فلق اور سورۂ ناس) کا ورد رکھیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے نواسوں امام حسینؓ امام حسنؓ کو زانو پر بٹھا کر یہ سورے تلاوت فرما کر دم کیا کرتے تھے۔

اپنے بچے تیار ہو کر سامنے آئیں تو ماں کی پیار بھری نگاہ نہیں ٹھہرتی اس وقت آعوذ باللہ پڑھ کر بچوں پر یہی سورے دم کیا کریں۔

☆سورۂ عادیات جو قرآن پاک کا 100 واں سورۂ ہے۔ جو آخری پارے عمہ یتسالون میں ہے۔ اسے ایک گلاس پانی پر دم کرکے نظر شدہ فرد کو پلائیں یہ عمل اکتالیس روز تک مسلسل کرنا ہے۔

کمر کے درد کا علاج

اگر کسی کی کمر میں درد رہتا ہو تو پانچوں وقت کی نماز باقاعدگی سے پڑھے اور ظہر کی نماز کے بعد ایک سو اکتالیس مرتبہ یہ پڑھیں۔

اَللّٰہُ الۡحَکِیۡمُ

انشاء اللہ کمر کا درد جاتا رہے گا۔

اولاد کا حصول

رَبِّ ھَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ ذُرِّیَّۃً طَیِّبَۃً
اِنَّکَ سَمِیۡعُ الدُّعَآ

ترجمہ: اے رب میرے! مجھے اپنے پاس سے دے ستھری اولاد بے شک تو ہی دعا سننے والا ہے۔

فضیلت: یہ دعا طلب اولاد کی دعا ہے جو حضرت ذکریا علیہ السلام نے بڑھاپے میں کی تھی چنانچہ قبول ہوئی اور حضرت یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔

دماغی قوت کے لیے

ہر نماز کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر یاقوی گیارہ دفعہ پڑھنا ضعف دماغ کے لیے مفید ہے۔

بے خوابی کا علاج

لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الۡمَلِکُ الۡحَقُّ الۡمُبِیۡنُ

رات کو سوتے وقت پہلے سو مرتبہ درود شریف پڑھیں، اس کے بعد اس آیت کو بار، بار پڑھیں۔ انشاء اللہ نیند بہت اچھی آئے گی اور بے خوابی کی تکلیف دور ہو جائے گی۔

(یہ خوب صورت دعائیں ہمیں سیدہ عروج فاطمہ نے ملتان سے بطور خاص ارسال کی ہیں)

استغفار کی فضیلت

بہنو! ضروری نہیں ہے کہ ہم گناہ کریں اور اس کے بعد استغفار طلب کریں۔ دانستہ و نادانستہ تمام دن ہم سے بے شمار گناہانِ کبیرہ وصغیرہ سرزد ہوتے ہیں، کوئی بھی بے عیب نہیں سوائے ذات باری تعالیٰ کے سو جیسا کہ سورۂ نوح میں بھی ارشاد ہوا ہے کہ کثرت سے استغفار کرو۔

رسول پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے بے شک میں دن میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔ سو توبہ واستغفار کرنا ہی ایک مسلمان کا شیوہ ہے۔

استغفر اللّٰہ ربی واتوب الیہ

درود شریف کے ورد کے ساتھ، ساتھ استغفار کا ورد بھی اپنا وتیرہ بنالیں۔

استغفار اللّٰہ الذی لا الہ الا ھوا لحی القیوم واتوب الیہ

☆☆☆

SCHWABE شوابے ہومیو کلینک

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

آرتھرائٹس

عروبہ.........گلبرگ

میں پاکیزہ کی بہت پرانی قارئہ ہوں اور ہومیو کلینک بھی بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ مجھے دو سال سے مہروں کی پرابلم ہے۔ ایلو پیتھک کا علاج کروایا۔ فرق نہیں ہوا، اب ایک سال سے ہومیو پیتھک علاج کر رہی ہوں۔ سب سے آخری مہرے میں بہت تکلیف ہے۔ کولہوں کے بالکل اوپر ٹانگ سے لے کر پاؤں کی انگلیوں میں درد جاتا ہے۔ دوائی مسلسل استعمال کر رہی ہوں.... درد کم ہو جاتا ہے پر ختم نہیں ہوتا۔ زیادہ کام کرنے سے درد کافی بڑھ جاتا ہے۔ ٹانگ پر وزن نہیں پڑتا ہے۔ بائیں ٹانگ میں درد جاتا ہے۔ اب بائیں بازو میں بھی دبرد جانے لگا ہے۔ ٹانگ میں گھٹنے کے اندر والی جگہ سوج جاتی ہے اور بہت شدید درد ہوتا ہے۔ کمر کے آخری حصے کے درمیان میں مہروں پر سوجن ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ اس مسئلے کا کوئی حل نہیں۔ صرف درد کنٹرول ہو جائے یہی غنیمت ہے۔ ایک اور مسئلہ قبض کی بھی شکایت رہتی ہے۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد سے پیٹ بہت نکل آیا ہے۔ توند کم کرنے کی اگر کوئی دوائی ہو تو وہ بھی ضرور بتائیں۔ پیریڈ تاریخ سے چار یا پانچ دن

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

اگست 2017ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________________

پتا: ____________________

____

پہلے آجاتے ہیں اور بہت زیادہ ہوتے ہے۔ ڈاکٹر خون کی کمی بھی بتاتے ہیں۔

جواب: کیلشیم کی کمی اور کچھ ہارمونز کے غلط عمل کی وجہ سے ہڈیاں کمزور ہوجاتی ہیں۔ مینسز کی بھی خرابی ہو جاتی ہے، وزن بھی بڑھتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ادویات بھی ہارمونز معدے، جگر، گردے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ Thyorid Profile, Serum Insulin, Progestron, Estrogen, Calcium, Vit-D کے ٹیسٹ کرائیں۔ فی الحال ایک ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Rhustox Pentrakan Ptk 73 کے 10 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں چار مرتبہ استعمال کریں۔ دودھ، دہی سبزیاں اور فروٹ کا استعمال کریں اور اپنے جسم کو دھوپ دکھائیں صبح اور شام کی 15 منٹ کم ازکم۔

چھائیاں

سفینہ.........کلاکوٹ

میں شادی شدہ ہوں۔ میرے دو بچے ہیں جو آپریشن سے ہوئے ہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے منہ پر چھائیاں ہیں جو تقریباً 5 سال سے ہیں۔ ہر طرح کی کریم استعمال کی ہے۔ کریم سے تھوڑا بہت فرق پڑتا ہے جب لگانا چھوڑ دیتے ہیں تو پھر زیادہ ہوجاتی ہیں۔ پلیز آپ کوئی دوا تجویز کریں تاکہ میری چھائیاں ختم ہوجائیں۔

جواب: آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ کو مینسز کی تو کوئی پرابلم نہیں رہی ہے۔ لیکوریا کی شکایت تو نہیں۔ بہرحال آپ 3 ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی دوا Sepia 30 کے 5، 5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں تین مرتبہ دو ماہ تک استعمال کریں۔

بیماری کے اثرات

ارجمند.........بہاولپور

ڈاکٹر صاحب میں کالج کی اسٹوڈنٹ ہوں، پریشانی یہ ہے کہ میری بقرعید کے بعد شادی ہے اور میں اپنے جسم کی کمزوری کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ پلیز کوئی ایسی دوا بتائیں کہ میں شادی سے پہلے ٹھیک ہوجاؤں اور سائیڈ ایفیکٹ بھی نہ ہو۔ میرا ماہانہ نظام ٹھیک نہیں ہے۔ چار چار پانچ پانچ ماہ نہیں آتے۔ لیکوریا بھی بہت زیادہ ہے۔ کمزوری بہت محسوس ہوتی ہے۔ ٹانگوں اور پیٹ کے نچلے حصے میں درد رہتا ہے۔ کمر اور سر میں بھی درد رہتا ہے، چکر آتے ہیں۔ بلڈ پریشر لو رہتا ہے۔ سر کے بال جڑوں سے اترتے ہیں، پیٹ موٹا ہو گیا ہے اور خود بھی بہت موٹی ہوگئی ہوں۔ آنکھوں کے گرد حلقے ہیں اور قبض بھی رہتا ہے۔

جواب: اپنی زندگی میں منتخب معمولات اپنایئے۔ نماز کی پابندی کیجیے۔ غذا اور آرام کا خیال رکھیے اور ایک ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Staphisagria200 ہر ہفتہ ایک خوراک لیں۔ ایک دن بعد Origanum 30 کے 5، 5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں تین مرتبہ لیں۔ Magnesium Phos Pentarkan Ptk 60 کی ایک گولی دن میں تین مرتبہ لیں۔ اپنی غذا کو متوازن بنائیں، ناشتا ضرور کریں اور خالی پیٹ نہ رہیں۔

ٹی بی کے اثرات

بابرا عوان.........فیصل آباد

کچھ سالوں پہلے مجھے ٹی بی کا مرض لاحق ہوا۔ جس کا میں نے لگ کر اسپتال سے 9 ماہ کا علاج کیا۔ اس کے 6 سال بعد میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہوئی تو اسپیشلسٹ کو چیک کرایا۔ جب میرے ٹیسٹ کرائے گئے تو ان میں میرے پھیپھڑے متاثر پائے گئے۔ اسپیشلسٹ نے مجھے میڈیکل کلینک علاج کے لیے روانہ کردیا جہاں سے کچھ عرصے تک میں نے علاج کرایا۔ طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو میں نے علاج چھوڑ دیا۔ مارچ 2015ء میں میری طبیعت پھر بہت خراب ہوگئی۔ بہت زیادہ بخار، سانس کی تھکن، جسم میں درد، بلغم، پیشاب جل

From Nature. For Health.

کر اور پیلا آتا تھا۔ صبح اٹھتا تھا تو سینہ بندھا ہوتا تھا۔ سانس بہت مشکل سے نکلتی تھی۔ ٹی بی اسپشلسٹ سے چیک کرایا۔ انہوں نے جو میڈیسن دی وہ کھاتا رہوں تو طبیعت ٹھیک رہتی ہے۔ چھوڑ دوں تو پھر وہی حال ہوتا ہے۔ اب کمزوری بہت ہے، پیشاب جل کر آتا ہے اور پیلا رنگ کا ہوتا ہے، چکر آتے ہیں، ناک کی وجہ سے گلے میں الرجی رہتی ہے۔ آواز بہت بھاری ہو گئی ہے، سانس رک جاتی ہے، جسم میں کافی درد رہتا ہے۔ پوستان فورٹ کی 2 گولی روزانہ کھاتا ہوں۔ منہ خشک ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے آواز بیٹھ جاتی ہے، کبھی کبھی ایسے کھانسی آتی ہے جیسے ٹی بی ہو، بھوک نہیں لگتی، صبح سو کر اٹھتا ہوں تو جسم میں درد ہوتا ہے اور سینہ بندھا ہوتا ہے۔ بلغم ہوتا ہے جس کی وجہ سے سانس لینے میں بہت دشواری ہوتی ہے۔ رپورٹس بھیج رہا ہوں۔ میں سگریٹ بھی پیتا ہوں۔ برائے مہربانی میرے لیے اچھی دوا تجویز فرمائیں جس سے میری بیماری ختم ہو جائے۔ تازیست دعا گو رہوں گا۔

جواب: جو رپورٹس آپ نے بھیجی ہیں وہ 5 سال پرانی ہیں۔ آپ خود اپنے آپ کو ٹھیک ہونے نہیں دیتے ورنہ آپ یہ سگریٹ نوشی کب کی چھوڑ چکے ہوتے۔ صبح فجر پڑھ کر تازہ ہوا میں سانس لیں۔ ورزش کریں، صبح سویرے دھوپ لگائیں۔ بکری کا دودھ، مکھن، گوشت، تازہ پھل اور سبزیوں کا استعمال کریں Urine D/R کرا کر اس کی رپورٹ بھیجیں۔ پیشاب میں انفیکشن ہے۔ پانی زیادہ پیا کریں۔ کم از کم 8 سے 10 گلاس روزانہ۔ خود سے دوائیں لینا چھوڑ دیں۔ اس وجہ سے بھی آپ کی طبیعت بگڑتی ہے اور کچھ دوائیوں کے مضر اثرات۔ اب آپ ایک ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Tuberculinum 1M کی ایک خوراک یعنی 5 قطرے آدھا کپ پانی میں صرف ایک مرتبہ لیں۔ اس کے ایک دن بعد Merc.cor 30 Terebinth 30 کے 7، 7 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ، Senega Pentarkan Ptk77 کی 2 گولیاں دن میں تین مرتبہ منہ میں ڈال کر چوسیں۔ اللہ آپ کو عقل وصحت دے، آمین۔

وزن بڑھانا ہے

تبسم .... ساہیوال

چار مہینے بعد میری شادی ہونے والی ہے۔ میری عمر 24 سال ہے اور میرا وزن 45 کلوگرام ہے اور میں تقریباً ہڈیوں کا ڈھانچا نظر آتی ہوں۔ مناسب کھانا کھاتی ہوں مگر پھر بھی موٹی نہیں ہوتی۔ برائے مہربانی کوئی ایسی دوا تجویز کریں کہ میں موٹی ہو جاؤں۔

جواب: آپ تفصیل سے اپنا حال لکھیں جس میں اپنے جسم کی ساخت اور مزاج کے بارے میں بھی لکھیں..... فی الحال Alfalfa Q ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کے 11 قطرے صبح نہار منہ، 11 بجے اور شام 5 بجے ایک گلاس پانی میں ڈال کر لیں۔ Calc Carb 30 کے 5 قطرے دن میں تین مرتبہ آدھا گلاس پانی میں ڈال کر لیں۔ ناشتے میں دودھ، مکھن، دہی، بالائی استعمال کریں۔ نشاستے دار غذائیں، کھجور، آم، سنگترہ، کیلا اور آلو کھائیں۔

کمزور یادداشت

نورین .... اسلام آباد

میری یادداشت بہت کمزور ہے۔ ایک سوال کو میں ایک دن میں یاد کروں وہ میں دوسرے دن بھول جاتی ہوں۔ دوسرے یہ کہ مجھے یاد بھی دیر سے ہوتا ہے۔ جب پڑھنے بیٹھتی ہوں تو مختلف خیالات ذہن کو پریشان کرتے ہیں اور جب خالی پیٹ ہوتی ہوں تو معاملہ اور خراب ہو جاتا ہے اسی وجہ سے میں امتحان میں بار بار فیل ہو جاتی ہوں۔ برائے مہربانی کوئی ایسی دوا تجویز فرمائیں کہ میری یادداشت تیز ہو جائے۔

جواب:۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Anacardium 30 کے 10 قطرے آدھا کپ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پانی دن میں 3 مرتبہ لیں۔ پڑھنے سے ایک گھنٹا پہلے 20 قطرے اور Avena Sativa Q Acid Phos Q کے 5، 5 قطرے گرم پانی میں استعمال کریں۔ پوری توجہ سے یکسو ہو کر پڑھا کریں۔ جس چیز کو یاد کرنا ہو اس کو پہلے اچھی طرح پڑھیں پھر اس کو تین یا چار بار لکھا کریں۔ اس طرح اچھا یاد بھی ہوجائے گا۔

پیچش

آفاق......کراچی

میں جب بھی کچھ کھاؤں تو مجھے اس کے فوراً بعد اجابت ہوجاتی ہے۔ برائے مہربانی اس کا کوئی علاج تجویز کردیں کیونکہ اس وجہ سے میں کسی دعوت میں شرکت کرنے سے گھبراتا ہوں۔ مجھے میٹھی چیزیں بہت پسند ہیں۔

جواب: چربیلی غذاؤں سے پرہیز کریں۔ تین حصے کھانا اور ایک حصہ پیٹ خالی چھوڑ کر کھانا کھائیں تاکہ ہضم ہوسکے۔ بار بار کھانے پینے سے پرہیز کریں۔ تیز مرچ مصالحے اور گائے کے گوشت سے پرہیز کریں، انار کے دانے کھائیں۔ اس کے ساتھ دن میں چار مرتبہ Argentum Nitricum 30 پندرہ دن استعمال کریں پھر کیفیات سے آگاہ کریں۔

وزن کی زیادتی

نوردین......راولپنڈی

میری عمر 23 سال ہے لیکن میرا وزن 65 کلو گرام ہے۔ میں بہت موٹا ہوں۔ دودھ، انڈے اور میٹھی چیزوں سے مجھے رغبت ہے اور ورزش سے مجھے چڑ ہے۔ مٹاپے کی وجہ سے گھٹنے میں درد رہتا ہے اور سر میں بھی ہلکا سا درد رہتا ہے۔ سر کو گھمانے سے سر میں چکر آتے ہیں۔ اس موٹاپے کی وجہ سے میں مناسب طور پر کپڑے بھی نہیں پہن سکتا اور دوسرے لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔

جواب: سب سے پہلے آپ اپنی غذا کی طرف توجہ کریں۔ دن میں بھوسی والی ایک موٹی روٹی کھائیں، آدھی پیالی دودھ پئیں، سبزیوں میں گاجر، ٹماٹر، سلاد ابال کر یا کچی استعمال کریں۔ پھلوں میں موسمی پھل اور سیب استعمال کریں۔ کیلا، آلو اور مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں۔ ورزش ضرور کیا کریں، کم از کم ایک گھنٹا پیدل چلیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی روزانہ ایک خوراک 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں Calc Carb 200 کے روز صبح کو لیں اور Phytolacca e Baccis Q کے 7 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

قد بڑھانا ہے

فیروز..........لاہور

میری عمر 20 سال ہے اور وزن 110 پونڈ ہے۔ میرا قد 5 فٹ 2 انچ ہے۔ کئی سالوں سے میرا قد نہیں بڑھ رہا ہے۔ برائے کرم قد بڑھانے کی کوئی دوا تجویز کریں۔

جواب: ۔قد 17 سال کے بعد کم ہی بڑھتا ہے۔ بہر حال ٹرائی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ اچھی متوازن غذا استعمال کریں۔ متوازن غذا سے مراد انڈا، دودھ، مکھن، گھی، گوشت (گائے، بکرا، مچھلی) دالیں، پھل و سبزیاں لیں۔ صبح سویرے ورزش کا اہتمام کریں خصوصاً لٹکنے والی ورزش آپ کے لیے مفید ہے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Thyroidinum 30 صبح و شام کھائیے اور + Ferrum Phos 30 Calc Phos 30 دوپہر اور رات کھانے کے بعد پانچ پانچ قطرے ایک گھونٹ پانی میں استعمال کیجیے اور اپنے احوال سے بھی آگاہ کرتے رہیں۔

چہرے پر دانے

شاہانہ عروج..........حیدر آباد

میرے چہرے پر دانے نکل رہے ہیں جو کہ سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ خود بخود نکلتے ہیں اور غائب ہوجاتے ہیں۔ مگر بعض اوقات اتنے نکلتے ہیں کہ چہرہ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.

All Done

Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

http://paksociety.com

عجیب سا لگتا ہے۔ برائے مہربانی کوئی دوا تجویز فرمائیں۔ میری عمر 20 سال ہے۔

جواب:۔ آپ اپنے کھانے میں موسمی پھلوں اور سبزیوں کا اضافہ کیجیے۔ منہ پر کسی قسم کی کوئی کریم استعمال نہ کریں۔ دن میں پانچ سے چھ مرتبہ پانی سے دھویا کریں۔ صبح سویرے کی دھوپ یا شام کو سورج غروب ہونے سے پہلے کی دھوپ میں 15 منٹ تک روزانہ بیٹھیں۔ ساتھ Juglans Regia 30 روزانہ ایک خوراک یا Gun Powder 3X دن میں تین مرتبہ لیں۔

سر کے بال گر رہے ہیں

راحیلہ..........کوئٹہ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ کافی عرصے سے میرے سر کے بال گر رہے ہیں اور سر میں خشکی بھی ہے۔ مختلف قسم کے تیل اور شیمپو استعمال کیے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آپ کوئی اچھا سا نسخہ تجویز فرمادیں۔

جواب:۔ اپنے بالوں کی صفائی کا خیال رکھیں۔ اچھی اور متوازن غذا کا استعمال کریں۔ خوشبو والے صابن اور تیل کا استعمال ترک کردیں۔ صبح ناشتے کے بعد AcidFlour 30 دوپہر کو کھانے کے بعد Vinca Minor 30 اور Acid Phos Q کے پانچ قطرے ایک گلاس پانی میں رات کو سوتے وقت استعمال کریں اور ایک مہینے بعد اپنے حال سے آگاہ کریں۔

گردے میں پتھری

سمیرا کاشان...... ضلع مظفر گڑھ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عرصہ 5 سال سے گردے میں بار بار پتھری بن جاتی ہے۔ پہلی مرتبہ جب پتھری ہوئی تو ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے دوائی لی جس سے پتھری نکل گئی۔ سال کے بعد پھر بن گئی علاج کرایا پھر نکل گئی۔ پتھری تقریباً ہر سال ہو جاتی ہے۔ آخری مرتبہ جب پتھری ہوئی تو الٹرا ساؤنڈ کرایا اس وقت تقریباً 10mm کی پتھری تھی دائیں گردے میں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ کوئی علاج نہ کروانا صرف آپریشن ہوگا۔ آخر تنگ ہو کر آپریشن کرایا۔ اب تقریباً دو سال ہو گئے ہیں آپریشن کو۔ اب دونوں گردوں میں درد اور کھنچاؤ رہتا ہے۔ پیشاب ٹیسٹ کرایا تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس میں کرسٹل نہیں آتے۔ بائیں گردے میں تقریباً چنے کے برابر پتھری ہے۔ برائے مہربانی کوئی اچھی سی دوائی تجویز کردیں تاکہ آپریشن نہ کرانا پڑے۔

جواب: آپ علاج بے قاعدگی سے کراتی ہیں جبھی تو یہ بار بار بن رہی ہے۔ کیلشیم کی گولی یا اس کے مرکبات کے استعمال سے بھی پتھری بننے کے چانس بڑھتے ہیں۔ پیشاب آنے پر اس کو روکنے سے بھی پتھری بنتی ہے۔ پانی کا کم استعمال کیا جائے تو بھی پتھری بنتی ہے۔ کیلشیم کی گولیاں استعمال نہ کریں۔ پانی کم از کم 15 گلاس روزانہ پئیں۔ پیشاب جیسے ہی آئے ویسے ہی کریں روکنے کی عادت ترک کردیں۔ کیلا، پالک، ٹماٹر، دودھ کا استعمال فی الحال نہ کریں۔ وزن نہ اٹھائیں۔ البتہ چلتی پھرتی ضرور رہیں بلکہ سیڑھیاں اترنے چڑھنے کی ورزش کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کریں پھر کیفیت سے مطلع کریں۔ Lycopodium-30، Calc. carb-30 کے 7-7 قطرے ایک گلاس پانی میں جبکہ BerberisPentarkan Ptk.15 کی ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ لیں ہر کھانے سے پہلے دن میں 3 مرتبہ۔

Dr.Willmar Schwabe Germany
SCHWABE
Available at All Medical & Homoeopathic Stores
شوابے سنگل ریمیڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیوپیتھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام